بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد شعبان المعظم ۱۳۴۱ھ مطابق اپریل ۱۹۲۳ء نمبر ۴

راہِ عمل

(برٹرنڈ رسل کی کتاب "ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو" کے آخری باب سے اقتباس)

ہم ذیل میں انگلستان کے مشہور فلسفی اور ریاضی داں برٹرنڈ رسل کی کتاب "ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو" کے آخری باب کا تفصیلی اقتباس درج کرتے ہیں۔ رسل کی خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ جہاں فلسفہ اجتماع کا ماہر ہے وہاں ریاضی میں بھی استعداد تام رکھتا ہے۔ اکثر اجتماعیین کی تحریروں میں صفائی اور اہتمام صحت کمیاب ہوتا ہے۔ نفس انسانی کی ترکیب میں اتنے لاتعداد عناصر کی آمیزش ہے کہ ان کی حکیمانہ تجزی کے لیے نہایت مرتب دماغ درکار ہے۔ رسل کا دماغ اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ مسائل اجتماعی پر ان سے زیادہ سلجھی ہوئی رائے رکھنے والا کوئی شخص یورپ میں مشکل سے ملے گا۔ رسل دار العلوم کیمبرج میں ریاضی کا درس دیتے تھے آغاز جنگ پر جنگ کی مخالفت اور فوجی خدمت سے انکار کے باعث محبوس کر دیے گئے اس کتاب سے ذیل کا اقتباس ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے یہ ان خیالات کا نتیجہ ہیں جو جنگ نے رسل کے دماغ میں پیدا کیے۔ "تعمیر نو" کے روز افزوں تحریروں میں اس کتاب کو نہایت اہم درجہ

Allen & Unwin طبع "Principles of Social Reconstruction"

حاصل ہی۔ اور اس کتاب میں نیز اپنی دوسری کتاب "آزادی کی راہیں"[1] میں جو خیالات مصنف موصوف نے ظاہر کیے ہیں اور انکا جو اثر عام دماغی رجحانات پر ہوا ہی اس کی بنا پر اخیں تعمیر نو کا اخلاقی راہنما کہنا بیجا نہ ہوگا۔

رسل نے ان کتابوں میں محرکات اجتماعی کا ایک بالکل جدید فلسفہ پیش کیا ہی۔ اس جدید فلسفہ میں رسل نے اصول نمو پر بہت زور دیا ہی اس کے نزدیک اعمال انسانی پر ارادہ اور خواہش شعوری کے بہ نسبت ہیجان کا زیادہ اثر ہے۔ چنانچہ اس کے خیال میں وہی نظام اجتماعی صحیح اور عمدہ ہی جس کی ساخت ایسی ہو کہ فطرت انسانی کے ان ہیجانات کو مفید کاموں میں صرف کیلئے اور ضرر رساں اعمال سے محترز رکھے۔ وہ کہتا ہی "صرف یہی کافی نہیں کہ ہم اپنی شعوری آرزوئیں کو بدل دیں، ضرورت اس کی ہی کہ ہماری ہیجانی زندگی میں تغیر پیدا ہو"۔

ایسی جماعت کی ترتیب کے لیے ملکیت شخصی کے اصول میں بڑی تبدیلی کی ضرورت ہی۔ اشتراکیین بھی ملکیت شخصی کو مٹا کر حکومت کی ملکیت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ رسل کا رجحان جماعت کے نزاجی (Anarchistic)[2] نشو ونما کی طرف ہی۔ وہ حکومت کو ہر چیز کا مالک نہیں بنانا چاہتا۔ اور اس طرح اشتراکیین سے مختلف ہی۔ وہ علوم و فنون کے معاملہ میں حکومت کے اختیارات میں اضافہ کو نہایت مشتبہ نظر سے دیکھتا ہی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ رسل بالکل نزاجی نشو ونما کی طرف ہے اس کے خیال میں حریت کے نقطۂ نظر سے نزاجی اصول بہتر ہی اور لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اشتراکی اصول۔ اور رسل نے اپنی کتابوں میں کوشش کی ہی کہ ان دونوں میں ایک میانہ راستہ نکالے۔ مسائل اجتماعی سے دلچسپی رکھنے والوں کے ان کتابوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ کاش دونوں کتابوں کا ترجمہ اُردو زبان میں شائع ہو جاتا

(ذاکر)

---

[1] Roads to Freedom

[2] Anarchistic

ہم اپنی زندگی میں دنیا کے لیئے کیا کر سکتے ہیں؟

بہت سے لوگ ہیں، مرد اور عورتیں، جو نوع انسانی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب پریشان ہیں اور ان کی قوت کیسی بے وقعت اور کس درجہ قلیل معلوم ہوتی ہے! بالآخر یاس انھیں آ لیتی ہے۔ اور وہ جن میں جذبۂ خدمت سب سے قوی ہوتا ہے، وہی اس احساس بیچارگی سے سب میں زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور فقدان امید کے باعث روحانی تباہی کا احتمال انھیں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اگر ہم محض مستقبل قریب کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ چنداں زیادہ نہیں۔ مثلاً ہمارے لیے غالباً یہ ناممکن ہے کہ ہم جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔ اسی طرح ہم حکومت یا ملکیت شخصی کی مضبوط طاقت کو بھی تباہ نہیں کر سکتے، نہ ہم اسی دم تعلیم میں نئی روح پھونک سکتے ہیں ان معاملات میں اگرچہ ہم خرابی کو دیکھ لیں لیکن سیاسیات کے معمولی طریقوں سے انکا کوئی فوری علاج ممکن نہیں ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا پر ایک غلط روح کا تسلط ہے اور اس روح میں آج سے کل تک کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ ہماری امیدیں، ہماری توقعات، کل کے لیے نہ ہونی چاہئیں بلکہ ہمیں اس زمانہ کا خیال کرنا چاہیے جب وہ خیالات جو آج معدودے چند دماغوں میں ہیں پھیل کر اکثریت کا مشترک خیال بن جائیں گے۔ ہم میں اگر جرأت ہے اور صبر، تو ہم وہ خیالات سوچ سکتے اور ان امیدوں کو محسوس کر سکتے ہیں جو جلد یا بدیر انسانوں میں روح پھونکینگی۔ اور جن سے پژمردگی اور مایوسی، قوت اور ولولہ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لیے ہمیں جو پہلا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خود اپنے ذہن میں صاف طور پر معلوم کر لیں کہ ہم کس قسم کی زندگی کو اچھا سمجھتے اور دنیا میں کسی نوع کی تبدیلی کے آرزومند ہیں۔

دنیا میں اسی وحدت کے وجود کی تمنا کہ ایک فرد ایک جماعت، یا خود ساری نوع انسانی کی زندگی بہت سے جدا جدا اجزا پر مشتمل نہ ہو بلکہ کسی معنی میں خود ایک کُل ہو۔ ایسی حالت میں ایک فرد کی نشو و نما دوسرے کی نشو و نما میں حائل نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مدد پاتی اور ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اور اس طرح مذکورہ بالا دونوں اصول باہم مطابق ہو جاتے ہیں۔

حیات انفرادی میں یہ وحدت ایک مستقل تخلیقی غرض یا غیر محسوس ہیجان سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مہذب مرد یا عورت کی زندگی میں یہ وحدت پیدا کرنے کے لیے خلقی جبلت کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کیلئے ضروری ہے ایک ہمہ گیر غرض، ایک حوصلہ، حکمی یا جمالی تخلیق کی کوئی آرزو، کوئی مذہبی اصول، یا قوی اور پائدار جذبات اس مرد یا عورت کے لیے یہ وحدت حیات بہت دشوار ہے جسے ایک قسم کی شکست نصیب ہو چکی ہو۔ اور وہ شکست یہ ہے کہ اسکی زندگی میں جو ہیجان (Impulse) حاوی ہونا چاہیے تھا وہ رک کر پامال ہو جاتا ہے اکثر پیشے انسان کو زندگی کے شروع ہی میں اس شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص صحافت کا پیشہ اختیار کرے تو اسے غالباً کسی ایسے اخبار کے لیے لکھنا پڑے گا جس کی سیاسیات سے وہ نفرت کرتا ہے۔ اس طرح کام سے جو ولولہ اور فخر پیدا ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ احساس خودداری بھی۔ اکثر طبیب ہیں کہ بلا تھوڑی سی دھوکہ بازی اور دھونس کے کامیاب نہیں ہو سکتے، چنانچہ جو کچھ تھوڑا بہت حکمی ضمیر ان میں ہوتا بھی ہے وہ بھی غارت ہو جاتا ہے۔ سیاسیین اپنی جماعت یا فرقے کے پروگرام ہی کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ساتھ ساتھ اپنے کو بزرگ اور برگزیدہ بھی ظاہر کرنا پڑتا ہے، تاکہ مذہبی خیال والے ساتھیوں کی تسکین ہوتی رہے۔ چنانچہ ہماری انگریزی پارلیمنٹ میں مشکل ہی سے کوئی شخص بلا ریاکاری کے پہنچ سکتا ہے۔ پیشے انسان کے اس طبعی و فطری احساس نفس کی ذرا عزت نہیں کرتے، جس کے بغیر انسان کامل انسان نہیں رہ سکتا۔ دنیا بے رحمی کے ساتھ اس جذبہ کو کوٹ کوٹ کر اس سے نکالتی

وریہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ عبارت ہے خودداری اور خودمختاری سے! اور انسانوں میں خودآزاد رہنے سے زیادہ قوی آرزو دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی ہے - یہ داخلی ونفسی آزادی ایک بیش قیمت جوہر ہے، اور وہ جماعت نہایت پسندیدہ اور آرزو کرنے کے قابل ہے جو اسے برقرار رکھے -

انسان میں اصل نمو یہ لازم نہیں کہ کسی خاص عمل سے منع کرنے سے برباد ہو - بلکہ اکثر اس کی تباہی یوں عمل میں آتی ہے کہ اسے کوئی دوسری چیز کرنے پر آمادہ کردیا جائے - نمو کے لیے تباہ کن وہ چیزیں ہوتی ہیں جو دل کے اندر ان چیزوں میں بے بسی کا احساس پیدا کردیں جن میں انسان کا ہیجان حیات اپنا اثر دکھانا چاہتا ہے - ان میں بدترین چیزیں وہ ہیں جنھیں قوت ارادی تسلیم کرلیتی ہے - اکثر عدم خودشناسی کے باعث انسان کا ارادہ اس کے ہیجان سے ادنیٰ سطح پر ہوتا ہے - اس کا ہیجان ہوتا ہے کسی قسم کی تخلیق کی طرف، اس کا ارادہ اسے کسی رسمی پیشہ کی جانب لیجاتا ہے جس میں آمدنی اور علم چشموں میں عزت کافی نصیب ہو ......
اور چونکہ یہ ہیجان عمیق ہوتا ہے اور خاموش، چونکہ وہ چیز جو "عام سمجھ" کے نام سے معروف ہے اس کی مخالف ہوتی ہے، چونکہ اس تہیج کی اتباع اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اپنے پوشیدہ احساسات کو بزرگوں اور دوستوں کے عقل وفہم اور دانشمندانہ پند ونصایح کا مخالف بنائے اس لیے سو صورتوں میں سے ۹۹ میں یہ تخلیقی ہیجان جس سے ایک آزاد اور قوی زندگی پیدا ہوسکتی تھی شروع ہی میں کچل کر پامال ہوجاتا ہے - اور یہ نوجوان بجائے خودمختار کاریگر بننے کے ایک آلہ بننے پر راضی ہوجاتا ہے، اب یہ اس مقصد کا پیرو نہیں رہتا جسے اس کی فطرت اچھا جانتی ہے، بلکہ دوسروں کے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے - عین جس آن میں کہ اس سے تسلیم کا یہ فعل سرزد ہوتا ہے، اس کے اندر کسی چیز کی موت بھی واقع ہوتی ہے اس کے بعد وہ کبھی کامل انسان نہیں بن سکتا، اس کی پہلی غیر مجروح خودداری اس میں پھر

کبھی واپس نہیں آسکتی، نہ وہ سربلند احساسِ نفس جو باوجود تمام خارجی مصائب و مشکلات کے اس کی روح کے انبساط کا باعث ہوتا الّا یہ کہ ان کے خیالات میں کامل تبدیلی یا اس کے طرزِ زندگی میں بنیادی تغیر پیدا ہو جائے۔

خارجی موانع جنھیں قوت ارادی تسلیم نہ کرے، اسقدر ضرر رساں نہیں ہوتے جتنی کہ وہ پوشیدہ ترغیبات جو ارادہ کو بہکا لیتی ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ عشق و محبت میں کوئی سخت مایوسی نہایت شدید کرب و الم کا باعث ہو، لیکن ایک قوی انسان کو یہ مایوسی وہ داخلی نقصان نہیں پہونچا سکتی جو فرض کرو کہ صرف روپیہ کی خاطر شادی کر لینے سے انسانی روح کو پہونچتا ہے۔ اس لیے کہ اصل چیز کسی خاص آرزو کا حصول نہیں بلکہ وہ سمت ہے، وہ راہ ہے جس پر تکمیل یا حصول کی خواہش ہو، تاثیر کی وہ نوع ہے جو مطلوب ہو۔ چنانچہ جب اصلی ہیجان کی مخالفت قوتِ ارادی کرتی ہے، تو ہیجان اپنے کو بےبس محسوس کرنے لگتا ہے، اور پھر اسمیں محرکِ عمل بننے کی امید باقی نہیں رہتی برخلاف اس کے اگر ہیجان قوی ہے تو خارجی جبر سے بےبسی اور لاچاری کا یہ احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ورنہ یوں تو بعض مخصوص آرزوؤں کی پامالی بہتر سے بہتر جماعت میں بھی ناگزیر ہوگی۔ کیونکہ بعض لوگوں کی آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انھیں روکا نہ جائے تو دوسروں پر جبر یا دوسروں کی تباہی انکا نتیجہ ہو۔ مثلاً ایک اچھی جماعت میں نپولین کو اپنا من مانا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ ملتی؛ البتہ وہ کہیں مغربی امریکہ میں نئے علاقوں کی دریافت یا آبادی میں اولیت کا شرف حاصل کرسکتا تھا۔ ایک بنک کے محرر کی حیثیت سے وہ خوشی نہ حاصل کرسکتا اور نہ کوئی معقول نظام جماعتی اسے محرر بننے پر مجبور کرتا۔

حیات انفرادی کی وحدت چاہتی ہے کہ فرد میں جو کوئی تخلیقی ہیجانات ہوں وہ اس کی زندگی میں پائے جائیں، اور اس کی تعلیم و تربیت ان ہیجانات کی حفاظت کرے اور انھیں ابھارے

جماعتی زندگی کی وحدت کے لیے ضرورت ہے کہ مختلف افراد کے مختلف تخلیقی ہیجانات مل کر سب ایک مشترک زندگی، اور ایک مشترک غرض (جس کا محسوس ہونا ضروری نہیں) کی طرف مائل ہوں، جس سے جماعت کے ہر فرد کو اپنی ذاتی تکمیل میں مدد ملے۔

انسان کے ہیجانات اور آرزوؤں کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ تخلیقی اور تملیکی۔ ہمارے بعض اعمال اس غرض سے ہوتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز پیدا کریں جو ان اعمال کے بغیر موجود نہ ہوتی اور بعض دوسرے افعال وہ ہوتے ہیں جو اُن چیزوں کو حاصل کرنے یا اپنے قبضہ میں قائم رکھنے کے لیے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں۔ ہیجان تخلیقی کا اچھا نمونہ فنون لطیفہ کے ماہرین میں ملے گا، اور تملیکی ہیجان کا بہترین نمونہ ملکیت شخصی ہے بہترین زندگی وہ ہے جسمیں تخلیقی ہیجانات زیادہ سے زیادہ اور تملیکی کم سے کم کارفرما ہیں۔ .... سیاسی اور خانگی زندگی دونوں کا اصول اوّلین یہ ہونا چاہیے کہ ہر اس چیز کو فروغ دیں جو تخلیقی ہے اور ہر اس آرزو اور ہیجان کو کم کریں جنکا مرکز تملیک ہے۔ بحالات موجودہ حکومت بڑی حد تک تملیکی ہیجانات کا مجسمہ ہے۔ امور داخلی میں یہ امیروں کو غریبوں کے مقابلہ میں بچاتی اور معاملات خارجی میں یہ اپنی قوت کمزور قوموں سے ناجائز کسب فوائد اور دوسری حکومتوں سے مقابلہ و مسابقہ میں صرف کرتی ہے۔ اسی طرح ہمارا نظام معاشی تمام تر تملیک سے متعلق ہے۔ .... تعلیم، ازدواج اور مذہب اصلاً تخلیقی ہیں۔ لیکن تملیکی محرکات کی مداخلت نے انھیں اپنی اصلیت سے بہت کچھ دور کر دیا ہے۔ مثلاً تعلیم اس بات کا وسیلہ سمجھی جاتی ہے کہ طلبا کے دماغ میں تعصبات بھر کر موجودہ نظام کو کسی طرح قایم رکھا جائے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اسے حرّیت فکر اور آزادی خیال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے یا جذبات و احساسات حسنہ کی مثال اور ذہنی حوصلہ کی تحریک سے اس تعلیم کو ایک بہتر مطمح نظر پیدا کرنے میں صرف کیا جائے۔ ازدواج میں محبت کے تخلیقی جذبہ کو رقابت کا تملیکی جذبہ پابجولاں رکھتا ہے۔ مذہب کا کام ہونا چاہیے تھا روح کے تخلیقی

منشائے نظر کا آزاد کرنا، اب اس کا کام عموماً حیات جبلی و طبعی کو دبانا اور فکر و خیال کی تہ و بالا کرنی والی قوت کا مقابلہ کرنا ہے۔ الغرض مختلف طریقوں سے خوف نے، جو غیر محفوظ تملیک کا آفریدہ ہے، اس امید کی جگہ لے لی ہے جس کی روح رواں تخلیقی قوت ہے۔

(لہذا) مہذب دنیا کو اگر انحطاط سے بچانا ہے تو اس کے لیے ایک بنیادی تغیر کی ضرورت ہے، یعنی اس کی معاشی ساخت اور اس کے فلسفۂ زندگی دونوں میں تغیر۔..... ... زندگی کی ترقی یا تباہی میں نظام ہائے معاشی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک غلامی کو چھوڑ کر، موجودہ نظام صنعتی زندگی کے لیے ان تمام نظاموں سے زیادہ تباہ کن ہے جو کبھی عالم وجود میں آئے ہیں۔ اس میں سے مشینوں کے استعمال اور بڑے پیمانہ پر پیداکش، اجتماع، کا نکالنا تو اب ممکن نہیں اور اس نظام سے بہتر نظام میں بھی یہ باقی رہینگے۔ اصلاح کی بہترین راہ اس معاملہ میں غالباً صنعتی جمہوریتوں کا قیام اور انکا اتحاد ہے۔

جب بہت سے لوگ یقین کریں تو فلسفہ ہائے زندگی بھی جماعت کی قوت اور اس کی حیات پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو فلسفۂ حیات سب سے وسیع حلقۂ معتقدین رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مسرت کے واسطے سب سے زیادہ اہم چیز اس کی آمدنی ہے۔ اس کے دیگر نقائص سے قطع نظر یہ فلسفہ اس لیے اور بھی مضر ہے کہ یہ انسان کا مقصد بجائے ایک عمل کے ایک نتیجہ کو قرار دیتا ہے۔ یعنی بجائے ایک تخلیقی ہیجان کے جو انسان کی انفرادی شخصیت کا پرتو ہو یہ مادی اشیائے لطف اندوزی کو اس کا مقصد بناتا ہے جس میں افراد کی کوئی تفریق نہیں۔ دوسرے فلسفے جو اس سے لطیف تر ہیں، مثلاً وہ جو اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ پھیلائے جاتے ہیں، وہ عموماً مستقبل کے بجائے ماضی کو، موثر عمل کے بجائے رویہ اور برتاؤ کو توجہ کا مرکز بنا دیتے ہیں۔ لیکن روایات قدیم اور خزانۂ علم کا روز افزوں بار اٹھانے کے لیے انسان کو ان فلسفوں سے کافی قوت نہ ملے گی۔

دنیا کو ایک ایسے فلسفہ یا ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو حیات پرور ہو۔ لیکن انفرادی حیات کیلئے محض حیات کے علاوہ کسی اور چیز کی قدر کی بھی ضرورت ہے۔ جو زندگی بس زندگی کے لیے ہی وقف ہو وہ حیوانی زندگی ہے۔ اس میں کوئی حقیقی قدر انسانی نہیں۔ اور نہ اس میں صلاحیت ہے کہ انسان کو ہمیشہ پژمردگی سے یا اس احساس سے محفوظ رکھ سکے کہ سب کچھ ہیچ ہے۔ اگر زندگی کو کامل طور پر انسانی زندگی بنانا ہے تو اسے کسی ایسے مقصد کا خادم ہونا چاہیے جو کسی نہ کسی معنی میں اس سے خارجی ہو، کوئی مقصد جو مافوق الناس اور غیر شخصی ہو، مثلاً اللہ، یا حق، یا جمال۔ جو لوگ سب سے زیادہ ترقی حیات کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خاطر زندگی نہیں گذارتے۔ ان کی نظر ہوتی ہے حقیقت کے ایک تدریجی حلول پر، وجود انسانی میں حقیقت ازلی کا جزو پیدا کرنے پر۔ اس چیز پر جو متخیلہ کی نگاہ کو جدال و نامرادی سے مامون اور زمانہ کی ہمہ گیر گرفت سے محفوظ کسی بلندی پر رہتی دکھائی دیتی ہے۔ اس عالم ازلی سے لگاؤ — خواہ یہ ہمارا خیالی عالم ہی کیوں نہ ہو — اپنے ساتھ ایک ایسی قوت اور اپنے ہمرکاب ایک ایسا امن و سکون لاتا ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی کی کشاکش اور ظاہری ناکامیاں اسے کبھی کلیتہً فنا نہیں کرسکتیں۔ حقیقت ازلی کا یہی مسرت انگیز تصور ہے جسے اسپی نوزا خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کرتا ہے جنھوں نے ایک مرتبہ اسے جان لیا، ان کے لیے یہ ہمیشہ کلید گنج عرفاں ہے۔ ....

اگر ہم اس حقیقت ازلی سے لگاؤ پیدا کریں، اگر ہم اپنی زندگی اس لیے وقف کردیں کہ اس مصیبت زدہ دکھیا دنیا میں اس حقیقت الٰہی کا ایک جزو دے آئیں، تو ہم آج بھی کہ سرچہار طرف ظلم و دغا کی جدال و قتال، نفرت و حقارت سے محصور ہیں، اپنی زندگی کو تخلیقی بنا سکتے ہیں.....

جو لوگ دنیا کی اس حیات نو کا آغاز کرینگے انھیں تنہائی، مخالفت، افلاس، اور بدنامی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ انھیں اس قابل ہونا چاہیے کہ صداقت اور محبت کی قوت کی زندہ صورتیں ہوں اور اپنے سینہ کو ایک غیر تسخیر پذیر عقلی امید ہمیشہ سے آباد رکھیں۔ ایماندار ہوں، اور عقلمند۔ بے خوف ہوں، اور ایک مستقل غرض کے تابع۔ ایسے مردوں اور عورتوں کی جماعت پہلے اپنی انفرادی زندگی کی

مشکلات اور پیچیدگیوں پر فتح پائے گی اور پھر کچھ وقت گزرنے پر، اگرچہ شاید زیادہ وقت گزرنے پر خارجی دنیا پر ظفریاب ہو گی۔ دنیا کو عرفان اور امید کی ضرورت ہے، اور ہر چند وہ ان کے مقابل جنگ آزما ہو، بالآخر ان کے روبرو اپنا ہدیہ تعظیم پیش کرتی ہی ہے۔ جب قوم گوتھ نے روما کو پامال کر ڈالا آگستین مقدس نے اپنی کتاب "مدینۃ اللہ" لکھی اور تباہ شدہ مادی حقیقت کی جگہ ایک روحانی امید پیدا کی۔ آنے والی صدیوں میں کہ روما ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا ایک قریہ رہ گیا تھا، آگستین کی امید زندہ بھی رہی اور زندگی بخش بھی۔ ہم پر بھی لازم ہے کہ ایک نئی امید پیدا کریں اور اپنے خیال سے ایک ایسی دنیا بنائیں جو اس دنیا سے بہتر ہو جو خود اپنے کو قعر تباہی میں دھکیل رہی ہے۔ وقت چونکہ بُرا ہے، اس لیے ہم سے بھی اس سے زیادہ مطلوب ہے جتنا معمولی زمانہ میں ہوتا۔ آنے والی نسلوں کو اس موت سے، جو اس نسل پر آپڑی ہے جسے ہم جانتے اور جس سے ہم محبت کرتے تھے صرف خیال و روح کی دھکتی آگ ہی بچا سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے بحیثیت معلم مختلف اقوام کے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملا ہے، وہ نوجوان جن میں شمع امید فروزاں تھی، جن میں وہ تخلیقی قوت موجود تھی جو دنیا میں اس تخیلی حسن کا کچھ حصہ ضرور پیدا کرتی جس کے خیال سے وہ زندہ رہتے تھے۔ ان کو جنگ کا سیلاب بہا لے گیا کسی کو ایک طرف کسی کو دوسری طرف۔ بعض اب تک جنگ آزما ہیں بعض ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے ہیں، اور بعض مر چکے ہیں۔ جو زندہ ہیں ان کے متعلق خوف ہے کہ اکثر میں حیات روحانی کی شمع گل ہو چکی ہو گی، امید کا چراغ بجھ گیا ہو گا، قوت صرف ہو چکی ہو گی، اور آنے والے ماہ و سال اس تھکے ماندے مسافر کے جادۂ سفر ہونگے جس کی منزل قبر ہے۔ ان کے معلموں میں بہت سے ایسے ہیں جنھیں اس حادثۂ المناک کا کچھ احساس نہیں۔ یہ اپنی بے رحم منطق سے ثابت کرتے ہیں کہ ان نوجوانوں کی قربانی کسی بار دغرض مجرد کے لیے ناگزیر تھی۔ چونکہ خود ان کے

آرام میں خلل نہیں پڑا اس لیئے اگر کبھی جذبات کا کوئی آنی حملہ ہوتا بھی ہے تو یہ پھر جلدی سے اپنے آرام و اطمینان میں واپس آجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں حیات روحانی کی موت ہو چکی ہے۔ اگر یہ زندہ ہوتی تو اپنے پہلو میں باپ ماں کی سی محبت لیے ہوئے ان نوجوانوں کی روحوں سے ملنے کے لیے بڑھتی۔ یہ نفس و ذات کی قیود سے آزاد ہوتی اور اُن کی حسرت ناک مصیبت ان کی مصیبت ہوتی۔ پھر کوئی چیز پکار کر ان سے کہتی:۔ "نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یہ اچھا نہیں۔ یہ غرض مقدس نہیں جس کے لیے شباب کی دمکتی روشنی ماند اور تباہ کی جا رہی ہے۔ یہ ہم سن رسیدہ بڈھے ہیں جو گنہگار ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات سو، اپنی روحانی موت کی خاطر ان جوانوں کو میدان پیکار میں بھیجا ہے۔ یہ وہاں اس لیے ہیں کہ ہم اپنے دل میں گرمی اور اپنی روح میں ایک زندہ منظر نہ رکھنے کے باعث بھلائی اور رواداری سے زندگی گذارنے میں ناکام رہے۔ آؤ۔ اب ہم اس موت سے نکل آئیں۔ اس لیے کہ دراصل مردہ ہم ہیں، نہ یہ نوجوان جنھوں نے موت کا منہ اس لیے دیکھا کہ ہم جینے سے خائف تھے۔ ان کے تو مردہ جسموں میں ہم سے زیادہ زندگی ہے۔ اور وہ ہمیں تمام آنے والی نسلوں کے سامنے شرم و ندامت کا منظر بنا رہے ہیں۔ چاہیے کہ ان کے مردہ اجسام سے زندگی پیدا ہو اور وہ ہمیں بھی زندہ کرے"۔

ذاکر حسین خاں از برلن

پارسی علوم اور اسلام

(گذشتہ سے پیوستہ)

بھاٹ اور شاعر

قدیم پارسی شاعری کی تلاش میں باربد اور تین چار اور بھاٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عرب شاعر خالد بن فیاض نے جو اول صدی ہجری کے آخر میں گذرا ہے باربد کا افسانہ عربی میں لکھا ہے۔ باربد ایک بھاٹ تھا جو خسرو پرویز کو گا بجا کر خوش کیا کرتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الغضب بادشاہ تھا۔ جب کوئی ناگوار بات اس کے کانوں تک پہنچانا ہوتی تو اہل دربار باربد کی موسیقی اور بول کے ذریعے سے آگاہ کرتے تھے چنانچہ بادشاہ کے شبدیز نام گھوڑے کی موت کی خبر باربد نے اُسے کس طرح گا کر دی ہے خالد نے عربی نظم میں اس کو بتایا ہے۔ مگر عربی میں اس قسم کے چٹکلے اور افسانے بہت ہیں جنکو تاریخی رنگ دیکر دلچسپ اور مقبول طبع بنایا گیا ہے۔ عنترہ کے کارناموں کا پورا افسانہ، سیر شہرستیا کی کیفیت، الف لیلہ کی بعض تاریخ نما داستانیں۔ حماد الراویہ کی کہانیاں، یہاں تک کہ ہابیل کی موت پر حضرت آدم کا مرثیہ اور ابلیس کا جواب عربی نظم میں موجود ہیں جو بالکل قابل اعتنا نہیں۔ دوسرے اگر باربد کی اصلیت تسلیم بھی کی جائے تو اس کے بول شعر نہ تھے۔ چنانچہ عوفی کا بیان ہے:۔

"نوائے خسروانی کہ آں را باربد درصورت آوردہ است بسیار است فاما از وزن شعر و قافیہ و مراعات نظائر آن دور است بداں سبب تعرض بیان آں کردہ نیامد"[۱۵]

درحقیقت بھٹیتی اور شاعری دو چیزیں ہیں، الگ الگ۔ اور بھاٹوں کا وجود بجائے تہذیب و تمدن کی علامت کے ہمیشہ اور ہر ملک کی تاریخ میں وحشت و بدویت کی نشانی رہا ہے۔ آجتک غیر مہذب پہاڑی علاقوں میں بھاٹ پائے جاتے ہیں جو قومی افسانے گایا کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے دور وحشت میں امیروں کے درباروں میں آزاد آوارہ گرد بھاٹ پہنچ

۱۵۔ جلد اصفحہ ۲۔ لباب الالباب

ی تھے جن کی صحیح تصویر مشہور افسانہ نویس اور قومی شاعر سر والٹر اسکاٹ نے اپنی تصانیف
کھینچی ہے۔ اسی طرح کوہسار ویلز میں بھی بھاٹ تھے اور سرحدی پٹھانوں میں بھی موجود ہیں
کا وجود تمدن و تہذیب اور علم و ادب سے جو کچھ علاقہ رکھتا ہے محتاج بیان نہیں۔

لت شاہی روایت

رہی دولت شاہ سمرقندی کی روایت جو آغاز مضمون میں
نقل کی جا چکی ہے یعنی عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان کی طرف فارسی
پر کی غارت گری کی نسبت اور صاحب مجمع الفصحا کا اُلکم کی طرح تعمیم کرکے عام عربوں کی طرف اس وحشت
سوب کرنا، اول تو یہ اچھوتا مضمون صرف دولت شاہ کی طبع رسا کا نتیجہ ہے اور دولت شاہ کی اکثر
ایتوں کی طرح بے سند پھر محمد عوفی اپنے مستند و معتبر تذکرۂ لباب الالباب میں جو خود مجمع الفصحا مؤلفہ
اقلی خاں مذکور کا بھی ماخذ ہے "باب سوم در معنی اول کسے کہ شعر گفت" باب چہارم در معنی اول
پارسی کہ گفت" جیسے مستقل باب باندھکر ان مسائل پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ آج عام تذکروں
ں اولین اشعار پارسی کے جو نمونے منقول ہیں تقریباً سب کے سب اسی کتاب سے ماخوذ ہیں
قصۂ وامق و عذرا اور عبداللہ بن طاہر کا افسانہ کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ آل طاہر کا ذکر ان
ناظ میں موجود ہے:۔

"اگرچہ فیض و انعام ایشاں عام بود فاما ایشاں را در پارسی و لغت دری اعتقادے نبود۔
دراں عصر شعراء دریں فن کمتر خوض کردند۔ اما در عہد میمون ایشاں شاعر شکر سخن خاست
حنظلہ نام از بادغیس .... ۵۱"

اس کے بعد حنظلہ بادغیسی اور دوسرے اولین شعرائے فارس کے کلام جمع کیے ہیں! اس
نام کے سوا مثنوی وامق و عذرا کے ذکر کا اور کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ عنصری کی تصانیف
کے ضمن میں اس مثنوی کا ذکر بھی آتا ہے مگر وہاں بھی اس واقعہ کا کوئی نشان نہیں۔ پھر
رایۃً یہ ناممکن محض معلوم ہوتا ہے کہ خراسان کے گورنر کے حکم سے ساری دنیا کا فارسی لٹریچر
نا ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ خراسان میں یہ حکم چل سکتا تھا، باقی ملک ایران میں عبداللہ

---

۵۱ لباب الالباب جلد ۲ صفحہ ۲۔

کا کیا دخل ؟

فارسی اصطلاحات علمیہ سے مغالطہ

پروفیسر آزاد نے سخندان فارس میں پہلوی و فارسی قدیم کی اصطلاحات فلسفیہ کا کچھ نمونہ پیش کر کے پارسی قدیم کی مالداری کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مخصوص ادیبانہ طرز میں اس کے فنا پر سینہ کوبی کی ہے۔ مگر حسب عادات اپنا ماخذ بتایا نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری اصطلاحات پارسی جن پر ماتم کیا گیا ہے ظہور اسلام سے بہت بعد کی کوشش ہیں۔ کیونکہ اوستھا اور اس کی شرح کے سوا فلسفہ وغیرہ پر فارسی قدیم یا پہلوی میں آج دنیا پر جو کچھ اجزاء موجود ہیں وہ چودھویں صدی عیسوی (۱۳۲۳ء) تک کے لکھے ہوئے ہیں ایسی حالت میں فاضل ممدوح کا یہ ماتم اشکِ ہمدردی بہانے کے عوض خندہ ملامت کے لائق ہے۔

ایرانیوں کی حب وطنی نے انھیں ہمیشہ سے غیر مخلوط خالص پارسی کے شیوع کا متمنی اور ساعی رکھا ہے۔ یہ کوشش بے سود بھی عہد فردوسی سے لیکر آج تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔ محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب عملِ صالح میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ خالص فارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جن کا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ	کے لیے	چگامہ	تخلص	"	داغ
غزل	"	چامہ[1]	نثر	"	پراگندہ
وزن شعر	"	دم	نظم	"	پیوستہ[2]
ردیف	"	پساوند			

[1] فردوسی نے چامہ گیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

[2] فردوسی نے پیوستہ کسی نہ کسی صفت کے ساتھ لاکر اسے نظم کے مفہوم میں مجازاً استعمال کیا ہے۔ جیسے گویا پیوستہ۔ حدیث پیوستہ۔

خبار روزنامہ ایران سلطانی نمبر ۴ مورخہ ۱۳۲۱ھ ہجری میں نصاب بوالظفر صادق فراہانی
ام سے ایک منظوم فرہنگ شائع ہوئی تھی۔ چند لفظ یہ ہیں:۔

یزداں	کے لیے		صراط	کے لیے	چینود
ایزد	"		بہشت (باغ)	"	مینو
ہُدہ	"		افعال مسنون	"	چنب
وخشور	"		سحر	"	فرہ
آئیں	"		معجزہ	"	فرہود
دعناد	"		فاضل دانا	"	فرجاد
گرزماں	"		کعبہ	"	آباد
زیرگہ	"		قرآن	"	نوی
گرفہ	"		مسجد الاقصیٰ	"	گنگ دژ ہوخت
یزہ	"				

گر محض چند پہلوی الفاظ کی موجودگی سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ یہ زبانِ
دِ ساسانی کی اصطلاحات ہیں اور ان کی موجودگی علوم و فنون کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے۔
ہی الفاظ کی بنا پر ایک مدعی تحقیق پادری صاحب نے اسلام کے تمام عقائدِ معاد کو زرتشتی
یات سے ماخوذ ثابت کیا ہے۔[۱]

لوی ادبیات باقیہ پر ایک نظر اخیر ساسانی عہد کی پہلوی ادبیات بھی جو کچھ آج موجود ہیں، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے

[۱] ینابیع الاسلام مطبوعہ ایران جسے سر ولیم میور نے ترجمہ کر کے خوب چمکایا اور اچھالا ہے اس کا نام The Sources of Isla[m] رکھا ہے۔

کہ بجائے تاریخ و مذہب و تمدنِ ایران پر روشنی ڈالنے کے وہ اسے تاریک سے تاریک تر بنا رہی ہیں ایک طرف اوستا اور ژند کیومرث کو حضرت آدم قرار دیتی ہیں دوسری طرف[1] دساتیر کا بیان ہے کہ کیومرث کے قبل ایک پیغمبر مہاباد گذرا ہے جس سے موجودہ نوع انسان کی نسل چلی ہے اس میں قدیم مجوسیوں کا یہ فلسفہ بھی درج ہے کہ زمانہ بہت دوروں میں منقسم ہے۔ ہر دورے میں ایک خلقت پیدا ہوئی، بڑھی اور پھیلی، پھر تدریجاً فنا ہوگئی۔ آخر میں صرف ایک مرد و عورت بچ رہے جن سے آیندہ دورہ چلا۔ وعلیٰ ہذا القیاس مہاباد آخری دورے کا باوا آدم ہے جس نے تمدن کے سارے سامان ایجاد کیے۔ اس کے زمانہ میں دنیا میں بہشت کا امن و عیش میسر تھا۔ مہاباد کے خاندان کے بعد ایک پیغمبر جی افرام نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس خاندان کی جسے جیانیاں کہتے ہیں مدت حکومت ایک اسپار سال بتائی گئی ہے، جو ان کے حساب سے ایک ہزار ملین یا دس کروڑ سال کے برابر ہے[2]۔ مورخین یونان پیشدادی یا ان سے پہلے خاندانوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

شاہنامہ فردوسی کو آج ہم محض شاعرانہ افسانہ سمجھتے ہیں لیکن یہ مثنوی بھی بلحاظ واقعات زیادہ تر پہلوی تصنیف کارنامک ارتخشتر پاپکاں (کارنامۂ اردشیر بابکاں) اور خدائے نامک کا چربہ ہے۔ آخر الذکر کتاب آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں ابن المقفع اور دوسرے فضلا کے پانچ چھ مختلف عربی تراجم کے ذریعے سے دنیائے اسلام میں مشتہر ہو چکی تھی اگرچہ اب اصل پہلوی متن نایاب ہے۔ یہ غالباً یزدگرد سوم کے عہد کی تالیف تھی۔ اسی طرح کارنامۂ

---

[1] یہ اوستا اور ژند پاژند سے بالکل الگ ایک قدیم کتاب ہے جو سنہ ۵۹۰ء میں عہد خسرو پرویز میں پہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ اس میں شاہانِ ایران کے نامے یا الہامات ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق ایران کے تمام شاہانِ پیشین خدا کا اوتار تھے۔ زیادہ تر آفرینش عالم سے بحث کی گئی ہے جو اوستا سے بالکل مختلف ہے۔

[2] تاریخ ایران سر جان ملکم جلد اول باب دوم۔ تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن سنہ ۱۲۶۰ھ صفحہ ۱۰

یر ۶۰۰ء کی تالیف بتایا جاتا ہے لہٰذا ان دونوں کتابوں کو پہلوی لٹریچر کا اعلیٰ نمونہ سمجھنا
۔ کارنامہٴ اردشیر دستبرد زمانہ سے بچ رہا ہے۔ جس کا جی چاہے کسی ایک بحث پر اس
مہ اور شاہنامہ دونوں تصانیف کو پہلو بہ پہلو رکھ کر سرجان ملکم اور پروفیسر براون کی طرح
کرلے۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق کیومرث کی طرف سے اس کے حریف کے مقابلے
یر اور بھیڑیے بھی لڑے اور اس کے دشمنوں کا نام ونشان جہاں سے مٹا دیا۔ جمشید،
ک فریدون، زال و رستم، ہفتخوان، اسکندر و دارا کی مشہور بے تکی کہانیوں کی عام شہرت
ح تکرار نہیں۔
بھی قصوں میں رنگ آمیزی جائز ہو تو ہو مگر آج تک کسی نے خوش سنین و تواریخ میں مبالغہ جائز
ں رکھا۔ شاہانِ شاہنامہ کی مدت پادشاہی قابل دید ہے:-

شاہان پیشدادی۔ جملہ مدت سلطنت ۱۶۲۰ سال		(۲) شاہان کیانی۔ جملہ مدت سلطنت ۷۳۲ سال	
سلطنت جمشید	۱۰۰۰ ”	سلطنت کیقباد	۱۰۰ ”
” فریدون	۵۰۰ ”	” کیکاؤس	۱۵۰ ”
” منوچہر	۱۲۰ ”	” لہراسپ	۲۲۰ ”
		” گشتاسپ	۱۲۰ ”
		” بہمن اردشیر درازدست	۱۱۰ ”

ری، ابومعشر، حمزہ اصفہانی اور دوسرے مسلم مورخین نے بھی پہلوی ماخذوں ہی سے کم
یش یہی مدتیں نقل کی ہیں۔ ثعالبی نے اپنی تاریخ میں زال و سیمرغ کی داستان نقل کر کے
رت کی ہے کہ ”میں ان افسانوں سے بری الذمہ ہوں۔ اگر تاریخ ایران میں یہ داستانیں
ہی علی التواتر بیان ہوتی چلی نہ آتیں تو میں ان کا ذکر نہ کرتا۔ اس زمانہ کی عجیب عجیب
نقول ہیں۔ مثلاً ہزار ہزار سال کی عمریں اور جن و شیاطین کا بادشاہوں کے تابع
ہ“۔ اسی طرح البیرونی جو خود ایرانی نژاد اور محب وطن ہے ہفتخوان رستم کے ذکر

کے بعد لکھتا ہے۔ ولهم فى اخبار تاریخ اعمار الملوك وافاعيلهم المشهورة عنهم مايستنفر عن استماعه القلوب وتمجه الاذان ولا تقبله العقول[1] یعنی ایرانیوں کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں اور ان کے کارنامے ایسے درج ہیں جن کے سننے سے دل اکتاتا ہے، نہ کان ان کو گوارا کرتے ہیں نہ عقل قبول کرتی ہے۔ حمزہ اصفہانی اپنی کتاب سنی ملوك الارض والانبياء میں صاف کہتا ہے کہ ان کی تمام تاریخی کتابیں محرف اور غیر صحیح ہیں۔ .... مجبوراً میں نے یہاں بادشاہوں کے صرف وہی حالات مختصراً جمع کر دیئے ہیں جو ان کتابوں میں موجود ہیں۔ باقی فضول باتیں ان کی تمام کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ ان کے خطوط اور وصیت نامے وغیرہ جو کتب تاریخ میں مذکور ہیں ان سے ہم نے اپنی کتاب کو پاک رکھا ہے[2]"

یونانی و پارسی تواریخ میں تناقض

ایران قدیم سے یونان کے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں۔ صدیوں حاکم و محکوم کا واسطہ رہا ہے۔ اسکندر ایران کے علوم دین کو تلف کر کے باقی تمام علوم و فنون یونان اُٹھوا لے گیا اور یونانی و قبطی زبانوں میں ان کے ترجمے کیے[3]۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس عہد کی تاریخ ایران کے لیے دنیا میں بہترین مواد و مواقع یونانیوں ہی کو حاصل تھے۔ چنانچہ قدیم مورخین یونان نے اپنے عصر کے ایران کے جو تاریخی حالات چھوڑے ہیں وہ ہر اعتبار سے ایرانی بیانات سے زیادہ معتبر سمجھے جانے کے لائق ہیں۔ مگر وہ بالاکثر ان پارسی روایات سے متناقض ہیں۔ ثعالبی کا بیان ہے کہ "ہمارے پاس تاریخ ایران کے متعلق دو ماخذ ہیں۔ ایرانی و یونانی۔ ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے، لیکن صاحب البیت ادری بما فیه۔ گھر کا حال گھر والا ہی خوب جانتا ہے۔ اس لیے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا" لیکن جب صاحب البیت سیکڑوں اور ہزاروں سال پیشتر کے اسلاف کی مبالغہ داستانیں غلو اور اغراق کے ساتھ بیان کر رہا ہو تو اس کے اس بزرگ ہمسایہ کی شہادت

---

[1] آثار الباقیہ مطبوعہ لیپزگ صفحہ ۱۰۰

[2] سنی ملوک الارض حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن ۱۳۴۰ھ صفحہ ۴۳ - [3] ایضاً

بے شبہ کہیں زیادہ معتبر قرار دی جائینگی جو اس کے اسلاف کا ہمعصر یا قریب العصر ہو۔ غرض واقعیت کے اعتبار سے پارسی تاریخوں اور کلیلہ دمنہ جیسی کہانیوں میں چنداں فرق نہیں معلوم ہوتا۔

محمد اسلم۔ ایم اے۔

کلام فانی

نتیجۂ فکر مولوی شوکت علی فانی بی اے۔ ایل ایل بی

اب اُنھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہی ۔۔۔ چشم بد دور دُلہن بننے کے شباب آتا ہی
ہجر میں بھی مجھے امدادِ اجل تھی درکار ۔۔۔ میری تربت پہ نہ آ تجھسے حجاب آتا ہی
دیدآخر ہے اُلٹ دیجیے چہرے سے نقاب ۔۔۔ آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہی
کسطرف جوشِ کرم تیری نگاہیں اُوٹھیں ۔۔۔ کون محشر میں سزاوارِ عتاب آتا ہی
موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم ۔۔۔ کہ جنازہ پہ وہ غارتگرِ خواب آتا ہی
جلوۂ رنگ ہی تیرنگِ تقاضائے نگاہ ۔۔۔ کوئی مجبورِ تماشائے سراب آتا ہی
ہوگیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید ۔۔۔ اب تصور بھی ترا نقش برآب آتا ہی
دل کو اس طرح ٹھہر جانیکی عادت تو نہ تھی ۔۔۔ کیوں اجل کیا مرے نامہ کا جواب آتا ہی

ملتی جلتی سے مری عمرِ دوروزہ فانی
جی بھر آتا ہی اگر ذکرِ حباب آتا ہی

رومۃ الکبریٰ

(گذشتہ سے پیوستہ)

ٹ پیٹرس

نیرو - روما کا تاجدار اُس عہد کا ہلاکو تھا تاریخ اس کے خوفناک کارناموں
کی تفصیل بیان کرتی ہی جو اس قابل ہی کہ اب تمام یورپ کے دفاتر خار
موٹے حرفوں میں لکھکر دیواروں پر آویزاں کر دیجائے سنہ ۶۴ عیسوی میں نیرو نے سارے
ما کو جلا کر خاک کر دیا، اور دوسرے برس اپنے لیے ایک سنہری محل تعمیر کیا، جس کی چند اینٹیں
پڑی ہوئی ہیں۔ سنہ ۲۷۰ء میں شاہ ایرلین نے دار السلطنت کا ایک مینار تعمیر کرایا، سنہ ۳۱۲ میں
نطین نے اپنے جھنڈے پر صلیب کی شکل بنائی۔ مسیح علیہ السلام کے مشہور حواری سنیٹ پیٹر
جاتا ہی کہ سنہ ۴۲ء میں روم آئے تھے، ان کی تعلیمات کا اثر وفات کے ۲۷۰ برس بعد مترتب
ا شروع ہوا اور قسطنطین نے اپنے عہد میں اُس عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی آیندہ مسیحی دنیا کا
ب سے بڑا کلیسا سمجھا گیا اور واقعہ یہ ہی کہ شاید آج دنیا میں کوئی مذہبی عمارت اتنی خوبصورت
ر اتنی بڑی موجود نہیں۔ لیکن سنیٹ پیٹرس صدیوں کی تدریجی تعمیر کا نتیجہ ہی، شروع میں ایک
وٹا سا مقبرہ اس مقام پر بنایا گیا جہاں قدیم روایات کے مطابق سنیٹ پیٹر مدفون سمجھے جاتے
تھے، اُسی کے پہلو میں نیرو کے عہد جاہلیت کا ایک مندر تھا جو بعد میں منہدم کر دیا گیا اس کے
ند سنہ ۱۲۵۰ تک مسیحیت کی یہ پہلی یادگار بدستور قایم رہی لیکن وہ بہت کمزور ہو چلی تھی اور اندیشہ
ھا کہ منہدم ہو جائیگی۔ اس زمانہ میں نکولاس پنجم پاپا کی مسند پر متمکن تھا اُس نے نئے نقشے تیار
رانے شروع کیے اور پوپ جولیس دوم نے اُس عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جو در حقیقت
یکھنے والے کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ پھر بھی یہ عمارت سنہ ۱۶۲۶ تک مکمل نہ ہو سکی جب پوپ اربن ہشتم
نے اس کا افتتاح کیا۔ "مقدس سلطنت روم" کا ستارہ اقبال روشن اور بلند تھا اور اس عمارت
کے در و دیوار نے عیسائیت کے بڑے بڑے مذہبی حاکموں کے جاہ و جلال کا منظر دیکھا۔

ایک کالا کمبل اوڑھنے والے اور اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلنے والے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جاں نثاروں کو نام نہاد جانشینانِ مسیح اپنے عہدِ گذشتہ کے اس جاہ و جلال کے مقابلہ میں کتنی ہی حقارت سے دیکھیں۔ لیکن عالمِ مسیحیت میں روحانیت پر تو مسیحؑ کے بعد ہی نفسِ لئیم حاوی ہو چکا تھا، وہاں امارت اور دولت کے کرشمے مسیحؑ کے مسند پر بکھرے ہوئے تھے۔ اسی عمارت کے وسط میں وہ مقام ہے جہاں رُوما کے بڑے بڑے تاجدار، پوپ کے قدم لیتے تھے اور ان کے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھواتے تھے، ساری عمارت کی وسعت و بلندی کا اندازہ ایک نظر میں کرنا بالکل ناممکن ہے۔ وسط کے فرش کا طول و عرض شاید اس طرح کچھ سمجھ میں آئے کہ اگر عہدِ جدید کا بڑے سے بڑا جہاز وہاں رکھ دیا جائے تب بھی فرش کا کچھ حصہ خالی رہ جائیگا۔ سینٹ پیٹرس کی نشستوں میں ۵۰ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش بتائی جاتی ہے، اور یہ تخمینہ بہت قرینِ قیاس ہے۔ چھت کی بلندی کا اندازہ یوں کیجیے کہ اگر وسطی گنبد کے اندر جو برآمدہ چھت سے ملا ہوا بنا ہے اُس پر کھڑے ہو جائے تو نیچے فرش پر چلنے والے انسانوں کی جسامت بکریوں سے بھی چھوٹی نظر آئے گی! عمارت کے ہر حصہ میں ایک پوپ کا مجسمہ اور ایک خوبصورت یادگار نصب ہے اور نیچے تہ خانوں میں اُن جانشینانِ مسیح" کی لاشوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں! بہت سے اسقف اور راہب جو دنیا کے ہر گوشہ سے رُوما آتے تھے (مورخ نے اُس عہد کے متعلق کہا تھا کہ دنیا کی ہر سڑک رُوم کی طرف آتی ہے!) اور یہاں کی خونریزی میں اپنا خون ملا دیتے تھے، وہ سب بھی اُن ہی تہ خانوں میں سردارانِ مذہب کے پہلو بہ پہلو پڑے ہیں! صدر عمارت میں سنہری شامیانہ کے پاس دیوار میں ایک فاختہ کی تصویر چسپاں ہے، یہ فاختہ مسیحیت کی اصطلاح میں "مقدس فاختہ" کہی جاتی ہے، مدبرین اپنی اصطلاح میں آجکل اُس کو "امن کی فاختہ" کہتے ہیں، یہ وہی امن کی فاختہ ہے جو کبھی مسیحی دنیا میں امن قائم نہ رکھ سکی! جنھوں نے سب سے پہلے اس مقدس فاختہ کا گھونسلا سینٹ پیٹرس میں بنایا اُن کے ہاتھ بھی کہنیوں تک خون میں رنگے ہوئے تھے۔ میں جب اُس عمارت کی بے مثل صناعیوں کو دیکھتا پھرتا تھا تو میرا خیال بار بار

بس فاختہ کی طرف جاتا تھا کاش کہ جناب پاپا اُس کا پنجرہ لیے ہوئے روم میں نہ بیٹھے ہوتے
بلکہ اُس کو لیکر ایک دفعہ بلجیم اور فرانس کے اُن میدانوں میں بھی آتے جہاں انسان کی
ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں! مگر غریب فاختہ تو عہد قدیم میں خود اپنے گھر کے اندر امن قائم نہ
رکھ سکی، اس عہد کے گناہگار اُس کے پروں کے سایہ کے نیچے کیونکر پہونچیں! اب تو پاپا خود
کبھی سال دو سال میں اس عبادتگاہ کے اندر آتے بھی ہیں تو خفیہ سرنگوں کے ذریعہ سے!

ویٹیکن

سینٹ پیٹرس کی سیر کرتے ہوئے ہم پاپائے روما کے ایوان کی طرف جا نکلے، اور معاً یہ معلوم ہوا کہ آج سے دو ہزار برس پہلے کوئی شہر آباد ہوا تھا اُسی میں ہم آج
چل پھر رہے ہیں۔ مجھے یہ ادا بہت پسند آئی کہ پوپ نے اپنے گرد و پیش اپنے عہد جاہ و اقبال
کی یاد کو ہر طرح تازہ رکھا ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی دیواریں، وہی پرانی قسم کے دروازے
اور راستے ہیں، سڑکوں پر وہی اینٹوں کا فرش ہے، سوائے ایک چیز کے کہ عمارت کے
اندر بجلی کے تار لگے ہوئے ہیں کوئی چیز جدید نہیں، حتےٰ کہ پوپ کی مختصر فوج کے سپاہی جو دروازوں
پر پہرا دے رہے تھے۔ وہی عہد قدیم کی رنگین وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ اس زمانہ کی گاڑیاں
اور موٹریں جو اندر صحن میں کھڑی ہوئی تھیں وہ تو ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ گویا کسی تصویر پر بدنما
دھبے ڈال دیئے گئے ہوں، اُس سارے منظر سے یہ چیزیں جدا اور بے تعلق معلوم ہوتی تھیں
پاپائے اعظم کی صورت نہ دیکھ سکا، لیکن اگر چاہتا تو دیکھنا مشکل نہ تھا اس لیے کہ جو شخص چاہے
ملاقات کی درخواست کر سکتا ہے۔ خود پوپ اپنے محل سے باہر کبھی نہیں جاتے سوائے ایک
پائیں باغ کے جس میں کبھی کبھی انکا ہوادار نظر آتا ہے شہر روم سے انکا کوئی تعلق نہیں اور
ان کے محلہ سے سلطنت اٹلی کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ گویا اطالیہ کے موجودہ دارالسلطنت
کے اندر ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست ہے جس کے سیاہ سپید کا اختیار پاپا کے سوا
کسی کو نہیں۔ یہ داستان بھی بہت دلچسپ ہے اور اگر موقعہ ہوتا تو میں اس زمانہ میں اُس کی
کچھ تفصیل بیان کرتا، عہد جدید میں وہ "نان کوآپریشن" کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔

...نے جو کبھی ساری مقدس سلطنت روم کا مالک و مختار تھا اب اپنے۔ آپ کو ایک محلے کے اندر
...بند کر لیا ہے اور ہر پوپ معہ اپنے تمام عہدہ داروں اور درباریوں کے سینٹ پیٹرس کی مسند
...بیٹھنے سے پہلے عہد کرتا ہے کہ وہ کبھی اور کسی حال میں غاصب شاہ اٹلی کی حکومت کو قبول نہ کریگا
...اس دربار کے نزدیک سلطنت اٹلی کا کوئی وجود نہیں، جو کچھ ہے پوپ ہے! شاہ اٹلی کی سلطنت
...ی وسیع اور طاقتور ہو گیا کہ یہاں اُس کو کوئی جانتا ہی نہیں!

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

قدیم مسیحیت کا یہ ٹوٹا ہوا مینار ابھی تک سر اُٹھائے کھڑا ہے اور اس کے گرد و پیش ایک
نیا آباد ہے، جس پر وہ نفرت کے ساتھ نظر کرتا ہے۔ جناب پاپا جنگل کے اُس مور کی طرح ہیں
...جا اور کسی نے اُس کو نہ دیکھا۔ سارے مراسم و مشاغل شاہانہ اسی چار دیواری کے اندر
...ی ہیں اور چاہے وہ چند ہی ہوں مگر انکے دربار کے درباری وہی ڈراما کھیلتے رہتے ہیں
...اس طرح کھیلا گیا تھا کہ دنیا گونج اُٹھی تھی، گو کہ اس تھیٹر کے پردے اب بوسیدہ اور بے رنگ
...گئے ہیں، اور ایکٹر بھی وہ نہ رہے اور جو ہیں وہ از کار رفتہ ہیں، لباس اور سامان آرائش
...پرانا ہو گیا، لیکن پرانا ہیلا تماشہ جاری ہے۔ پاپائے روما کی یہ وضعداری مجھے بھلی معلوم
...ئی۔ محل کے جو حصے دیکھے جا سکتے تھے اون کو میں نے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا،
...ن وقت کم تھا اور ہزاروں آثار قدیمہ کو دیکھنا تھا جن کا دامن ساری دنیا کی تاریخ کے
...تھ وابستہ ہے۔ البتہ ایک چیز کا اور ذکر کر دوں۔ ہم نے سینٹ پیٹرس میں جو تصویریں
...ہوئی دیکھیں ان سب کو قلمی تصویر کیا، بعد کو معلوم ہوا کہ وہ سب رنگین پتھروں سے بنائی جاتی
...ں۔ اس صناعی کو موزیک کہتے ہیں اور اس کا بہت بڑا کارخانہ خود پوپ کے محل میں ہے،
...کو ہم نے اچھی طرح دیکھا، درحقیقت حیرت انگیز صناعی ہے۔ معمولی الفاظ میں سمجھانا مشکل ہے
...پتھر کے ٹکڑوں سے تصویریں اور ایسی خوبصورت تصویریں کہ من و عن قلمی معلوم ہوں، کیونکر
...ئی جا سکتی ہیں۔ ہم نے دیکھا صناع اس چابکدستی سے اُن تصاویر کو تیار کرتے تھے۔

کہ اٹلی کے بہترین مصور کی تصویر کو بجنسہٖ نقل کر لیتے تھے، ہزاروں مختلف رنگ کے پتھر کے ٹکڑے ان کے سامنے رکھے ہوتے ہیں اور ایک چوکھٹے میں کوئی چپکانے والا مصالحہ بھرا ہوا ہی، صناع اُن ٹکڑوں کو اٹھاتا ہے اور اُس چوکھٹے میں چپکا دیتا ہی، رنگوں کی آمیزش اس خوبی سے کرتا ہی کہ وہ ٹکڑے ملتے چلے جاتے ہیں اور تصویر کا صحیح نقشہ نمایاں ہوتا جاتا ہی ممکن نہیں کہ ٹکڑے غلط لگ جاویں یا تصویر کی رنگ آمیزی ناقص ہو جائے۔

کلوزیم

قدیم مسیحیت کے اس دارالسلطنت سے نکل کر ہم کلوزیم دیکھنے گئے۔ کلوزیم کیا ہی۔ آؤ آج سے ایک ہزار ۹ سو چالیس برس پہلے جو دنیا آباد تھی گھڑی بھر کے لیے وہاں بھی چلیں، اور دیکھیں کہ شہنشاہ ٹیٹس کے دارالسلطنت میں کیا ہو رہا ہی؟ کلوزیم کی سیڑھیوں پر اندر کی طرف نشست کی ایک جگہ بھی خالی نہیں وسط میں سب سے بلند شہنشاہ روما اپنے تخت پر ریشم کے شامیانہ کے نیچے متمکن ہی، قرمزی رنگ کا ایک لباس پہنے ہوے ہے اور دبدبۂ سلطنتِ قیصری کا یہ عالم ہی کہ سلطنت کا بڑے سے بڑا سردار بھی تخت شاہی کے قریب آنے کی جرأت نہیں رکھتا اسکے نیچے کی سیڑھی پر روم کی "کنواریاں" بیٹھی ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک سلطنت روما کے لیے ایک ستارہ سعادت ہی! شہنشاہ کے بعد تمام سرداران سلطنت پر افضلیت ان ہی کو حاصل ہی۔ "سن رسیدہ کنواریاں" جنھوں نے اپنی عمر میں بہت سے تماشے دیکھے ہیں خاموش اور سنجیدہ ہیں، لیکن ان میں سے نوجوان لڑکیاں جن کو اس قوم کی توہم پرستی نے عمر بھر کے لیے دنیا سے جدا کر دیا ہی جھکی ہوئی اس خونخوار تماشہ کو دیکھ رہی ہیں جو رومن قوم کا قومی کھیل ہی! انکا سانس کس قدر جلد جلد آ رہا ہی، ذرا دیکھنا ان کے چہروں کی رنگت کیوں بدل رہی ہی؟ دیکھو نیچے اکھاڑے میں اُس نوجوان کا پاؤں پھسل گیا جو ابھی ابھی شیر ببر پر تلوار کھینچ کر جھپٹا ہی، خون کی کیچڑ اتنی ہی کہ پاؤں کا جمانا مشکل ہو گیا ہی، یہ لو، اس خونخوار بھینسے کی پیٹھ پر ایک دوشیزہ زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہی اور وہ بھینسا اب اُس سورما کی جانب آ رہا ہی جس کے ہاتھ میں ایک تیغہ ہی تو وہ اس بھینسے کے سینگ نے پہلوان کے سینہ میں شگاف کر دیا' نوجوان کنواری

ھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہی، دل میں کہتی ہی ہائے کیا اس زنجیروں سے جکڑی ہوئی
رہ کو کوئی نہ بچا سکیگا، کیا رومن قوم کا کوئی سورما بھینسے کی خونخواری کا مقابلہ نہ کر سکیگا . . .
. . . اُن کنواریوں کی نشست سے نیچے، روما کے معمر سردار اور منصب دار اپنی ٹھوڑیوں
روں کے دستوں پر رکھے ہوے "تماشہ" دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد نیچے کی صفوں میں
سلطنت کے ہزاروں شہری صف در صف بیٹھے ہوئے ہیں، اکھاڑے میں خوفناک درندے
بڑے نوجوان پہلوانوں کو چیر رہے ہیں اور چبا رہے ہیں، جو سورما ابھی ابھی اپنی تلوار چمکا تا
تھا درندوں کے تیز پنجوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہی! اور ہر کھلاڑی جب اس طرح شکار ہوتا
احسنت مرحبا کی ۸۰ ہزار آوازیں، نعرے، اور چیخیں، پیہم بلند ہوتی ہیں۔ سب سے آخر
س خونیں تماشے کا آخری منظر! ایک طرف سے اکھاڑے کا دروازہ کھلتا ہی اور چند
یس پچیس نوجوان اور سن رسیدہ عورتیں اور مرد ہلکا اور بالکل سپید لباس پہنے ہوئے
ں ہوتی ہیں، معاً دوسرا دروازہ کھلتا ہی اور دس بیس شیر، مست جنگلی بھینسے اور ریچھ نمودا
ہیں، یہ تماشہ چند لمحہ کا ہنگامہ ہی، ایک دفعہ پلک ماری چند چیخوں کی آواز آئی! درنتا م
اب سوائے اُن درندوں کے غرانے کے جنگلے مُنہ سے گوشت کے ٹکڑے اور انسانوں
تھ پاؤں لٹکتے نظر آتے ہیں، ہر طرف سکوت ہی، درندوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے
زے کی طرف ہٹایا جا رہا ہی۔ وہ آہستہ آہستہ ہٹتے جاتے ہیں، دیکھو نا، یہ معلوم ہوتا ہی کہ
بڑے بلّوں کے مُنہ میں چھوٹے چھوٹے سفید چوہے ہیں، اور اُن سے خون کی دھاریں گر رہی
خر شکار ختم ہو گیا، دونوں طرف کے دروازے بند ہو گئے اور اب اکھاڑا خالی ہی، کانوں
رکھ لو، پردے نہ پھٹ جاویں، روما ۸۰ ہزار بہادر شہری اِس "تماشہ" کی داد دے
ں! شہنشاہ اپنے غلام کی جانب متوجہ ہوتا ہی اور غلام ادب کے ساتھ ایک ہاتھ سینہ پر رکھ
ارغوانی کا جام لبریز پیش کرتا ہی، بہادر شہنشاہ جام کو منہ سے لگاتا ہی اور کچھ اس طرح مست
یا ہی کہ شراب کے چند قطرے اُسی طرح اُس کے مُنہ سے بھی گرتے ہیں۔ جس طرح شیروں کے

مُنہ سے انسان کا خون بہ رہا تھا! تم پوچھتے ہو یہ سب لوگ کون تھے جنکو شہنشاہ گیتی پناہ نے درندوں کے دسترخوان پر رکھوا دیا؟ میں ایک مورخ کی زبان سے جواب دیتا ہوں،

یہ سب عیسائی تھے جو مسیح کا پیام لیکر روما میں آئے تھے! تماشہ دیکھ لیا، اب عالم خیال سے نیچے آئیے اور اینٹوں اور پتھروں کی اُن سر بفلک دیواروں کو دیکھیے جو روما کے اقبال اور بہادران روما کے سپاہیانہ (۱) مشاغل کی آخری یادگار ہیں! کلوزیم! اس نام سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، لیکن فلسفی کہتا ہے کہ کلوزیم کے تماشہ دیکھنے والوں کو گالیاں نہ دو! وہ تو اُس عہد کی یادگار ہے جب انسانیت نے حیوانیت کے حدود سے ذرا ہی قدم آگے رکھا تھا، جسم کے لمبے بال اور نوکدار ناخن باقی نہ تھے مگر طبائع کے اندر بہیمیت کے بہت سے عناصر ہنوز موجود تھے، اور کچھ کم سہی وہ عناصر موجود تو اب بھی ہیں، مگر، میں کہتا ہوں کہ ایسے انسانی صورت درندے تو ایشیا میں بستے تھے، یورپ کے آباد اجداد کو اس حیوانیت سے کیا نسبت، وہ تو کچھ اور ہی ہوں نگے۔ جنکی اقبالمندی اور علو ہمتی کی قسم آج تک کھائی جاتی ہے!

عیسائیوں کو ناز ہے کہ اُنھوں نے مذہب کی خاطر کیسی کیسی سختیاں جھیلی ہیں! اور آخر ساری دنیا کو مہذب بنا دیا! لیکن آج اگر پاپائے روما کلوزیم میں بے قصور عیسائیوں کے درندوں کے سامنے ڈالے جانے کا ذکر فرمائیں تو میں عرض کروں کہ عیسائیت کے بہترین زمانہ میں اسپین احتساب غیر عیسائیوں کے لیے درندوں کی بجائے آگ سے کام لیتی تھی، اتنا ہی تو فرق ہے! اور اُن آلات عقوبت کا کیا ذکر جن کی تفصیل خود مورخین یورپ نے لکھی ہے!!

شہنشاہ فلیوس وسپاسیانو نے ۷۲ء میں کلوزیم کی بنیاد ڈالی، تاکہ اسکو دربار اور اہل روما کے لیے تفریح کی ایک عمارت عامہ قرار دیا جائے اور اُس زمانہ کی انسانیت کے معیار کے مطابق اس میں سپاہیانہ کھیل تماشے، اور بہادری و جرأت کے مظاہرہ ہوا کریں۔ ۸۰ء میں شہنشاہ وسپاسیانو کے بیٹے ٹیٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ تقریب افتتاح اس طرح منائی گئی کہ تقریباً ۵ ہزار جنگلی درندے اکھاڑے میں چھوڑے گئے اور ہزاروں نو رما

(جن کو اس زمانہ کی اصطلاح گلیڈیٹر Gladiator کہتے تھے) اُن درندوں سے دست بدست مقابلہ کرنے کے لیے اندر داخل ہوئے۔ پھر جو تماشہ "اہل روما نے دیکھا وہ اندازہ تخیل سے باہر ہے! ہزاروں درندے، ہزاروں انسانوں کو لپیٹے ہوئے ہیں ان کی تلواریں اُن کے جسم میں اور اُن کے پنجے اُن کی کھال میں پیوست ہیں گوشت کے پُرزے اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں اور خون کے فوارے تماشائیوں کے صف اول تک پہنچتے ہیں ہزاروں انسان اور درندے اس طرح فنا ہوئے کہ لاشیں بھی پہچانی نہ جاتی تھیں! الغرض اہل روما کے تماشہ گاہ کا افتتاح یوں عمل میں آیا! عمارت ایک سو ستر گز بلند ہے اور اس کا محیط ۵۰۰ گز ہے۔ دیواروں کا زیادہ حصہ ابھی تک محفوظ ہے اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے ایک چھوٹے سے حصہ کو اُسی طرح پھر تیار کر دیا ہے جس طرح کہ اُن کے خیال میں وہ شہنشاہ ٹیٹس اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں تھا۔

رومی حمام | مہذب رومن شہری جب کلو زیم کے تماشوں سے سیر ہو جاتا تھا تو اپنا وقت اُن حماموں میں صرف کرتا تھا جن کے نام سے آج تک یورپ کے بہترین حمام منسوب کیے جاتے ہیں، لیکن ان حماموں کے آثار دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ دولت وسطوت ونقش پرستی کے اِس عہد جدید میں بھی حمام کی وہ عظیم الشان عمارتیں خواب وخیال سے باہر ہیں، لندن و پیرس کے جو حمام ہم نے دیکھے وہ تو روما کے قدیم حماموں کے مقابلہ میں محض کھلونا ہیں، یوں تو بہتر سے بہتر متعدد حمام موجود تھے لیکن کراکلا کا حمام عامۃ الناس کے لیے تعمیر کیا گیا تھا جس میں ۲۶ ہزار آدمی روزانہ اور اکثر بہ یک وقت غسل کرتے تھے، ناشتہ ہر شخص کو مفت ملتا تھا سینکڑوں سنگ مرمر کے ستون، متعدد بڑے بڑے حوض، گرم پانی کے نل، سنگ مرمر کے فرش کی بے مثال بچہ کاری، بیٹھنے کے لیے کرسیاں، چبوترے جن پر لیٹ کر خوشبوئیں ملی جاتی تھیں۔ وسیع برآمدے جہاں ناشتہ کھایا جاتا تھا، یعنی جب وہ حمام اپنی پوری آرائش کے ساتھ آباد ہوگا تو میں کہہ سکتا ہوں اس کا ہر کمرہ دیوان عام اور دیوان خاص سے وسعت اور خوبصورتی میں کسی طرح کم نہ ہوگا۔ اور کہنے کو کچھ بھی نہ تھا اہل روما کا محض حمام

تھا! قیمتی پتھروں کے نہانے کے حوض "باور ٹب" اور طشت آج تک پاپائے روما کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان قیمتی پتھروں کے اتنے بڑے ٹکڑے کہاں ملے کہ ایک آدمی کی پوری جسامت کے قابل غسل کرنے کا حوض ایک ہی ٹکڑے میں سالم بنا لیا گیا۔ عہد قدیم کی ان عجائبات کو دیکھیے اور حیران رہ جائیے!

قاضی عبدالغفار

لوزان کانفرنس

مغرب کے کارکنان قضا وقدر جب کبھی اقوام مشرق کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے بیٹھتے ہیں تو ان کی ایک ہاں اور ایک نہیں پر کرور ہا انسان کے سرتن سے جدا ہوجاتے ہیں، پیاسی زمین معصوم انسان کے لہو سے سیراب ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ بندگانِ خدا جن کی قسمتوں کا فیصلہ ہونے کو ہی کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے کہ یہ شاطران مغرب کن کن چالوں سے بازی جیت لینے کی کوشش کرتے ہیں، ابھی حال ہی مشرقِ قریب کے فیصلہ کے لیے جو کانفرنس لوزان میں منعقد ہوئی تھی، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس کی اصل حقیقت و واقعات سے واقف ہیں۔ مضمون ذیل لندن کے ایک معتدد رسالہ نا غینشنہ سیجری (مارچ ۲۳ء) کا ترجمہ ہے جو قارئین "جامعہ" کے لیے بتمامہ درج کیا جاتا ہے۔

(سعید)

اکتوبر ۱۹۱۸ء کے صلحنامہ میں جو بنیادی مسائل تھے اُن میں سے ایک آبنائے کی آزادی اور دوسرے حقوق اقوام کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ جو اناطولیہ اور تھریس کے غیر ترکی صوبوں میں واقع (دیکھئے دفعہ ۷) یورپ میں اتحادیوں کا مفاد خطرہ میں ہو یا آرمینی ولایتوں میں بدنظمی نہ پیدا ہو حاصل کیا جانے کو تھا۔ اس موقع پر ترکوں نے اس بری طرح شکست کھائی تھی اور اس قدر کمزور اور پست ہمت ہوگئے تھے کہ ان سے تقریباً ہر قسم کے شرائط کا منوانا بہت آسان تھا۔ لیکن پیرس میں دول متحدہ کی حرص و آز نے کسی ایسے صلحنامہ کو عمل میں نہ آنے دیا۔

بجائے اس کے کہ اتحادی شرائط صلح کے پابند رہتے" انھوں نے قسطنطنیہ، اناطولیہ اور تھریس کے متعدد اضلاع پر قبضہ کرنا شروع کردیا جو مجوزہ حدود سے باہر تھا حالانکہ کسی حیلہ جوئی سے بھی جو انھوں نے دفعہ ۷ میں رکھی تھیں وہ ایسا کرنے کے مجاز نہ تھے۔

روس کے یکایک انقلاب ہوجانے کی وجہ سے یہ معاہدۂ جنگ عمل میں آیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ قسطنطنیہ روس کو دیا جائے مشرقی اناطولیہ کا ایک حصہ خالی کردیا جائے

اور اپریل ۱۹۱۷ء کا عہد نامہ سنیٹ ماریں بھی ختم ہو گیا جس کی رو سے سمرنا اور ضلع ادالیہ اٹلی کو دیا جانے والا تھا، اور اس وجہ سے قسطنطنیہ اور خطہ ابنائے کا مسئلہ ہنوز زیر تجویز ہی رہا۔ اس وقت عام رجحان یہ تھا کہ دارالخلافہ عثمانیہ کسی یورپی طاقت کو نہ دیا جائے اور اگرچہ مسٹر لائڈ جارج اس حد تک آ گئے تھے کہ قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک ترکوں کو واپس دیدیا جائے، انگلستان اور فرانس دونوں معاہدۂ جنگ سے نجات پا جانے پر شاداں تھے اور ترکی کو مال مفت کی طرح باہمی مفاد کے لیے دول یورپ میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اختتام جنگ کے قریب یونان کی غیر جانبداری تسلیم کرکے اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر لیا گیا اور اس کو مقدونیہ میں فوجی نقل و حرکت کی اجازت دیدی گئی جو ایک حد تک مفید ثابت ہوئی۔ اتنی بات ایم وینیزلاس کے لیے کافی تھی کہ وہ مجلس عالیہ (سپریم کونسل) کے سامنے اپنے ناقابل قبول مطالبات پیش کریں یعنی یہ کہ قسطنطنیہ، پورا تھریس، جنوبی البانیہ، داڈیکنیز بندر سمرنا اور اناطولیہ کا کچھ حصہ یونان کو دیا جائے اسے درحقیقت صرف سمرنا اور تھریس کے ملنے کی توقع تھی لیکن وہ وہی مشرقی چال چلا۔ ہر کشں گر تا بہ تپ راضی شود۔ انگلستان اور فرانس دونوں اس سے خوش تھے کہ ایشیائے کوچک میں اٹلی کا قایمقام اب یونان ہو گیا ہے لیکن اٹلی نے اس سے اتفاق نہ کیا اور ترکی کے تمام سول اور فوجی ملازمین نے خواہ برطانوی ہوں یا غیر برطانوی اس سے اختلاف کیا کہ ایشیا کا کوئی حصہ یونان کو دیا جائے جس کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ نہ صرف دولت عثمانیہ میں بلکہ تمام اقوام اسلامی میں خطرناک جذبات مشتعل ہو جائیں گے۔ صرف اٹلی کا اختلاف پیرس میں یونان کے مطالبات کو رد کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں تمام دول کے نمایندگان نے باوجود اپنے اپنے مقامی تجربہ کاروں کی اختلاف رائے کے سمرنا یونان کو دیدیئے جانے کا تصفیہ کر دیا اور مئی میں یونانی فوجوں نے برطانوی بیڑے کی زیر سرکردگی جس میں فرانس کا کوئی حصہ نہ تھا، سمرنا پر قبضہ کر لیا اور جلد ہی اندر کی جانب پھیلنا شروع ہو گئے۔

اس یونانی انڈے کا ترکی آشیانے میں رکھا جانا ان مظالم اور قتل و خونریزی، کثیر مال اسباب کی بربادی اور ترکی میں ایک نئی قومی روح کے پیدا کرنے کا اصلی سبب ہو گیا۔ یونانیوں کے ایشیائے کوچک میں رکھے جانے کے مجنونانہ فیصلہ کی تمام تر ذمہ داری مسٹر ولسن اور مسٹر لائڈ جارج پر ہے۔ جس کی تائید ایم کلیمنشو نے بھی بادل ناخواستہ کر دی تھی۔

امریکہ کی طرح ترک بھی دول عظمی میں سے کسی ایک کے یا اٹلی کے (حالانکہ اس کے متعلق یہ ہی) مطیع ہو کر ختم ہو گئے ہوتے لیکن یہ قیاس کرنا کہ ترک کبھی ان لوگوں کے مظالم اور بدنظمیوں کو جو صدیوں تک ان کے غلام رہ چکے ہیں برداشت کریں گے ترکی جذبات کی تحقیر اور ان سے عدم واقفیت ثابت کرنا ہے۔ یونانیوں کا رویہ سمرنا میں جو رہا وہ اب اظہر من الشمس ہے گو دول نے بین الاقوامی اتحادی کمیشن کی رپورٹ کو چھپانے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن اس کے شائع ہونے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ سمرنا میں ترکوں کا یونانی مظالم کی جی توڑ مزاحمت کرنی (جو بالآخر کامیاب ہوئی) معقول وجوہ پر مبنی تھی۔ کوئی اور شے انھیں یورپ کے مقابل میں نفرت اور بغاوت کے جذبات سے اس سے زیادہ سرشار نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ وہ قسطنطنیہ اور تھریس کے قبضہ کو معاہدہ کے خلاف سمجھتے تھے لیکن ان کا تمام تر غیظ و غضب یونانیوں پر اُتر آیا۔

ان جذبات نفرت و حقارت کے ساتھ قوم پرستوں کی جماعت مصطفےٰ کمال کے علم کے نیچے آگئی اور یہ تجویز پاس کی کہ "یا تو ہم مکمل آزادی حاصل کریں گے یا اسی کوشش میں مر یں گے" یہ ظاہر ہے کہ وہ مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) جو ترکی کے مٹانے پر تلی ہوئی تھی اسی نے اسکی ترقی و عروج کے تخم باشی بھی کی۔ اس موقع پر حکومت ائتلاف نے یہ کچھ نہ دیکھا کہ آئندہ کیا ہوگا اور آنکھیں بند کیے ہوئے ترکوں کو مردہ سمجھتے رہے۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں مجلس عالیہ نے ایک عہدنامہ کے دفعات مرتب کیا جو بعد میں عہدنامہ   کے نام سے موسوم ہوا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ ترک سمرنا اور ایڈریانوپل یونان کو دیدیں اور دوسری تقسیم کے لیے بھی راضی ہو جائیں اس مرتبہ بھی برطانوی اور فرانسیسی فوجی مشیروں نے ان تجاویز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کھلم

ڈ جارج نے ان تمام ہدایات کو پس پشت ڈال کر ترکی کو نقشے سے مٹا دینے اور ان پر یونان کے
یم محکوم قوم سے جو کبھی آپ اپنے اوپر بھی بہتر حکومت کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ حکومت
بنانے کی پالیسی اختیار کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ بالشویکی عنصر بالکل نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ اس کی بمشکل امید کی جاسکتی
کہ سویٹ کبھی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دیں گے۔ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا
ر ترکوں سے جو اس وقت از حد ضرورتمند تھے انھوں ہر طرح کی امداد کے فیاضانہ وعدے
کیے۔ اگرچہ بالشویزم اصول اسلام کے بالکل منافی ہے اور اگرچہ روس ہمیشہ سے ترکی کا جانی
من رہا ہے پھر بھی مصطفےٰ کمال نے سویٹ کے ان وعدوں سے انکار نہ کیا اور سامان جنگ
ی اعانت منظور کی لیکن روسی فوج یا بالشو یکی پروپگنڈا قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا
نامبارک معاہدہ جسے اتحادیوں کی حرکتوں سے مجبور ہو کر ترکوں نے کیا مارچ ۱۹۲۱ء میں بمقام
سکو عمل میں آیا اور اگرچہ سلطنت برطانیہ کے لیے یہ معاہدہ خطرات سے پر ہے ہم نے اسی کو
بے کار کرنے کے لیے کبھی کوئی کوشش نہ کی۔ ہم نے یہ بالکل نہیں سمجھا ہے کہ ترکی بیداری
یا ای اسلام کی بیداری نہیں بلکہ صرف قومی ہے۔ یہ بذات خود ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں بلکہ
ں نے اگر صلح جنبانی میں ذرا بھی کوتاہی کی تو دول ایتلاف میں ان کا روس سے تصادم ہونا
یادہ اغلب ہے۔

اس موقع پر بالشویکوں کے میدان میں اتر آنے کا اثر ۱۹۲۱ء میں یہ ظاہر ہوا کہ اسلام نے
م عیسائی حکومتوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ کلام بلاشبہ بالشویکوں اور کسی قدر جرمنوں
ھا نہ کہ ترکوں کا جنھیں یونانی پیشقدمی کے روکنے سے ہی بہت کم فرصت ملی تھی۔

اگرچہ اتحادیوں نے یہ دیکھ کر کہ ایشیا میں واقعات کی رفتار ان کے حسب خواہش نہیں ہے
ی جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا، فرانسیسیوں نے جنھیں سائلیشیا میں بہت سے مصائب
سامنا کرنا پڑتا تھا، ترکی سے ایم فرینکلن بویلان کے ذریعہ ایک جداگانہ معاہدہ کر لیا لیکن اس

سے حالات میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی بجز اس کے کہ ترکی کو اپنی ایک تھوڑی سی فوج کے
ستعمال میں استعمال کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ اور ۱۹۲۲ء میں باوجود غیر جانبداری کے انگلستان
کی یونان نوازی نے ان کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت تک خود یونانیوں کو اپنی ناکامی کا
احساس ہوگیا تھا اور فروری میں اس بدنصیب ایم گونریس نے ایک خط اس مضمون کا لندن لکھا
کہ مادی امداد فوراً نہ بھیجی گئی تو یونانی فوج فوراً خالی کردے گی، وزیر یونان انگلستان کو امداد
کا ذمہ دار اور مزید براں اپنا اتحادی سمجھتا تھا۔ بہرحال اس خط نے وزارت انگلستان پر اتنا اثر
بھی تو نہیں کیا کہ مسٹر لائڈ جارج اور ان کے رفقا اس کو پڑھنے کے بعد یاد رکھتے۔

بالآخر امداد کی طرف سے مایوس ہوکر یونانیوں نے اتحادیوں کو اکسانے اور جوش
دلانے کا طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ ایشیائے کوچک میں تمام صلحناموں کو پس پشت ڈال کر یونانی
حکومت آیونینہ کے بنانے اور پھر قسطنطنیہ پر حملے کرنے کے ارادہ کا اعلان کردیا۔ یہ کسی طرح ممکن
نہ تھا اور یونانی افواج کی شکست اور ترکی افواج کی بابعالی کی طرف پیشقدمی کے بعد ہی میثاق کا واقعہ
اور معاہدہ مدینہ پیش آیا جو لوزان کانفرنس کی تمہید تھی۔ یہ واقعات ناظرین کے دماغ میں ابھی
تازہ ہیں اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

کانفرنس بعض عجیب و غریب حالات میں منعقد ہوئی اگرچہ دول وسطی کے ساتھ ترکی نے بھی
شکست کھائی لیکن قوم پرستوں نے جنگ ہمیشہ جاری رکھی۔ اور اگرچہ اس جنگ عظیم میں اتحادیوں نے
شکست کھائی لیکن خود بھی دول ائتلاف کے ایک جکمبردار اتحادی کو شکست فاش دی۔
صلح کی کانفرنسوں میں ایک فاتح ہوا کرتا ہے اور دوسرا مفتوح، لیکن لوزان کی مفتوح جماعت
فاتح کی حیثیت میں تھی اور پہلی جماعت فاتح کے شریک نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ حاصل تر
کی اس حیثیت میں نہ آئے تھے کہ وہ بالکل شکست خوردہ ہیں اور فاتحین جو شرائط چاہیں ان سے
منوالیں۔ معاہدہ سیورے کی ناکامی کے بعد سے دول نے حالات کی اسقدر تبدیلی تو تسلیم کرلی
تھی کہ کانفرنس مصطفےٰ کمال کے ساتھ بحیثیت ان کی درمیانی صلح کن شخص کے منعقد ہو نہ کہ

دول خود فاتح بنکر رہیں۔ باوجود اس کے ترکوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا گیا جس طرح مسرف
بیٹے کے ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ وہ نہایت عجز و حکم کے ساتھ اظہار پشیمانی کرے ترکوں کی اسکیم
یہ تھی کہ ان کے معاہدۂ قومی کی تعمیل کی جائے جس کی رو سے انھیں اپنے حدود کے اندر مکمل
خود اختیاری آبادیوں کی آزادی اور غیر ملکی مفاد کا ضروری تحفظ حاصل ہو۔ اتحادیوں کے پروگرام
میں بھی انھیں حقوق کی حفاظت کرنی تھی اور اگرچہ اس کا اعلان نہیں کیا گیا لیکن وہ ترکی خود مختاری
کو حتی الامکان ملکی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے محدود کر دینا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لئے
انھیں قوم پرستوں کی مادی قوت کا لحاظ رکھنا پڑا جس کے ساتھ بالشویک روس کی غیر محدود اعانت
اور جرمنی کی اخلاقی حمایت بھی جو یقیناً لاسین میں اپنا کام کر رہی تھی، شامل تھیں۔ بین الاقوامی
قوانین اور اخلاقی اصول کی بنا پر قلیل التعداد آبادی اور حقوق خود اختیاری کی حیثیت سے دول
کو ترکی کے یونان پر فتحیابی اور غلبہ بہ لحاظ تعداد کے مطالبات تسلیم کرنے ہی پڑے۔ ان کا پروگرام
بالکل عام تھا جیسا انگلستان، فرانس اور اٹلی ہر ایک مختلف نقطۂ نظر سے متفق تھے۔ جہاں تک
دول ادنیٰ کا تعلق ہے (جن کے مفاد دول عظمیٰ سے کہیں زیادہ متعلق تھے) انھیں کچھ کہنا نہ تھا
اور اُنھوں نے مجبوراً معاملہ کو اپنے بڑے بھائیوں پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آپ ہی نبٹ لیں۔ بدنصیب
یونان کی حالت بد سے بدتر تھی دیگر اقوام کی مداخلت کی وجہ سے تباہی سے بال بال بچا تھا
جس کی نمائندگی ایم وینیزلاس بے قاعدہ طور پر کر رہا تھا جس نے اپنے کو یونان کی انقلاب
پسند حکومت کی طرف سے ملکہ یونانی قوم کے نمائندہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اسکی تصدیق
کی کیا حقیقت تھی؟ اور کہاں سے اس کو حاصل ہوئی؟ اس کا کچھ پتہ نہیں اور آیا حکومت ایتھنز
یا یونانی افواج نے اس کے دستخط کو تسلیم و منظور بھی کیا ہو گا؟ یہ بھی مشتبہ تھا۔ ان کے علاوہ
دوران کانفرنس میں چند سابق وزرائے یونان اس جرم میں کہ اُنھوں نے ایم وینیزلاس
اور دول کی جارحانہ کارروائی کی تعمیل کیوں کی سزایاب ہوئے یہ امر خود ایم وینیزلاس اور
برطانیہ جو اس کی ذمہ داری میں شریک تھا دونوں کے لیے نہایت پریشان کن تھا باستثنائے بلغان

کچھ مطمئن نہ تھیں اور کبھی کبھی دبی زبان سے کچھ بول دیا کرتی تھیں۔ بلغاریہ، یونان یا اور کوئی ریاست
تھریس ترکی کو دیئے جانے پر خوش نہ تھی اگرچہ سب کی سب اپنے علاوہ کسی اور کو دیدیئے جانے
ہی کو دیا جانا مرجح سمجھتی تھیں۔[1]

روسیوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ مسئلہ بنانے میں ان کی صرف آواز ہی آواز ہے حالانکہ انکا
لیہ ترکوں سے کہیں زیادہ تھا اور انھیں ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ کانفرنس
لڑنے آئے ہیں۔

خاص خاص بین الاقوامی مسائل زیر بحث یہ تھے، آبنایوں کی آزادی، غیر ملکی باشندوں
ران کے ذاتی، مالی اور معاشرتی مفاد کی حفاظت اور قلیل التعداد آبادی کے حقوق اور
ن کا تحفظ آزادی آبنائے کے متعلق زمانہ امن میں کوئی بڑی دشواری نہ تھی جو ہمیشہ ایسے
انہ میں اس کو حاصل رہا کرتی تھی البتہ بعض حصوں میں فوجیں نہ رکھنے اور دوسرے فروعی سوالات
بث تھی۔ لیکن ترک کم از کم اتنا تسلیم کرتے تھے کہ صلح کے زمانہ میں خواہ کچھ بھی شرائط ہوں
بن جنگ چھڑتے ہی کوئی بھی حکومت کھوتی اگر اس سے ممکن ہوتا، آبنایوں کو فوراً بند کردیتی
یسا کہ انگلستان نے جنگ عظیم کے زمانہ میں چینل کو بند کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے قسطنطنیہ میں
ہنے کی بنا پر ترکی بھی راستہ فوراً بند کر دینے کی مجاز تھی اور کانفرنس کا اس کے متعلق استقدر
نور وغل بالکل نمائشی تھا غیر ملکی حقوق و مفاد پر جانبین سے سخت مباحثہ رہا اور اسی مسئلہ پر

---

[1] یہ بڑے طور پر مشتہر کر دیا گیا ہے کہ ترکی نے اپنی عیسائی رعایا کو نہایت بیرحمانہ طریقہ پر ستایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکی حکومت ایک
حقیقی نمونہ نہ تھی لیکن بعض لحاظ سے دیگر مشرقی یوروپی سلطنتوں سے کسی طرح بری بھی نہ تھی۔ یونانی جو ایشیائے کوچک میں ترکوں
کے مظالم سے اپنی اور دوسروں کے تحفظ کا استقدر ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، سرنا میں صدیوں سے استقدر خوشحال اور متمول
ہیں بلکہ وہ اپنے کو یونان سے زیادہ بہتر حالت میں پاتے ہیں جہاں ابھی زندگی بسر کرنی دشوار ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ترکوں
نے ان پر مظالم کئے ہیں تو وہ خود بھی وہاں کیوں جمے رہے اور دوسرے یونانیوں کو کیوں بلاتے رہے ہیں؟
حقیقت یہ ہے کہ اب جبکہ ترکی حکومت مٹ رہی ہے انہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ترکی خواہ کیسی ہی بری کیوں نہ رہی
ہو، ان کے ہمسایہ عیسائی اور یہودیوں سے لاکھ درجہ اچھی تھی۔

بالآخر کانفرنس کا خاتمہ بھی ہوا۔ اس قسم کے کسی تحفظ سے شہنشاہیت مفروحہ تا اور اگر ترکی شہنشاہیت
انگریزی مصری شہنشاہیت کے معنی میں نہیں تسلیم کر لی جاتی تو دول یا ترکوں کے مطالبات
منظور کر لیتے یا جنگ ہوتی۔

قلیل التعداد آبادی کے مسئلہ تحفظ میں ممکن ہے مختلف حکومتوں کے مختلف سیاسی معاد شامل
ہوں لیکن یہ معاملہ ترکوں کے گزشتہ طریقہ حکومت کی بنا پر خاصتہً عام انسانیت سے تعلق رکھتا ہے
جہاں تک ایشیائی کوچک میں یونانیوں اور آرمینیوں کا تعلق ہے یہ مسئلہ قتل عام اور جلاوطنی نے
اس کو صاف کر دیا ہے لیکن ان کے یا قسطنطنیہ اور تھریس کے دیگر اقوام کے متعلق خواہ صفحہ
کاغذ پر کچھ بھی وعدے لے لیے جائیں کہ حقیقتاً یہ تمام تر ترکوں کی نیک نیتی پر مبنی ہے بدقسمتی سے ایسے
دوسرے معاہدوں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی اور حکومت جو مناسب
سمجھے نہ یہ کہ ان معاہدوں کی پابندی کرالے۔

ہمیں بسمارک کا وہ قول یاد ہے۔ اور ۱۴-۱۹۱۸ء کے ناگوار تجربوں کے بعد بھی جو حکومت اس
قسم کی قربانی اور مظالم کے لیے تیار ہے، بخوبی دوبارہ غور کرے۔

مجلس اقوام کے آئندہ کارروائیوں پر بہت کچھ امید و اعتماد کیا جا رہا ہے لیکن اس لیگ
نے ابھی بمشکل اتنا وزن اور اختیار اپنے میں پیدا کیا ہے جس سے یہ بھروسہ یا امید قائم کی جا سکے
کہ اس کی کارروائیاں اراکین مجلس یا دیگر دول پر کوئی اثر بھی ڈال سکیں گی۔

ان بین الاقوامی مسائل کے علاوہ دول عظمیٰ اور دول ادنیٰ کے بہت سے قومی سوالات
بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر حکومت اپنے ذاتی معاد کے لیے کوشاں اور دوسروں کی
حمایت کی اس بنا پر متوقع تھی کہ بوقت ضرورت وہ اس کی مدد کرے گی۔

اس کی ایک بہتر مثال موصل کی تھی جس میں انگلستان کے سوا کسی دوسری طاقت کا کوئی
معاد براہِ راست نہ تھا لیکن تمام دول چاہتی تھیں کہ اس پر کوئی تفریق نہ ہو۔ تاکہ کانفرنس اور
خود ان کے معاد کا بے وقت خاتمہ نہ ہو جائے

لاسین کے مباحث میں دول عظمیٰ کے تمام نمایندے نہایت اعلیٰ جذبات سے کام لے رہے تھے۔ لیکن ان کی تہ میں اکثر مادیت کی بدنما صورت پنہاں ہوتی تھی۔ ترکوں جیسے سادہ دل کم تعلیم یافتہ لوگوں کے معاملہ میں نہایت اعلیٰ اخلاقی اور ذہنی افضلیت ظاہر کرکے پریشان بیکار رہتا۔

دول عظمیٰ کے نمایندگان کے لیے یہ ایک بہت بڑا نقصان تھا کہ وہ ان مقامات کے حالات و واقعات کی اصل حقیقت سے جن سے ان کو کام پڑا واقف نہ تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا ہے اگر کوئی برطانوی نمایندہ جو ترکوں، یونانیوں اور ریاستہائے بلقان کے متعلق کچھ علم رکھتا رہا ہو۔ تو وہ ایک سر ایڈم بلاک کی ذات تھی اور اس نے خود میرے سامنے اسکا اعتراف کیا کہ موجودہ ترکوں کو آج کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ وہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ کے بھولے بھالے ترک نہیں ہیں اور نہ انجمن اتحاد و ترقی کے خود غرض چالاک نوجوان ترک ہیں وہ عثمانی ترک نہیں ہیں بلکہ ایک نئی نسل کے پرجوش قوم پرست ہیں جو یورپ کے اس خیال کی وجہ سے کہ ترکی کی طاقت نیست و نابود کر دی جائے سرکف رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ لارڈ کرزن کو مشرق اور مشرقی اقوام کے متعلق بہت کچھ تجربہ حاصل ہے لیکن ان کا تجربہ ترکی سے بھی دور مشرقی لوگوں کے متعلق ہے۔ اور خود ان کی (لارڈ کرزن) قدامت پسندی جذبات و طبائع میں کسی تغیر و انقلاب کو تسلیم کرنے میں مانع ہے۔

مشرق قریبہ میں تغیر حالات سے دول کی عدم واقفیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ گذشتہ چند سال کے اندر غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہوئیں اور اتنے مصائب وقوع میں آئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لارڈ کرزن کو مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) میں اسوقت وہی اعزاز حاصل تھا جو آج ہے اور یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ یکبارگی ایک نیا باب کھول دینگے۔ اور اپنے قدیم مقلدانہ رویہ کو بدل دیں گے۔ درحقیقت یہ دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ لارڈ کرزن جیسے عالی دماغ شخص مسٹر لائڈ جارج کی پالیسی کی اس طرح اندھی تقلید کرے غالباً ان کی صحت اچھی نہ تھی جس کی وجہ سے

وہ اس پالیسی کی مزاحمت کرنے کی بجائے اتباع کرتے رہے - پھر بھی ترکی، مصر، عراق اور فلسطین میں بالآخر ایک نیا باب کھولنا ہی پڑے گا۔

پیرس، کینز، اور جینوا میں مسٹر لائڈ جارج مشرقی سیاسیات کے بن دیکھے میدان میں قدم رکھتے ہوئے تمام مشوروں سے آنکھیں بند کر کے خوشی کے مارے اچھلتے پھرتے تھے اور ان کے دائیں بائیں وزیر خارجیہ تھے جو انھیں انکی حرکتوں سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔

لاسین میں لارڈ کرزن کا رویہ ترکوں کے ساتھ ایک ہیڈ ماسٹر کی طرح تھا اور بعض اوقات نیک دل اور طفلانہ - لیکن بہر صورت ایک مسلمہ لیڈر کا سا بر تاؤ ضرور تھا - ان کا گھر کو رخصت ہونا جبکہ چوبیس گھنٹہ کے قیام میں وہ دستخط شدہ صلحنامہ کو جیب میں رکھ کر لیجاتے، ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہی۔ موصل کے معاملہ میں انگلستان کی بھی کچھ پیش نہ گئی - اور چونکہ یہ مسئلہ ان کی زیر غور سمجھا جاتا ہی، لہذا فی الحال اس میں پڑنا مناسب نہیں۔ لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ترکی کے کسی مطالبہ پر بحث تک کرنے سے بھی لارڈ کرزن کا انکار کر دینا حقیقت میں بالفاظ دیگر کہتا تھا کہ انگلستان بجائے اس کے کہ ایک انچہ بھی پیچھے ہٹے جنگ پر آمادہ ہی - یہ امر مشتبہ ہی کہ آیا کوئی برطانوی شہری موصل کے لیے جنگ کرنے پر تیار ہی تاکہ اس کو امیر حجاز سے لیکر جسے برطانیہ نے عراق پر لگا رکھا ہی، کسی بدوی سردار کے حوالہ کر دیا جائے - علاوہ اس کے مستند ذرائع سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ شاہ فیصل ترکوں کا موصل پر قابض رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ خود اس معاملہ میں اپنے طاقتور ہمسایوں سے برسرپیکار رہیں - یہ دیکھ کر لارڈ کرزن اپنی حیثیت پر دوبارہ غور کر رہے ہیں اپنی نہیں بلکہ انگلستان کی حیثیت پر - وہ اس کی توقع نہ کر سکتے تھے کہ فرانس یا اٹلی موصل کے لیے ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے۔ اسی لیے بجائے صاف انکار کرنے کے اُنھوں نے یہ مسئلہ مجلس اقوام کے حوالہ کیے جانے کی تجویز کی ہی - ترکوں نے جو لیگ کے ممبر نہیں ہیں اس فیصلہ پر اعتراض کیا - لارڈ کرزن کے اس تجویز کی غرض یہ بھی تھی کہ انکار صاف کے جو نتائج ظہور پذیر ہوں، انکی

؛اری ان کے بجائے لیگ کے نشانوں پر آئے۔ یہ اگرچہ ایک اچھی سیاسی چال تھی لیکن برطانیہ
جیسی سلطنت کے شایان شان نہیں جبکہ اسکی غرض اس قدر صاف ظاہر ہو چکی تھی۔ اس چال سے
امیابی تو ضرور ہوئی کہ تمام کارروائی ایک سال کے لیے رک گئی اور اس وقت تک امید ہی کہ
سئلہ کی اہمیت بھی جاتی رہیگی۔

اس مضمون کے لکھنے کے وقت تک یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا کانفرنس پھر دوبارہ
یا نہیں، اس لیے کانفرنس کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر زیادہ گفتگو کرنی بے سود ہی۔
یہ ایک بڑی ناانصافی ہوگی اگر کانفرنس کے اس ناکامی کا کوئی ایک واحد سبب قرار دیا جائے،
نیہ کے کارگزاریوں پر اس تنقید و تبصرہ کے بعد جو گزشتہ صفحات میں کیا گیا برطانوی نمایندگان
ام رویہ کو برا سمجھا جائے۔ لارڈ کرزن کو ایک مختلف العناصر جماعت کے رہنمائی کرنی پڑی اور
کے اکثر غیر معقول اور احمقانہ حرکتوں سے وہ غصہ و اشتعال کی انتہائی حد کو پہنچ جاتے
یسی نہ کسی کو تو تمام رہبری اپنے ہاتھ میں لینی ضرور تھی اور لارڈ کرزن کی سرکردگی متفقہ طور پہ
رہوئی اور بعد میں پسندیدگی اور تعریف کا بھی اظہار کیا گیا۔ کوئی دوسرا شخص اس کی بجائے
اسے بہتر کسی حالت میں نہیں ہوسکتا تھا اور اگر ان سے اتفاقیہ کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں تو ہر بڑے
ں کی طرح، اس کا سبب یہ تھا کہ اسمیں اچھے اوصاف کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔
کوئی سمجھدار شخص جو کانفرنس کے انعقاد اور اس کے عارضی شکست کے اسباب کا متلاشی
یہ سوال کیئے بغیر نہیں رہسکتا کہ "کیا ہماری خارجیہ پالیسی میں تبدیلی کی فوری ضرورت نہیں
سب سے بڑے واقعات جن کی وجہ سے کانفرنس منعقد کی گئی دو تھے۔ (۱) یونانیوں
شکست (۲) واقعہ چناق۔ اس موقع پر مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) نے ترکی سے
کرنے پر آمادگی ظاہر کی بجائے اس کے درہ دانیال سے قدم اٹھالیں اس کی سب سے
وجہ یہ پیش کی جاتی ہی کہ برطانوی پرسٹیج (رعب و وقار) اٹھ جاتا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ
س اور اٹلی نے ایسا کرنے سے اپنا کوئی وقار نہیں کھویا اور اس کے بتانے کی کوئی ضرورت

نہیں کہ اُس وقت برطانوی پرسٹیج پر کیا اثر پڑتا جبکہ ترک کمک کا انتظار کیے بغیر فوراً قلعہ بند انھیں برباد کر دیتے جیساکہ اکثر فوجی ماہرین کے خیال کے بموجب اغلب تھا۔

رعب و وقار سے بھی زیادہ ضروری سوال یہ تھا کہ آیا اتنے سے کام کے لیے جنگ مناسب بھی تھا؟ کیا ہم نے اس پر کبھی غور کیا ہی کہ اس جنگ میں جبکہ اتحادیوں میں سے کم ہمدردی بھی اس کے ساتھ نہ ہوتی اکیلے برطانیہ کی کیا حالت ہوتی؟۔ انگلستان کو ایشیا کوچک میں فوجی پیشقدمی کرنی ہوتی اور ممکن تھا کہ اُسے ترکی یا بالشویکی افواج کے تعاقب میں سائبیریا کے دشوارگزار اور اجنبی ملک میں دوڑنا پڑتا۔ ساتھ ہی اس کو بحر روم کے سواحل کی نگرانی بھی قسطنطنیہ سے لیکر افریقہ میں سلّم تک کرنی پڑتی۔ اور عراق، ٹرانسجارڈینیہ فلسطین اور مصر کے حکمرانوں کی بھی حمایت یا مخالفت کرنی ہوتی۔ اس بے چینی اور غلفت کی وجہ سے یہ امید نہ تھی کہ بالشویکی اور ترکی پروپگینڈا کامیاب ہونے سے رہتا۔ انگلستان کی اس وقت جنگ عظیم کے زمانہ سے بھی زیادہ دشوار ہو جاتی۔ اور اس مہم میں جان و مال کی عظیم الشان قربانی کرنی پڑتی اس کے خیال سے دل لرز جاتا ہی۔ آخر یہ سب کس لیے؟ صرف اس لیے کہ ایک غلطی کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے اور ایک ایسی مہلک پالیسی پر اڑے رہتے بجائے اس کے کہ ترکی کے ساتھ ایک سمجھوتا کرلیں۔ موجودہ خارجیہ پالیسی کی ہر جنبش پر بالشویزم اور اشتراکیت کے خوفناک گمات میں لگے ہوئے ہیں جو انگلستان کو دنیا میں اپنا سب سے بڑا جانی دشمن سمجھتے ہیں۔ کیا یہ کوئی اچھا کام ہوگا کہ ترکی کو روس اور جرمنی کے آغوش میں ڈالدیں؟ ترکوں کو روس سے کوئی محبت نہیں بلکہ برعکس اسکے ہر وقت خوف لگا رہتا ہی۔ لیکن ہم نے انھیں متعدد بار مجبور کیا کہ وہ سویٹ سے امداد اور اتحاد قایم کریں۔ یہ کس کے لیے؟ یقیناً اپنے لیے نہیں۔ ترک اگر یونان یا بلقانی ریاستوں

سلّم یہ دن جسے انگریزی میں جارڈن کہتے ہیں، فلسطین میں ایک دریا ہی۔ اسکے مشرقی ساحل کا علاقہ ٹرانسجارڈینیہ کہلاتا ہی۔ (مترجم)

ہ دبالینا چاہتے ہیں تو ان کو اس سے باز رکھنے میں انگلستان کا کیا مفاد شامل ہے جس سے وہ
ی جنگ اپنے سر مول لے؟ اس کی حمایت میں جو دلیل پیش کیجاتی ہے وہ یہ ہے کہ تاوقتیکہ مکمل
حاصل کر لیا جائے، ممکن ہے کہ دول کو جلدی پھر دوبارہ بلقان جیسی آتش زدگی کا مقابلہ کرنا
۔ فرض کرو (حالانکہ یہ بہت دشوار ہے) کہ اس قسم کے تحفظ سے آیندہ مشرقیہ قریبہ میں کوئی
نہ ہوگی پھر بھی ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ فرض خاص انگلستان ہی کا
ہ اس پر مصر ہے اور اس کے عوض ترکی تمام دنیائی اسلام کو اپنا دشمن بنالے اور اپنے
دستان، ایشیا اور شمالی افریقہ کے ممالک میں بالشویکی اور جرمن پروپگنڈا کے خطرہ میں
اور قسطنطنیہ سے لیکر خلیج فارس اور خرطوم تک ایک طوفان عظیم میں مبتلا رہے۔

زمانہ عملی سیاسیات کا ہے اور اس عہد میں انگلستان اور فرانس جن کی زیر حکومت مسلمانوں کی
داد بستی ہے۔ اگر کوئی بات قابل عمل ہے تو وہ یہ کہ ایشیا اور افریقہ کے ساتھ باہمی دوستانہ
ت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اس حکومت سے بھی صلح رکھیں جو ان کا مستقر خلافت ہے۔
س سے فوراً ابنایوں کی آزادی بھی حاصل ہوجائے گی اور روس و جرمنی کی ان پیہم کوششوں
شکست ہوگی جو وہ غیر متفق دول مغرب کے خلاف اپنے اور ترکی سے مرکب ایک جدید
ٹ پیدا کر کے کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مٹادیں اور فوائد و نقصانات اور قربانی، منافع کا نسبتہً
کر کے حالات آیندہ کا وسیع النظری کے ساتھ اندازہ کریں تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ
ان کا فرانس اور ترکی سے متفق ہونا ناممکن ہے۔

ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی پالیسی کو نہایت دیانتدارانہ، پائدار اور درست
ں۔ ہم اصول خود اختیاری کے اسقدر حامی بنتے ہیں لیکن فلسطین میں مسلمانوں اور عیسائیوں
تعداد آبادی پر یہودی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح عراق اور ٹرانس جارڈینیہ میں
نے برائے نام چھوٹے چھوٹے بادشاہ منتخب کیے ہیں جن پر وہاں کے باشندے ترکوں کے قدیم

حکومت ہی کو ترجیح دیں گے یہی حال ارض پاک کا بھی ہے جہاں نئے آقا سے پرانے مالک ہی بہتر تھے۔ کوئی شخص یا کوئی قوم کسی ایسی غیر ملکی حکومت کو صبر و سکون سے نہیں برداشت کر سکتی جو انہیں ہر حیثیت سے بنظر حقارت دیکھتی ہو یہ برطانیہ عظمیٰ ہے " جو حکومت کثیر التعداد قوم " کی اسقدر حامی ہو نیکی باوجود اس گناہ کے سب سے بڑی مرتکب ہوئی ہے۔

ہم نے فرانسیسی ہمدردی کو بھی اپنے سے علٰحدہ کر دیا ہے اور علاقہ رہر میں اس کی دشواریاں زیادہ ہماری وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ بجائے اس کے کہ اسکی اخلاقی حمایت و امداد کرتے جس کی اسے توقع تھی، ہم نے پند و نصائح کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء میں اگر انگلستان نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا ہوتا کہ وہ فرانس کی طرف سے لڑے گا تو یہ جنگ کبھی نہ ہوتی اسی طریقے سے اسکا بھی قطعی یقین تھا کہ اگر ہم نے اصولاً رہر کے معاملہ میں فرانس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہوتا تو جرمنوں کی طرف سے بہت کم مزاحمت ہوتی۔ مصر میں ہم امن و صلح قایم کرنے میں قطعاً ناکام رہے، فلسطین تقریباً بغاوت ہی کی حالت میں ہے، عراق سے بھی بعد از خرابی بسیار واپسی پر غور کیا جا رہا ہے۔ ہماری خارجیہ پالیسی چار سال تک سخت ابتلا آزمائش میں رہی اور پہلے سے کچھ زیادہ بہتر نہ رہی بلکہ تقریباً ناکام رہی۔

میں یہاں پر وہی ذکر کرتا ہوں جس کا مجھے علم ہے۔ گزشتہ صدی کے آخر میں جو جنگ ترکوں اور یونانیوں کے درمیان ہوئی تھی اس موقع پر بھی ہم نے قسطنطنیہ کے ساتھ تقریباً وہی غیر دوستانہ رویہ اختیار کیا جو آج ہمارا ہے۔

اپنے قدیم دوستانہ رویہ کے ترک کر دینے اور اسلام کو اپنا دشمن بنا دینے سے جو خطرہ ہمارے درپیش ہے، اس کا اظہار اس خط سے بخوبی ہوتا تھا جو " تماشائی "، (اسپکٹیٹر) کے نام سے اسٹینڈرڈ میں شائع ہوا تھا۔ لارڈ سالسبری وزیر خارجیہ ایسے نہ تھے کہ تنبیہ پر دھیان نہ دیتے چنانچہ انھوں نے اڈیٹر کو یہ لکھا کہ اس خط سے انگلستان کی پالیسی آیندہ بدل جائیگی، یہ وہ الفاظ تھے جن کی فوراً تعمیل کی گئی اور سر ... پی گری کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور باب عالی کے

ساتھ بہتر سلوک ہونے لگا۔کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی؟ ہمارا حال یہ ہے کہ گڑ کھاتے ہیں اور گلگلے سے پرہیز۔کیا برطانوی سپاہی، جہازراں، اور محصول دینے والے نہیں سمجھتے کہ وہ کہاں لیجائے جارہے ہیں؟ قبل اس کے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے بہتر ہے وہ خود اپنے دل سے پوچھیں۔

سعید انصاری متعلم جامعہ

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(اقبال)

مصر میں تعلیم

(بسلسلہ اشاعت فروری)

اپنی نشأت جدیدہ میں حکومت اپنے مددگاروں، بہترین مشیروں اور امانت دار کام کرنے
ں سے خالی تھی۔ ساتھ ہی پیہم مخالف واقعات، متواتر شورشیں اور مسلسل لڑائیاں کرنا پڑیں
، وجوہ سے اسلوب تعلیم جس معیار پر ہونا چاہیے تھا۔ نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس وقت صرف یہ مقصد
ِ نظر تھا کہ جلد سے جلد وطن عزیز کے نونہال تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں اور حکومت
، سے اپنے امور میں مدد لے سکے۔ اور بڑے بڑے علوم کی تکمیل کرانے والا کوئی نہ تھا۔ غیر وطنی و
ی لوگوں کی اگر خدمات حاصل کی جاتی تھیں تو وہ زیادہ مفید و کارآمد نہ ثابت ہوتے تھے۔
ر انھیں اہل وطن ہی میں سے جو جب مل جاتا تھا اوسے لینا پڑتا تھا۔ مگر جب حکومت مصر نے
وس کیا کہ اُس کو ایسے اُستاد درکار ہیں جو ریاضیات، معقولات، اصول تربیت و ترتیب
رس طریقہ تعلیم وقت معلمی میں کامل و ماہر ہوں تو اس نے طلبہ کی جماعت یورپ بھیجنے کا تہیہ
۔ اس وجہ سے کہ آج یورپ ہی اِن علوم کا مرکز بنا ہوا ہے اور تمام قدیم و نایاب علمی کتابیں
ں کی مروجہ زبانوں میں منتقل ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ خود مشاہیر یورپ کی تصانیف بھی
ن میں شامل کر لی گئی ہیں۔ اس طرح تعلیم کو یورپ نے بالکل اپنے ہاتھوں میں محصور کر لیا ہے۔
ض سب سے پہلی کیپ ماہ شعبان ۱۳۴۱ھ میں یورپ بھیجی گئی۔ اس نے آٹھ سال نو ماہ یورپ میں
م کیا یہ طلبہ مختلف ممالک میں تقسیم اور ہر فن کے لیے چند مخصوص ہو گئے۔ گوہر مقصود حاصل کر کے
ن کے مایۂ ناز فرزندوں کی یہ جماعت جمادی الاول ۱۲۵۰ھ میں اپنے مقدس ملک میں واپس
ئی۔ انھیں میں علامۂ فاضل مرحوم رفاعہ بک، مظہر پاشا، پاشا بھی تھے اس جماعت کی تعداد
بہ (۱۳۷) تھی۔ ان میں مشائخ امرا، عام رعایا اور معززین کے بچے تھے، ترک، عرب، اور

کچھ رومی وارمنی بچے بھی تھے۔ جو ملازمین حکومت کی اولاد تھی۔ ۱۲۵۳ھ میں پھر تیرہ (۱۳) طالب علم یورپ گئے۔ ان میں سے بعض آٹھ سال کچھ گیارہ سال وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد ۱۲۶۲ھ ۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹ میں اور چند لائق طلبہ گئے جن کی تعداد (۳۷) نفر تھی۔ یہ سب (۷۷) طلبا یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے۔ جن کی تعلیم پر محمد علی پاشا نے (۱۲۳۱۷۴) پونڈ مصری صرف کیے ان طلبہ نے مختلف مدتوں تک یورپ میں قیام کیا۔ ان کی مدتِ قیام ہی کے لحاظ سے مصارف و وظائف بھی مختلف ہوئے۔ چنانچہ پہلی کیپ میں ۵۱۰ پونڈ فی طالب علم صرف ہوا۔ اور حکومت کے خزانہ سے ادا کیا گیا۔ دوسری کیپوں میں بھی مختلف تعداد تھی۔ اور وظائف و مصارف بھی مختلف ہوئے مثلاً جو لوگ گیارہ سال یورپ رہے۔ اُن پر حکومت مصر نے (۹۷۹) پونڈ صرف کیے۔ محمد افندی اسمٰعیل اکتیس ۳۱ سال یورپ میں رہے۔ اور ان کی تعلیم پر (۶۴۳۵) پونڈ صرف ہوا۔ حسن افندی ۱۹ سال رہے۔ اُنھوں نے ۲۱۰۷ پونڈ وظیفہ پایا۔ محمد افندی شباسی تیرہ سال رہے۔ ان کو ۱۳۲ پونڈ ملا۔ مصطفیٰ افندی سیکی نے ۱۹ سال قیام کیا۔ اُنھوں نے ۲۱۰۷ وظیفہ لیا۔ ابراہیم افندی نبا ۱۳ سال رہے۔ ان کو ۹۴۹ پونڈ دیا گیا۔ محمد افندی علی البقلی اور حسین افندی رشیدی نے تیرہ سال قیام کیا اُن میں سے ہر ایک کو ۳۶۱ پونڈ۔ غرض اس طرح سے مدت قیام یورپ کے اختلاف کے لحاظ سے طلبہ پر مصارف بھی ہر ایک کے مختلف ہوئے۔ اور ۱۲۶۲ھ میں ایک خاص منتخب جماعت یورپ کو بھیجے گئے۔ جن میں حسین بک اور عبدالحلیم پاشا، پاشائے مرحوم کے صاحبزادے قابل ذکر ہیں۔ یہ نشتر طلبا، تھے جن میں علامہ علی پاشا مبارک بھی ہیں جو مصر کے مشہور و نامور وزیر ہوئے۔ اور جن کا علم و فضل محتاج بیان نہیں اس جماعت کے سرگروہ ا ن بک سلیے۔ اس گروہ نے پیرس کو اپنا تعلیمی مرکز بنایا۔ اور اسپر (۱۱۵۴۹) پونڈ مصری صرف ہوئے۔ پھر اور ملک کے نوجوان بھیجے گئے۔ جنکی تعداد (۲۹۰) ہوتی ہے۔ ان میں بڑے بڑے ترک و عرب سردارزادے تھے۔ اور ان سب کی تعلیم پر کل (۲۷۳۳۶۰) پونڈ مصارف آئے۔ مرحوم عباس پاشا اُن کے عہد حکومت میں ۸۴ طلبہ یورپ گئے۔ جن پر ۲۹۴۳۸ پونڈ صرف ہوئے پھر خدیو معظم اسمٰعیل پاشا

کے زمانہ میں ۱۵۰ طلبہ روانہ ہوئے جن پر ۱۳۷۸۶۶ مصری پونڈ خرچ ہوئے۔ مرحوم توفیق پاشا کے دور میں موجیل بک کی سرگردی میں ایک جماعت بھیجی گئی مگر افسوس یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس پر کیا صرف ہوا۔

تکمیل فوائد و اتمام مضمون کے خیال سے اس موقعہ پر مکاتب کی تاریخ افتتاح بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱. مدرسۃ البیادہ (پیادہ فوج) ماہ ذالحجہ سنہ ۱۲۴ھ میں بمقام قصر عینی۔ (مگر یہ مدرسہ پھر سنہ ۱۲۵۲ھ میں کسی خاص وجہ سے بند کر دیا گیا۔
۲. مدرسہ حربیہ بمقام قلعہ سنہ ۱۲۱۴ھ میں
۳. مدرسہ شوال سنہ ۱۲۴۲ھ میں
۴. مدرسہ الاجزائیہ (دواسازی کا مدرسہ) بمقام قلعہ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۴۵ھ میں
۵. مدرسہ السواری (فوجی رسالہ کا مدرسہ) حافظ افندی اسمٰعیل کی نگرانی ماہ ذیقعد سنہ ۱۲۴۶ھ میں بمقام جیزہ۔
۶. مدرسۃ الطب بیطاری (وٹرینری علاج مواشی) بمقام ا سنہ ۱۲۴۷ھ میں
۷. مدرسۃ التوبحہ (توپ خانۂ فوجی) بمقام بطرہ زیر نگرانی خورشید افندی سنہ ۱۲۴۷ھ میں جو سنہ ۱۲۵۶ھ میں موسیو بورڈکن نگرانی میں دیدیا گیا،
۸. مدرسۃ البحریہ (جہازراں) ماہ ربیع الآخر سنہ ۱۲۴۷ھ
۹. مکتب پیادہ (پیادہ فوج) بمقام خانکہ۔ جمادی الاول سنہ ۱۲۴۸ھ میں
۱۰. مکتب شریف (ملک مصر کا حصۂ زیریں) سنہ ۱۲۴۹ھ میں
۱۱. مکتب مہمات الحربیہ (سامان جنگ کا مدرسہ سنہ ۱۲۴۹ھ میں۔ پھر یہ سنہ ۱۲۵۱ھ میں بند ہو گیا،
۱۲. مکتب پیادہ مقام ابی زعبل میں سنہ ۱۲۵ھ
۱۳. مکتب پیادہ بمقام دمیاط صفر سنہ ۱۲۵ھ میں

۱۴ - مدرسۂ فنِ تعمیر (انجینرنگ) بمقام بولانہ ۱۲۵۰ھ میں زیر نگرانی موسیو حالیکان (سلکین)
یہ مدرسہ ماہ رجب ۱۲۵۴ھ میں امیر یک کے سپرد کیا گیا۔ پھر ۱۲۶۶ھ میں علامہ علی پاشا مبارک
کے حوالہ ہوا جبکہ وہ یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن واپس آئے ہیں۔

۱۵ - مدرسۂ تجہیزیہ (ہائی اسکول) یہ ماہ رجب ۱۲۵۲ھ میں مدرسۃ البیادہ سے الگ کیا گیا
پہلے دونوں ایک تھے۔

۱۶ - مدرسہ طب و دایہ گری (ماہ ذیقعد ۱۲۵۲ھ میں

۱۷ - مدرسہ الی سبہ (حساب دفاتر) بمقام سیدزینب ماہ ذیقعد ۱۲۵۲ھ میں

۱۸ - مدرسۃ الالسن (زبانیں سکھانے کا) بمقام ازبلیہ۔ ماہ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ میں

۱۹ - مدرسۂ علاج مویشی بمقام مصر ماہ ذیقعد ۱۲۵۲ھ میں

۲۰ - مدرسۃ العملیات (تشریح زخم وغیرہ) ماہ محرم ۱۲۵۵ھ میں

۲۱ - مدرسۃ المفروزہ (فوجی دستہ کا) ذیقعد ۱۲۶۵ھ میں بمقام مصر

۲۲ - مدرسۃ " " ماہ صفر ۱۲۶۶ھ " بمقام اسکندریہ

۲۳ - مدرسۂ زراعت و محاسبۂ قبطیہ بمقام عباسیہ ان دونوں کی تاریخ افتتاح افسوس کہ معلوم ہو سکی

یہاں تک پہنچکر نگاہِ بصیرت و غور ٹھہر جاتی ہے۔ اور ان مساعی جمیلہ کو حیرت انگیزی کے ساتھ دیکھتی ہے۔ اس دور میں جو معارف ضروریہ سے بالکل خالی اور حوادث وصعوبات میں گھرا ہوا تھا۔ روپیہ کی قلت اور کارآمد آدمیوں کے قحط میں مبتلا تھا، ایک مرد دانا سمجھ سکتا ہے کہ محمد علی پاشا کا یہ اہم ترین کارنامہ ایک عالی ہمت، دوراندیش نتیجہ شناس ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ مرحوم ہی نے مصریوں کو تعلیم یافتہ و مہذب آدمی بنایا۔ اور کاروبار حکومت میں درک حاصل کرنیکے مواقع دیئے یہی استعداد و قوت پیدا کی کہ اپنی قابلیت و حقوق دونوں کے لحاظ سے وہ اس قابل ہو سکے کہ حکومت کے انتظامی اور ذمہ دار عہدوں کو سنبھال لیا۔ اور غیر متمدن ملک میں جب تمدن و شائستگی کی نیا دپڑتی ہے اور ملک جہالت و وحشت میں مبتلا ہوتا ہے اس وقت اس کو

سنبھال لینا آسان کام نہیں ہے۔ اور محمد علی پاشا ہی کا کام تھا اُن کی وفات کے بعد اُن کے
فرزند رشید بطل نامور مرحوم ابراہیم پاشا کے ہاتھ میں حکومت مصر کی عناں آئی۔ اُن کا
عہد دولت اگر جلد ختم نہ ہو جاتا تو یقیناً اُن کے کمال علم دوستی و معارف پروری کی بدولت
اُس دولتِ لازوال سے مالامال ہو جاتا۔ لیکن افسوس تمناؤں اور آرزوؤں کے خلاف
نے بہت عجلت کی۔ مرحوم ابراہیم پاشا کے بعد اُن کے جانشین عباس پاشا الاول ۲۷
صفر سنہ ۱۲۶۴ھ کو سریر آرائے مصر ہوئے۔ آپ نے بعض مدارس میں کمی کی بعض میں اضافہ
آپ کے عہد میں مدارس کی تعداد اور اُن کے مصارف کا اندازہ حسب ذیل نقشے سے ہو گا
سنہ ۱۲۶۵ھ کا ماہانہ نقشہ ہے۔

	ماہانہ	تعداد	معلم	ملازم
مدرسہ المبتدیات	۷۰۷۰	۲۰۹	...	.
مدرسہ طب و دایہ گری	۳۱۷۵۰	۴۵ ۴۲ حبشن ۳ لڑکیاں تھیں	.	.
مدرسہ اسواری بمقام جیزہ	۲۵۰۲۳	۲۴۵	.	.
طلبہ پیرس روانہ کئے گئے	۲۳۱۳۵	۷۲	.	.
مدرسہ توجیہ بمقام طبرہ	۱۳۰۹۷	۸۸۶	.	.
مدرسہ الالسن و محاسبہ	۴۷۵۴۹	۳۲۰	.	.
مدرسہ فن تعمیر (انجینئرنگ)	۲۵۷۱۳	۱۳۲	.	.
مدرسہ المفردہ فوجی ستو کا	۱۹۸۵۹	۱۲۹۶		
ملازمین و مشاہرات	۱۴۹۴۹۷	۳۲۲	.	.
میزان مصارف	۴۳۰۱۹۳	۳۳۰۸		

یہ تعداد پاشائے موصوف کے آغاز دورِ حکومت کی ہے۔ مدارس کی تعداد میں مزید اضافہ
اور طلبہ کی تعداد میں بھی پھر دو شوال ۱۲۷۰ھ کو مرحوم عباس پاشا اول کے بعد مرحوم سعید پاشا
ں مصر ہوئے۔ انھوں نے سررشتہ تعلیم کی جانب مطلق توجہ نہ کی اور طلبہ کا یورپ بھیجا جانا بھی بالکل
ر دیا۔ تمام مدارس بند کر دیئے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اُنھوں نے ایسا کیوں کیا۔ حالانکہ خود
ر پاشا نے علوم و معارف کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اُس فضا میں پھولے پھلے تھے اور
ے خود ذوق آشنائے علوم تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم یافتہ گروہ کی کثرت سے اُن کو
ئی خطرہ تھا۔ کیونکہ وہ خود نہایت بہادر و جری تھے۔ اور سب سے پہلے فرمانروا ہیں جنھوں نے
یت شخصی کی طرح ڈالی لیکن تعلیم عام کی بجائے فوجی تعلیمات کی طرف زیادہ صرف ہمت فرمایا
بجید التفات سے کام لیا خود بہ نفس نفیس اس کی سرپرستی کی۔ اور قوانین یورپ کو پیش نظر
ر بہت سے طریقوں کا اضافہ فرمایا۔ اس سے فوجی صیغہ حسن انتظام کی حیثیت سے بہت ترقی
لیا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سلطان عبدالمجید کی جانب سے خطرہ تھا۔ لہٰذا صیغۂ فوج، آلات و اسلحہ
ت کی بہم رسانی و تیاری پر زیادہ توجہ مبذول رکھی جس قدر شغف و انہماک فوجی صیغہ سے تھا۔
ں قدر اگر سررشتہ تعلیم کی جانب ہو جاتا تو ایک متنفس کو بھی وہ جاہل نہ رہنے دیتے۔ تاہم اُنکے
یں کسی مقرب خاص کی تحریک و سفارش پر مدرسہ طب دوبارہ قائم کیا گیا۔ اور علامہ
کی سوڈان سے واپسی پر قلعہ میں اُن کے لیے ایک مدرسہ کھول دیا۔ جس میں ۲۵۶ طلبہ
خل ہوئے۔ جس کا ماہانہ صرف ۲۳۸ پونڈ ۳ قرش تھا۔ مگر کوئی خاص مقصد پیش نظر نہ تھا۔
سہ رفاعہ بک میں فوجی تعلیم کے لیے بھی چند معلمین رکھے گئے۔ باقی مدارس کے مکانات
رخانوں وغیرہ کے کام میں لائے گئے اور تمام آلات و سامان تعلیم فروخت کر دیے گئے۔ مصر
اس حد پر پہنچ کر تعلیم رکی ہوئی تھی کہ حضرت خدیو اسمٰعیل پاشا کا دور مبارک آیا وہ ۲۷ رجب
۱۲۷۹ھ میں والیٔ مصر ہوئے۔ اُنھوں نے تمام مدارس اور تعلیمات کے شعبے کھول دیئے۔ اور
ت خاص محکمہ اس کا الگ جاری کیا۔ اپنی پوری توجہ تعلیمات پر صرف فرمائی۔ بہت سے طلبہ کو

یورپ بھیجنے پر تیار کیا۔ فوجی تعلیم کا شعبہ ملکی (سول) تعلیم سے جدا کر دیا۔ اور اُس کے تمام شعبوں کا ایک خاص جدید محکمہ سے الحاق فرمایا۔ پھر مکاتب اہلیہ (پبلک اسکولز) کی طرف توجہ فرمائی۔ تمام ملک کے مدارس و مکاتب کے لیے ایک قانون بنایا۔ شہروں اور گانوؤں میں تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے پوری کوشش سے کام لیا۔ اور تعلیم کی تین قسمیں قرار دیں۔

۱۔ اول ابتدائی تعلیم۔ شہروں اور دیہات کے مدارس میں، جو صرف معمولی نوشت و خواند اور حفظ قرآن شریف، علم توحید کا ایک رسالہ اور حساب کے چاروں ابتدائی قواعد تک محدود تھی۔

۲۔ قسم دوم مدارس عامہ، مرکزی شہروں میں، ان طلبہ کو نحو عربی، حساب، ہندسہ، جغرافیہ تاریخ اور کچھ علم الطبیعات پڑھایا جاتا تھا۔ مثلاً حوادث فضائیہ اور کچھ فوائد کیمیاویہ، نباتات اور زمین کی درستی و اصلاح سے متعلق۔ تاکہ طلبہ میں، مدارس عالیہ میں داخل ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

۳۔ قسم سوم۔ مدارس امیریہ تھے۔ اِن میں اُن تمام علوم اولیہ کی تعلیم دی جاتی تھی جس سے طلبہ میں مدارس خصوصیہ میں داخلہ کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور ان مدارس خصوصیہ کے مصارف خود بارگاہِ خدیویہ سے ہوتے تھے۔ اب رہے ابتدائی اور تجہیزی (پرائمری اور ہائی) مدارس ان کا تمام بار مصارف حکومت کے ذمہ اور فیس کی آمدنی پر تھا جو طلبہ کے متولیوں سے وصول ہوتی تھیں۔ اس کی مقدار بیس سے سو قرش تک اُن کی حیثیت و مقدرت کے لحاظ سے ہوا کرتی تھی۔ اور دوسری مکاتب پر اقطاع جفلک کی آمدنی صرف کی جاتی تھی۔ یہ ملک مصر کا وہ نشیبی حصہ تھا جسے خدیو معظم نے مکاتب اہلیہ کو عطا فرمایا تھا۔ اور اُن اوقاف خیریہ کی آمدنی، جو دیوان اوقاف سے متعلق تھے۔ یا بعض اہالی ملک کے نگرانی میں تھے۔ اس کے علاوہ تلامذہ کے ماں باپ سے کچھ رقم فیس وصول ہوتی رہتی تھی جس کی مقدار پانچ (۵) قرش سے پندرہ قرش تک تھی۔ اور ان کی حیثیت کے لحاظ سے لی جاتی تھی۔ یتیم بچے بھی بلا استثنا حکومت کے ہر ایک مدرسہ اور مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آلات و سامانِ تعلیم عام طور پر یتیم طالب علم کو مدرسے سے مفت دیئے جاتے تھے۔ اس طریقے سے تعلیم تمام شہروں اور گانوؤں میں عام ہوگئی۔ مدارس و مکاتب بھی اس تعلیم سے ہزاروں کی تعداد میں

ابنائے ملک نے فائدہ حاصل کیا۔ خدیو معظم اسمٰعیل پاشا کو اس تعمیم مصارف پر آمادہ کرنے کا سہرا علامۂ
افضل، وزیر خلیل علی پاشا مبارک کے سر ہے۔ جو ابو المعارف کہے جا سکتے ہیں۔ وہی مدارس کو ترتیب
نظام میں لانے اور صحیح اصول پر فن تعلیم کو وضع کرنے والے ہیں اس سے قبل محض قیاس اجتہادی
اصول پر تھے، یہ نیک دل، علم پرور وزیر جس روز یورپ سے واپس آئے اُن کا ایک دن بھی ایسا
نہیں گزرا جو ترقی و تعلیم کے مسئلہ سے خالی گزرا ہو۔ اور اُنھوں نے بہت سے مدارس و مکاتب بلا
اجازت حکومت بھی کھول دیئے تھے۔ پھر جب موقع مل جاتا تھا منظوری لیکر مستقل کر دیتے تھے۔ حقیقت
یہ ہے کہ علی مبارک پاشا کی مساعی جمیلہ اور ان کی شاندار تعلیمی کارناموں کو گننے کے لیے ایک مستقل
تصنیف درکار ہے۔

تجوی صدیقی

قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

از افاضات مولانا شاد عظیم آبادی

چشم سیہ میں سرمہ دے زلفِ رسا میں شانہ کر
قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

نالہ ہوا ہے منفعل شہرتِ عام سے عبث
کس نے کہا کہ یوں بلند شورشِ عامیانہ کر

اہلِ ہوس بھی ہو گئے آ کے حریفِ میکشاں
پیرِ مغاں الٹ دے خُم، بندِ شرابخانہ کر

جس پہ ہو آپ محو تو نقش وہ کھینچ ہر طرف
ہاتھ میں کلکِ فکر لے، گھر کو نگارخانہ کر

تشنگیِ زباں عبث، دل میں بھرے ہیں خار و خس
چھوڑ ابھی یہ دنِ در، فکرِ درونِ خانہ کر

باغِ جہاں ہے پُرخطر، بلبلِ زار سے کہو
شاخِ بلند و استوار دیکھ کے آشیانہ کر

دیکھ کلام شاد کا، شعر کا ماحصل سمجھ
جاگ کے کرشبی بسر، فکر کو عارفانہ کر

مسئلہ اشتراکیت

تنقیدی نقطۂ نظر سے

اشتراکیت کی تحریک موجودہ سوسائٹی کے نظام سرمایہ داری کے خلاف دراصل صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک کی بنیاد ہی انفرادیت کے خلاف ہے جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے عیاں ہے۔ اس کا تمامتر مقصد سرمایہ اور محنت (جو پیدائش دولت کے دو اہم اجزائے لاینفک ہیں) کی باہمی کشاکش کو رفع کرنا اور ان کے باہمی تعلقات کو (جن کا اثر صرف انھیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی پر پڑتا ہے) خوشگوار بنانا ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کے نزدیک پیدائش اور تقسیم دولت کا ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ سوسائٹی کے سب ممبر اس کے ذریعہ سے بہرہ مند ہو سکیں۔ اس تحریک کا یورپ کی سرزمین میں اس وقت آغاز ہوا جب وہاں کی فضا ہر قسم کی برائیوں اور آلودگیوں سے مکدر ہو رہی تھی چنانچہ اشتراکئین نے اقتصادی ناانصافیوں کے ہی خلاف اپنی آواز نہیں بلند کی بلکہ اخلاقی و سیاسی اصلاح کے بھی وہی لوگ علمبردار ہوئے۔

علم طبعیات کے اس کلیہ میں مطلقاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ عمل و ردِ عمل میں ایک خاص مناسبت ہوتی ہے جس طرح ساری دنیا میں یہ کلیہ عمل پیرا نظر آئے گا اسی طرح انسان کی تمدنی و عمرانی حیثیت میں بھی اس کی کارفرمائی سے انکار نہیں۔ انقلاب فرانس دراصل تمام یورپ کا انقلاب تھا لیکن فرانس کی سرزمین اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوئی یہاں مطلق العنان بادشاہ صرف ملکی و قومی معاملات تک اپنی دخل اندازی کو محدود نہیں کرتے تھے بلکہ خانگی معاملات تک میں شاہی قوانین اپنی تمام دہشت و جبروت کے ساتھ عمل پیرا نظر آتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب کے بعد جب جمہوریا سوسائٹی کا "درمیانی طبقہ" برسر اقتدار ہوا تو ان قوانین کو سب سے پیشتر مٹایا گیا جو شخصی آزادی میں ہارج یا مانع تھے۔ درمیانی طبقہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اکثر اپنے کاروبار میں مصروف تھے رؤسا اور نوابوں کے زمانہ میں ان پر طرح

طرح کے قیود عائد تھے انقلاب نے گویا ان نوابوں کے طریق حکومت کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے معدوم کر دیا۔ اس کی جانشینی موجودہ آزاد خیال، حریت پسند طبقہ نے نہایت بے باکانہ طریقہ سے اپنے سرلی ان کے خیالات آزادی نہ صرف میدان سیاست تک پہنچ گئے بلکہ مذہب بھی انکی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ انھیں لوگوں نے رومن کیتھلک کے رسوم و توہمات کے خلاف سخت جہاد شروع کیا غرضکہ جب تقریباً تمام یورپ نے لبرل طبقہ کی سرکردگی قبول کر لی تو زیادہ سے زیادہ مفاد کے حصول میں موانع باقی نہ رہے۔ نظام سوسائٹی کے ذمہ دار بھی تھے۔ کسی مطلق العنان کی دراز دستیوں کا خوف باقی نہ رہا کیونکہ اب تو دستوریت کی ابتدا ہو چکی تھی، مذہب کے احکام کی ان مادیت پرستوں کے دماغوں میں کچھ وقعت باقی نہ رہی چنانچہ اس زمانہ میں جتنے بڑے بڑے فلسفی اور علم اقتصادیات کے ماہرین پیدا ہوئے وہ بھی ماحول کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہر طرف لیسز فیئر (یعنی ہر قسم کی اقتصادی آزادی) کے نظریہ کا غلغلہ بلند تھا، گورنمنٹ تو اپنی تھی ہی شخصی آزادی کا بری طرح استعمال کیا گیا۔ بادی النظر میں یہ آزادی جمہوریت کا سنگ بنیاد معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی موجودہ سقیم حالت اسی اصول کی عدم توجہی کی رہین منت ہے۔

جب یہ "طبقہ درمیانی" اپنے تفویض کردہ فرائض سے متجاوز ہونے لگا تو فطرت کے قانون نے اپنی دائمی سنجیدگی اور استغنا کے ساتھ اسکو بھی سزا دینی چاہی چنانچہ تحریک اشتراکیت کے معرض وجود میں آنے کی علت العلل یہی ہے۔ جیسا ہر تحریک کا خاصہ ہے اس میں بھی پہلے ارباب تخیل پیدا ہوئے جن پر مذہبی و اخلاقی رنگ غالب تھا اس کے بعد وہ جماعت آئی جو فلسفہ اور مادیت میں ڈوبی ہوئی تھی ان لوگوں نے ہیئت اجتماعیہ کو بھی علم الحیات پر خیال کیا کہ جس طرح جسم انسانی مختلف مدارج ارتقا طے کرتا ہے بعینہ ہیئت اجتماعیہ ان قوانین سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ جس طرح موجودہ سوسائٹی کے "طبقہ وسطیٰ" نے طبقہ اعلیٰ" پر غلبہ حاصل کیا ہے اسی طرح "طبقہ ادنیٰ" "مستقبل قریب میں تمام دنیا میں برسر اقتدار ہو جائیگا۔ یہ جماعت بھی اپنے

دعووں میں حد سے متجاوز ہو گئی۔ ہم اپنے مضمون میں بھی بتلانا چاہتے ہیں کہ اکثر اشتراکیین بھی درمیانی راستہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں جو یقیناً اسلام کا مسلک ہے۔ چونکہ اس تحریک کو یورپ کی متحدہ طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا اس لیے ان اصولوں کو بھی جو فی نفسہ اچھے اور پسندیدہ ہیں نہایت بُری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلا الزام اشتراکیت کے خلاف یہ ہے کہ "ملکیت ذاتی" کے حقوق یہ نظام تسلیم نہیں کرتا۔ یہ خیال غلط فہمی یا (تجاہل عارفانہ) پر مبنی ہے۔ اشتراکیین کا تو یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ نظام سوسائٹی میں "ملکیت ذاتی" تو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں محنت اور اس کے ثمر میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ جو لوگ زیادہ محنت کرتے ہیں وہی محروم محض ہیں۔ اگر دنیا کے کسی ملک کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جائے کہ دنیا میں زیادہ تعداد انھیں فاقہ مستوں کی ہے جو "ملکیت ذاتی" سے بالکل عاری ہیں۔ نہ دنیا کے ممالک میں سے کہیں کے مزدوروں کا منتہائے نظر "ملکیت ذاتی" ہوتا ہے۔ مزدوری سے صرف پیٹ بھرنا مقصد ہوتا ہے اور جو بچ رہا تو وہ اس منحوس ساعت کے لیے پس انداز کر لیا جاتا ہے جب بیماری یا بیکاری سے دوچار ہونا پڑے۔ اس پس انداز سے سطح زندگی کو بلند کرنا - یا مزید آسائش بہم پہنچانا مقصود نہیں ہوتا ملکیت ذاتی سے ایک خاص جماعت بہرہ اندوز ہوتی ہے اور سوسائٹی کے عامتہ الناس کو اس سے زیادہ فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب وہ زمانہ بھی نہیں جب ایک معمولی مزدور بھی یہ امید کر سکتا کہ ایک روز وہ بڑا سرمایہ دار ہو جائیگا۔ اب تو زمانہ کا رجحان یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار سے لیے تو اپنی مرفہ الحالی میں اضافہ کرنے کا موقع حاصل ہے لیکن وہ شخص جس کی حالت خراب ہے اس خستگی و خواری کو دور کرنے کے لیے مواقع موجودہ طریق تمدن نہیں بہم پہنچا سکتا۔ نظام اشتراکیت ملکیت ذاتی کے اصول کے خلاف ہے بلکہ موجودہ طریق تمدن کے خلاف ہے جس کی بدولت عوام غربت و افلاس میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ انھیں اسباب کی بنا پر اشتراکیین نے "مساوات مواقع" کا اصول قایم کیا ہے۔ ایک بچہ جو معمولی گھرانے میں پیدا ہوتا ہے اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت

حاصل کرلیتا ہے اور اس کے غریب پڑوسی کا فرزند باوجود زیادہ ذکی اور ذہین ہونے کے ان مواقع سے محروم رہتا ہے یقیناً یہ بالکل درست ہے کہ خود کائنات فطرت میں کسی چیز کو مساوات حاصل نہیں۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "فطرت اعادہ کو ناپسند کرتی ہے"۔ دو درخت جنکو نشو ونما کے تقریباً مساوی مواقع حاصل ہو جاتے ہیں جب بھی بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ جب ایک درخت میں کونپل نکلنا شروع ہوئی ہو تو اس نے مشرقی ہوا کے جھونکے کا اتنا اثر قبول کیا ہو کہ اس کی تمام آیندہ شاخوں کے نکلنے کا رجحان مغرب کی طرف ہو گیا کیا یہ فطرت کی عدم مساوات نہیں؟ خیر ہم اس مافوق الطبعی بحث کو چھوڑتے ہیں۔ سوسائٹی میں مساوات مواقع سے مشابہت کلی مراد نہیں بلکہ ملک کی ذمہ دار جماعت یعنی گورنمنٹ کی طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ ایک دہقان کے فرزند کو بھی ایسے حالات بہم پہنچائے کہ وہ بھی اپنے ہر قسم کے پوشیدہ جوہر دکھلا سکے کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دہقان زادہ جو اپنی تمام عمر ہل بیل کے اہتمام میں گذار دیتا ہے اور جس کی سیاست کا دائرہ اپنے گھر کی چار دیواری یا اپنے گاؤں تک محدود رہتا ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع اس کو بہم پہنچ جانے پر نیوٹن یا بوعلی سینا کی طرح سائنس کے کلیات ونظریات قائم کرتا؟

چنانچہ تفریق مراتب تو بیشک معدوم نہیں ہوسکتی اور نہ اشتراکیین یہ چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکومت بحیثیت نمایندہ عوام ہونے کے اس کی ذمہ دار ہے کہ ہر متنفس کو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت حاصل کرنیکا پورا پورا موقعہ دیا جائے۔

یہ کہنا کہ جب اشتراکیین ملکیت ذاتی کو یکقلم مٹا دینگے تو تجارت اور عام صنعت وحرفت کا بازار بالکل سرد پڑ جائیگا حقیقت سے اسی قدر دور ہے جیسا کہ پہلا خیال۔ اس قسم کی افواہ کی ترویج صرف مخالفین اپنے پروپگنڈے کی غرض سے کرتے ہیں۔ ایچ۔ جی ولیس صاحب مشہور مورخ انگلستان جو ۱۹۲۰ء میں روس صرف اس لیے تشریف لے گئے تھے کہ وہاں کی سیاسی ومعاشی حالت کا مطالعہ کریں اپنی کتاب میں اس مکالمہ کو لکھتے ہیں جو ان کے اور لینن صدر

جمہوریہ اشتراکی کے درمیان اسی اثنا میں ہوا تھا۔ ولیس صاحب لکھتے ہیں کہ "میرا خیال تھا کہ میں لینن میں وہ باتیں پاؤنگا جو کٹر قسم کے مارکسی کے متبع میں ہونی چاہئیں۔ لیکن ملاقات کے بعد میرا یہ خیال محض غلط ثابت ہوا۔ ایک امریکن سفیر بھی میرے ساتھ ملاقات کے لئے گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لینن سے کچھ خاص باتیں کرنا چاہتا ہے چنانچہ وہ وہاں سے میری واپسی کا منتظر تھا لیکن اثنائے گفتگو میں لینن نے امریکن کی طرف دیکھ کر مجکو مخاطب کیا کہ ہم امریکہ سے خلیہ تجارتی معاہدہ کر رہے ہیں اور ہم لوگ اہل امریکہ کو سائبیریا میں ۵۰ سال کے لیئے ٹھیکہ دینے کو تیار ہیں تاکہ یہ لوگ وہاں کاشت عمیق کریں اور ساتھ ہی کارخانے قائم کریں۔ اس معاہدہ میں ہم یہ شرط بھی رکھیں گے کہ امریکہ برطانیہ عظمیٰ اور جاپان کی غاصبانہ پالیسی کی مدافعت میں ہماری ممد و معاون ہو"۔ یہ روس کی جمہوریت اشتراکی کے صدر کے الفاظ ہیں ان سے ان تمام بیانات کی یکسر تردید ہو جاتی ہے جو اشتراکئین کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں کہ اشتراکی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ تجارتی و صنعتی ترقی بالکل مسدود ہو جائے۔

سرمایہ داری اشتراکئین کے نزدیک

اشتراکئین کا موجودہ نظام تمدن پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انسانی توہین جیسی اس زمانہ میں ہوئی ہے ویسی کبھی نہیں ہوئی۔ سرمایہ داروں کے نزدیک "محنت" بھی تجارتی بیع و شری کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک وہ بھی دیگر اشیاء بازاری کی طرح بے روح و بے ارادہ چیز ہے۔ ایام سابقہ کی رسم بردہ فروشی کے ذکر سے یورپ کے تعذیب و تمدن پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے لیکن فی الواقع آجکل کی نام نہاد آزادی سے اس زمانہ کی غلامی بہتر تھی۔ اس زمانہ میں "محنت" (یعنی پیدائش دولت کا ایک اہم عنصر) ایک غیر جاندار چیز سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ایک سرمایہ اصل دار اپنی مشین کی مرمت کرانا اور اپنی آمدنی سے مطالبات فرسودگی کو علیحدہ کرنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس کو اس بدنصیب انسان کے پس ماندگان کا مطلقاً خیال نہیں ہوتا جو اس کے کارخانے میں کسی مشین کے غیر معمولی صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ اگرچہ آجکل

تعلیم اشتراکیت کی نشر و اشاعت کی وجہ سے یورپ کے تمام ممالک کے مزدوروں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوگیا ہے اور ہر جگہ ارباب العمال نے اس قسم کے قوانین پاس کرائے ہیں جن کی وجہ سے بہ نسبت پیشتر کے اب مزدوروں کو رعایت حاصل ہوگئی ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ اب مزدوروں کی حالت میں کوئی خرابی باقی نہیں رہی یا یہ کہ وہ اب بالکل مرفہ الحال ہیں۔ زندگی کا بیمہ یا فیکٹری ایکٹ کے ذریعہ سے یقیناً اب بہ نسبت پیشتر کے مزدوروں نے اصلاحات کرلی ہیں جنکی وجہ سے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

تجارت اور جنگ

جنگ کوئی نئی چیز نہیں کہ اسی زمانہ کے لیے مختص ہو۔ لڑائیاں ایام سابقہ میں بھی ہوا کرتی تھیں لیکن آج کل کی لڑائیوں کی بنیاد سرمایہ داری ہے۔ موجودہ تہذیب تجارتی تہذیب ہے۔ اس تہذیب و تمدن کی کہانی کے فوراً بعد موجودہ زمانہ کی مہیب اور عافیت سوز جنگوں کی داستان سرائی بھی ناگزیر ہے اسوقت تک یہ کہانی ہمہ وجوہ مکمل نہیں ہوتی جبتک یہ خونیں منظر بھی نظروں کے سامنے سے نہ گزر جائے۔

اس زمانہ میں متمدن ممالک کے نزدیک یہ دو اہم سیاسی مسائل درپیش ہیں کہ کس طرح اپنے ملکی مصنوعات کے لیے بازار حاصل کیے جائیں اور جس قدر منافع حاصل ہوں ان کو کس جگہ سرمایہ کی شکل میں لگایا جائے؟ یہ دونوں مسئلے بالکل لازم و ملزوم ہیں پہلے سیاسی چالوں سے ملکی مصنوعات کے لیے بازار حاصل کیے جاتے ہیں اور اس کلیہ کا ثبوت بھی دیدیا جاتا ہے کہ کس طرح سیاسی غلامی اور اقتصادی غلامی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

چونکہ یہ معاشی قانون ہے کہ کسی ملک میں سرمایہ کی زیادتی کی وجہ سے قیمت اشیا بڑھ جاتی ہے اس لیے وہ منافع جو غیر ممالک کے بازاروں سے حاصل کیا جاتا ہے اپنے ملک کے کسی کاروبار میں نہیں لگایا جاتا بلکہ ان غیر متمدن ممالک میں لگایا جاتا ہے جہاں بمقابلہ اپنے ملک کے سرمایہ کی کمی ہے۔ اور شرح سود زیادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی وہاں اپنا سیاسی اقتدار قایم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان غیر متمدن ممالک میں احتیاطاً اپنے سرمایہ کی حفاظت کی خاطر فوجیں

اور بحری قوت ہر وقت تیار رکھنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثال مصر اور مراکش کی گذشتہ تاریخ سے خوب واضح ہو جاتی ہے اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کے اِن دونوں اسلامی ممالک پر قبضہ و تسلط کی تاریخ سے یہ تمام اصول "سرمایہ داری" بخوبی روشن ہو جاتے ہیں۔

پریس ان تمام حرکات کو مستحسن بنانے کے لیے انکو عوام کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ فوراً مسحور ہو جائیں۔ کبھی ان کے جذبات سے اپیل کی جاتی ہے، کبھی مادر وطن کی آہ وزاری ان کے گوش گذار کیجاتی ہے۔ اور ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ اپنی شخصی اغراض کو ملکی و قومی مفاد کی مدافعت کا جامہ پہنایا جائے اگر ترکوں کے خلاف انگلستان جنگ کرنے کا ارادہ کریگا تو یقین جانئے اقتصادی یا سیاسی مفاد پریس کے ذریعہ سے عوام کے سامنے نہیں پیش کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے تو خود اپنی قلعی کھلتی ہے یعنی اگر تھریس کے علاقہ میں ریل کی انگریزی کمپنی قایم کرنے کا ذکر کیا جائے تو ظاہر ہے کہ انگلستان کے مزدوروں کے لیے کوئی خاص اور قابل ذکر فائدہ نہیں۔ اس قسم کا بہت کم ذکر کیا جائیگا۔ ہاں سب سے زیادہ زور اس مسئلہ پر دیا جائیگا کہ گیلی پولی میں انگریز "شہیدوں" کی قبروں کی محافظت انگریز قوم کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے چنانچہ انھیں "شہیدوں" کے نام سے عوام کے جذبات کو ابھارا جائیگا اور ان کو برسرپیکار ہونے کی ترغیب دیجائیگی۔ پروپگنڈا انیسویں صدی عیسوی کی ایجاد ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے بھی طریق "سرمایہ داری" نے بہت ترقی کی ہے۔ علامہ اقبال نے مزدوروں کی حالت کا اپنی نظم خضر راہ میں یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

مکر کی چالوں سے بازی لیگیا سرمایہ دار ٭ انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیکاری آج کل مسئلہ "بیکاری" بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ اور موجودہ تہذیب و تمدن کی اس سے بڑھکر اور کوئی خرابی قیاس میں نہیں آتی کہ ایک شخص جو ایمانداری کے ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اقتصادی مجبوری کی وجہ سے جن پر اس غریب کو کوئی اختیار نہیں وہ اپنے خاندان کو ذلت و خواری کی زندگی

نہیں بچا سکتا۔ مسئلہ بیکاری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب موجودہ "سرمایہ داری" کا دور شروع ہوا اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے تو وہ کاشتکار لوگ جو گاؤں میں زمینداروں کے ظلم سے تنگ آئے تھے شہروں کی طرف ہٹ چلے۔ پہلے پہل تو ان سب کی کھپت ہو گئی لیکن جب بخار و برق کی ایجاد ہوئی مزدوروں کی ضرورت کم ہو گئی۔ اب ایک بڑی سے بڑی مشین کے لیے بھی ایک شخص نگرانی کے لیے کافی تھا جو صرف اس کی کارروائی کو سمجھ گیا ہو۔ اس طرح مزدوروں کی بڑی جماعت جو برسرکار تھی مطلقاً بیکار ہو گئی۔ اسی زمانہ میں یورپین اقوام کو جو امریکہ ایشیا اور افریقہ میں تفوق حاصل ہوا تو ملکی مصنوعات کے لیے بازار بھی سیاسی اثر کی وجہ سے بہم پہنچ گئے۔ باوجود آپس کے تجارتی مقابلہ کے کارخانوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی اور ملکی مصنوعات نے اسقدر ترقی کی کہ توازن رسد و طلب قائم نہ رہ سکا۔ اس کا قدرتاً نتیجہ یہ ہوا کہ کساد بازاری کے وقت اکثر کارخانوں کو بند کرنا پڑا۔ ایک تو نئی نئی مشینوں کے استعمال سے "محنت کی" کم ضرورت باقی رہی تھی اس قسم کے تجارتی حالات نے بیکار مزدوروں کی تعداد میں بہت اضافہ کر دیا۔ اب تو آہستہ آہستہ یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک برسرکار مزدور کو اپنی بیکاری کے روز کا ویسا ہی یقین ہوتا ہے جس طرح دن کے بعد رات کا۔ اس کو مرگِ ناگہانی کی طرح اس منحوس ساعت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ وہ محنت و مزدوری سے اپنے خاندان کی پرورش کرنا چاہے گا لیکن اسکو اپنی محنت کی قیمت گرانے کے بعد بھی مزدوری نہیں ملے گی۔ اس قسم کے مناظر یورپ کے تمام صنعتی شہروں کے قرب و جوار میں ایک انسان سال کے بارہوں مہینہ دیکھ سکتا ہے۔ بقول ایک انگریز مصنف کے کہ دنیا کے سب سے مالدار شہر کے گرد و نواح میں ہمیشہ مزدوروں کی ایسی فوج نظر آئے گی جنکی سردی کے موسم میں پوشاک ہی ناکافی نہ ہو گی بلکہ اگر آپ ان کے گھر میں جا کر ایک نمک کی ڈلی بھی تلاش کرنا چاہینگے تو مشکل دستیاب ہو گی۔ یہ ہیں موجودہ تمدن کی برکات جس کے مناقب کی مدح سرائی سے اب تک ہماری زبانیں نہیں تھکیں۔ یہ اس جگہ کی حالت ہے جہاں جمہوریت اور دستوریت کے غلغلے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بلند کیے جاتے ہیں۔ اقبال نے مزدوروں کو مخاطب ہو کر دوسری جگہ

بھی خوب کہا ہے سہ دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب. تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!
ہم نے اشتراکیین کے خلاف موجودہ سرمایہ داروں کے الزامات اور موجودہ تمدن کے خلاف اشتراکیت کے اعتراضات پر کافی بحث کرلی۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ دونوں فریق اپنے دعوے میں کس قدر حد سے متجاوز ہیں۔

صحیح راستہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ موجودہ تمدن میں خرابیاں ہیں لیکن ان کو درست کرنے کا طریقہ بھی ابتک غلط استعمال کیا گیا ہے۔

اشتراکیت اور اسلام

ہمارے نزدیک اگر موجودہ کشمکش کو دور کرنے کا کوئی واحد ذریعہ ہے تو وہ تمام عالم کا اصول اسلام کی طرف رجوع کرنا ہے۔ دنیا کے کسی مذہب نے معاملات زندگی اور معاشرت کے ایسے اصول نہیں مرتب کیے جن پر بجا طور پر مسلمانوں کو ناز و فخر ہے۔ اسلام نے نہ صرف مسیح کی طرح اخلاقی تعلیم پر اکتفا کی بلکہ مدنی زندگی کے وہ تمام اصول بھی وضع کیے جن پر اگر آج عمل ہونے لگے۔ تو ہمارا عقیدہ ہے کہ یورپ کی موجودہ کشمکش مطلقاً باقی نہ رہے اسلام نے اپنے پیرووں کے لیے روحانی مساوات کے دوش بدوش مادی مساوات پر بھی زور دیا یعنی ہر مسلمان پر زکوٰۃ اسی طرح فرض کی گئی جس طرح اور احکام کی ادائیگی۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ دراصل ایک مقررہ ٹیکس ہے جو راس المال پر لیا جاتا ہے۔ عموماً اس مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیجاتی ہے جو تمام مصارف نکالنے کے بعد بچتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم کہہ چکے ہیں۔ عام مرفع الحالی کا اندازہ صرف تناسب آمدنی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ آمدنی متناسب کرنے کی کیا دنیا کے کسی مدبر نے اس سے بہتر ترکیب بتلائی ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے اگر دنیا تمدنی تاریخ کا عہد زرین دیکھنا چاہتی ہے تو اسلام کی تاریخ کے علاوہ کوئی تاریخ اپنے آپ کو پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ تناسب آمدنی کی مثال کیا اس واقعہ سے بہتر کہیں دنیا میں مل سکتی ہے جب لوگ اس کے متلاشی رہتے تھے کہ کوئی صدقہ قبول کرنے والا ملے؟
آج تک جو بڑے بڑے معاشئین پیدا ہوئے تقریباً سب انفرادیت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ

انھوں نے "اصل" پر معمولی سا ٹیکس لگانے کی بھی سخت مخالفت کی۔ ان سب نے سب سے
بڑی یہ وجہ بیان کی کہ اصل پر اگر ٹیکس لگایا جائیگا تو وہ "اصل" بازار سے فرار ہو جائیگا۔ بعضوں نے
لفظ Shy استعمال کیا ہے یعنی "اصل" شرمیلا ہو جائیگا اور تجارت وصنعت کے میدان
میں نہ آئے گا۔ اور اس طرح عام قومی تجارت کو سخت ضرر پہنچیگا۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا مسلمانوں
نے باوجود اس اصل پر ٹیکس قائم ہو جانے کے تجارت وصنعت میں ترقی نہیں کی تھی۔ کیا اس
زمانے میں عربوں اور مصریوں کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی نہ تھی ؟

جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں دنیا اپنے تلخ تجربوں کے بعد پھر میانہ روی یعنی (مسلک اسلام)
کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ واقعات کی منطق کے سامنے کسی فلسفی کی منطق نہیں چلتی
گذشتہ سال سوئٹزرلینڈ کی پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ "اصل" پر بھی ٹیکس لگنا چاہیے۔
چنانچہ ممبران اشتراکی نے تقریباً اکثریت اپنے ہم نوا بنالی لیکن چونکہ معاملہ نہایت اہم تھا عوام سے
استصواب رائے کیا گیا (جیسا کہ وہاں کا ملکی دستور ہے) اسی زمانہ میں سوئٹزرلینڈ کے سکہ کی قیمت
تمام بڑے بڑے بازاروں میں گر گئی۔ یورپ کے تمام ممالک کے اور خصوصاً انگلستان کے
سرمایہ داروں نے جنکا "اصل" سوئٹزرلینڈ میں لگا ہوا تھا اپنی اپنی گورنمنٹوں سے خفیہ طور پر
سوئٹزرلینڈ کا معاملہ خاطر خواہ طے کرانے کی درخواستیں کیں۔ اسوقت تمام یورپ میں سراسیمگی
اور بدحواسی کا عالم تھا کیونکہ اس معاملہ کے بعد سب ممالک سوئٹزرلینڈ کی ضرور پیروی کرتے۔
خود انگلستان کے اراکین حزب العمال نے یہ تجویز منظور کی کہ "اصل" پر بھی ٹیکس لگنا چاہیے
چنانچہ ان لوگوں نے اس "اصل" پر جو ایام جنگ میں سامان حرب وغیرہ تیار کرنے میں حاصل کیا گیا ہے
خاص ٹیکس" لگانے میں کچھ کامیابی حاصل کر لی۔ کیونکہ ایام جنگ میں جو آمدنی حاصل کی گئی۔
اس کی ملکیت کی تمام قوم حقدار ہے اور خاص شخص یا کمپنی کو اپنی ملکیت کرنا بے انصافی ہوگی۔ اس لیے
[illegible] ماورائے آمدنی کے ٹیکس کے جو اس اصل سے حاصل کی گئی ہو مقرر کیا
۔ غرضکہ ہر طرف سچائی کی طرف اقدام ہو رہا ہے اور یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ تمام اقوام عالم

اصول اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاویںگے۔

حرمت ربا

جس طرح مسئلہ زکوٰۃ کی اہمیت کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس سے زیادہ حرمت ربوٰئے کے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں بعضوں نے تو یہ فیصلہ ہی کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے ادبار و افلاس کے اسباب میں سے ایک حرمت ربا اور زکوٰۃ دینا بھی ہے۔ کیونکہ دولت و سرمایہ کے بڑھانے کا اتنا موقع نہیں دیا جاتا ہے جتنا اس میں سے سالا نکل جاتا ہے۔ حرمت ربوٰئے کے ذریعہ اسلام نے صرف دائن و مدیون یعنی سوسائٹی کے دو ممبروں کے ناگوار تعلقات قایم کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا بلکہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ داروں کی غاصبانہ چیرہ دستیوں کو مٹا دیا۔ موجودہ نظام تمدن جو تمامتر خود غرضی پر مبنی ہے درست کرنے کے لیے اسلام نے اپنے احکام کے ذریعہ صحیح راستہ بتلا دیا۔ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ خود غرضی تو فطرۃً جذبات انسانی کی محرک ہے اور جس طرح کہ فلسفی مل نے کہا ہے۔ کہ "اگر کوئی شخص اپنی پندار میں نہایت نیک کام کرتا ہے وہ بھی دراصل خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے" اگر کوئی شخص کسی پر رحم کرتا ہے تو اس میں بھی خود غرضی کا شائبہ ضرور ہے کیونکہ کسی دوسرے کو مصیبت میں دیکھ کر انسان خود دل گرفتہ اور آزردہ خاطر ہوتا ہے اس لیے وہ اُس پر رحم کرتا ہے۔ یعنی جذبات عالیہ بھی تمامتر خود غرضی پر مبنی ہیں۔ لیکن ہم کو اس فلسفیانہ بحث سے سروکار نہیں۔ ہر معقول انسان کے نزدیک (یقیناً فلسفی بھی جن میں داخل ہیں) خود غرضانہ حرکات اسی حد تک جائز ہیں جب تک کہ اس شخص تو دغرض سے اجتماعی مفاد کو نقصان کا اندیشہ نہو غرضکہ اگر اقوام یورپ اپنی موجودہ معاشی پیچیدگیوں کو رفع کرنا چاہتی ہیں تو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ان کے پاس نہیں کہ وہ بھی اسلامی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ ان اصول پر ایک حد تک جمہوریہ روس میں حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے لیکن یہ لوگ بھی کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ مثلاً قانون میراث کو اُنھوں نے یکسر اڑا دیا ہے تاہم امید ہے کہ عنقریب جب مدنی زندگی اور ہیئت اجتماعیہ کے معاملات زندگی کا ان لوگوں کو تجربہ ہوگا تو آہستہ آہستہ درمیانی راستہ پر آجائیںگے۔

یوسف حسین خاں

شذرات

عالم اسلامی کا موجودہ اضطراب حیات ملی کی کشمکش تمام دنیا کے مسلمانوں کی توجہ کی محتاج تھی اسی لیے دور و نزدیک متعدد تحریکیں جداگانہ ناموں اور مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئیں۔ جنگ بلقان و جنگ یورپ کے بعد ترکی، عرب، و ترکستان و دیگر اقطاع عالم کے مسلمانوں نے اس قدر ضرور محسوس کرلیا کہ ملت اسلامی کی بقا جمعیت و شیرازہ بندی سے ہی ممکن ہے اور ایسے وقت میں جبکہ تمام عالم اپنی ہوسناکیوں اور حرص و آز کا آماجگاہ اسلامی ممالک کو بنائے ہوئے ہے اس مسئلہ کی اہمیت اور فوری ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن گزشتہ عالمگیر جنگ کے انتشار و اضطرار میں کسی عملی کام کی گنجائش درکنار اس طرف پوری توجہ کا بھی موقع نہ تھا لیکن اب وہ وقت گزر چکا ہے اور ہر ملک اپنی استطاعت اور ہر فرد اپنی بصیرت کے موافق اس مقصد عظیم کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کی نگرانی میں "الجامعہ" کا اجرا ایک مبارک فال ہے اور مسلمانان ہند کی سیاسی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے "الجامعہ" کو آج سے پہلے جاری ہو جانا چاہیے تھا مولانا نے اس رسالہ کو عربی زبان میں شائع کیا ہے جو بلا شبہ تمام ممالک اسلامی کی زبان ہے اور چونکہ ایک حصہ زبان فارسی کا بھی رکھا گیا ہے اس لیے تمام اسلامی ممالک میں اس رسالہ کا پڑھا اور سمجھا جانا یقینی ہے۔

"الجامعہ" کے مقاصد میں مندرجہ ذیل امور کا بھی ذکر کیا گیا ہے:۔

(۱) تمام ممالک اسلامیہ و شرقیہ اور بالخصوص ہندوستان و ممالک اسلام و عرب میں باہمی تعلقات پیدا کرنا اور ایک دوسرے ملک کے واقعات و حالات پر روشنی ڈالنا۔

(۲) اس وقت کہ تمام دنیا انقلابات و تغیرات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور ہر ملک میں جدید اصلاحات و گزشتہ نقائص کے دور کرنے کی فکر کی جا رہی ہے اس امر کی کوشش کرنا کہ ان

تمام مساعی کو باہم گر ایک رشتہ میں منسلک کر دیا جائے اور اس میں یکجہتی پیدا کی جائے۔

گزشتہ عالمگیر جنگ اپنے عظیم الشان نتائج ہلاکت و تباہی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے کتنی ہی سلطنتیں صفحۂ ہستی سے محو ہو گئیں، تاجدار بے خانماں، ممالک معدوم، اور اقوام و ملل حرفِ باطل کی طرح مٹ گئے۔ اتلافِ جان و نقصانِ مال کا اندازہ لگانا تو غالباً آج بھی ناممکن ہے لیکن سب سے بڑھ کر جو انقلاب ہوا ہے وہ خیالات و روایات کی تبدیلی ہے جس نے آج ملکوں کے نام، قوموں کی حیثیت، سلطنتوں کے نظام، اور دنیا کی اکثر مسلمہ اصولوں کو اس طرح بدل دیا گویا اُن کا وجود ہی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو مٹ جانے ہی کے لیے!

ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ بعض طاقتور سلطنتیں اور سرمایہ دار قومیں آج بالکل مفلوک الحال ہیں اور عام فلاکت و نکبت تو تقریباً یورپ کے ہر ملک پر چھائی ہوئی ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس عام بربادی و مالی مشکلات کا اگر سب سے کم کسی سلطنت پر اثر پڑا ہے تو وہ سلطنت ترکی ہے!

اگرچہ سلطنت ترکی کے پاس مال و متاع نہ تھا، اُس کے ذخائر و سائل دولت زمین میں دفن تھے اُس کے یہاں مالیات کے نبض شناس اور صنعت و حرفت کے ماہر نہ تھے لیکن آج اُس کا سکہ دنیا کے بازار میں تقریباً وہی قیمت رکھتا ہے جو جنگ سے قبل تھی اور زمانہ جنگ کے طویل اندوہناک عرصہ میں اُس نے صرف ۱۶ کرور پونڈ کا کاغذی سکہ اپنی سلطنت میں جاری کیا تھا، جو ایسے ملک کے لیے جس کے خزائن دولت بیشمار ہوں اور خام پیداوار کی فراوانی ضرب المثل ہو کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی

اگرچہ دنیا عرصہ سے امن و امان کی محتاج ہے لیکن گزشتہ چند سال کی خونریزی نے عام اضطراب و بےچینی پیدا کر دی ہے جس کا لازمی نتیجہ امن و عافیت کی طلب، اور سکون و راحت کی تلاش ہے۔ لیکن عرصہ تک زمانہ کی رفتار اس قسم کی ہر کوشش کو مظلوم کی آواز کی طرح باقی

ہی اور اپنی ہولناک سفاکیوں کے لیے نت نئے طرز ستم ایجاد کر رہی ہے۔ مگر ایسا وقت بھی آتا
ہے جب "ورنہ ستانی بہ ستم می رسد" کا دست غضب ان ظالمانہ کوششوں کا انسداد
کرنے کے لیے بڑھتا ہے اور دنیا محو حیرت رہ جاتی ہے کہ جرمنی و آسٹریا جو جنگ و جدال، قتل و
غارت، اور ہلاکت و بربادی کے مرادف سمجھے جاتے تھے آج جنگ کے خیال سے بھی متنفر
ہو رہے ہیں کہ جرمنی میں باوجود ہزارہا اختلافات باہمی و مناقشات اندرونی کے اس ایک امر میں سب
متفق ہیں کہ آیندہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن جنگ نہ ہو، چنانچہ فرانس کے خلاف مکمل ستیاگرہ اس کی
روشن مثال ہے۔ آسٹریا اپنے حلیفوں سے ایک منزل اور آگے ہے اور اگر تازہ اطلاعات صحیح
ہیں تو اس نے اپنے ملک سے فوجی قوت کو بالکل ختم کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر
آج تمام عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ سال رواں کے بجٹ میں جس قدر رقم فوجی اخراجات
کے لیے رکھی گئی تھی وہ سب نامنظور کر دی گئی اور اس کی بجائے کسی قدر پولیس میں اضافہ
کر دیا گیا ہے اور یہ کوشش ہے کہ اندرونی انتظامات بالکل پولیس ہی کے ہاتھ میں ہوں اور چونکہ
بیرونی قوت جنگ کا تصور بھی نہیں لہذا فوج کی مطلق ضرورت نہیں۔

مختلف حصص ملک میں بعض اندوہگیں واقعات اور بالخصوص صوبہ پنجاب کے تازہ فسادات
اتحادی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے موت کا حکم رکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں
ہر شخص یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی وہ ہندو مسلم اتحاد ایک فرضی و مصنوعی
چیز تھی جو محض سیاسی مصلحتوں اور ملکی ضروریات کے لیے ایک وقت خاص کے لیے وضع
کی گئی تھی یا در حقیقت وہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کا وجود ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری ہے؟
اس بحث کے مختلف پہلو ہیں اور ان کی تشریح و توضیح اور رد و قدح کے لیے اخبارات
کے صفحات ہی زیادہ موزوں ہیں لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندوستان کی
مختلف قوموں میں اتحاد باہمی اور مقاصد سیاسی میں یکجہتی ملک کی فلاح کے لیے لازمی اور

ضروری ہی، صرف اس قدر عرض کریں گے کہ اگر اکابرین قوم اختلافات باہمی پر پردہ ڈالنے کے بجائے اُن کو وضاحت سے بیان کرکے جرأت ودلیری کے ساتھ اتحاد عمل کے صحیح معنے سمجھانے کی کوشش کرتے اور لفظ "اتحاد" کو الف لیلہ کا "سیسم" یا اسم اعظم ہوجانے سے بچاتے تو غالباً یہ صورت نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غفلت اخبارات کی طرف سے کی گئی جن کی نامناسب وقابل اعتراض تحریروں نے باہمی منافرت وجماعتی اختلافات ومذہبی جذبات کو اس طرح برانگیختہ کردیا کہ اب صورت اصلاح نظر نہیں آتی۔

عرصہ سے ملک میں باثر وقابل وقعت اخبارات کی کمی ہی اور گزشتہ دو سال کے انقلاب انگیز زمانہ میں اگر "ینگ انڈیا" کی رہنمائی معاون نہ ہوتی تو غالباً یہ یا اسی قسم کا کوئی دوسرا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ آج جبکہ مصیبت کا وقت نظر آرہا ہی ایک باوقعت وباثر اخبار کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی ہی اور غالباً محض انگریزی اخبارات کو موجودہ ضروریات کے لیے کافی خیال کرلینا صحیح نہیں ہی۔

جناب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ کو حضرت عبدالعزیز چاوشں کا ایک مکتوب بزبان عربی موصول ہوا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ حکومت ملیہ انگورہ نے ایک محکمہ بنام "امور شرعیہ واوقاف وکالتی تدقیقات وتالیفات اسلامیہ ہئت علمیہ سی" قائم کیا ہی جس کے روح رواں علامہ موصوف ہیں۔ اور ان کی خواہش ہی کہ یہ ادارہ دنیاے اسلام کے علوم وفنون ومساعی علمیہ ادبیہ کا مرکز قرار پائے۔ چنانچہ اکثر اسلامی مدارس کو اُنھوں نے اتحاد عمل کی دعوت دی ہی۔ امید ہی کہ اشاعت آیندہ میں ہم اصل تحریر مع ترجمہ شائع کرسکیں گے۔

جلد ۱ شوال المعظم ۱۳۴۱ھ مطابق مئی ۱۹۲۳ء نمبر ۵

ایسٹر کا خواب

(مسٹر ولیم شوانز نے خاص "جامعہ" کے لیے مرحمت فرمایا)

یاایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (قرآن)

بہار کی پیاری جانفزا نظر نے ندیوں اور چشموں کو، جنھیں برف نے جکڑ رکھا تھا، رہا کر دیا ہے؛

وادیوں میں امید کی مسرت سرسبز ہو رہی ہے؛

دشمن جاڑے نے ضعف کے سبب پسپا ہو کر ناہموار پہاڑیوں میں پناہ لی ہے؛

اور بھاگتے بھاگتے وہاں سے بھی میدانوں کے سبز پوش سطح پر برف کے چھوٹے چھوٹے دانوں کی بوچھار کر رہا ہے؛

میں گاؤں کی چہل پہل کی آواز سن رہا ہوں

یہی ہے غریبوں کا سچا آسمان
ہر چھوٹا بڑا خوشی کے نعرے بلند کر رہا ہے
یہاں میں انسان ہوں
اور یہیں میں انسان ہو سکتا ہوں

(گیئٹے : فاؤسٹ)

بدنفس، بدخصال انسان مردود اور ہلاک ہوگا۔
بھیڑیے اور بھیڑیں ساتھ ساتھ رہینگی۔

(انجیل مقدس)

صفحۂ عالم پر وہ تنہا قوم جس کا تعلق اُس جنگ سے نہیں تھا جو مغرب، مشرق، اور جنوب کے ملکوں نے حد سے زیادہ ذہنی اور اقتصادی ترقی کرنے والے جرمنی سے چھیڑی تھی؛ وہ تنہا قوم جس کے دامن پر اس محاربۂ باطل کی خونریزی، طمع اور نفرت کا دھبہ نہیں ہے وہ قطب شمالی کے ایسکیمو Eskimos ہیں۔ اسی لیے میرے خواب کے دیوتا نے پانچوں برِاعظم کے ممالک کے قائدین کو گاڈ ھاب میں، جو جنوبی گرین لینڈ کے مغربی ساحل پر ایک پُرامن بستی ہے Good Friday منانے کے لیے ایک مجلس میں مدعو کیا۔ دراصل پہلے شمالی گرین لینڈ میں مقام کرسٹن ھاب Christenhaab دائمی امن کے مسکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا لیکن یہودی اور مسلمان نام پر معترض ہوئے وہ چاہتے تھے کہ سب لوگ محبت، عقیدت، اور امید کے مساوی حقوق کے ساتھ آئیں اور یہ صرف گاڈھاب، "خدا کے بندرگاہ" میں ممکن تھا۔

صرف خواب میں، جو زمان و مکاں کے ماوراء اپنی اُڑان اُڑتا ہے، بھیڑیے اور بھیڑیں شیر اور ہرن، عقاب اور کبوتر، امن و امان کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھ سکتے ہیں۔ اس لیے

یہ قابلِ یقین ہی کہ میرے گرین لینڈ والے مستقبل کے معبد میں ولیم ثانی اور وڈرو ولسن کو نو اور پوان کارے، لینن اور لائڈ جارج، مسولینی اور ترائپل، بنیش اور کمال پاشا، سنیاٹسین اور یاما گاٹا، ھیوز اور ٹویانر، بوتھا اور گاندھی سب جمع تھے ۔ اسی لیے یہ بھی باور کیا جا سکتا ہی کہ یہ لوگ پیرس، ورسیلز، کینس اور لوزان کی طرح حریفانہ پڑاؤ میں منافق دلوں اور زبانوں کے ساتھ ایک دوسرے کو حملہ، درندہ پن، اور فریب کے انداز سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان پشیمان لوگوں کی طرح جنھوں نے گمراہی اور شامت سے ایک دوسرے کو دکھ دیا ہی اور اس لیے اب اسی قدر گرمجوشی کے مصافحے سے بخاموشی یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو کچھ گزر چکا ہی وہ اب حقیقت میں فراموش کر دیا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے امن الٰہی کا دور دورہ رہے گا، دلوں کے آسمان پر اور ذہن کی دنیا میں ۔

تھمسٹاکلیس پوان کارے اپنے سیدھے ہاتھ سے دل تھامے اور سفید بالوں والا سر سینہ پر جھکائے اُٹھتا ہی اور سلسلہ کلام یوں شروع کرتا ہی:۔

"بھائیو! جب میں نے اپنے پیارے وطن کی عظمت اور اقتدار کی خاطر انگلستان کے ایڈورڈ اور روس کے نکولا کے ساتھ مل کر مجبور اور اسلحہ کے بوجھ میں دبے ہوئے جرمنی کے خلاف ذلت اور بربادی کی جنگ چھیڑی اُس وقت میں گمراہی میں مبتلا تھا۔ اے عوض نولو اے ہابس برگ والو، اے ھیسن والو، اے کوبرگ والو، میری خطا معاف کرو اور پیارے خدا کے سامنے میری سفارش کر کے میری مدد کرو تاکہ لاکھوں بیگناہ مقتولوں کا خون تا ابد میری آنکھوں سے نہ ٹپکے!"

شکستہ حال ولیم جو اپنے گناہوں کے کفارہ میں جرمنی راہبوں کے کپڑے پہنے اور ڈاڑھی بڑھائے تھا، رقت آمیز لہجہ میں جواب دینے کھڑا ہوا:۔

"پیارے ہمسایہ اور دوست! یہی التجا میں تجھ سے اور سب خدا کے بندوں سے کرتا ہوں ہم سب کے سب گمراہ تھے۔ ہم سب اندھے ہو گئے تھے۔ میں نے بھی بارہا تلوار اٹھائی ہی لیکن

یقین جانو میں نے جو کچھ بھی کیا خوف سے کیا۔ مجھے ڈر تھا۔ اپنے تاج کے لیے۔ لیکن میرے ضمیر پر اس سے بھی بدتر گناہ کا بوجھ ہے۔ میں نے اپنے جرمن بھائی کو جو مزدور کے لباس میں تھا "بیوقوف" اور "کمبخت"، کہا۔ تم جانتے ہو کہ ناصرہ کے خدا آسا باشندے نے ایسے روحانی قتل کے لیے کیسی خوفناک سزا مقرر کی ہے۔"

اس کے بعد لائڈ جارج جس نے ایک زمانہ میں زرعی زمین کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اوٹھا:

"عیسائی بھائیو! تم دونوں سچ کہتے ہو۔ زمین پر صرف اسی وقت سچا امن ہو سکتا ہے جبکہ ہم سب بلا کچھ چھپائے ہوئے پشیمانی کے انداز میں اپنے سب گناہوں کا اعتراف کریں۔ لیکن پیارے نکیس اور غریب ولیم! تمہارے گناہوں کی کیا حقیقت ہے میری ذلیل حرکات اور ریاکاری کے سامنے۔ جب میں جرمنی پر سارقانہ فتح پانے کے بعد انگریز قوم کے گرجا میں جاکر نماز شکر ادا کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اس وقت میرا دل اپنے دریائے اسپرے Spree کے کنارے رہنے والے عزیزوں کے خلاف نفرت سے لبریز تھا۔ خدا میرے اس انگریزی جھوٹ کو معاف کرے۔"

ووڈرو ولسن اس انداز سے آگے بڑھا کہ اُس کے لباس سے استری کی صاف ستھری شکنیں مل دل کر مٹ گئی تھیں اور کلاہ میرزائی کی جگہ ایک کانٹوں کا تاج اس کے ہاتھ میں تھا:

"جرمنو۔ رومانو۔ سلافو۔ منگولو۔ انسانو۔ بھائیو! کیا میں تم سب میں ذلیل ترین فرد نہ تھا جبکہ میں نے تقدس مآب معصوم شکل بنائے ہوئے مسافر جہازوں پر آلات قتل بار کرا کے اپنے ان دینی بھائیوں کے خلاف استعمال ہونے کے لیے بھیجے جنھیں لوگوں نے مجھ سے جدا کر دیا تھا۔ جبکہ میں نے صلح کے وقت اس المناک ڈراما کو ایک شیطانی کامیڈی بنا دیا۔ کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس دن سے آجتک کیوں جنون میرا پیچھا کر رہا ہے اور کیوں میرا جسم زار و نزار ہو گیا ہے۔"

لینن روسی چغہ پہنے اور کمر رستی سے باندھے، پیر میں کھڑاؤں ننگے سر اوٹھا۔

"اے خدا کے غریب بے مایہ لوگو (Proleteriat) ! اپنی مقدس املاک کی جو تمھیں اب خدا خدا کرکے ملی ہیں حفاظت کرو اور ہم لوگوں سے جو صدیوں سے پیسے اور روندے جارہے ہیں مل کر سب سے خوفناک دشمن کا مقابلہ کرو، جو خود ہمارے سینہ کے اندر ہی اور ہر پسندیدہ اور نیک جذبہ کو دبانا چاہتا ہے۔ آؤ ہم سب رشک، حسد، نفرت اور بدباطنی، تمام جہنمی اور شیطانی قوتوں کے خلاف آخری لڑائی، آخری جہاد کا اعلان کریں۔ میرے ضمیر پر بھی اتنا بوجھ ہے جو ایک معمولی آدمی کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتا۔ مجھے یہ بوجھ سر سے اتارنا اور خطاؤں کی تلافی کرنا ہے۔ ہم جہنم پر ضرور فتح پائیں گے اگر محبت ہمارا قول اور محبت ہی ہمارا فعل بن جائے!"

ان الفاظ کو سن کر مشرق بعید کے ایشیائی اُس چھوٹے سے جھونپڑے کے وسط میں آکھڑے ہوئے اور ان کے ہندی رہنما گاندھی نے جن کے متین چہرے پر اب تک قید فرنگ کا رنگ جھلک رہا تھا دعا کے انداز میں کہنا شروع کیا:۔

"اے پرماتما! ہم سب کو بخش دے کہ ہم جو کچھ کرتے تھے اسے سمجھتے نہ تھے۔ لیکن آج سے اے خالق برتر پرستش ہو تیرے نام کی۔ چین ملے رونے والی زمین کو اور مسرت نصیب ہو مصیبت زدہ انسانوں کو۔ آمین!"

سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک حلقہ بنالیا اور مشترک انسانی معبد کے اس پرانے گیت کو گانا شروع کیا:۔

بھائیو۔ اس حلقہ میں شامل ہونے کے لیے اپنے اپنے ہاتھ بڑھاؤ اس پیاری مقدس ساعت نے ہمیں عالم قدوس کے انوار سے روشناس کردیا ہے اپنی ارضی آلودگیوں کو پھینک دو۔

ہماری دوستی کی ہم آہنگیاں ہمیشہ حسن و خوبی سے باقی رہیں۔ آمین۔ آمین۔ آمین

آخری آمین، کے ساتھ ایک نگاہ کو خیرہ کردینے والی بجلی چمکی، جاڑے کے نیلے آسمان سے جس کے در پچے پٹ کھل گئے تھے۔ اب موسم بہار کے گیت اُس شمالی آزادی یافتہ زمین پر گائے جارہے تھے جو ابھی چند منٹ پہلے برف سے جکڑی ہوئی تھی ..... آسمان سے ایک ندا آئی:۔

"آج سے میری زمین انسانوں کے ہاتھوں خراب نہ ہوگی۔ یہ ویسی ہی مکمل ہوگی جیسی میری آسمانی سلطنت ہے۔ کیونکہ جیسے تیسے آج تم سب نے محبت کا اقرار کرلیا ہے۔ امن و چین تمہیں نصیب ہو اور ہمیشہ قائم رہے۔ تمہیں اپنے خالق کا 'ایسٹر' مبارک"
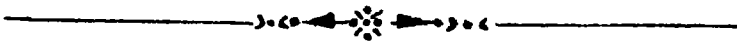
تاریخ اور اُس کا موضوع

ہر علم وفن کا ایک مخصوص موضوعِ سخن ہوتا ہے اور بحث کے لیے متعین حدود ہوتے ہیں جن سے آگے بڑھنا گویا دوسرے کی مملکت میں مداخلت بیجا کرنی ہے۔ مثلاً ریاضی صرف اعداد سے بحث کرتی ہے۔ نفسیات کا رُخِ سخن انسان کی دماغی و جذبی کیفیت سے ہوتا ہے۔ ریاضی کو نہ کیفیات قلبی و حسیات دماغی سے غرض ہے اور نہ نفسیات کو اعداد و شمار سے مطلب۔ لیکن ہمارے مورخین کے نزدیک تاریخ کے لیے کوئی متعین حدود نہیں۔ فلسفہ کے لفظ کی طرح تاریخ کا استعمال بھی ہر موقع و محل کے لیے ہونے لگا ہے اور چند قصے، افسانے اور واقعات گزشتہ کا جاننے والا بآسانی مورخ کا لقب پا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ان چند علوم میں سے ہے جسے انسان نے اپنے ساتھ لیکر دائرہ تہذیب میں قدم رکھا اور آج بھی دیگر علوم کی طرح اس کا درجہ کسی سے کم نہیں۔ سطور ذیل میں ہم اس پر بحث کریں گے کہ تاریخ کا مفہوم مختلف زمانوں اور مختلف اشخاص کے نزدیک اب تک کیا رہا ہے؟ اور درحقیقت اس کا صحیح موضوع کیا ہونا چاہیے؟

تاریخ اب تک کیا تھی؟

یوں تو انسان نے جب سے اپنی تمدنی زندگی شروع کی، تاریخ کا آغاز اسی کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن علمی حیثیت سے اس کا پتہ سب سے پہلے چھٹی صدی قبل مسیح میں یونانیوں کے ہاں ملتا ہے جو اس لفظ کو عام معنی میں علم کی تلاش و تفحص کے لیے بولتے تھے۔ اس سے ان کا مطلب واقعات گزشتہ یا کارنامہائے دیرینہ کا بیان کرنا نہ تھا بلکہ علمی تفتیش و تحقیق مقصود تھی۔ لیکن وہی صدی بعد جب یونان کا آفتاب علم اپنے نصف النہار پر پہونچا، یہ مفہوم

سے انسیکلوپیڈیا برٹینکا

اُلٹ گیا۔

"ارسطو کے بعد ہمارے ہاں (یونانیوں) اس لفظ کا استعمال متعین طور پر ادبی معلومات کے لیے ہونے لگا بجائے اس کے کہ تفتیش و تحقیق کے لیے ہو جو اس سے پیشتر تھا۔ ارسطو سے لیکر اب تک تاریخ ایک طرح کا لٹریچر یا ادب ہی ہے۔"

یونانیوں کے بعد جب یہ علم مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا تو اُنھوں نے اس میں معتدبہ اضافہ کیا اور بہت سی خصوصیات پیدا کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ تمام واقعات کو حدیث کی طرح بہ اسناد متصل لکھتے تھے جن سے واقعات کے صحیح ہونے اور غلو سے پاک ہونے میں بمشکل شبہ ہو سکتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ علامہ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کے ہاں چونکہ حدیث اور سیرت کا فن مذہب سے متعلق ہونے کی وجہ سے شروع ہی تھا، اس کے اثر سے تاریخ نے بھی ذکر واقعات و سوانح کا رنگ پکڑا۔ علاوہ اس کے عربوں میں انساب کا چرچا قبل اسلام سے اس قدر موجود تھا کہ انسان تو انسان اونٹ گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد رکھنا انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بھی مسلمانوں کے مروجہ تاریخی مفہوم پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

ہندوستان کو فلسفہ و الٰہیات سے بھلا اس قدر فرصت کہاں کہ تاریخ کی طرف کوئی خاص اعتنا کیا جاتا۔ آج جو قدیم تاریخی سرمایہ ملتا ہے وہ زیادہ تر راجاؤں مہاراجاؤں کے قصے کہانیاں ہیں، یا بعض سورماؤں کے کارنامے جن میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی قدیم مستند تاریخوں میں کوٹلیہ کی تصنیف بہت مشہور ہے اس میں اس عہد کے نظام حکومت اور خود راجہ کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ قدیم تاریخ کا زیادہ تر سرمایہ ابھی تک غیر مرتب اور اکتشاف کا محتاج ہے لیکن جو کچھ بھی موجود ہے اس میں فسانہ کا رنگ غالب ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی طرح یہاں روایات کے محفوظ

سلے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد صفحہ

رکھنے یا ان کے صحیح و غلط میں تمیز کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔

آج اس دَور حاضر میں یورپ جو تمام دنیا کا علمی حیثیت سے علمبردار بنا ہے اس کے ہاں تاریخ نہ تو روایت اور ذکر واقعات کا نام رہی اور نہ قصہ افسانہ کا بلکہ اس نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ واقعات و حالات کو مبالغہ سے پاک کر کے ان کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے بلکہ جو مورخ جس عہد یا قوم کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ان واقعات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اپنی رائے کی بجائے خود مصنف کے خیالات و عقائد کا پابند ہو جاتا ہے۔ تاریخ نے یہاں آ کر ایک اور صورت بھی اختیار کر لی ہے۔ کسی عہد یا ملک کی عام تاریخ لکھنے کے علاوہ ان کا خصوصی طور پر مطالعہ کرنا ہوتا ہے اور واقعات کی تفتیش و تحقیق، تاریخوں کی تعین و تخصیص، حالات کی تہذیب و ترتیب اس عہد کے اصلی ذرائع معلومات سے کی جاتی ہے۔ وہ ذرائع خواہ تحریر کی صورت میں ہوں یا چٹانوں، ستونوں اور سکوں کی تحریریں ہوں یا اور بھی کوئی قدیم آثار ہوں۔

جس طرح تاریخ کا مفہوم مختلف قوموں اور ملکوں میں مختلف رہا ہے، اسی طرح مختلف حکما اور اہل علم نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ دو ہزار برس قبل پالیبیس[۵] کا تاریخ کے متعلق یہ خیال تھا وہ کہتا ہے کہ

"ترقی کے صرف دو راستے ہیں، ایک اپنا ذاتی تجربہ۔ دوسرا طریقہ دوسروں کے تجربہ کے ذریعہ سے ان میں اول الذکر میں بہت سے مصائب خطرات کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور دوسرے میں، حالانکہ فوائد وہی حاصل ہوتے ہیں لیکن کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ ہر شخص کو ماننا چاہیے کہ تاریخ کا مطالعہ بہترین ذریعہ ہے زندگی کے تمام مراحل طے کرنے کا۔"

اس خیال کے بموجب تاریخ بڑے بڑے اشخاص کے سوانح زندگی کا نام ہے جو انسان کے سامنے درس عبرت پیش کرتے ہیں۔

۵؎ دوسری صدی قبل مسیح میں (۲۰۸ ق۔م سے ۱۲۰ ق۔م) یونان کا ایک بہت مشہور مورخ گزرا ہے۔ اس نے روما کی تاریخ ۴۰ جلدوں میں لکھی ہیں جن میں سے اب ابتدائی ۵ جلدیں ملتی ہیں۔

کارلایل نے تاریخ کا مفہوم یہ لیا ہی کہ

"ماضی کی خوب چھان بین کرو۔ یہ علم کا سرچشمہ ہی جس کے ذریعہ سے 'حال' اور 'استقبال' کا پتہ لگ سکتا ہی"[۱]

میکالے کے نزدیک اس کا جو مفہوم ہی، اسے خود اسی کے الفاظ میں سُنیے۔ وہ کہتا ہی کہ

"تاریخ[۲] اپنے منتہائے کمال پر شعر و فلسفہ کا ایک مجموعہ ہی"

میکالے چونکہ خود بھی بہت بڑا انشاپرداز تھا، اس نے اسی نقطۂ نظر سے تاریخ کو دیکھا اور شعر سے تعبیر کیا اور فلسفہ اس لیے کہا کہ تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی صحیح تصویر پیش کرتی ہی۔

غرض ان تمام مفہومات و معانی کے لحاظ سے جو مختلف قوموں اور زمانوں میں مروج تھے اور ان تمام تاویلات سے جو حکما اور مورخین نے کی ہیں، تاریخ شعر و فلسفہ، قصہ و افسانہ، اخلاق و نصائح، پند و موعظت، حکمت و سیاست اور تمام دیگر علوم و فنون کا دفتر بے پایاں بنجاتی ہی اور مورخ کی حیثیت کبھی ادیب و شاعر کی اور کبھی حکیم و فلسفی کی ہی تو کبھی اتالیق اور معلم اخلاق کی۔ اور اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا کہ تاریخ کا مفہوم اب تک ہر زمانہ اور ہر قوم میں کیا رہا ہی؟ اور ہر شخص نے اس کی کیا تاویل کی ہی؟

تاریخ کسی ایک مضمون کا نام نہیں

حقیقت یہ ہی کہ جب کوئی قوم شاہراہِ تمدن پر قدم رکھتی ہی تو اس کی معاشرت میں وہ ترقی تنوع نہیں ہوتا جو دنیا کی تہذیب یافتہ قوموں میں ہوتا ہی۔ مثال کے طور پر اس کی طرز بود و باش کو لو۔ ایک ہی کمرہ دن میں اگر نشستگاہ کا کام دیتا ہی تو شب میں خوابگاہ کا۔ کھانے کے وقت وہی دارالطعام ہو جاتا ہی تو دوسرے اوقات میں نوشت و خواند کا کام بھی

[۱] کارلایل کا مضمون "On History" نوشتہ ۱۸۳۰ء

[۲] میکالے کا مضمون Hallam's Constitutional History of England. نوشتہ ۱۸۲۸ء

اسی میں ہوتا ہے۔ برعکس اس کے وہی قوم جب تہذیب و تمدن سے آراستہ ہو جاتی ہے تو پھر اس کے کسی فرد کی جائے قیام کو دیکھو۔ جو نشستگاہ ہے وہ دار الطعام کا کام نہیں دیتا۔ خوابگاہ اور مطالعہ کا کمرہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ملاقات اور آرام کے جداگانہ حصے مخصوص ہیں یہی فرق ان کے کھانے میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ انواع و اقسام اور رنگ برنگ کے کھانے جو شباب تمدن میں نظر آتے ہیں، وہ اوایل تہذیب میں ان کے ایک نان و نمک کے اندر پنہاں ہوتے ہیں۔

بعینہ یہی علوم و فنون کا بھی حال ہے۔ جب قومیں میدان تہذیب میں قدم رکھتی ہیں، اس وقت تمام علمی مشاغل کسی ایک و مضامین میں محدود رہتے ہیں لیکن یہی نیم متمدن جماعت جب تہذیب کے اوج شباب پر پہنچتی ہے تو ہر طرف علوم و فنون کی شاخیں وقت اور ضرورت کے تقاضے سے اس طرح پھوٹ نکلتی ہیں جیسے ایک غنچہ کی پنکھڑیاں۔ یہ عرب کے بادیہ نشین قبائل ظہور اسلام سے قبل شاعری اور انساب کے سوا اور کیا جانتے تھے؟ لیکن چند صدیاں بھی نہ گزرنے پائی تھیں کہ فلسفہ، وہیئت، منطق، وکیمیا، ریاضی و طب، تاریخ و مذہب اور ان میں سے ہر ایک کی متعدد شاخوں کا مطالعہ ہر خاص و عام کرنے لگا۔

اب سے پیشتر تاریخ ایک بہت ہی وسیع مضمون سمجھا جاتا تھا اور انسان سے متعلق ہر قسم کا علم و فن اس میں شامل تھا۔ لیکن انسان کوئی بے حس، غیر متحرک شی کا نام نہیں یا مشین کا کوئی ایک پرزہ نہیں جو صرف ایک ہی کام کرے بلکہ انسان کھاتا پیتا ہے، ہاتھ پاؤں کی جنبش سے دولت پیدا کرتا ہے، تنہا نہیں بلکہ جماعت میں رہنے سہنے کا عادی ہے، صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہنی و دماغی قواء کو بھی کام میں لاتا ہے، ماسوا بندوں کے اس کا بحیثیت روحانی کسی اور ذات سے بھی تعلق ہے، غرض انسان کی ان مختلف حیثیتوں نے اس کے لیے مختلف شاہ راہ عمل تیار کر دیا ہے اور یہی حیثیتیں تہذیب و تمدن کے آنے پر چمک اٹھتی ہیں اور متعدد و مختلف علوم کی شکلوں میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ سترہویں صدی سے پیشتر علم المعیشت یا معاشیات کوئی علم نہ تھا

لیکن جب یورپ میں صنعتی انقلاب نے پیدائش دولت کی نئی نئی صورتیں پیدا کر دیں تو انسان کے اس شعبۂ زندگی نے ایک مخصوص نام اختیار کر لیا جو اکنامکس، پولیٹیکل اکانمی اور معاشیات کے نام سے وقتاً فوقتاً موسوم ہوتا رہا ہے۔

اسی طرح جب ایک بنی آدم کے لسانی اختلاف کی طرف توجہ ہوئی تو ایک ہی قوم کے مختلف زبانوں کی بولیوں میں فرق و تشابہ اور اسی طرح مختلف قوموں کی زبانوں میں اشتباہ و اختلاف سے علم اللسان کی بنیاد پڑی۔ پھر اسی انسان پر جب بہ اعتبار نسل و خون غور و فکر کیا جانے لگا اور مختلف ممالک کے باشندوں میں کچھ مشابہت و کچھ مخالفت بہ لحاظ رنگ و روپ نظر آئی تو اس سے علم الانسان Ethnology پیدا ہوا، وقس علے ہذا اسی طرح پہلے نہ صرف انسان سے متعلق تمام علوم و فنون تاریخ میں شامل سمجھے جاتے تھے بلکہ دنیا کی ہر شی کے متعلق چھوٹے بڑے تمام واقعات داخل تھے۔ "فلسفۂ تغیر" نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کوئی شی ایک حالت پر قائم نہیں۔ آج جس جگہ ایک وسیع دریا موجیں مار رہا ہے، عناصر کی باہم کشمکش سے کیا عجب کہ کل وہی خطہ ایک یکسان بے آب بن جائے۔ انسانی مصنوعات میں بھی، ع۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت، کی بنا پر ہر چیز میں روزانہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر تدریجی تغیرات کے بیان کا نام تاریخ ہے، تو ہر چیز اپنی تاریخ رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ خود تاریخ کی بھی تاریخ ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ تمدن کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں تنوع و تعدد ہوتا ہے، آج ہر علم و فن انسان کے ہر شعبۂ زندگی اور ہر شی کی مکمل و مرتب تاریخ جدا جدا موجود ہے۔ معاشیات کی تاریخ عالم معاشیات سے پوچھو، ادب شاعری کی تاریخ صرف اس زبان کا ادیب شاعر ہی بہتر بتا سکتا ہے۔ زمین کے تدریجی تغیرات کا حال ماہر علم الارض (جیالوجی) کے ہاں ملے گا۔

غرض اس ترقی و تعدد کی بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل بجا ہے کہ اس انبارِ علم و فن سے جس کا نام اب تک تاریخ چلا آتا ہے، اسی طرح تمام علوم و فنون ایک ایک کر کے علیحدہ ہو جائیں گے اور مخصوص

لہ پائونیر کے آج کی دو اشاعتوں میں رومال و بوسہ تک کی تاریخ شائع ہوئی!

صورتیں اختیار کرلیں گے جن کے اپنے اپنے خاص نام اور پھر تاریخ کے نام سے کوئی علم باقی نہ رہیگا۔

تاریخ کا موضوع ریاست و حکومت ہی

لیکن باوجود اس کے کہ تاریخ علوم و فنون کا ایک معجون مرکب ہی ہی، پھر بھی اُسے ایک نہ ایک شاخ علم سے نسبتاً زیادہ تعلق رہا ہی۔ اور اس کے ان تمام مفہوم و معانی میں ایک شی قدرِ مشترک بھی اور وہ سیاست ہی۔ پُرانے قصے کہانیوں کو لو (جو تاریخ ہی کی ایک صورت ہی) اس کی ابتدا، "ایک بڑے راجہ" کے فقرہ سے ہوگی۔ ہندوستان کی قدیم کتابوں مثلاً رامائن اور مہابھارت کو دیکھو، اول الذکر میں راجہ دسرتھ کے دربار کا حال اور ولیعہد تخت رام چندرجی کا المناک قصہ جلاوطنی مذکور ہی۔ موخر الذکر کوروؤں اور پانڈوں میں ایک عظیم جنگ کی داستانِ خونیں پیش کرتی ہی۔ قدیم تاریخ کے لیے کوٹلیہ کی تصنیف سب سے مستند سمجھی جاتی ہی لیکن اس میں بھی خود راجہ کے نظام اوقات، دارالسلطنت پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ) کے تفصیلی حالات، افواج کی اقسام و تعداد اور حکومت کے دوسرے شعبوں کا بیان غالب نظر آرہا ہی۔ بعد کی تصانیف میں ساتویں صدی عیسوی کی ہرش چرت بہت مشہور ہی۔ اس میں جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہی ہرش راجہ کے حالات سے زیادہ بحث کی گئی ہی۔

تاریخ اسلام کو لو۔ اس کی ابتدائی تصانیف میں کتاب الفتوح الکبیر، کتاب المغازی، کتاب امراء البصرہ کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ان کا باطن ان کے ظاہر سے دیکھو کہ فتح و نصرت، جنگ و جدل کے واقعات اور ارکان و اعیانِ سلطنت کے حالات درج ہیں۔ بیہقی و طبری کی مجلدات بھی خلافت و حکومت، افواج کی نقل و حرکت و توسیع مملکت کے حالات سے پُر ہیں۔ یہاں آکر سلاطین ہند کے عہد حکومت میں جو تاریخی کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے کچھ تو خود ان سلاطین کے خود نوشتہ تزک و تذکرے تھے مثلاً تزک بابر، تزک جہانگیر اور کچھ درباری مورخین و مصنفین کے قلم سے بعض جو عموماً سلاطین کے نام سے موسوم ہوتی تھیں مثلاً تاریخ فیروز شاہی

طبقات ناصری اکبر نامہ وغیرہ۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں جبکہ یونان کے علم و تہذیب کا عالم شباب تھا، اُس وقت بھی یہی چیزیں تاریخ کا سرمایہ تھیں تھوسیڈائڈس[۱] نے جس عہد کے حالات لکھے ہیں اس میں سب سے زیادہ مشہور و معروف واقعات کچھ ہوسکتے ہیں تو وہ سقراط (پیدائش ۴۶۹ء ق م) کا حکمت و فلسفہ یا فیڈیاس[۲] کی سنگتراشی لیکن مصنف مذکور نے ان میں سے کسی ایک کا ذکر نہیں کیا، ملکی و جنگ و جدل کی داستانیں اور دوسرے سیاسی واقعات نہایت زور و شور سے بیان کرتا ہے۔

یہ امر کہ تاریخ کا موضوع بحث ریاست و حکومت ہے اور وہ صرف سیاسیات سے بحث کرتی ہے خود تاریخی واقعات سے روشن ہے۔ دنیا میں کتنی ہی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں جو آگے چلکر تاریخ کا سرمایہ بنتی ہیں، لیکن اس وقت تک وہ کسی شمار میں نہیں ہوتیں جب تک ان کا اثر وہاں کی سیاسیات پر نہ ہو یا بہ الفاظ دیگر وہ خود اس عہد کی سیاسیات نہ بنجائیں پندرہویں صدی کے آخر میں گرو نانک جی پیدا ہوتے ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے چیلوں کی معقول تعداد سکھوں کے نام سے موسوم ہوتی ہے لیکن اس طرف کوئی توجہ بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ ۱۶۰۶ء میں جب ان کا روحانی پیشوا قتل کیا جاتا ہے اور وہ سلطنت مغلیہ سے ٹکراتے ہیں تو اس کے بعد سے ہر شخص چونک پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب ان کی جماعت مذہبی حیثیت سے منظم فوجی صورت اختیار کرلیتی ہے اور گزشتہ صدی کے وسط میں جب برٹش گورنمنٹ سے تصادم ہوتا ہے اس وقت انگریز مورخین بھی ان کے آغاز وجود اور حالات سے، گو مختصراً ہی

[۱] پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کا بہت مشہور مورخ گزرا ہے۔ سیماں کی وفات کے بعد وہ امرائی سلطنت کی جماعت کا لیڈر رہا۔ ۴۲۳ء ق م۔ میں وہ جلاوطن کردیا گیا۔

[۲] پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک بہت بڑا سنگ تراش اور نقاش ہوا ہے۔ حکومت کی طرف سے وہ اس فن کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا تھا۔

سی بحث کرتے ہیں۔ اب بھی جس قدر سکھ یہاں کی سیاسیات پر اپنا اثر ڈالیں گے اسی قدر روز بروز نمایاں ہوتے جائیں گے۔

اسی طرح یورپ میں کرل مارکس انیسویں صدی میں اپنے معاشی نظریہ اور نظام اشتراکی کی تبلیغ شروع کرتا ہے اور ایک عرصہ تک اس کی تمامتر تعلیم و تبلیغ غریب مزدوروں تک محدود رہتی ہے لیکن ۱۸۴۳ء میں فرانس کے تغیرات سیاسی سے متاثر ہو کر جرمنی بھی علم بغاوت بلند کرتا ہے، اس وقت اس کی تعلیمات و خیالات کا حکومت سے تصادم ہوتا ہے اور اسکی تحریک خطرناک خیال کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی جرم میں وہ گرفتار بھی کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ فرانس میں آتا ہے تو یہاں بھی اس کی تحریک سرمایہ دار حکومت کے خلاف آن پڑتی ہے اور وہ جلاوطن کیا جاتا ہے۔ یہی تحریک آیندہ چلکر اپنے عہد کے سیاسیات کی مرادف بنجاتی ہے اور ایک کثیر تاریخی مواد فراہم کرتی ہے۔ اسی کے بالمقابل ان تحریکوں کو بھی دیکھو جو حکومت و سیاست سے بے تعلق رہیں اور انجام کار ان کا نام و نشان بھی مٹ گیا ہندوستان میں برہمو سماج تحریک کو چند افراد کے سوا کون جانتا ہے؟

یہی حال بعینہ اشخاص کا بھی ہے۔ دو آدمی ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے کم اہمیت نہیں رکھتے لیکن تاریخ کے نزدیک جو حیثیت ایک سیاسی شخص کی ہوتی ہے، وہ غیر سیاسی کی نہیں غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۴ء) اور محمد تغلق (۱۳۲۴ء سے ۱۳۵۱ء) کے ناموں سے آج بچہ بچہ واقف ہے اور ہندوستان کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کو چھوڑ کر مکمل نہیں ہو سکتی لیکن اسی تغلق آباد (دہلی) میں ایک ذات سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کی بھی گزری ہے جن کی حکومت جسمانی نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے قلوب پر تھی لیکن تاریخ میں آپ کا ذکر تک نہیں آتا اور کتنے ہیں جو آپ کے نام کے علاوہ حالات و واقعات سے بھی واقف ہیں۔

انگلستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھو، ایک مورخ جب سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی

کے حالات لکھیگا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ جو وقعت وہ سر رابرٹ والپول[51] کو دے گا، وہی سر آئزک نیوٹن کو بھی ملے گی؟ جس شرح و بسط کے ساتھ وہ اول الذکر کے حالات، اس کے اقتدار و اثر کے اسباب، قانون مسکرات، اور اس کی صلح پسند پالیسی سے بحث کرے گا، کیا اسی تفصیل سے نیوٹن کے سوانح زندگی، اس کے کارنامے، اس کے قانون کشش اجسام، اس کی لاطینی تصنیف پرنسی پیا پر بھی روشنی ڈالے گا؟ آخر اس کا کیا سبب ہے؟ صرف یہی کہ شاہان تغلق اور والپول ریاست و حکومت سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت سلطان المشائخ اور نیوٹن کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے وہ تاریخ میں ان سیاسی اشخاص کے برابر جگہ نہ پا سکے۔ آیندہ جبکہ تاریخ کا موضوع اور متعین و متعارف ہو جائے گا تو غیر سیاسی حالات و اشخاص اس دائرہ سے بالکل خارج ہو جائیں گے۔

کیمرج یونیورسٹی میں سیاسیات پر لیکچر دیتے ہوئے جب سیلے نے اپنا یہ خیال پیش کیا "سیاسیات پر لیکچر دینا تاریخ پر لیکچر دینا ہے" تو اس کے سب سے بڑے مخالف مسٹر بیرل تھے وہ کہتے ہیں کہ :-

"طبائع انسانی دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے پڑھنے میں قدرتاً دلچسپی رکھتے ہیں اور ہمیشہ رکھیں گے۔ اس لیے تاریخ کا فن کبھی مردہ نہیں ہو سکتا"

آج بھی کم و بیش شاید یہی اعتراض پیش کیا جائے کہ تاریخ صرف بڑے بڑے واقعات اور اہم حوادث کا نام ہے، خواہ جو ابر دیا و سے تعلق رکھتے ہوں یا کوہ و دریا سے۔ اور ان واقعات و حوادث کے اسباب و نتائج سے کوئی بحث نہ ہو، یا اس اصول سے جس کی بنا پر

[51] بہت بڑا ماہر با لیاقت تھا۔ جارج اول (۱۷۲۱ء سے ۱۷۴۲ء) کے عہد حکومت میں وہ وزیر اعظم رہا اور اکیس برس تک انگلستان کی عنان حکومت عملاً اسی کے ہاتھ میں تھی۔

[52] کیمرج میں پروفیسر تھا، ۲۴ برس تک رایل سوسائٹی کا صدر رہا۔ "قانون کشش اجسام" کی ایجاد کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کی مشہور تصنیف پرنسی پیا لاطینی زبان میں ہے۔

[53] و [54]

وہ ظہور پذیر ہوئے کوئی غرض نہ ہو تو اس صورت میں تاریخ کی حیثیت گورنمنٹ گزٹ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں رہتی، جو خشک واقعات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ نیز ان واقعات کی فراہمی و نگہداشت میں حکومت جو کوشش کرتی ہے، وہ مورخین کی ذمہ داری کو ہلکا کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایک دوسرا شائبہ اس خیال میں اور یہ پایا جاتا ہے کہ طبایع انسانی کی دلچسپی، تاریخ میں اگر یہ غرض ملحوظ ہے تو فسانہ و قصص کا مطالعہ دلچسپی کے لیے کافی ہے اور اگر اس پر بھی واقعات کی عظمت و شوکت منظور ہے تو ہمارے نزدیک طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کا نام لینا نامناسب نہ ہوگا۔ غرض اس تاریخ کے لیے یہی دو چیزیں ضروری تھیں، تو موجودہ مفہوم کے لحاظ سے یہ فن کبھی کا مردہ ہو چکا ہوتا۔

ابتدائے مضمون میں ہم نے تاریخ کے مختلف معانی و مفہوم سے بحث کی پھر اس کے بعد اس علم کی تدریجی ترقی دکھائی کہ آئندہ کس طرح سے تمام علوم اس انبار علم سے ایک ایک کرکے نکل جائیں گے اور ہر ایک اپنی اپنی مناسبت سے مخصوص اور مناسب نام اختیار کرے گا، لازمی طور پر سے اجاڑے گا لیکن انھیں تاریخی ذخیروں سے ہم نے یہ بھی بتایا کہ پہلے بھی کسی نہ کسی قدر اس کا تعلق ایک شعبہ زندگی یعنی 'ریاست و حکومت' سے رہا ہے اور پھر متعدد تاریخی مثالوں سے یہ ثابت کیا کہ آئندہ بھی اس کا موضوع یہی 'ریاست و حکومت' ہوگا اور تاریخ سیاسیات سے بحث کریگی۔ تاریخ کا یہ موضوع قرار دینے میں ایک سب سے بڑا الزام جو عاید ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کا دائرہ بہت تنگ کر دیا گیا ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں تاریخ ایک دریای بے پایاں یا 'انبار علوم' نہیں رہی، راقم کے نزدیک علم صرف دماغی تعیش کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے عملی زندگی میں کچھ نہ کچھ کام لینا ہے اس بنا پر تاریخ سے بھی انسان کی عملی زندگی میں کام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے متعین حدود نہ قائم کیے جائیں اور اس کا ایک مخصوص موضوع بحث نہ قرار دیا جائے۔

سعید انصاری متعلم جامعہ

ہندوستان عربوں کی نظر میں

(خاص جامعہ کے لیے)

ہم جناب محمد حبیب صاحب بی۔ اے (آکسن) پروفیسر مدرسۃ العلوم کی عنایت سے مندرجہ ذیل مضمون نذر ناظرین کرتے ہیں جو صوبہ ہذا کی انجمن تاریخ کے ایک خاص جلسہ کے لیے ڈاکٹر ٹوٹین نے طیار کیا۔ مضمون ہذا   ہندوستانیوں کے لیے صرف اس وجہ سے دلچسپ ہی کہ اس میں قدیم زمانہ میں عربوں کا جو تعلق ہندوستان سے تھا اُس کا وہ پہلو پیش کیا گیا ہے جس سے ہم لوگ بہت کم آشنا ہیں۔ مدیر

اس وقت جبکہ علوم عربیہ کے بہار کا زمانہ تھا، ہندوستان عربوں کے نزدیک ایک نامعلوم ملک تھا، اسی لیے بڑے بڑے اشخاص کے نام اس مضمون میں بمشکل نظر آئیں گے۔ ہندوستان عربوں کے دنیائے علم کا کوئی جزو نہ تھا۔ تجار بندرگاہوں تک آتے جاتے تھے لیکن اندرونی حصہ ان کے لیے ایک خیالی دنیا تھی۔ مثال کے طور پر لیجیے ابو الفدار (المتوفی سنہ ۱۳۳۱ء بمقام شام) تاریخ مصر کے ابتدائی حالات نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہی لیکن اس میں ہندوستان کا ذکر بہت ہی شاذ آتا ہی۔ البیرونی کی تصنیف مقبول نہوئی اور کسی اور مصنف نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی۔

عام طور پر ہندوستان عقل و دانش کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور اس کا کچھ حصہ عربوں تک بھی پہونچا۔ بیدپاے کا قصہ جو کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہی اور الف لیلہ کے بعض حصے اس کی کافی دلیل ہیں لیکن خیالات بہت مبہم ہوا کرتے تھے۔ ایک مسلمان عالم (المتوفی سنہ ۱۴۳۱ء) نے یہ بتایا کہ برہمن کا لفظ ابراہیم سے مشتق ہی ان کا قول ہی کہ حضرت ابراہیمؑ کی ایک کتاب جو پانچ جلدوں میں تھی، برہمنوں کے ہاتھ لگ گئی۔ پانچواں حصہ بہت ہی مقدس سمجھا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔" ان میں یہ مشہور تھا کہ جو کوئی اس حصہ

کو پڑھے گا فوراً مسلمان ہو جائے گا۔" ابن خلدون نے (۱۴۰۶ء) خاص طور سے ہندوستان کے جوگیوں کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنے جسم کو طرح طرح سے اذیتیں دیکر علم اور قوت حاصل کرتے ہیں۔

مشرقی سیاحوں کے عجیب غریب قصے کتاب عجائب الہند میں جمع کیے گئے ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ کتاب حقیقتاً پرانی ہے؟ اس میں بہت سے خودکشی کے متعلق بھی قصے درج ہیں۔ دو آدمیوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور اسے آگ سے بھر دیا، اس کے بعد اسمیں کھڑے ہو گئے اور بچیسی کھیلنے لگے یہاں تک کہ آگ نے ان کے اعضائے رئیسہ تک پہنچکر ان کا خاتمہ کر دیا بعض لوگ جو غرق آب ہونا چاہتے تھے وہ لوگوں کو روپئے دیتے تھے تاکہ وہ ان کے سر کو پانی کے اندر دبائے رکھیں نمونہ کے طور پر ایک ہی عجیب قصہ کا ذکر کر دینا یہاں کافی ہو گا۔ ایک دریا میں بہت سے مگر رہا کرتے تھے، ایک ہندوستانی جادوگر نے پانی پر جادو کر دیا اور کچھ دور تک مگر کسی کو کوئی اذیت نہ پہنچاتے تھے۔ وہاں کے راجہ نے یہ سنا اور حکم دیا کہ اچھا پھر جادو کرے۔ دو مجرم پانی کے اندر بھیجے گئے اور ان کو کوئی اذیت نہ پہونچی۔ جب راجہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ مگر کچھ بھی تکلیف نہیں پہونچاتے تو اس نے اشارہ کیا، ایک نوکر اٹھا اور جادوگر کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مشہور اشخاص کے بت رکھے جانیکا بھی دستور تھا۔

ابن الاثیر نے اپنی تاریخ عالم میں چند واقعات دیے ہیں لیکن ان کی تفصیلات کوئی قابل اعتبار نہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ محمد غوری نے لاہور پر ۱۱۸۲ء میں قبضہ کیا۔ اس نے اجرا (اُچھ) فتح کیا اور اس کی ایک فوج کے ہاتھ شکست کھائی جس کی کمان ایک عورت کرتی تھی (۱۱۵۲ء)۔ محمد غوری اس جنگ میں زخمی ہو گیا تھا اور جب اچھا ہو گیا تو اس نے امراء کو جو میدان جنگ سے بھاگ آئے تھے، گھوڑوں کے توبڑوں میں جو کھانے کو دیے۔ یہ تمام قصہ ۱۱۸۶ء کا بیان کیا گیا ہے۔ صحیح تاریخ ۱۱۷۵ء ہے۔ اُچھ کی فتح ایک انی کی ہکاری سے

ہوئی لیکن اس کے متعلق کچھ گڑبڑی ہے۔ تھانیسر کی پہلی لڑائی کی تاریخ غلط دی ہوئی ہے لیکن دوسری کی صحیح ہے یعنی ۱۱۹۲ء۔ اس سے حالات معلوم ہوتے ہیں یعنی یہ کہ ہندوستانی طلوع آفتاب سے قبل اُٹھنے کے عادی نہ تھے۔ ۱۱۹۴ء میں راجہ بنارس نے شکست کھائی اور قتل ہوا اس کی نعش اس کے دانتوں سے شناخت کی گئی۔ جڑ چونکہ کمزور تھی اس لیے اس کے دانت سونے کے تار سے جڑے ہوئے تھے۔

خوشاپور کے قریب ایک قوم رہتی ہے اس کے بارہ میں یہ لکھا ہے کہ انہیں بہ یک وقت متعدد شوہر رکھنے کی رسم جاری تھی اگر ان میں سے کسی کے لڑکی ہوتی تھی تو وہ اپنے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دیتا کہ اس لڑکی سے کون شادی کرے گا؟ اسے کوئی لے گا؟ اگر کوئی جواب دیتا تو وہ اسے چھوڑ دیتا ورنہ وہیں اسے ختم کر دیتا تھا۔ جب ایک شوہر بیوی کے پاس ہوتا تھا تو وہ اپنے جوتے دروازہ پر چھوڑ جاتا اور جب تک وہ پڑے رہتے کوئی دوسرا شوہر نہیں آسکتا تھا۔ اسے دیکھکر جنوبی عرب کے لوگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن کا بیان اسٹرابونے کیا ہے۔

ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ اس کے معلومات زیادہ تر سیاحین اور تجار سے مشتق ہیں اس لحاظ سے اس کی غلطیاں کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہیں۔

یاقوت نے (۱۲۲۹ء) جو ایک عالم جغرافیہ تھا اپنے روزنامچہ میں بہت کم ذکر کیا ہے مثلاً دہلی اور بنارس کا کہیں تذکرہ نہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ ابو الفدا نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہ نے (غالباً محمد تغلق) سلطان مصر کے پاس ۱۳۳۰ء میں تحائف بھیجے لیکن سلطان یمن نے انھیں راستہ میں چھین لیا اور سفرا میں سے بعض کو مار ڈالا۔ اس کے عوض سلطان مصر نے یمن کے قاصد کو قید کر لیا۔

اس امر کو ظاہر کرنے کے لیے کہ عربوں کی خالص زندگی ہندوستانی اثر سے پاک تھ

بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خاص خاص کتابیں اس کے لیے دیکھنی چاہئیں۔ سب سے پہلے ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہے جو ۱۳۳۳ء سے ۱۳۴۷ء تک ہندوستان میں تھا۔ اس مضمون میں تاریخی حیثیت سے واقعات کا ذکر ہوگا۔

یہاں کی حکومت تلاش و نگرانی کی بہت عادی تھی۔ جب ابن بطوطہ سندھ میں پہنچا حکومت کے محرروں نے حاکم ملتان کے ہاں اطلاع دی اور اس کے بعد دہلی خبر بھیجدی۔ ایسے ہی اور بھی واقعات ہیں اس کی ایک بیوی کو ملکہ سے ملاقات کرانے کے لیے لے گئے اور جب وہ واپس ہوئی تو بیش بہا تحائف ساتھ لائی۔ ابن بطوطہ نے اپنا وقار قائم کرنے کے لیے انھیں اپنے احباب میں تقسیم کر دیا اس لیے اس کی زندگی کے تفصیلی حالات سلطان کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ صرف نو واردا شخاص ہی کی نگرانی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ ہر حاکم کے پیچھے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا سلطان کا ایک غلام بطور خفیہ کے لگا رہتا تھا۔ غلام لڑکیاں ان کے گھروں میں خفیہ کا کام کرتی تھیں اور ان کی اطلاعات بھنگیوں کے ذریعے سے پہنچتی رہتی تھیں۔ اسی تفتیش کی ابن بطوطہ ایک مثال بیان کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنا چاہتا تھا۔ اس عورت نے سلطان کے سر کی قسم دیکر بہت منت سماجت کی کہ اس ارادہ سے باز آئے دوسرے دن صبح کو وہ دربار میں بلایا گیا اور سلطان نے اسے اس واقعہ کی یاد دہانی کی۔ مصنف سنجیدگی کے ساتھ یہ لکھتا ہے کہ اس شخص کے خاتمہ کا باعث یہی واقعہ ہوا۔

ہر نو وارد شخص (بشرطیکہ وہ بڑا آدمی ہو) جو ملک میں قدم رکھتا ہے اپنے ساتھ سلطان کے لیے ایک تحفہ لاتا ہے۔ ہمارے سیاح (ابن بطوطہ) نے اس رسم کی تعمیل اس طرح سے کی کہ منجملہ دوسری چیزوں کے وہ اپنے ساتھ تیروں سے لدا ہوا ایک ونٹ لایا تھا بعض رسومات دربار کا بھی کچھ پتہ چلتا ہے۔ سلطان کی بلا اجازت کوئی شخص دربار عام میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ امرا و حکام کو ملازمین کی متعین تعداد ساتھ لیجانے کی اجازت تھی لیکن داخلہ سے قبل سب کے نام درج کر لیے جاتے تھے۔ دربار عام کے آداب میں کچھ آزادی رہی ہوگی۔ کیونکہ

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں امرار کے زمرہ میں بادشاہ کو تمیز نہ کرسکا۔ سلطان غیر ملکی اشخاص سے ملنے کا بڑا شائق تھا جنھیں وہ ہندوستان کے لوگوں پر ترجیح دیتا۔ وہ ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کرتا اور حکومت میں ان کو خاص حصہ دیتا تھا، خود ابن بطوطہ نے قاضی کی خدمت انجام دی وہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ "عزیز" کہے جائیں اور لوگ انہیں "غریب" (مسافر) کے نام سے نہ پکاریں۔ اردو کے عرف عام میں اس لفظ کا جو مفہوم ہے اس سے اس کا کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے۔

اس عہد میں اکثر شاہانہ فیاضیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ عام دستور تھا کہ تحفے کسی نام سے منسوب کرکے دیے جاتے تھے مثلاً فلاں تحفہ "سر کی دھلائی" کے لیے، جب کبھی کوئی تحفہ پیش کیا جاتا تھا تو طریقہ عمل بہت پیچیدہ ہوتا تھا۔ تحفہ پانے والے کو پہلے ایک سرٹیفکٹ دیا جاتا تھا (ابن بطوطہ کو اس کے لیے دو یا تین دینار دینے پڑے) جس پر وہ اپنے دستخط کرتا تھا پھر تین امرا اس پر اپنے اپنے دستخط ثبت کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ وزیر کے دفتر میں بھیجدیا جاتا جہاں اس کی نقل لی جاتی، پھر وہ کاغذ رجسٹری و معائنہ کے دفتر میں جاتا۔ اس کے بعد وزیر خزانچی کو ادائیگی کا حکم لکھتا جسے وہ ضابطہ تحریر میں لاتا۔ اور پھر زر عطیہ ادا کردیا جاتا تھا۔ یہ سنکر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ ابن بطوطہ کو بارہ ہزار دینار کے لیے چھ ماہ تک انتظار کرنا پڑا تھا اس پر بھی ۱۰ فیصدی حسب دستور کاٹ لیا جاتا تھا۔

برعکس اس کے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر درباریوں کو روپیوں کی سخت ضرورت ہوتی تھی کئی ایسے مدیون تھے جو سلطان کی زیر حفاظت ہوتے، ادائیگی قرض کا طریقہ باقاعدہ طور پر عمل میں آتا تھا۔ جونہی مدیون محل میں داخل ہونے لگتا، داین اس پر دست درازی کرتا۔ اتنے وہ چلا اٹھتا کہ "بادشاہ کا دشمن!" "سلطان کے سر کی قسم، تم داخل نہیں ہوسکتے۔ جب تک پورا قرضہ چکا نہ دو۔ مدیون بھی تاوقتیکہ بقایا صاف نہ کرلیتا یا ملتوی نہ کرلیتا، اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا تھا۔

سلطان کے خود مختارانہ رویہ کی عجیب اور دلچسپ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک بار وزیر کہیں باہر گیا ہوا تھا، چنانچہ اس کے ہاں ایک دن شب میں گیا اور اس کی دو لڑکیوں کی شادی خداوند زادہ قوام الدین کے لڑکوں سے کردی گویا وہ خود وزیر کا حقیقی قایمقام تھ۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے روپیوں کی تھیلیاں اور کپڑے قاضی اور نوشے کو عطا کیں۔

ایک دوسری شادی میں دولھا اور دولہن کے ساتھیوں میں نقلی جنگ ہوئی، اس کے شرکا رتمامتر حکام تھے جنھیں سلطان نے نامزد کیا تھا۔ جنازے کا لیجانا امر قدرتی ہے۔ ایک بار ہمارے مصنف (ابن بطوطہ) کی ایک بچی کا انتقال ہوگیا چنانچہ وہ تمام رسوم بیان کرتا ہے جو اس کے مرنے پر عمل میں آئیں۔ وہ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد قبر کے پاس ایک خیمہ نصب کیا گیا، قبر پر پھول ڈال دیئے گئے اور نارنگی اور لیمو کی ٹھنیاں لگائی گئیں۔ اگر ان میں پھل نہ ہوتے تھے تو دھاگے سے باندھ دیئے جاتے۔ خشک پھل اور ناریل بھی قبر پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مختلف رؤسا وہاں پہنچے، تلاوت کلام مجید ہوئی، قاضی نے نوحہ پڑھا اور اس کے بعد سلطان کی مدح کی (اس وقت تمام لوگ کھڑے ہوگئے تھے) اور پھر نماز پڑھی گئی۔ یہ ختم ہو جانے کے بعد لوگوں پر گلاب چھڑکا گیا، شربت اور پان تقسیم کیے گئے اور مجمع رخصت ہوا۔

سلطان کی قبر کے بغل میں اس کے جوتے ایک تپائی پر رکھدیئے جاتے تھے اور لوگ ان کا اسی طرح اعزاز و اکرام بجالاتے جیسا خود سلطان کا اس کی حیات میں کرتے تھے۔ جب محمد تغلق، قطب الدین کے مقبرہ پر گیا تو اس نے ان کے جوتوں کو سر پر اٹھا کر رکھ لیا۔

جب سلطان عین الملک باغی سے لڑنے کو نکلا تو فوج کے ہمراہ ابن بطوطہ بھی تھا۔ جس وقت وہ خیمہ میں اپنی بیویوں کے پاس بیٹھے تھے، ایک نوکر نے آکر کہا کہ "جلدی باہر آیئے سلطان نے ابھی یہ حکم صادر کیا ہے کہ جو شخص کسی عورت کے ساتھ پایا جائے اسے فوراً قتل

کر دیا جائے" ابن بطوطہ یہ سنکر بہت خوفزدہ ہوا لیکن امرا میں سے ایک نے بادشاہ کو سمجھا
کہ اس حکم کو منسوخ کر دے۔ اگر کہیں اس حکم کے تعمیل کی نوبت آتی، فوج کا بیشتر حصہ قتل ہو چکا
تھا۔ اس کے بجائے تمام عورتیں پاس کے ایک قصبہ میں بھیجدی گئیں۔

ایک بتہ ابن بطوطہ کو دس ہندو لڑکیاں جو جنگ میں گرفتار ہوئی تھیں، ہاتھ آئیں۔
ان میں سے ایک لڑکی اس نے اس لڑکے کو دی جو انہیں لایا تھا لیکن وہ اس عطیے سے مطمئن نہ ہوا۔
ان میں تین لڑکیاں خود اس کا ایک دوست لے گیا، باقی کا حال اسے خود نہیں معلوم۔ لڑکیاں
بہت گندہ اور غیر شایستہ تھیں۔ تربیت یافتہ غلام بھی ارزاں قیمت پر ملتے تھے لیکن کسی کو
ان کے خریدنے کا خیال بھی نہیں ہوتا تھا البتہ بطور تحفے کے عموماً پیش کیے جاتے تھے۔ وہ
لکھتا ہے کہ لوگ زیادہ تر ہندو ہوتے تھے جو یا تو بہ حیثیت ذمی گاؤں میں بستے یا پہاڑوں
میں باغی ہو کر رہتے تھے۔ جبکہ وہ سلطان کی سفارت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لیے
چین جا رہا تھا، اس اثنا میں کوئل سے چند میل کے فاصلہ پر لڑائی کا حال سننے میں آتا ہے
اس واقعہ سے اس عہد کے حالات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اس لڑائی میں وہ خود بھی گرفتار
ہوا اور بمشکل جان بچا سکا جس پر وہ خود اظہار تعجب کرتا ہے۔

جب مسافر ملتان میں پہونچتے تھے تو وہاں دستور کے مطابق ان کی سخت جانچ ہوتی
تھی۔ مال تجارت کا ایک چوتھائی بطور محصول کے لے لیا جاتا تھا اور فی گھوڑا ۷ دینار
دینے پڑتے تھے۔ غنیمت ہے کہ ایک نامی امیر کی مداخلت کی وجہ سے ابن بطوطہ اس قسم کی
جانچ سے بچ رہا۔ دو سال بعد محمد شاہ نے خلیفہ عباسی کو تسلیم کیا اور حکم دیا کہ وہ یکی اور
زکات صرف دو ہی محصول باقی رہیں اور دیگر محصولات اس نے اٹھا دیے۔

اس نے علاء الدین خلجی کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے تمام اشیاء کی قیمتیں مقرر کر دی
تھیں۔ اس نے بازار کے افسر سے پوچھا کہ گوشت اس قدر گراں کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ
بھیڑ اور جانوروں پر سخت محصول لگا دیے گئے ہیں۔ اس نے یہ محصول اٹھا لیے اور گوشت

فروشوں کو روپئے دیے اور کہا کہ مال بیچکر روپئے خزانے میں جمع کر دیا اور خود انہیں کمیشن ملتا تھا
اس نے ایسا ہی کپڑے کے معاملہ میں بھی کیا جو دولت آباد سے آتا تھا۔

اس کے بعد جب غلہ کی قیمت بڑھی اس نے سلطنت کی طرف سے ٹھتے کھولے اور لوگوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا۔ جب غلہ فروشوں نے مقررہ قیمت پر بیچنے سے انکار کیا تو اس نے انھیں بیچنے ہی سے روک دیا اور چھ مہینے تک برابر وہ لوگوں کو غلہ مہیا کرتا رہا۔ جن جن کے پاس بڑے بڑے ذخیرے تھے، وہ ڈرنے لگے کہ کہیں تمام غلہ سڑ نہ جائے اس لیے اس سے پھر اجازت لی لیکن اب انہیں مقررہ قیمت سے بھی کم پر بیچنے کا حکم ملا۔

کچھ نظام حکومت کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ ایک صوبہ کی جس میں پندرہ سو گاؤں تھے مالگزاری ساٹھ لاکھ تھی۔ لیکن سکہ کا ذکر نہیں۔ ایک حاکم صوبہ مالگزاری کا بیسواں حصہ اپنی تنخواہ کے لیے رکھ لیتا تھا۔ حکام کی دیانتداری اور ادائگی فرض کی تحقیق کے لیے ایک مخصوص محکمہ تھا جو انھیں رعایا سے انصاف و مہربانی کے ساتھ روپیہ وصول کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ ہندو قصبات پر مسلمان حاکم مقرر کرنا گورنروں کا دستور سا ہو گیا تھا۔ یہ صاف طور پر مذکور ہے کہ فوجوں میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل ہوتے تھے۔

کچھ روشنی دونوں مذاہب کے تعلقات پر بھی پڑتی ہے۔ جب کوئی نامور ہندو اسلام قبول کرتا تو وہ سلطان کے پاس بھیجا جاتا تھا جو اس کے حسب رتبہ طلائی کنگن یا ہار اور خلعت عطا کرتا۔ یہ عموماً شب میں ہوتا تھا تاکہ دن میں اس کے دوستوں یا ہم مذاہب میں سے کوئی محل میں آنہ جائے۔

اسلام اگرچہ فاتح قوم کا مذہب تھا لیکن ہندو مذہب کا اثر پڑے بغیر نہ رہا۔ قصبہ جنبنی واقع دریائے سندھ میں عربوں کا ایک خاندان رہتا تھا جو حجاج کی فرستادہ فوج کے ساتھ یہاں آ گئے تھے وہ کھانا تنہا بیٹھکر کھاتے تھے اور کسی کو کھاتے ہوئے دیکھنے نہیں دیتے تھے۔ اپنے خاندان سے باہر شادیاں بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک شیخ تھے جو

اپنا کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ غلام یا کنیز کے چھونے سے کھانا ناپاک ہو جائے گا۔

جادو یا سحر پر عموماً اعتقاد کیا جاتا تھا۔ اور جنوبی ہند میں مسلمان ہندوستانی فقیروں کو اس میں اپنا استاد مانتے تھے۔ یہ اعتقاد تھا کہ ساحر بے آب و دانہ مہینوں تک رہ سکتے ہیں۔ منگلور میں ایک مسلمان نے جو انہیں جوگیوں کا چیلہ تھا، ایک اونچا چبوترہ بنوایا۔ اور اس پر ۲۵ دن تک بے آب و دانہ کھڑا رہا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس گولیاں ہوتی ہیں جن میں سے وہ ایک ہر روز کھا لیا کرتے ہیں، اس کے علاوہ انھیں اور کھانے پینے کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی۔ بہت سے سبزی کھانے کے عادی ہوتے تھے اور اکثر گوشت نہیں کھاتے تھے بعضوں کی نظر میں یہ اثر تھا کہ جس شخص کی طرف دیکھتے وہ مر جاتا۔ اُس کا دل جسم کے اندر سے غائب ہو جاتا تھا۔

بہت سی عورتوں میں یہ قوت تھی اور اس لیے وہ جادوگر مشہور تھیں۔ اگر کوئی عورت ساحرہ سمجھی جاتی تو چار مٹکے پانی سے بھرے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں میں باندھ دیئے جاتے اور وہ دریائے جمنا میں ڈال دی جاتی۔ اگر وہ نہ ڈوبتی تو یہ ثابت ہوتا کہ وہ ساحرہ ہے اور پھر وہ جلا دی جاتی۔ اس کی راکھ جمع کر لی جاتی اور جو شخص اسے اپنے جسم پر مل لیتا تو ایک سال تک اس پر کسی کا جادو نہ چل سکتا۔ بعض مقامات پر لوگ ایسے جانور کا عقیدہ رکھتے تھے جو دن میں انسان کی شکل اور رات میں بھیڑیا ہو جاتا تھا۔

امیر عین الملک نے ایک بار بغاوت کی اور گرفتار ہوا۔ اس کی بیوی کے اعزہ نے اس سے اصرار کیا کہ تو بھاگ جا لیکن اس عورت نے جواب دیا "کیا میں کافروں کی بیوی کی طرح نہ ہوؤں لیکن اپنے شوہروں کے ساتھ جلا دیتی ہیں؟ میں بھی اپنے خاوند کے ساتھ جان دیدوں گی اور حیات ابدی پاؤں گی"، سلطان نے یہ سنکر اس کی بڑی عزت کی۔ ہمارے سیاح نے ستی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ رسم بہت ہی معزز سمجھی جاتی تھی

اور گو اس کے لیے کوئی جبر نہ تھا پھر جو عورت اس سے انکار کر دیتی اس کا حشر ایسا بُرا ہوتا کہ اس رسم کا اختیاری سمجھا جانا تقریباً غلط تھا۔ سلطان کے دائرۂ حکومت میں اس کے لیے اجازت لینی پڑتی تھی اگرچہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کبھی اجازت سے انکار کر دیا گیا ہو۔ ایک جلوس میں مسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ مرگھٹ تک گئے۔ جب عورت شعلوں میں کود پڑی تو ہر قسم کے باجے وغیرہ بجنے شروع ہو گئے تاکہ عورت کی آواز دب جائے اور مرد بڑے بڑے لٹھوں سے اس کو دبائے ہوئے تھے تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ یہ سُنکر حیرت ہو گی کہ اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ فارسی بولتی ہی شاید اس سے اس کو اپنے عرب ناظرین پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ عورت غیر قوم کی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان مجنون فقیر کے بھیس میں رہا کرتے تھے، سر کے بال شانوں پر لٹکتے رہتے تھے۔ اس کے برعکس بنگال کے قریب کہیں ایک شیخ تھے جس کی زیارت کے لیے ہندو ان کی خدمت میں آتے اور تحفے پیش کرتے تھے۔

خسرو خاں نے خود مختار ہونے کے بعد ہندوؤں کو دوست بنانے کے لیے جانوروں کا ذبیحہ ممنوع قرار دید یا تھا۔

ایک شیخ علی الحیدری کھمبات میں (کاٹھیاوار کے قریب) رہتے تھے وہاں کے ملاح انھیں اپنا مرشد مانتے تھے۔ اگر کوئی ان میں منت مانتا اور پوری نہ کرتا تو شیخ اسکی یاد دہانی کر دیا کرتے تھے۔ جلال افغانی کی بغاوت میں شرکت کرنے سے ان کی سزا ہو گئی پہلے جلاد نے تلوار چلائی لیکن ان پر کچھ ضرب نہ آئی، دوسرا کچھ کامیاب ہوا۔ ابن بطوطہ نے حیدریہ فرقہ کے بعض درویشوں سے امروہہ میں ملاقات کی۔ وہ ناچتے تھے اور آگ میں سے گزر جاتے تھے۔ دلّی کے پاس ایک مسجد تھی جس پر ملاح منتیں چڑھاتے تھے۔ یہ صحیح نہیں کہ رسم ہندوؤں کے اثر سے ہی آئی ہو۔

مختلف چیزوں کے متعلق اگر متفرق معلومات جمع کیے جائیں، تو بہت سے حالات پر

روشنی پڑتی ہے۔ ہنور میں ۲۳ مدرسے لڑکوں کے لیے اور ۱۳ لڑکیوں کے لیے تھے۔ اس قصبہ کی تمام عورتیں قرآن جانتی تھیں؛ خود ابن بطوطہ کی ایک بیوی نہایت عبادت گزار تھی اور قرآن پڑھ سکتی تھی لیکن لکھنا نہیں جانتی تھی۔

اگر جنگ میں فتح کی کوئی امید باقی نہ رہتی تو سپاہی اپنی پگڑیاں اُتار کر گھوڑوں کی گردنوں پر ڈال دیتے تھے تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اس پر تل گئے ہیں کہ یا تخت یا تختہ، اس وقت گھوڑوں کی چار نسلیں ہوا کرتی تھیں۔ گھوڑوں کو دس روز تین رطل یومیہ گھی پلایا جاتا تھا، اس عرصہ میں ان سے سواری کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک انھیں ماش کی پتی کھلائی جاتی تھی۔

محل یا مکانات کے باہر کرایہ کے لیے پالکیاں طیار رہا کرتی تھیں۔

ابن بطوطہ نے دسترخوان کے لذائذ سے بھی بے توجہی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ آندھی کے گرے ہوئے آموں کے اچار بنتے تھے جو کھانوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ مالوہ اور دہلی کے درمیان جو سڑک جاتی ہے اس پر میلوں کے نشانات بنے ہوئے ہیں۔

بہت سی باتوں میں ہندوستان اس وقت سے کچھ زیادہ نہیں بدلا ہے۔ شمالی حصہ میں لوگ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے، اس وقت بھی خچر کی سواری ذلت سمجھی جاتی تھی۔ ہرکارہ ایک لاٹھی لیے ہوتا تھا جس میں گھنٹیاں بندھی ہوتی تھیں۔ یہ سُنکر حیرت ہوتی ہے کہ پیدل ہرکارہ سوار سے کہیں تیز چلتا تھا۔ دس دن کا آمد و رفت کا سفر ہرکارہ ۳۶ گھنٹہ سے کم میں طے کرتا تھا یعنی جواب اگلے دن کی شام تک آجاتا تھا۔ (روانگی کا وقت نہیں دیا ہے)

جنوبی ہند میں ہمارے سیاح (ابن بطوطہ) نے دیکھا کہ عورتیں کمر سے اوپر اپنے جسم کو نہیں ڈھکتی تھیں ایک شریف مسلمان کی حیثیت سے وہ اس سے بہت متاثر ہوا

اور قاضی سے شکایت کی۔ اس نے ان کے لباس کی اصلاح کرنی چاہی لیکن ناکام رہا۔ اس نے اپنی ایک کنیز کو دہلی کا لباس پہنایا لیکن نتیجہ اس سے بھی بُرا نکلا کنیز اس نئے لباس کو سنبھال نہ سکتی تھی۔

اس نے سلطان رضیۃ الدین کے موت کا عجیب قصہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک جنگ میں شکست کھا کر وہ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلی۔ تکان سے چور چور ہو گئی تھی اس نے ایک جگہ ایک کسان سے کچھ کھانے کو مانگا۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔ کسان نے اس کے سُنہرے کپڑوں سے پہچان لیا کہ وہ عورت ہے اور اسے جان سے مار ڈالا۔

سعید انصاری متعلم جامعہ

نظام اشتراکی

اس عہد کی جدید تحریک اشتراکیت، جس کا مقصد مزدور پیشہ جماعت اور مفلوک الحال عوام کی بہبودی ہے۔ دنیا میں اُسی وقت سے موجود ہے جب سے تفریق مراتب کی ترویج ہوئی۔ مسٹر میکڈانلڈ ممبر انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی اپنی کتاب 'تحریک اشتراک' میں فرماتے ہیں :-

"اشتراکیت اُن لوگوں کا مذہب ہے جو اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ جماعت انفرادی بقا و خوشحالی کے لیئے ہوتی ہے۔ زندگی کے معاشی اسباب کا انتظام مثلاً زمین اور اصل کو صنعت و تجارت کے لیے چند افراد کے ناجائز قبضہ میں نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ کم و بیش ہر شخص قدرت کے اِن وسیع خزانوں سے یکساں مستفیض ہو۔ یہی اشتراکیت ہے۔ اس کا مقصد آزادی ہے۔ وہ آزادی جس کا کانٹ (Kant) نے اُس وقت تصور کیا تھا جبکہ اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ انسان بذات خود ایک مدعا ہے نہ کہ اپنے ایک ہم جنس کے مدعا حاصل کرنے کا آلۂ کار۔ گو اشتراکیت موجودہ سوسائٹی کو بدلنا چاہتی ہے لیکن کسی طرح اُس کے لیے مضرت رساں نہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو انفرادی آزادی کے لیے مانع نہیں۔ حکومت و رعایا کے تعلقات، باہمی امداد، تدریجی اجتماعی ترقی اس نظام کے تحت اچھی طرح کامیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک شہر ہے جہاں ہر سمت سے آ کر بہت سے راستے ملتے ہیں ایک راستے سے مذہبی لوگ، دوسرے سے تجارت پیشہ اور تیسرے سے فلسفی اس میں آ کر داخل ہوتے ہیں اور بے شمار طریقہ اور راستے ہیں مثال کے طور پر انگلستان میں انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی۔ چرچ سوشلسٹ لیگ و سائنٹفک سوشلسٹ سیکشن اپنے اپنے اصولوں کے موافق اس کو کامیاب بنانے کے لیے نشر و اشاعت میں نہایت انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔"

ہنگامۂ فرانس ۱۸۴۸ء کے بعد جبکہ فضائے یورپ میں امن و سکون پیدا ہوا تو جرمن بمقابلہ دیگر ممالک کے صنعت و حرفت میں زیادہ گامزن نظر آیا۔ اسی زمانہ میں کارل مارکس نے ایک غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اسٹیٹ سوشلزم کا حامی تھا۔ یعنی حکومت پیدائش و تقسیم دولت کا خود انتظام کرے۔

موجودہ حکومت سے وہ بہت بیزار تھا۔ اس کی جگہ جمہوری نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ علاوہ انقلاب پسند ہونے کے ایک بہترین مصلح بھی تھا۔ تخریب کے ساتھ وہ تعمیر کو بھی ضروری سمجھتا تھا۔ انقلاب کو ارتقار کا ایک منظر اور قانون فطرت کے تابع سمجھتا تھا۔ اب اشتراکیت کوئی خیالی تحریک تھی۔ ارباب تخیل (   ) کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ اب اصلی کام کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے سوسائٹی کی خرابیوں اور نقائص دور کرنے کے دو اصول قرار دیئے اور ان کے حاصل کرنے کے لیے دو طریقہ۔

(۱) موجودہ نظام اجتماعی کو برباد کر کے تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنا

(۲) پرائیویٹ ملکیت کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے "انجمن بین الاقوامی" برائے اتحاد مزدوران اور فرقہ بندی (   ) یہ دو ذرائع عمل میں لائے جائیں۔ پرائیویٹ ملکیت کو فنا کرنے سے یہ مقصد ہے کہ گورنمنٹ بذات خود دولت کی پیدائش و تقسیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور غیر مکتسب ذرائع کو تباہ کر دیا جائے۔ ہر شخص کام کے لیے مجبور کیا جائے اور تجارف و تقابل کا خاتمہ ہو جائے۔[۱]

ہنگامۂ فرانس کے بعد جبکہ نیابتی حکومتیں نئی نئی قائم ہوئی تھیں جرمنی میں مشہور سیاست داں پرنس بسمارک نے جب پارلیمنٹری گورنمنٹ مرتب کی تو اس کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا۔ بنڈیسرٹھ (   ) اور ریشتاغ۔ (جس طرح کہ انگلستان میں دارالخواص اور دارالعوام ہیں) انتخاب کے ایسے اصول بنائے کہ بنڈیسرٹھ میں عمائدین و روسار ملک اور ریشتاغ میں عوام شامل ہوئے۔ اصلی طاقت اول الذکر کے ہاتھ میں رہی۔ اور دوسری محض بحث و مباحثہ کی جولانگاہ بن گئی۔ اشتراکین نے جب یہ حالت دیکھی تو اس نظام کی تباہ کرنے کی کوشش کی   ۔ کرل مارکس کے اصولوں پر عملدرآمد کیا گیا۔ گو حکومت کو تو

[۱] انتخاب مضامین جوہر۔ "کرل مارکس اور نظام اشتراکی"، از یوسف حسین خانصاحب متعلم بی۔ اے جامعہ ملیہ

نہ پلٹ سکے لیکن پشتاغ میں عوام کی نیابت کا ایک حد تک کز ضرور بن گیا۔ جوں جوں وقت آتا گیا تمام یورپ امریکہ میں سوائے روس کے صحیح نیابت کا طریقہ ترقی پذیر ہوتا رہا۔ خاصکر موجودہ زمانہ میں انگلستان سب سے زیادہ عوام کی نیابت کا مرکز بن گیا ہے۔ کارل مارکس کے عہد میں جرمن میں انجیلز اور لیسلی۔ فرانس میں پراوڈھن۔ اٹلی میں میزنی۔ انگلستان میں آون اور رسکن روس میں بیکانن وغیرہ تھے۔

روس میں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا۔ اس کے مٹانے کے لیے یہاں بھی یہ تحریک عدمیت (نہلزم) کے نام سے مشہور تھی[۱۵] فرقہ جنگی پر عملدر آمد کیا گیا۔ ملک میں عام بیداری پیدا ہو گئی۔ کامیابی خوب اچھی طرح ہوئی۔ طلبا نے اس میں بہت کافی حصہ لیا تھا۔ گرفتاریاں برابر جاری رہیں۔ حکومت نے عاجز ہو کر مارشل لا کا نفاذ کر دیا۔ تحریک اگرچہ ایک قلیل مدت کے لیے بند ہو گئی لیکن پھر اپنی اصلی حالت پر بلکہ پہلے سے دوگنی طاقت کے ساتھ شروع کی گئی۔ گزشتہ جنگ عظیم نے بہت اچھا موقع دیا۔ مسٹر لینن کی رہنمائی میں کام شروع کیا گیا۔ بالآخر انقلاب ظہور میں آیا۔ اس سے قبل ایک لاکھ اسّی ہزار آدمی جیلخانوں میں مقید تھے۔ اب شہنشاہیت کا دور ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ نظام اشتراکی دبالشویکی حکومت قائم ہوئی۔ یورپ کے دیگر ممالک سے روس اپنی طبعی و اقتصادی حیثیت سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت پیدائش و تقسیم کا انتظام بذات خود کرتی ہے۔ لیکن چونکہ اس تحریک کی کامیابی کا دارومدار اور قیام "بین الاقوامی" اصول پر مبنی ہے لہذا دیگر ممالک کو بھی بالشویک اسی نظام کے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن واقعات بتلاتے ہیں کہ دنیا اس کے بہت خلاف ہے۔ ان کی طبعی و اقتصادی حالت بالکل جدا ہے پس بیرونی معاشی دباؤ سے یہ نظام بدل جائے گا۔ روس میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو دوسرے ملکوں میں لے جا کر تجارت میں لگاتے ہیں۔ روس میں سرمایہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

---

۱۵ تاریخ اشتراکیت، کرکپ

اشتراکیت ایک مقصد ہی نہ کہ الہامی قانون اس لیے ہر زمانہ کے موافق مختلف صورتوں میں اس کا مفہوم سمجھا گیا۔ منزلِ مقصود تو وہی رہی مگر طریقۂ کار بدلتا رہا۔ مسٹر میکڈانلڈ فرماتے ہیں۔

"جوں جوں وقت آتا جاتا ہی اور ہمارے صنعتی و حرفتی تجربے مکمل ہوتے جاتے ہیں اسی طرح سابق اشتراکیین کے اُصول اور طریقۂ کار میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ نیز ایک جانب قدم بڑھانے سے دیگر مخفی راستے نکل آتے ہیں اور طریقۂ کار بھی بدل جاتا ہی۔ گزشتہ اشتراکیین کو دیکھو جبکہ فضائے یورپ صدائے انقلاب سے گونج رہی تھی اُن کے اُصولوں پر ایک رنگ اور چڑھ گیا تھا مگر اب وہ فضا بدل گئی اور یہ رنگ بھی اُڑ گیا (ارتقار کا اقتصار ہی تھا) لیکن اشتراکیت اور مقصد وہی ہی یعنی عوام الناس کی بہبودی۔" اور آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"اس سے کچھ غلط فہمی رفع ہو جائیگی اگر پہلے ہی سے میں یہ ظاہر کردوں کہ یہ تحریک انفرادی مفاد کے لیئے مضرت رساں نہیں ہی۔ جب اشتراکیین سرمایہ داری (Capitalism) اور شخصی ملکیت ——— پر اعتراض کرتے ہیں تو سرمایہ داروں اور تاجروں کو الزام نہیں دیتے بلکہ برخلاف اس کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دار اس طریقۂ کار . . . . کا اتنا ہی شکار ہوا ہی جتنا کہ ایک مزدور۔ اور اُس کی خرابیوں سے اتنا ہی متاثر ہوا ہی جس قدر کہ ایک فلاں زدہ شخص۔ گو اِن دونوں کی حالت سے نتائج تو یکساں مرتب نہیں ہوتے لیکن نقصان کی حیثیت سے دونوں برابر ہیں۔ اشتراکیت اُصولاً معاشی اسباب کے ارتقار سے بحث کرتی ہی نہ کہ اخلاقی تاریخی سے ہم کسی صورت سے اجتماعی مسائل انفرادی مسائل سے علٰحدہ نہیں کر سکتے۔ اِن دونوں سے بہت سے فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ اشتراکیت ترقیٔ اجتماعی کا دوسرا نام ہی جس میں ہر فرد اپنا وجود رکھتا ہو۔"

موجودہ حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے ایک ماہر نفسیات یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ علم طبائع انسانی ایسی ہیں کہ اشتراکیت یک لخت قابل عمل نہیں بنائی جاسکتی بلکہ ارتقائی انقلاب (Evolutionary Revol.) زیادہ کارگر ہوگا کہ جارحانہ انقلاب Aggressive

Revolution، وہ ذرا ذرا سی بات کو اندیشۂ خطرہ سے تعبیر کرتی ہیں۔
انگلستان کے موجودہ نظام حکومت میں نیابت کا کافی حق دیا گیا۔ انڈپنڈنٹ لیبر پارٹی کے اراکین اور دیگر جماعت کے ممبران جن کے مقاصد میں عوام کی بہبودی مدنظر ہے دارالعوام میں حال کے انتخاب کے بعد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ مسٹر میکڈانلڈ حصول اشتراکیت کے لیے حسب ذیل طریقہ بتلاتے ہیں۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں ایک جلسہ کی صدارت فرماتے ہوے کہا کہ "سرمایہ داروں کے خلاف کوئی سازش نہیں کی جارہی ہے بلکہ عوام کے لئے اقتصادی واخلاقی آزادی حاصل کرنا مقصود ہے۔ ڈماکریسی۔ تعمیری قوانین۔ حق گزاری۔ پرائیویٹ ملکیت۔ بہترین ذریعہ کارپردازی ثابت ہوں گے۔

(۱) جمہوریت

پارلیمنٹری گورنمنٹ جس میں عوام کو نیابت کا کافی حق حاصل ہو۔ ملکیت کو حق رائے دہندگی کا معیار قرار نہ دیا جائے۔ انگلستان جہاں نیابت کا طریقہ ایک حد تک اصلی معنوں میں حاصل ہے وہاں حکومت کو تباہ و برباد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ گزشتہ صدی عیسوی میں عوام کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ طاقت اُن کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اسی وجہ سے اشتراکیین نے فرقہ جنگی و دیگر طریقہ کار ایجاد کیے

(۲) تعمیری قوانین

جب عوام کو حق نیابت حاصل ہے تو قانون کے ذریعہ مختلف فرقوں کی جائز شکایات دور کرنے کے لیے مناسب سہولتیں بہم پہونچائی جائینگی۔ وہ تمام اقتصادی رکاوٹیں جو نقصان دہ ہیں دور کردی جائیں گی۔ کارخانوں کی از سر نو تنظیم کی جائیگی۔ خاص خاص قسم کی فیکٹریاں قائم رہیں گی یعنی صنعت و حرفت کو زیادہ رواج دیا جائے گا۔ اصل پر ٹیکس لگا دیا جائیگا تاکہ مفاد عامہ پر صرف کیا جائے۔ تعلیم عام اور سستی کردی جائیگی تاکہ ایک معمولی سے معمولی مزدور بھی اپنے

بچوں کو تعلیم دلا سکے۔ کام کے لحاظ سے فرق تو ضرور ہو گا مگر ہر شخص اپنی ضروریات آسانی سے
پورا کر سکے گا۔

(۳) حق کارگزاری قانون کے ذریعہ کارخانوں اور
دیگر محکمہ جات میں کام کے گھنٹے کم کر دیے جائیں گے۔ اگر انجن میں کوئلہ جلانے والے صرف ۲ آدمی ہیں
جیسا کہ عام دستور ہے (یعنی دن میں ۱۲ گھنٹے ایک آدمی کام کرتا ہے اور رات میں ۱۲ گھنٹے دوسرا)
تو بجائے دو آدمیوں کے چار رکھے جائیں گے۔ اس سے ایک تو بیکاری کا انسداد ہو جائے گا۔
دوسرے قوائے انسانی زیادہ مضمحل نہ ہونگے۔ عام تندرستی بڑھ جائیگی۔ آرام کا کافی وقت
ملے گا۔ پیدائش بھی زیادہ ہو گی۔ مشین کے ذریعہ پیدائش اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ملک کا ہر فرد
اپنی ضروریات اچھی طرح پوری کر سکتا ہے۔ اور پھر بھی ایک کثیر ذخیرہ بچ رہتا ہے۔ آجکل لنکاشایر
میں ۲۰ آدمی اتنا کپڑا طیار کرتے ہیں جتنا کہ پہلے زمانہ میں تمام جولاہے بناتے تھے لیسٹر کے
ایک ہزار چمار ایک چوتھائی ملین افراد کے لیے اتنے جوتے بنا سکتے ہیں کہ ایک سال میں ہر شخص
چار جوڑے پہن سکتا ہے۔ ۱۲ آدمی اتنا آٹا پیس سکتے ہیں کہ ۲۰۰۰۰۰ افراد کھا سکتے ہیں۔

گورنمنٹ ہر فن کو قائم رکھنے کے لیے اعلیٰ قانون بنائیگی۔ حتیٰ کہ حضرت شاعر (غالباً جو
زیادہ تر قوم کے جذبات کے ترجماں ہوں) بھی ایک کارگزار فرد شمار کیے جائیں گے۔ ایسا
ماحول پیدا ہو جائیگا کہ ہر شخص اپنی قابلیت کے موافق اپنی خدمات شوق کے ساتھ انجام دیگا۔
جو لوگ کام کرنے کے قابل نہ ہوں گے اُن کو وظیفہ وغیرہ سے امداد دی جائیگی۔

ذاتی ملکیت اشتراکیت کا عام مفہوم یہ سمجھا گیا
ہے کہ اس قسم کی حکومت مثل ایک خاندان کے ہے جس کا ایک فرد پیدائش و تقسیم کا انتظام کرتا ہے۔
ایسی حکومت میں ذاتی ملکیت کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ روس میں بھی
ہر شخص اپنے ایک مکان مستقل طریقہ سے رکھتا ہے۔ گو یہ نظام حکومت آخری درجہ کا ہے لیکن
پائدار نہیں۔

امریکہ جو دنیا کا سب سے متمول ملک ہے وہاں مالدار اور غریب کا تناسب ایک اور دس کا ہے۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی وغیرہ میں تو اس سے زیادہ ہے مگر بد قسمت ہندوستان میں ایک اور چھ سو کا تناسب ہے ہر شخص کو اپنی حیثیت . . . . مستحکم و مضبوط رکھنے کے لیئے ذاتی ملکیت جس پر اُس کی زندگی کا دار و مدار ہے رکھنا ضروری ہے ذاتی ملکیت جو موجودہ نظام کے ماتحت ایک خطرہ بن گئی ہے یقینی تباہ کر دینا چاہیئے وہ صرف قانوناً اُس حد تک رہیگی کہ مفاد عامہ اور حکومت خطرہ میں نہ پڑ جائے۔

یہ ہے وہ اشتراکیت جس کے لیے دنیا میں ہر شخص باوجود اختلاف مذہب عقائد کوشاں ہے۔ دراصل اشتراکیت کا اتنا ہی مقصد بھی ہے کہ اس نظام کے ماتحت عوام کافی اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

عبد الحمید خاں متعلم جامعہ

دول یورپ اور ٹرکی

وہ ممالک جو ترکوں کی اکثریت آبادی کے باوجود ان سے التوائے جنگ کے بعد علیحدہ کر دیئے گئے تھے دوبارہ اناطولیہ کے ترکان احرار کے قبضہ میں آ گئے ہیں۔ یونانیوں پران کی مہتم بالشان کامیابی کیوجہ سے یہ منظر لوگوں کو دیکھنا نصیب ہوا۔ ڈھائی سو سال میں پہلا موقعہ ہے کہ ترکوں نے اپنی کسی متاع گم شدہ کو حاصل کر لیا ہو۔ ۱۶۸۵ء کے محاصرۂ وائنا کے بعد سے ترکوں کے حدود سلطنت میں برابر تخفیف ہوتی جاتی ہے اور وہ صوبے جو اغیار کے زیر تصرف ہو جاتے ہیں مسلمانوں کی آبادی وہاں سے بالکل غائب ہو جاتی ہے حالانکہ چند سال پیشتر وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہی کیوں نہو۔ اس قسم کے واقعات پر تاریخ شاہد ہے۔ دول یورپ نے سربیہ، مقدونیہ اور بلغاریہ ہی تک اپنی قناعت ظاہر نہ کی بلکہ ترکوں کو اناطولیہ کے علاقہ سے جو ان کا قدیم وطن ہے محروم کرنے کی ٹھان لی تاکہ زمین کی تمام وسعتوں میں اس قوم کے پاس کوئی مامن و ملجا باقی نہ رہے۔ دول یورپ کے اس غاصبانہ طرز عمل نے ترکوں کی حیات کے حق میں مسیحائی کی اور ان میں جذبہ قومی پیدا کر دیا جو عرصہ سے ان میں مفقود تھا۔

ترک جنگ بلقان کے بعد سے ایسے درماندہ ہو رہے تھے کہ اس جنگ عظیم کی تاب لانے کے بالکل ناقابل تھے۔ اس وقت ٹرکی کے بعض ارباب حل و عقد نے جرمنی کے ساتھ دوستی کا اظہار کیا اور انہیں پر ترکوں کی آیندہ مشکلات کی ذمہ داری ہے۔ ترکی قوم "اعلان جہاد" کے مفہوم سے خوب واقف تھی اور ان کے نزدیک انگریزوں فرانسیسیوں اور جرمنوں میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ وہ ان سب کو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے خیال کرتے تھے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جب ترکی محاذ پر دول متحدہ کی طرف سے التوائے جنگ کا اعلان ہوا تو ترکوں کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور وہ تقریباً سب شرائط کو تسلیم کرنے کے لیے طیار تھے جو اتحادیوں کی طرف سے پیش کی جائیں۔ ان کو اس کا مطلقاً علم نہ تھا کہ شرائط صلح کیا ہونگی لیکن اس کا ضرور یقین تھا کہ اتحادی ان مواعید و مواثیق کے خلاف ورزی نہ کریں گے جو انھوں نے التوائے جنگ کے وقت

نہایت بلند آہنگی سے کیے تھے۔ رؤف بے نے جو شرائط التوائے جنگ پر دستخط ثبت کرنے والوں میں سے
تھے اور جو آجکل انگورہ گورنمنٹ کے وزیر اعظم ہیں مجھ سے (راقم مضمون) بذات خود ایک مرتبہ تذکرۃً کہا
کہ "مودروس کی گفت و شنید کے موقعہ پر اتحادی اپنی شرائط سے زیادہ اپنے وعدوں پر زور دیتے تھے"
التوائے جنگ کے اصولی شرائط یہ تھیں کہ ابنائے کلیۃً آزاد رہیں گی اور اصول قومیت وخود اختیاری کا
ہر طرح لحاظ رکھا جائیگا۔ پہلی شرائط دفعہ نمبر (۱) اور دوسری شرائط دفعہ نمبر (۷) کے ماتحت ہیں۔ دفعہ، کی
رو سے دول یورپ کے حدود بھی مقرر کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ غیر ترکی صوبجات کے علاوہ اپنا اثر نہ قائم کر سکیں
دفعہ (۲۷) کی رو سے اتحادی ترکی صوبوں پر اس وقت تک پیشقدمی نہیں کر سکتے جب تک کہ ترکوں کی طرف سے
اتحادیوں کے حقوق پر ناجائز حملہ نہ کیا جائے یا جب تک آرمینیہ کے علاقہ میں فتنہ و فساد دفع کرنے کی
ضرورت نہ محسوس کی جائے۔ لیکن بغیر کسی خاص وجہ کے دول متحدہ نے قسطنطنیہ تھریس اور اناطولیہ کے
بڑے رقبہ پر اپنا تسلط جما لیا۔ بیکس ترکوں میں اس وقت صدائے احتجاج تک بلند کرنے کی طاقت نہ تھی۔
التوائے جنگ کی ان اصولی شرائط کے خلاف ورزی کی گئی اور دوسرے شرائط مثلاً تخفیف فوج۔
سامان حرب کا حوالہ کرنا وغیرہ وغیرہ پر نہایت شد ومد کے ساتھ عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ انہیں ایام
میں یہ افواہیں بھی گرم ہونی شروع ہوگئیں کہ باقی ماندہ ترکی صوبے بھی اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیے
ہیں اور ترکی صوبوں کا بڑا حصہ یونان کے حصہ میں آیا ہے۔ حقیقتاً یہ افواہیں درست نہیں۔ دوران جنگ
میں اتحادیوں نے ایک خفیہ معاہدہ آپس میں کیا تھا کہ مشرقی اناطولیہ اور قسطنطنیہ کا علاقہ روس کو دیا جائے
اور سینٹ جین ماریں کے معاہدہ کی رو سے سمرنا اور عدلیہ پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ روس اسی زمانہ
میں انقلاب کی ابتلائے عظیم میں مبتلا تھا۔ اس کی حالت حد درجہ زبون تھی۔ چنانچہ قسطنطنیہ اور ابنائے
کے علاقہ کے متعلق اتحادیوں میں اختلاف شروع ہوا۔ دول متحدہ کا خیال ہوا کہ اگر ان علاقوں کو
ٹرکی کے نام نہاد تصرف میں رکھا جائے تو آپس کی نااتفاقی کا خدشہ مٹ جائے گا۔ حقیقتاً اسی آپس کی
نااتفاقی کی وجہ سے مسٹر لائڈ جارج نے اپنی تقریر میں با دل ناخواستہ اظہار فرمایا "کہ ہمارا مقصد ایشیائے کوچک
اور قسطنطنیہ کے مشہور و معروف خطوں اور زرخیز زمینوں پر قبضہ کرنا ہرگز نہیں"۔ اس اعلان سے اور بعد

فوائد بھی مطلوب تھے جن کے ذکر کا یہاں موقعہ نہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ نے جنگ میں اس شرط پر شرکت کی تھی کہ دوران جنگ کے تمام خفیہ معاہدات یکقلم منسوخ کر دیئے جائیں۔ چونکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس وقت امریکہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی اس لیے اس شرط کو فوراً منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ دونوں حکومتوں نے اعلان کر دیا کہ سنہ ۱۹۱۶ء اور سنہ ۱۹۱۷ء کے تمام معاہدے جو روس کی شرکت کے ساتھ کیے گئے تھے منسوخ کر دیئے گئے کیونکہ حکومت روس اب ہماری شریک کار نہیں رہی۔ اب یونان اپنی تمام دیرینہ امنگوں کے ساتھ میدان میں آتا ہے!

اگر روس نے اتحادیوں سے دست کشی اختیار کی تو ان کو اس کی بجائے ایک دوسرا تازہ دم رفیق مل گیا جو اب تک کسی سے برسرپیکار نہ تھا یعنی یونان؛ اگرچہ مقدونیہ کے علاقہ میں یونانی افواج سے کافی مدد ملی تھی لیکن یونان کی طرف سے جو اس خدمت کے انعام کا مطالبہ کیا گیا وہ حد سے متجاوز تھا۔ صلح کانفرنس میں مسٹر وِنزیلوس (وزیر اعظم یونان) نے جو رپورٹ پیش کی اس میں نہایت منطقی طریقہ سے تھریس، قسطنطنیہ، جنوبی البانیہ اور مغربی اناطولیہ معہ بندرگاہ سمرنا پر اپنا استحقاق ظاہر کیا۔ ساتھ ہی تمام ممالک یورپ میں پروپیگنڈے کے ذریعہ اپنے آپ کو برسر حق ہونے نیز ان تمام علاقوں میں یونانی نسل کے لوگوں کی اکثریت (چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں لیکن یونانی نسل میں داخل ہو سکتے ہیں) ظاہر کرنے کی بڑی شد و مد سے کوشش کی گئی۔ بعض مقامات میں جب علم اعداد و شمار کے بیجا استعمال سے بھی کوئی فائدہ متصور نہ ہوا تو یہ امر ثابت کیا گیا کہ ان لوگوں کی کہانیاں اور دیرینہ رسوم یونانیوں سے ملتی جلتی ہیں غرضکہ مقصد برآری کی تدابیر اختیار کرنے میں کوئی کوتاہی اپنی دانست میں نہ باقی رہنے دی۔

واقعتاً مسٹر وِنزیلوس اپنے غیر ذمہ دارانہ افعال سے مستقبل کے خطرہ کو دل ہی دل میں محسوس کرتے تھے لیکن مسٹر لائڈ جارج مسٹر ولسن اور مسٹر کلیمنشو کی ہمت افزائی نے جو ناقابل عمل عزائم اور ولولے ان کے دل میں پیدا کر دیئے وہ ان کی عقل سلیم اور سنجیدہ فطرت کی راہبری پر غالب

آ گئے۔ اُدھر انگلستان اور فرانس کی طرف سے اس لئے اور بھی خاطر مدارات ہو رہی تھی کہ ان کو مشرق قریب میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے فوجوں کی ضرورت تھی اور دونوں ملکوں کی مالی حالت جواب دے چکی تھی۔ بس پھر یونانی فوجوں سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا؟ مسٹر وِنزیلوس نے کانفرنس میں اپنا اثر اور بھی زیادہ یہ کہکر پیدا کر لیا کہ "عنقریب دنیا دیکھ لے گی کہ ترک ان تمام علاقوں میں ایک عیسائی بھی زندہ نہ چھوڑیں گے"۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے ان اعلیٰ حکام کے مشوروں کی بھی مطلقاً پروا نہ کی جو ترکوں کے ساتھ رہ چکے تھے اور ان کی فطرت اور قومی عصبیت سے بخوبی واقف تھے۔ بہر حال باوجود اٹلی کی سخت مخالفت کے یونانی افواج کو سمرنا میں داخلہ کی اجازت مل گئی۔ ۱۵ مئی کو یونانی فوج اتحادی جنگی جہازوں کی سرکردگی میں سمرنا کے ساحل پر اتری۔ متصل علاقوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ ممکن تھا ترک لوگ کسی متمدن اور شائستہ قوم کے داخلہ پر اتنے برافروختہ نہ ہوتے لیکن یونانیوں کی اس قوم کو جو مدت دراز تک ان کے محکوم رہ چکے تھے اور جو نظام تمدن کے مبادی اصول سے بالکل نابلد تھے کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ ہر وہ متنفس جو قوم ترک کی نفسیات سے کچھ بھی درک رکھتا ہو اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ لیکن دول متحدہ کے مدبرین پر تو ایک یونانی سحر طراز (مسٹر وِنزیلوس) کے جادو نے اپنا کافی اثر قائم کر دیا تھا۔ باوجود اتحادی کمیشن کے تحقیقاتی رپورٹ شائع ہونے کی اجازت نہ دینے کے تمام دنیا پر یونانیوں کی ہولناک ستم آرائیاں ظاہر ہو گئی ہیں۔

ترکوں کا شیرازۂ نظام اس وقت بالکل منتشر تھا لیکن لوگوں کی خودداری اور عصبیت فنا نہوئی تھی۔ یونانیوں کے مقابلہ کے لیے اُنھوں نے خود گروہ بندی شروع کر دی۔ یونانیوں کی فوج اس وقت اسی ہزار سے زائد پہونچ گئی تھی۔ یہ فوج اب اسی علاقہ تک محدود نہ رہی جہاں تک کہ کانفرنس نے اجازت دی تھی بلکہ اور پیشقدمی شروع کر دی۔ باقاعدہ سمرنا یونانی حکومت کا مرکز قرار دیا گیا اور مسٹر استر گیڈس کو اس علاقہ کا ہائی کمشنر مقرر کیا۔ یونانی تسلط کی خبر

تمام ترکی علاقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ اور چونکہ التوائے جنگ کے بعد صلحنامہ پیش کیے جانے تک اس قدر تعویق برتی گئی تھی کہ ان ایام میں ترکوں کو اپنی بے بسی کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور وہ احیائے قومی کی تحریک جو چند ذہنوں تک محدود تھی اب ایک عظیم الشان کام انجام دینے کی کفیل ٹھہرائی گئی۔ یہ تحریک عام طور پر مصطفےٰ کمال پاشا کے اسم گرامی کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن دنیا کی یہ مہتم بالشان ہستی خود اس تحریک کی بانی نہیں ہے۔ اس کے اصلی بانی تو وہ یونانی مدبرین ہیں جنھوں نے ساحل سمرنا کی طرف اپنی افواج روانہ کی تھیں۔ التوائے جنگ تک مصطفےٰ کمال سیاسیات میں کم دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اب تک ان کی زندگی ایک فوجی زندگی تھی (سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں یہ مقدونیہ میں تھے اگرچہ دوسرے فوجی افسروں کی طرح یہ بھی شریک کار رہے لیکن نمایاں حیثیت سے نہیں) دوران جنگ میں اُنھوں نے دردانیال اور فلسطین کی لڑائیوں میں اپنی قابلیت کے خوب اچھی طرح جوہر دکھلائے تھے۔ مقابلتاً ان کا رجحان اتحادیوں کی طرف زیادہ تھا۔ سنہ ۱۹۱۷ء ہی میں ان کو اتحادیوں کی کامیابی کا پورا یقین ہو گیا تھا چنانچہ اُنھوں نے جلد از جلد صلح کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

جب سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ ہو گیا تو اُنھوں نے ترک قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو اناطولیہ میں ایک نظام کے ماتحت لانے کی کوشش کی ارض روم اور سیواس کی کانگریسوں میں انھیں کو صدر منتخب کیا گیا۔ سیواس کی کانگریس کے بعد اُنھوں نے مدافعت کے لیے فوجی نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ آہستہ آہستہ ترکی قسمت کا فیصلہ مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں پر منحصر ہو گیا اور قسطنطنیہ کی دخل اندازی محض برائے نام رہ گئی۔ غالباً اس وقت سوائے داماد فرید پادشاہ کے اور کوئی متنفس نہ تھا جو غازی موصوف کی ان حرکات کو از راہ بدگمانی نہ دیکھتا ہو۔ داماد فرید نے ان پر بغاوت کا الزام لگایا کہ وہ سلطان المعظم کے اختیارات میں مداخلت کرتے ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف اعلان کر دیا۔ اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ دول متحدہ کی تمام حرکات التوائے جنگ کی شرائط کے صریحاً خلاف ہیں

جن میں ہر حکومت کو (اور ہم کو خاصکر) حکومت خود اختیاری کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں داماد فرید وزارت سے برطرف کر دیئے گئے اور ان کی بجائے علی رضا پاشا منتخب ہوئے جو ترکان احرار کے طرفدار تھے اور ان کی تمام حرکات کو حق بجانب خیال کرتے تھے۔ اس انتخاب عام میں حریت پسندوں نے پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت حاصل کر لی۔

۲۸ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو ممبران پارلیمنٹ نے کثرت آراء سے یہ قرارداد منظور کی کہ "ٹرکی کو حریت کامل سے کم پر قناعت نہ کرنی چاہیے۔ نیز کارس اردھان اور باطوم کے علاقوں کو اپنی گورنمنٹ کے متعلق حق فیصلہ ان کے انتخاب عام پر منحصر قرار دیا جائے۔"

انگریز خاص طور پر قسطنطنیہ میں اس قسم کی جماعت کی موجودگی کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں مجلس کابینہ کے اکثر ممبروں کو جن میں رؤف بے (موجودہ وزیر اعظم انگورہ گورنمنٹ) بھی شامل تھے گرفتار کر لیا گیا اور بعض کو مالٹا جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کو تمام سرکاری اور امور عامہ کی عمارات پر انگریزی سپاہ کا قبضہ ہو گیا۔ مجلس نے اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی اور علی رضا مستعفی ہو گئے۔ اور ان کی بجائے داماد فرید ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو دوبارہ برسر اقتدار ہو گئے۔

شیخ الاسلام کے ذریعہ ایک فتویٰ شائع کیا گیا جس کی رو سے مصطفےٰ کمال اور ان کے تمام ہم مشربوں پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور جلاوطنی کا حکم بھی دیدیا گیا۔ مصطفےٰ کمال نے انگورہ میں نئی پارلیمنٹ منعقد کی اور چونکہ برٹش گورنمنٹ نے اکثر ممبروں کو گرفتار کر لیا تھا اور ان کو انگورہ جانے کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے جدید انتخاب کا اعلان کر دیا گیا اور انتخاب کے بعد ۲۹ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ مصطفےٰ کمال صدر جمہوریت قرار پائے اور باقر سمیع بے وزیر خارجہ نئی گورنمنٹ نے تمام سرکاری ملکیت پر اپنا قبضہ کیا اور انگورہ میں قسطنطنیہ بنک کی شاخوں کو بھی اپنے زیر اہتمام لے لیا۔

اپریل سنہ ۱۹۲۰ء مقام سین ریمو میں "کونسل اعلیٰ" نے اتحادیوں کے نمائندہ جماعت ہونیکی

حیثیت سے شرائط صلح کی ترتیب دی۔ اور باوجود اتحادی افسروں کی سخت تاکید کے الوالی اور سنجک کا علاقہ یونان کے حوالہ کیا اور سلطان کے تسلط کو برائے نام تسلیم کیا۔ قسطنطنیہ کو (مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے) ترکوں کے لیے چھوڑ دیا گیا اور آبنائے پر بین الاقوامی کمیشن منعقد کیے جانے کا فیصلہ کیا۔ عرب صوبے ترکوں کے اثر سے بالکل علیحدہ کر دیئے گئے چونکہ ترکان احرار نے ان شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا یونان کو اس امر کا اختیار دیا گیا کہ وہ ان شرائط کو بہ جبر منوائے۔

جون کے آخری دنوں میں یونان نے اپنا حملہ شروع کر دیا اور یونانی افواج بالیکستر سے شمالی جانب روانہ ہو کر بحر مارمورہ تک پہونچ گئیں۔ تھریس میں جعفر طیار کے ماتحت جو سپاہ تھی اس سے مقابلہ ہوا اور جعفر طیار کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا اور ۲۵ جولائی کو ایڈریانوپل پر یونانی قبضہ ہو گیا۔ یونانیوں کو مغالطہ ہوا کہ اب ترکوں کی رہی سہی طاقت کا بھی بالکل خاتمہ ہو گیا۔ ان فتوحات کی اصل وجوہ یہ تھیں کہ اول تو ترکوں کی تمامتر توجہ باقاعدہ افواج کی ترتیب میں لگی ہوئی تھی اور دوسرے انہیں ایام میں مقام بروسا پر ترکان احرار کے خلاف اور اتحادیوں کے ایما سے احمد انزلور کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کر دیا گیا جس کو فرد کرنے کے لیے بہت قوت صرف کرنا پڑی۔ یونانی مادی حیثیت سے بہ مقابلہ ترکوں کے اچھی طرح مسلح تھے اور التوائے جنگ کے بعد سے اتحادیوں نے ہر ممکن طریقے سے مدد و اعانت کی۔

اس زمانہ میں دو ایسے اہم واقعات پیش آئے جنھوں نے جانبین کی سیاسی حالت میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر دیا۔ ایک تو ترکان احرار اور بالشویک روس کے مابین اتحاد اور دوسرے مسٹر وینزیلوس کا وزارت یونان سے برطرف کیا جانا۔ چونکہ روس کے تعلقات دول عظمیٰ سے کشیدہ تھے اس لیے ترکوں سے ان کے دوستانہ تعلقات پیدا ہونا بالکل طبعی امر تھا۔ ترکی کے ذی فہم مدبرین روس کے ساتھ اتحاد کے لیے دل سے متمنی نہ تھے لیکن سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے مصطفےٰ کمال روس سے عہدنامہ کرنے کے لیے طیار ہو گئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو دونوں ممالک کے نمایندوں نے اس عہدنامہ پر دستخط ثبت کیے۔ بایں ہمہ ترکوں نے اپنے تعلقات قائم

کرنے میں نہایت حزم و احتیاط برتا۔ اس عہد نامہ کی رو سے صرف دونوں ملکوں کی حدود کا تصفیہ کر دیا گیا، مراعات بکلم محو کر دیئے گئے اور آبناؤں کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا۔ اخلاقی اور مادی مدد بالشویکوں کی طرف سے بصد شکر قبول کی گئی لیکن فوجی کمک یا حدود ترکی میں اشتراکیت کی تبلیغ کو مطلقاً منع کر دیا گیا۔

اسی عرصہ میں شام۔ ہندوستان۔ اور عراق میں جو تحریکات دول عظمیٰ کے برخلاف رونما ہوئیں ان کی دراصل تمامتر ذمہ داری دول عظمیٰ ہی پر عائد ہوتی ہے کہ انہوں نے مشرق قریب میں ایسا برا سلوک کیوں روا رکھا۔ ترک بہت مدت سے ترکی قوم کے آپس میں اتحاد کی کوشش کر رہے تھے لیکن اتحادیوں کے اس سلوک نے ان کو تحریک "اتحاد اسلام" کی طرف متوجہ کر دیا۔ ایک قوم پرست ترک نے مجھکو (راقم مضمون کو) یقین دلایا کہ اگر اتحادی اور خصوصاً انگریز ترکوں سے حقیقی معنی میں مصالحت کر لیں تو ترکوں کو ہندوستان یا مصر کے معاملات میں مطلقاً دلچسپی نہ رہیگی۔

مسٹر وینزیلوس وزیر اعظم یونان کی علحدگی کے بعد ہی فرانس کی خارجی پالیسی میں ایک اہم تغیر واقع ہوا۔ فرانس نے واقعات کے رجحان سے بہت جلد معلوم کر لیا کہ ترکوں کے ساتھ مفاہمت کرنے میں اس کے ملک کا مفاد مضمر ہے۔ اگرچہ برطانیہ قسطنطین کو برسر اقتدار ہونا پسند نہیں کرتی تھی لیکن عہد نامہ سیورے کے خلاف کرنے میں برطانوی مدبرین مذبذب تھے اٹلی تو پیشتر ہی سے یونان سے خار کھائے بیٹھا تھا اور شروع ہی سے اس کی ہمدردی ترکوں کے ساتھ تھی۔ یونان کی سیاسی تبدیلی کے ساتھ ترکی محاذ پر جو یونانی افسر تھے ان میں سے اکثر کی بجائے دوسرے شہنشاہیت پسند افسر مقرر کیے گئے۔ چنانچہ ان چند در چند وجوہ سے جو آیندہ اثر پڑا وہ میں ابھی بتلاتا ہوں۔

یہ ظاہر تھا کہ موجودہ صورت حال عرصہ تک قائم نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ اتحادیوں نے لندن میں فروری ۱۹۲۱ء میں ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی۔ دول مغربی جاپان اور یونان کے

علاوہ ٹرکی کی دونوں گورنمنٹوں کو بھی دعوت دی (قسطنطنیہ کی گورنمنٹ اس وقت تک قائم تھی)۔ کثرت آرا سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ ایک اتحادی کمیشن بیٹھے جو مختلف فیہ علاقوں کے متعلق ایک رپورٹ پیش کرے۔ دونوں حکومتوں کو اس کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔ ترکی نمایندے طیار تھے لیکن یونانیوں نے اس کو قبول سے انکار کردیا۔ ۱۲۔ مارچ کو ایک یہ اسکیم پیش کی گئی کہ صلحنامہ سیورے پر کچھ ترمیمات منظور کرلی جائیں یعنی یونان اناطولیہ کے تمام مغربی علاقہ کا تخلیہ کرے اور سمرنا پر لیگ اقوام کے زیر اثر ایک عیسائی گورنر مقرر کیا جائے۔

دونوں حکومتوں کے نمایندوں نے اس تجویز کے متعلق اپنی اپنی گورنمنٹوں سے مشورہ کی مہلت طلب کی۔ بس اس کے بعد کانفرنس ختم ہوگئی اور کوئی بھی کسی خاص فیصلہ تک نہ پہونچ سکا باقر سیمع بے (وزیر خارجیہ جو اس وقت ٹرکی کی نمایندگی کر رہے تھے) نے فرانس اور اٹلی سے اسی عرصہ میں متعدد تجارتی عہدنامے کرلیے لیکن چونکہ مجلس عالیہ انگورہ نے ان کو منظور کرنے سے انکار کردیا اس لیے باقر سیمع بے کو مستعفی ہونا پڑا۔ اس استعفے کی اصلی وجہ دوسری تھی۔ باقر سیمع بے نے مسٹر لائڈ جارج کے ساتھ ایک دفعہ دوران گفتگو میں کہا تھا کہ ترکوں کو بالشویکوں سے کوئی محبت نہیں اور اگر اتحادیوں کی طرف سے عمدہ سلوک کی امید ہوسکے تو ترک روس کی دوستی کو بالائے طاق رکھنے کو طیار ہیں۔ چند روز بعد ہی یہ پوری گفتگو روس کے سرکاری اخبار نے نقل کی۔ ساتھ ہی گورنمنٹ روس نے مصطفےٰ کمال سے سخت شکایت کی۔ چنانچہ اسی بنا پر باقر سیمع بے کو اپنی گفتگو کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ کی وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔

یونانیوں نے اپنا دوسرا حملہ اس وقت تک شروع کردیا تھا۔ پہلے پہل کچھ فتوحات حاصل ہوئیں۔ لیکن تھوڑے دن کے بعد وہ اپنے پرانے محاذ عسکی شہر واپس آگئے۔ ۱۰۔ امئی ۱۹۲۱ء کو دول متحدہ نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ اپنی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے یونان نے اپنا تیسرا حملہ شروع کردیا اور اس مرتبہ عزم بالجزم کرلیا کہ ترکوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیں گے۔ بعض مقامات پر انہوں نے فتح حاصل کی لیکن ترکوں کی فوج کا زیادہ تر حصہ صحیح سلامت واپس چلا گیا۔ اس کے بعد تقریباً

ایک سال تک طرفین کی کوئی قابل ذکر فوجی کاروائی نہیں کی گئی۔

اس عرصہ میں سیاسی شاطرانہ چالیں دونوں طرف جاری رہیں۔ فرانس نے دوبارہ مسٹر فرنکلن کو انگورہ روانہ کیا تاکہ انگورہ گورنمنٹ سے گفت و شنید کریں۔ چنانچہ ایک معاہدہ پر طرفین کی طرف سے ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو دستخط ثبت کیے گئے۔ اور دوسرے روز مجلس ملیہ انگورہ نے اس کی منظوری دیدی۔ اس معاہدہ کی رو سے فرانس کو شام اور سلیشیا کے اضلاع خالی کرنے پڑے۔ اب گویا اتحادیوں میں سے ایک بڑی قوت نے انگورہ گورنمنٹ کو باضابطہ تسلیم کرلیا۔ اب ترکان احرار کو اپنی تمامتر توجہ یونان کی طرف منعطف کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اس عہدنامہ کی وجہ سے فرانس اور برطانیہ میں بھی کچھ کشیدگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ اب یونان کی ہمت افزائی کے لیے صرف برطانیہ باقی رہ گئی تھی۔

۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کو لارڈ کرزن نے ایک نہایت اہم تقریر کی جس میں انگلستان کو غیر جانبدار ہونے پر بہت زور دیا اور ساتھ ہی یونان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے انعام کا (جو عنقریب حاصل ہو جائیگا) نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا۔ ۱۵۔ فروری ۱۹۲۲ء کو مسٹر گونیریز نے لارڈ کرزن کی توجہ اپنے ملک کی ناگفتہ بہ حالت اور فوجوں کی بے سروسامانی کی طرف مبذول کرائی۔ اور یہ بھی ظاہر کردیا کہ اس حالت میں ترکوں کے خلاف عرصہ تک مقابلہ کی تاب لانا بالکل محال ہے۔ لارڈ موصوف نے لندن میں بیٹھے بیٹھے صبرو استقلال کی تلقین کی اور اطمینان دلایا کہ سلسلہ جنبانی جاری رکھو۔ لارڈ کرزن نے اس خط کی نقل تمام وزارت برطانیہ کے ممبرون کے پاس بھیجدی تھی لیکن ایسے اہم معاملہ پر بغیر غور و فکر کا موقعہ دیئے ہوئے اپنی ذمہ داری پر جواب دیدیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو پیرس میں پھر اتحادیوں کی طرف سے متحاربین کو شرائط صلح پیش کی گئیں ان شرائط کی رو سے قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور تھریس کے حدود دشتلجا سے بحر مارمورہ تک متعین کیے گئے نیز ترکوں کو اپنی فوجی تعداد بڑھانے کی اجازت دیدی گئی۔ ٹرکی ان شرائط پر صلح کے لیے طیار تھا بشرطیکہ اناطولیہ کا علاقہ یونانی فوراً خالی کردیں۔

غرضکہ حسب سابق اس مرتبہ بھی اس کانفرنس سے کوئی خاص مقصد حاصل نہ ہوسکا۔

اس کے بعد یونانیوں نے پھر ارادہ کیا کہ آخری جنگ کریں اور اس مرتبہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے شرائط بجبر منوائیں۔ مسٹر لائڈ جارج نے ۴ ا۔ اگست کو جودارالعوام میں تقریر کی اس میں یونان کی بہت طرفداری کا اظہار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفےٰ کمال کو پورا یقین ہوگیا کہ برطانیہ سنجیدگی کے ساتھ اناطولیہ کو خالی نہ کرائیگا اور اعلان کردیا کہ اب ترک بغیر کسی کی مدد کے اپنی قوت بازو سے اپنے جائز حقوق کو حاصل کرینگے۔ ترکان احرار کا حملہ عصمت پاشا کی زیر سرکردگی یونانی لشکروں پر شروع ہوگیا۔ یونانی سپاہ پیشتر ہی سے بددل ہورہی تھی ایسے بے تحاشہ بھاگنا شروع کیا کہ شاید اس کی نظیر تاریخ میں ملے۔ راستہ میں جتنے شہر اور گاؤں پڑے سب کو یہ لوگ خاک سیاہ کرتے گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ ۹ تاریخ کو ترکی سپاہ بغیر کسی مزاحمت کے سمرنا میں داخل ہوئی۔ پچاس ہزار یونانی قیدی گرفتار کیے گئے اور بہت سا سامان حرب بھی ان کے ہاتھ لگا۔

جب یونانی سپاہ اپنے ملک واپس پہونچی تو اس نے اپنی گورنمنٹ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور قسطنطین کو تخت سے برطرف کرکے اس کے بیٹے کو بادشاہ بنایا اور دوسرے وزرا منتخب کیے۔ پانچ سابق وزیروں پر مقدمہ چلایا گیا اور آخر میں ان پانچوں کے گولی ماردی گئی۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۲ء کو یونان نے اتحادیوں سے درخواست کی کہ وہ ان کے معاملہ میں مداخلت کریں۔ چنانچہ التوائے جنگ کی گفت وشنید ختم ہونے کے بعد خود دول متحدہ نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ صلحنامہ سیورے میں ترمیم کی جائے۔ انگورہ گورنمنٹ نے اپنی انہیں پرانی شرائط کا اس مرتبہ بھی اعادہ کیا جو اس نے تین سال قبل اپنے میثاق ملی میں طے کی تھیں یعنی تمام ترکی صوبوں کو غیر ترکی اثر سے بالکل پاک کردیا جائے۔ اس میثاق ملی کے ماتحت اناطولیہ تھرس اور قسطنطنیہ کا پورا علاقہ دول عظمیٰ کو خالی کرنا پڑتا تھا۔ فرانس اور اٹلی تو نیم راضی تھے لیکن صلح کی راہ میں کوئی رکاوٹ تھی تو وہ برٹش گورنمنٹ تھی۔

جب ترکان احرار کا لشکر مظفر سمرنا کی فتح سے فارغ ہوکر آبناؤں کی طرف متوجہ ہوا تو

برٹش گورنمنٹ نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ ترکوں کے خلاف دفاعی جنگ کرے گی چنانچہ وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) نے نوآبادیات کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کر لیا۔ بہت دنوں تک یہ خدشہ رہا کہ نہ معلوم کس چھوٹی سی بات پر آتش جنگ مشتعل ہو جائے۔

جب جنگ کا احتمال اس قدر بڑھ گیا تو فرانس اور اٹلی نے فوراً اپنے فوجی دستوں کو واپس آنے کی ہدایات روانہ کر دیں۔ اس وقت اتحادیوں کا نام نہاد اتفاق اپنی اصلی شکل میں دنیا کے روبرو ظاہر ہو گیا۔

دول متحدہ کے نمایندوں نے آپس کی گفت و شنید کے بعد ترکوں کو پیرس میں صلح کی گفتگو کے لیے دعوت دی۔ اناطولیہ اور تھریس (دریائے مرتضیٰ تک) کو ٹرکی کے زیر تصرف رکھے جانے اور تخلیہ قسطنطنیہ کے متعلق ترکوں کو پیشتر ہی سے مطلع کر دیا۔ آبناؤں کے متعلق جو اس کانفرنس میں فیصلہ کیا جائے اس کو عملی صورت میں لانا لیگ اقوام کے ذمہ کیا گیا۔

مدنیہ کانفرنس منعقد ہوئی اور ۱۹ اکتوبر کو بہت کوشش و کاوش کے بعد اس کی کارروائی ختم کی گئی۔ اور صلح کانفرنس کی تاریخ ۱۳ نومبر (بعد میں تاریخ ۲۰ نومبر کر دی گئی) مقام لوزان میں مقرر کی گئی۔ مدنیہ کانفرنس کی شرائط کی رو سے اتحادیوں نے تھریس کے علاقہ کو اپنے انتظام میں غیر ترکی عنصر سے خالی کرانا شروع کر دیا۔ اب ترکوں نے اس کے بعد برطانیہ کو قسطنطنیہ خالی کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا آہستہ آہستہ جیسا سب لوگ جانتے ہیں ترکوں نے تمام انتظام اپنے قبضہ میں کر لیا۔ جب قسطنطنیہ پر اچھی طرح اپنا قبضہ ہو گیا تو اس کے بعد سلطان کو معزول کر دیا اور وہ مالٹا فرار ہو گئے۔ اس کے بعد ترکوں نے مراعات سے (جو غیر ترکی اقوام کو حاصل ہیں) نجات حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آجکل دوسرا اہم مسئلہ عدالتوں کا ہے۔ اتحادی اپنی عدالتیں علیحدہ ہی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

میرے نزدیک اس کا تصفیہ اس صورت سے ہو سکتا ہے کہ اتنے عرصہ تک کے لیے جب تک ترکی عدالتی نظام با قاعدہ نہ ہو جائے لیگ اقوام کے ماتحت ایک عدالت مقرر کر دی جائے

جو اس وقت تک کام انجام دے سکے۔

مجھکو (راقم مضمون کو) پورا یقین ہے کہ اقتصادی ضروریات کی وجہ سے ترکوں کو اس میں نفع رہیگا کہ وہ ہمارے ساتھ صلح کرلیں کیونکہ ان کو اپنے مددگار بالشویک روس سے کسی قسم کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ وہ تو خود دیوالیہ ہو رہا ہے۔

میرے خیال میں ترکوں کے ساتھ جب کسی قسم کا معاملہ کیا جائے تو تین باتوں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ اتحادی خود موجودہ حالت کے ذمہ دار ہیں کیونکہ اُنھوں نے ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور یونانیوں سے حکمرانی کرانے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے یہ کہ ترکوں میں اب رتقاے قومیت پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ تیسرے یہ کہ ترکوں کو اب "پرانے ترک" یا "نوجوان ترک" نہ خیال کرنا چاہیئے بلکہ اب وہ "جدید ترک" ہیں۔

اگر ہمارے مدبرین ان باتوں کو خیال میں رکھیں تو مصالحت کی صورت نکل سکتی ہے۔ ہم کو یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ترکوں کا بمقابلہ مغربی دول کے روس سے تصادم کا بہت زیادہ گمان ہے کیونکہ قسطنطنیہ اور تھریس پر ہمیشہ روس کا دانت رہیگا۔ آبناؤں کے متعلق بھی لوزان کانفرنس میں عصمت پاشا کا رویہ نہایت صلح پسندانہ رہا ہے اور امید ہے کہ اگر اتحادیوں کی طرف سے بھی کوشش کی گئی تو مفاہمت کی کوئی شکل ضرور نکل آئیگی۔ ترک اپنے اس رعب و دبدبہ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو اُنھوں نے حال ہی میں حاصل کرلیا ہے اگر دول مغربی ان تمام امور پر لحاظ رکھینگی تو مجھکو امید ہے کہ "جدید ترکوں" سے مصالحت ہو جائیگی۔

(ماخوذ)

یوسف حسین خاں
متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

مطبوعاتِ جدیدہ

ہیئت جدید

پروفیسر منہاج الدین بی اے، ایم ایس سی اور پروفیسر برکت علی ایم اے، بی ایس سی اساتذہ طبیعات
و ریاضیات پشاور کالج کی یہ تازہ تالیف جس کا پہلا حصہ مبادی ہیئت، تجاذب مادی، ہیئت عملی،
مناظر ہیئت، کل چار مقالوں سے بحث کرتا ہے، موضوع سے اپنی ناآشنائی کے باوجود میں نے دلچسپی
سے پڑھی اور یہی اس کتاب کا سب سے زیادہ قابل ستایش پہلو ہے۔ نصاب تعلیم کی حیثیت سے اس نسخے
فائدہ مند ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ مگر پیمایش وقت کے مختلف ذرائع اور گھڑیوں کی تشریح
مختلف سنیں و تواریخ کے حالات ایک سے دوسرے کا استخراج، مد و جزر، موسم کی تبدیلیاں، دوربین،
اختلاف مناظر، مناظر فضائی، کسوف و خسوف ایسے مباحث ہیں اور اس دلچسپ طریقہ سے بیان کئے
گئے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا آدمی خواہ ہیئت سے قطعاً نابلد کیوں نہ ہو مستفید اور محظوظ ہو سکتا ہے قوم کی
عام معلومات علمیہ کی سطح کی بلندی کے لیے ایسی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ اگرچہ دنیاے اردو
بدمذاقی کا لحاظ کرکے اس قسم کی تالیفات مولف کے لیے سخت ایثار کی محتاج ہیں۔

وضع اصطلاحات کا اشکال جو دوسری مالدار زبانوں کے مصنفین کے مقابلے میں اردو کے اہل قلم
کے لیے ایک حوصلہ شکن گھاٹی ہے، جابجا سلاست بیان میں حارج ہو جاتا ہے۔ بعض مقامات پر عربی کی
اصطلاحات موضوعہ بھی اسی طرح تشریح و توضیح کی محتاج نظر آتی ہیں جس طرح اصل یونانی، لاطینی یا
انگریزی مصطلحات۔ مگر جب تک ایک ہی موضوع پر متعدد کتابیں نہ لکھی جائیں اور اصطلاحات علمیہ کثرت
استعمال سے حلقہ تعلیم میں دائر و سائر نہ ہو جائیں یہ دقتیں ناگزیر ہیں۔ بایں ہمہ موانع بیان واضح
اور سلیس، نقوش بہت صاف اور صحیح ہیں اور ہم مؤلفین کو ان کی اس کامیاب علمی خدمت پر داد
دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرہنگ مصطلحات انگریزی و اردو آخر میں ضم ہے۔ کاغذ عمدہ تقطیع ۲۹×۲۲ چھپائی صاف
حجم ۲۴۰ صفحے قیمت قسم اول ہے/ قسم دوم ۲/۔ مولفین ممدوحین سے مل سکتی ہے۔

بصائر

خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی اُستاد تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ نے جن کی تفسیر القرآن فی معارف القرآن سورہ بقرہ ملک میں مقبول ہوچکی ہی۔ یہ رسالہ بھی تالیف کیا ہی۔ فرعون کے قصّہ کو قرآن مجید کی متفرق آیات سے جمع کرکے اس پر اپنے مخصوص سیاسی طرز میں تبصرہ کیا ہی۔ کتاب نہایت سبق آموز اور دنیا کی موجودہ حالت سے مشابہت و موازنہ کے باعث نہایت بصیرت بخش اور دلچسپ ہی۔ تورات اور قران کے بیان قصص کا فرق لطیف، قران کے انتخاب و ایجاز کا راز، متحدہ قومیت جس کے توڑنے کی فرعون نے کوشش کی، فرعون کا اصل خوف کیا تھا، نتایج جبر و استبداد وغیرہ نہایت حکیمانہ مباحث ہیں۔ اور بیان واضح و دلنشیں کتابت و طباعت پاکیزہ تقطیع $\frac{20\times 30}{8}$ موزوں حجم ۴۹ صفحے قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

رشحاتِ اوج

حافظ محمد یعقوب صاحب اَوج گیاوی اپنے کلام کے ذریعے سے جو اکثر اُردو رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہی ملک میں کافی طور پر روشناس ہوچکے ہیں۔ ان کی بائیس نیچرل، اخلاقی، اور مذہبی نظموں کا یہ مختصر مجموعہ جو چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحوں پر چھاپا گیا ہی بغرض تنقید وصول ہوا ہی یہ نظمیں زیادہ تر قطعات شبلی، کلام حالی، نعت امیر مینائی اور مولوی ظفر علی خاں کی نظم طغیانی و دو د موسٰی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں اور اس کوشش میں حضرت اَوج بہت کچھ کامیاب کہے جاسکتے ہیں یہ مجموعہ نوجوانان ملک کے لیے سبق آموز اور مفید ہی اور عام دیباے تغزل کے مقابلہ میں قابل قدر مگر ان نظموں سے زیادہ دلچسپی تو مجھے خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی "پیر و میر" کی تقریظ سے ہوئی جس کا آغاز یوں ہوتا ہی "غایت شاعری یہ ہی کہ محاورات و اصطلاحاتِ زبان کی حفاظت کی جائے" اور آخری فقرے یہ ہیں "نظم میں محض اعلے خیالات سے کام نہیں لیا ہی بلکہ

شاعری بھی کی گئی ہی............ جناب آوج میں ایک خاص بات یہ ہی کہ وہ ضبطِ محاورات میں خاص احتیاط سے کام لیتے ہیں اور دائرۂ تقلید زبان سے باہر قدم نہیں سکتے ہیں جیسا کہ عموماً آجکل کے شعرار کے یہاں دیکھنے میں آتا ہی۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زبان اپنے اصلی مرکز (لکھنؤ) کے تحت میں ترقی کر رہی ہی" (؟!)

بنگلور کی طباعت کے لحاظ سے رسالہ غنیمت چھاپا گیا ہی قیمت فی جلد ۵ ر

ملنے کا پتہ :۔ کے حاجی محمد محی الدین تاجر کتب نمبر ۳۹۹ موچی بازار معسکر بنگلور

"ناقد"

رفتارِ تعلیم

"ہندوستانی فن لطیف کی خصوصیات" پر ڈاکٹر مس اسٹیلا کرامرش (مقیم حال شانتی نکیتن) نے میسور یونیورسٹی میں دو لکچر دیے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے پہلے لکچر میں یہ بتایا کہ ہندوستانی فن لطیف آج ہمارے سامنے کس حالت میں ہے؟ ان کے خیال کے بموجب یہ محض خیالات کی تصویر ہے، بجائے اس کے کہ نفسِ حقیقت کا مرقع ہو۔ دوسرے لکچر میں انھوں نے جاوا۔ سیام۔ چین۔ جاپان اور وسط ایشیا کے فن لطیف پر بحث کی۔ انھوں نے بیان کیا کہ کس طرح سے ان ممالک میں اس فن نے جدید شکل اختیار کرلی ہے تاہم ہندوستانی خصوصیات ان میں بہت کچھ پائی جاتی ہیں۔

یاد ہوگا کہ گزشتہ ماہ اکتوبر میں موصوف نے ہمارے جامعہ ملیہ میں بھی "اسلامی فن لطیف" پر ایک مبسوط اور دلچسپ لکچر دیا تھا۔

یہ دیکھکر کہ اسٹریا کی باشندہ اور ڈاینا یونیورسٹی کی تعلیمیافتہ لیڈی ہندوستانی اور اسلامی فنون لطیفہ کے مطالعہ اور ترویج میں اس قدر سرگرم ہے، یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہمارے علوم و فنون اغیار کے ہی منت کب تک رہیں گے؟ لیکن کم و بیش جو دلچسپی فنون لطیفہ سے اب پیدا ہو رہی ہے اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ شاید عہد جہانگیری و اکبری پھر لوٹ آئے۔ لیکن اور قوموں کی بہ نسبت ہندوستانیوں کی رفتار ابھی سست ہے۔

سویٹ گورنمنٹ کی طرف سے طفلس میں ایک یونیورسٹی کھلی ہے تاکہ ترکی، ایران، خیوا، بخارا، افغانستان، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے طلبا وہاں جاکر تعلیم حاصل کریں۔ تقریباً ایکسو طلبا جو بالخصوص ترکی اور ایران کے ہیں، اس تعلیمگاہ میں داخل ہو چکے ہیں۔

اکسفرڈ، کیمبرج اور دیگر مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیمی نتائج تو دیکھ لیئے، اب ذرا دیکھیں کہ

انقلاب جدید کی یہ درسگاہیں کیا اثر رکھتی ہیں؟

ایک طرف ہماری قدامت پرستی کا یہ عالم ہے کہ جس پاٹھ شالے یا مکتب میں جائیے آج سے دو ہزار اور پانسو برس پیچھے کا سمان نظر آتا ہے، دوسری جانب مغرب کی جدت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ نت نئے تعلیمی تجربے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ استادوں کے ذریعہ حصولِ علم تو سُنا ہوگا لیکن بن اُستاد کی تعلیم بھی دیکھی ہے؟

انگلستان میں ایک مدرسہ مالبروڈ یمانسٹریشن اسکول کے نام سے قائم ہے۔ اس کے شیر خوار بچوں کے شعبہ میں کوئی ۲½ برس سے ایک بہت ہی اہم علمی تجربہ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی چار سو غریب بچے دس جماعتوں میں منقسم ہیں۔ عمارت کی کل زیب آرائش ایک میز جس پر ایک پیانو رکھا ہوتا ہے اور ایک کرسی ہے۔ بچوں کو کوئی اُستاد باقاعدہ پڑھانے نہیں آتا بلکہ وہ اپنی تربیت آپ اپنے سے حاصل کرتے ہیں۔ البتہ ہر جماعت میں ایک نگراں ہوتا ہے، سامان تعلیم میں چند سادہ آلات رکھے ہوتے ہیں جنھیں بچے خود بخود استعمال کرتے ہیں، ان کی تندہی اور توجہ گزاری کا اندازہ چھوٹی ہی جماعتوں سے ہونا شروع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بڑی جماعتوں میں آکر ۷-۸ برس کے بچے اس نظم و تربیت اور سکون و توجہ کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی نمائش کی گئی ہے۔ اور اونچی جماعتوں میں آپ ان سے باتیں کیے جایئے لیکن ان کے کام میں کسی طرح کا فرق نہیں آتا۔ اور ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک بچہ ۴ سال کی عمر میں داخل ہوا، کوئی دو ہفتہ تک وہ ادھر ادھر پھر کر اپنے ساتھیوں کی تمام حرکات کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ ان تصاویر اور آلات سے جو دیواروں پر لگے ہوئے تھے، کام لینے لگا۔ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہ تھا اور تین ہفتہ تک اس نے یونہی اپنا وقت گنوایا لیکن حقیقت میں کیا یہ وقت کا گنوانا تھا؟ اب یہی بچہ ایک دوسرے اسکول میں داخل ہوتا ہے اور نہایت ہوشیاری

اور مستعدی سے اپنے لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہی۔

اسی طرح ایک دوسرا بچہ اور داخل ہوتا ہی جو ابتدا میں نہایت شریر اور گستاخ تھا، کوئی کام کاج نہ کرتا۔ اس کی اصلاح اس طرح پر ہوئی کہ جب کبھی وہ کوئی شرارت کرتا تو معلمہ (جس کا کام پڑھانا نہیں بلکہ نگرانی ہوتا ہی) اس کو چھوٹی جماعتوں کے سامنے لیجا کر اس سے مخاطب ہوکر یہ کہتی کہ "اگر ان بچوں کو کوئی عذر نہ ہو تو تم ان کے ساتھ رہ سکتے ہو" اس پر وہ بچے اظہار افسوس کرتے اور صرف یہ کہتے کہ "ہمیں ایسے لڑکے کی ضرورت نہیں" یہی حال ہر جماعت میں ہوتا۔ اب وہ غریب بچہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا اور سوچتا کہ اتنے لڑکوں کی ناخوشی وہ کب تک گوارا کر سکتا ہی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شریر بچہ تھوڑے دنوں میں سیدھا سادہ نیکبخت بن گیا۔

شانتی نکیتن میں ہندوستانی علوم قدیمہ کی تعلیم و اشاعت کے لیے جو کوشش کی جارہی علمی طبقہ میں اس سلسلہ میں یہ خبر بھی دلچسپی سے سُنی جائیگی کہ ڈاکٹر ٹیگور نے سنسکرت کے قلمی نسخوں کے لیے ایک اپیل شائع کیا ہی۔ ان علوم کے قلمی نسخے جو سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری قدیم زبانوں میں ہیں، بے اعتنائی کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں یہ دیکھکر وشوابھارتی (شانتی نکیتن کالج) نے انکی تہذیب ترتیب اور طباعت و اشاعت اپنے ذمہ لی ہی مسٹر آر۔ ایس شاستری نے جو بڑودہ لائبریری میں رہ چکے ہیں، اس کی فراہمی کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔

جرمنی میں موجودہ سیاسی اور معاشی مشکلات کی وجہ سے وہاں کی تعلیمی فضا جس حد تک غیر متاثر رہی، وہ اور ممالک کے حالات دیکھتے ہوئے جرمنی کے ذوق علم و فن پر دال ہی۔ ابھی حال میں یہ معلوم ہوا ہی کہ وہاں کی معاشی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے بارہ ہزار طلبا میں سے آٹھ ہزار طلبہ خارجی اوقات میں کام کر کے اپنی تعلیم کے مصارف ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے ۳ ہزار کی تعداد ایسے طلبہ کی ہی جو روزانہ ۸ گھنٹہ کام کرتی ہی اور اس سے جو وقت بچتا ہی وہ

مطالعہ کتب میں گزرتا ہی یہ طریقہ نہ صرف مجبوراً اختیار کیا گیا ہی بلکہ علمی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہی۔ خیال ہی کہ اس طریقہ سے طلباء اپنے حاصل شدہ علم کا صحیح استعمال بھی جان لیں گے اور آپ اپنے کفیل بھی ہوں گے۔

مسٹر ایس۔ اے پانڈے نے "تعلیم اور اس کے اغراض و مقاصد" پر مسلسل کئی مضامین لکھے ہیں۔ ایک نمبر میں موصوف نے تعلیم کی غرض بتائی ہی کہ "زندگی کو خوشگوار بنانا خواہ وہ انفرادی ہو یا قومی"۔ پھر اسی اُصول کی تشریح موصوف نے اس طرح پر کی ہی "کوئی شخص روزی کمانے کے لیے کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہی تو اُس کو چاہیے کہ وہ کسی صنعتی اسکول میں جائے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری جو امر ہی وہ یہ کہ اس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی خوشگوار اور مفید طریقہ پر کیونکر بسر کر سکتا ہی۔ ہم صدہا نوجوانوں کو دیکھتے ہیں جو اپنی زندگی میں بے انتہا بے اُصول اور بے کار نظر آتے ہیں۔ دیکھا ہوگا کہ کیسی جلدی وہ مغربی فیشن اور تقلید کے عادی بن جاتے ہیں اور اپنے ماضی کو کس طرح بھلا دیتے ہیں۔ ان سے اُتر کر عوام کو دیکھو جو سوسائٹی کے سنگ بنیاد ہیں۔ کس طرح سے وہ بدکاری، شراب نوشی اور دیگر مسکرات کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اکثر ان میں سے پیشہ کی تعلیم پائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن زندگی ان کے لیئے دو بھر ہو جاتی ہی۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ تعلیم نہیں ہوتی۔

"آج کل علمی تعلیم پہ صنعتی تعلیم کو ترجیح دی جاتی ہی تاکہ تعلیم یافتہ اپنی روزی پیدا کر سکیں لیکن یہ دونوں چیزیں جدا جدا ہیں۔ موخر الذکر سے تعلیم کا مقصد یعنی "زندگی کو خوشگوار بنانا" کبھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ علمی تعلیم کے بدلے صنعتی تعلیم پر زور دینا میرے خیال میں ایک قدم پیچھے ہٹنا ہے۔

۱۱۔ مارچ کو سر آشوتوش چودھری نے قومی مجلس تعلیم بنگال کے ایک کالج کا سنگ بنیاد

رکھتے ہوئے بیان کیا کہ مجلس مذکور بسلسلہ تقسیم بنگال ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی، پھر آپ نے عطیات کی تفصیل اور مجلس کی تدریجی ترقی بیان کی اور اُمید ظاہر کی کہ آیندہ سال کے وسط تک تمام عمارات وضروری سامان فراہم ہو جائیں گے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۲۱ء میں ۳ ہزار طلبہ اور ۱۹۲۲ء میں دو ہزار طلبہ نے داخلہ کی درخواست دی لیکن اس مرتبہ ۶۵۰ سے زیادہ طلبہ نہیں لیئے جا سکتے۔ مجلس نے کچھ اساتذہ اور طلبہ کے بغرض تعلیم باہر بھیجے جانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

"معلم"

مخمس بر غزل غالب

گر ٹھہرتا ہی نفس ضعف سے ور ہونے تک — دب کے رہ جاتا ہی سرگرم سفر ہونے تک
اور جو یہ آگ چمکتی بھی ستر ہونے تک — آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہونے تک

گلشن عشق میں سیکھو رہ و رسم تسلیم — گنج امید کی زینت ہے یہاں سایۂ بیم
ہے پریشانی نکہت اثر لطف شمیم — پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دل مضطر نہ ٹھہرنے میں ہے رشک سیماب — اُن کا انداز تغافل ہی قیامت کا جواب
جی میں ہے حضرت ناصح سے یہ پوچھوں کہ جناب — عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

دل تڑپتا ہے کہ سرگرم فغاں ہو تم بن — غیرت عشق یہ کہتی ہے۔ یہ ہے ناممکن!
اس کشاکش میں یہ بیمار جیئے گا کے دن — ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

جس کو سمجھا تھا جہاں چشمۂ حیواں وہی دل — شوق کے بل یہ ہے اُس برق فنا کا حاصل
جس کی اک لہر میں ہو زیست کا دعویٰ باطل — یک نفس بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہی اک رقص شرر ہونے تک

دل کو ہے تربیت جوہر باطن کی امنگ — سر میں ہی ساغر مستانہ عشرت کی ترنگ
روز رہتی ہی فسوں سازی اوقات سے جنگ — دام ہر موج میں ہی حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہی قطرے پہ گہر ہونے تک

آپ کیا پوچھتے ہیں اپنے مریضوں کا مزاج — اُن کو رکھنا ہی سیہ نامۂ تقدیر کی لا

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج　　درد مند تپ الفت کو شفا کل ہو نہ آج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

عابد - برلن مارچ ۲۳ء

کلام شاد عظیم آبادی

فلک کا ذکر تو کیا ہے زمیں کے بھی نہ رہے　　ہم اپنی چال سے آخر کہیں کے بھی نہ رہے
شکائتیں تری آئیں زباں پر آخر کار　　گئی جو ہاتھ سے دنیا تو دیں کے بھی نہ رہے
سُنا ہے بعد فنا کے ہے زندگانی پھر　　اگر یہی ہے تو پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہے
سوالِ وصل کیا اور ہوئے عدم کو رواں　　ہم انتظار میں تیری نہیں کے بھی نہ رہے
بتاؤ کون سنبھالے گا شادؔ مستی میں
اگر حواس بجا ہمنشیں کے بھی نہ رہے

وہ سبق سیکھ کہ دل جس پہ نظر دوختہ ہے　　گل و بلبل کی کہانی تو اب آموختہ ہے
اس پہ بھی تیر اثر پا نہیں جاتا اے صید　　ٹانکے پلکوں میں ہیں پابستہ و پردوختہ ہے
شاد عظیم آبادی

شذرات

ہرو لہلم شوانز جن کی تصویر آج شائع کی جاتی ہے ایک شصت سالہ بزرگ ہیں جو ایک بہت بڑی تعلیمی اور معاشرتی تحریک کے رہنما اور ایک ہردلعزیز رسالہ کے مدیر ہیں۔ "معلم ملت" نام ہے اُس جماعت کا جس کے ممدوح صدر ہیں اور اُس رسالہ کا بھی جو اُس جماعت کا آرگن ہے۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ عوام الناس خصوصاً کاشتکاروں کے لیے عام تعلیم اور اخلاقی تربیت کا سامان مہیا کرے اور انھیں سلطنت کے زیر اہتمام تعلیم سے جو اکثر سیاسی مصالح پر مبنی ہوتی ہے بے نیاز کر دے۔ اس جماعت کے اراکین کی تعداد پانچ ہزار ہے جو جرمنی کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر ان میں مدرسین ہیں لیکن تجار۔ صناع۔ اہل قلم اور سیاست داں طبقہ کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔

یہ بزرگ نہایت با اخلاص۔ بے بناوٹ سادہ مزاج اور صوفی منش ہیں۔ تصوف کے سلسلہ میں انھیں ہندوستان سے دلچسپی ہوئی اور ہندو اور مسلمان صوفیوں کے حالات اور خیالات کا تجسس کرنے لگے۔ بھگوت گیتا اور کیمیائے سعادت موصوف کی مرغوب کتابوں میں سے ہیں اور امام غزالی کو یہ مغرب کے بڑے سے بڑے صوفیوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ممدوح کو بیحد ہمدردی ہے اور ہمارے رسالہ کے لیے اکثر مضامین عنایت فرمانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

ذیل میں ممدوح کے مختصر حالات زندگی خود اُن کے قلم کے لکھے ہوئے نقل کیے جاتے ہیں۔

ولیلم شوانز۔ ۱۰ نومبر ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوا جو مشہور مجدد عیسویت مارٹن لوتھر اور روانا کے باکمال شاعر فریڈرش شلر کا یوم ولادت ہے۔ اس نے اپنے وطن کو رباخ میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک ریاست بین کے مقام سومبرگ میں ایک سیمنار مین رہبانیت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۴ء تک وبلدنڈ میں مدرس کے خدمات انجام دیتا رہا۔ اس عرصہ میں اپنی

آزاد خیالی کے سبب اُس سے اور متعصب مذہبی لوگوں سے جو کلیسائی عیسویت کی اندھی تقلید کرتے تھے بگاڑ ہوگیا۔ اُس نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور کچھ دن کیّل میں اور بعدازاں برلن میں ایک روزانہ اخبار کا مدیر رہا ۱۸۹۰ء میں مدرسوں کی آزادی کے لیئے احتجاج کرنے کے سلسلے میں اُسے مہینوں قید کی مصیبت جھیلنا پڑی۔ اس سے پہلے وہ ایک سال تک ایک مذہبی رسالہ کی ادارت کرچکا تھا اور قید سے رہائی پانے کے بعد اُس نے ایک معاشرتی۔ تعلیمی اور مذہبی اخبار "معلم ملت" کے نام سے نکالا۔ اس اخبار کی اشاعت کو اب ستائیسواں سال ہے اور جرمن قوم کے ہر طبقہ میں اس کے ہمدرد، بہی خواہ اور رفیق موجود ہیں۔ ولیلم شوانر نے جرمن نسل کے بہترین شعرا۔ فلسفیوں۔ صوفیوں اور ہر قسم کے مصنفین کی مقدس تصنیفات کا انتخاب ..... "جرمن انجیل" کے نام سے تالیف کرکے تین جلدوں میں شائع کیا۔ علاوہ اس کے اُس کی تصنیفات میں "خدا کی جستجو مختلف قوموں میں"۔ "روشنی کی تلاش" "زندگی کی جہاں گردی" وغیرہ وغیرا اور دو چھوٹے رسالے جس میں سوتے جاگتے کے خواب بیان کیئے گئے ہیں۔ اور "نورانی راتیں" اور "نورانی دن" ہیں۔

جرمنی کے مدرسین کا بہت بڑا حصہ اُس کے گرد جمع رہتا ہے اور اُس کے کام میں اُس کا دست وبازو ہے۔

اُس کی زندگی اور اُس کی زندگی کی کارگزاری خالص مذہب کے لیئے وقف ہے اور ہندوستان کے مصلح مہاتما گاندھی کے طرز عمل سے مشابہ ہے۔

س

ڈاکٹر اقبال کو آج تک صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ حیات ملی کے نازک پر خطر دور کا نبض شناس اور آنیوالے حوادث و آلام سے متنبہ کرنے والا پیغامبر سمجھا گیا ہے۔ خیالات کی بلندی نے جذبات کی پاکیزگی کو اعجاز بنا کر پیش کیا اور دل کی درد و تڑپ نے دنیا کو وہ چیز بخشی جو بالآخر کلام اقبال کے نام سے مشہور ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تصنیف "پیغام مشرق" اگر پیغامی حیثیت میں

نہیں تو اپنے شاعرانہ انداز میں اُن کی دوسری فارسی تصنیفات سے زیادہ بلند اور زیادہ وسیع ہی۔ اُنھوں نے اس مجموعہ میں ملت اسلامی کے کسی ایک پہلو سے بحث نہیں کی ہی بلکہ مختلف متفرق اشعار، قطعات، رباعیات، نظموں اور غزلوں میں مشرق کی روح کو مغربی دماغ کے لئے پیش کیا ہی تاکہ مغرب کے بعض افراد جو اپنی بلند پروازی اور وسعت خیال کے لئے دنیائے مغرب کو تنگ پاکر فضائے مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں اس مجموعہ میں اس کی ہمہ گیر و عدیم النظیر وسعت کا کچھ اندازہ کرسکیں اور اپنی استعداد کے مطابق اُس سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔

پیغام مشرق درحقیقت المانوی شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کا جواب ہی جو آج سے قبل اقلیم سخن کے اس تاجدار نے اپنی زبان (جرمن) میں شائع کیا تھا۔ گوئٹے مشرقیت کا دلدادہ تھا، خواجہ حافظ کے علاوہ سعدی و فردوسی سے بھی اُس نے خوشہ چینی کی تھی اور فارسی شاعری سے اُس کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مجموعہ کلام کو "مغربی دیوان" کے نام سے موسوم کیا اور بعض غزلیں بھی اپنی زبان میں تصنیف کیں۔

اقبال نے اپنی جدید تصنیف کے متعلق خود ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہی۔

"پیغام مشرق کے متعلق جو 'مغربی دیوان' کے سو سال بعد لکھا گیا ہی مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کرلیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی، اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہی جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہی۔"

جامعہ ملیہ کے کتب خانہ کے متعلق ایک مضمون ماہ فروری کی اشاعت میں نکلا ہی جس سے اس کتب خانہ کی موجودہ حالت و علم دوست و ہمدرد اصحاب کی گرانقدر اعانت کا کسی قدر اندازہ ہوجاتا ہی۔ مقام مسرت ہی کہ اس ماہ میں ہمارے کتب خانہ کو تقریباً پانسو جلدیں اور وصول ہوئی ہیں جس کو ایک بزرگ کی ذاتی لائبریری کہنا چاہیئے۔

مولوی محمد عسکری صاحب مرحوم جن کا حال میں انتقال ہوا ہے۔ ہاپڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ایک عرصہ سے فیض آباد اور دوسرے مقامات میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ مرحوم جدید یونیورسٹیوں کے ڈگری یافتہ نہ تھے شاید اسی لیے علمی ذوق سے بہرہ وافر رکھتے تھے اور کتب بینی کے عاشق تھے۔ دفتر کی ملازمت میں ان کاموں کے لیے وقت نکالنا اور اپنی محدود آمدنی سے ایک مختصر و مفید کتب خانہ قائم کر لینا ان بزرگوں کی بلند ہمتی و خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟ چنانچہ مولوی محمد عسکری صاحب نے بھی اردو کے تقریباً تمام بلند پایہ مصنفین کی کتابوں اور بہترین ادبی رسالوں کا (جنمیں مخزن اسوۂ حسنہ وغیرہ قابل ذکر ہیں) ایک مختصر کتبخانہ فراہم کر لیا تھا، جو ان کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی اہلیہ صاحبہ کی عنایت سے جامعہ ملیہ کو حاصل ہو گیا۔

کتنے ہی نادر و قابل قدر ذاتی کتب خانے آج اپنے مالکوں کی ناقدر دانی و غفلت کی بدولت فنا ہو رہے ہیں اور یہ حالت اس قدر عام ہے کہ اُس کو دیکھتے ہوئے اس نیکدل خاتون کی یہ فیاضی و اولوالعزمی باعث صد تحسین و آفریں ہے۔

مسٹر واڈوا ٹپسن دنیائے صحافت میں جو قابل رشک شہرت رکھتے ہیں۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ لکزآن، کرانیکل، انڈیپنڈنٹ، اور نیشن کے صفحات اُن کی بلند پایہ لطیف و ظریف تحریروں سے پر ہیں۔ علاوہ اخباری و سیاسی قابلیت کے وہ علمی و ادبی حلقوں میں بھی کافی معروف ہیں اور اپنی طرز کے نہایت پر لطف شاعر ہیں ان خصوصیات کے علاوہ اُن کے جذبات اسلامی و ہمدردی ملکی بجائے خود اک دلکشی رکھتے ہیں نہایت مسرت ہے کہ فی الحال اُنھوں نے جامعہ ملیہ کی خدمت کو قبول فرما لیا ہے۔ اساتذہ جامعہ میں ان کا اضافہ بلاشبہ قابل قدر ہے جہاں وہ علاوہ دیگر فرائض کے نصاب تعلیم کی طیاری میں بھی امداد کر رہے ہیں۔

سول ایجنسی

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ کو مطبوعات
ذیل کا ہندوستان میں مطلق حق فروخت
(سول ایجنسی) حاصل ہے۔ اور اصلی قیمت
پر فروخت ہوتی ہیں۔

ا۔ مطبوعات شرکت کاویانی (برلن)

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مع روشنائی نامہ
وسعادت نامہ (فارسی) مصنف چوتھی صدی ہجری
کے آخر میں پیدا ہوا تھا۔ اس عہد کے
بلاد اسلامیہ کے چشم دید حالات نہایت
دلچسپ عبرت آموز ہیں مصنف کی دو غیر مطبوعہ
نایاب مثنویاں بھی جو اخلاق اور فلسفہ و حکمت
پر ہیں اس میں ضم ہیں سرورق و سرنامہ
اصل ایرانی نسخہ کے موافق مطلا و رنگین
کاغذ و چھپائی نظر افروز ۔ عہ

۲۔ **سنی ملوک الارض و الانبیاء** (عربی)
مؤلفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی سنہ ۳۵۰ ھ
میں لکھی گئی انتہائی کاوش کے ساتھ
قدیم تواریخ فارس، روم، یونان، مصر،
عراق، شام، عرب کے متعلق تمام صحیح و
معتبر سنین کی تفتیش و تحقیق کی گئی ہے جو
شائقین تاریخ کے لیے نہایت دلچسپ مفید ہے
قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ۔ عہ/

۳۔ **تیاتر** (فارسی) از مرزا ملکم خاں
ناظم الدولہ۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنکی قلمی
عملی جد و جہد سے ایران دوبارہ زندہ
ہوا۔ یہ انکے تین نثر ڈراموں کا مجموعہ ہے
گزشتہ صدی کے نظام حکومت ایران
کی ابتری کی تصویر ہے۔ زبان شائستہ
اور لڑکوں کے مطالعہ کے لیے بھی نہایت
موزوں۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ عہ/

۴۔ **موش و گربہ**۔ فارسی
از عبید زاکانی۔ جو آٹھویں صدی کا
مشہور ہجو گو تھا قصہ تو چوہے بلی کی
جنگ کا ہے مگر مقصود ابنا عصر کی ہجو
ملیح ہے جو عہد حاضر پر بھی یکساں چسپاں ہے
ہر صفحہ ایک رنگین تصویر سے مزین ہے۔
نظم سلیس مہذب ہے بچوں کے لیے بھی
نہایت موزوں سبق آموز اور دلچسپ ہے
اس کے سات سے نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت
ہو رہے ہیں۔ قیمت ۰۵/

۵۔ **گلستان سعدی شیرازی**

۶۔ زاد المسافرین۔ حکیم ناصر خسرو۔

ب۔ تصانیف خواجہ عبد الحی صاحب
(استاد تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ)

مولٰنا نے اپنی تمام تصنیفات کی اشاعت
کے واسطے مکتبۂ جامعہ کو اپنا سول ایجنٹ
مقرر کر دیا ہے لہذا آپ کی تمام تصنیفات
صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکیں گی۔

۱۔ **الخلافۃ الکبریٰ**۔ تفسیر الفرقان
کا پہلا حصہ سورہ بقرہ کی جدید اسلوب
پر بہترین تفسیر قیمت للعہ مجلد صہ

۲۔ **الصراط المستقیم**۔ الفرقان کا دوسرا
حصہ جس کا نام اب مولٰنا نے بجائے قانون
جنگ کے رکھا ہے سورۂ انفال و توبہ کی
مفصل تفسیر۔ دو روپیہ عہ/

۳۔ **بصائر**۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کے

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ مطابق اگست ۱۹۲۳ء نمبر ۲

جرمنی کی تعلیمی زندگی

---

(۱) جدید فلسفۂ تعلیم کی تاریخ

(ڈاکٹر فریڈرش ایرنٹ رائش نے خاص جامعہ کے لیے تحریر فرمایا)

یہ مضمون ایک سلسلہ کا پہلا نمبر ہے جو خاص جامعہ کے لیے جرمنی کے ایک نوجوان ماہر تعلیم ڈاکٹر ایرنٹ رائش نے تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر ایرنٹ رائش کرسڈورف کے مشہور مدرسہ میں معلم ہیں۔ یہ مدرسہ اپنی نوعیت میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور جرمنی میں ایک جدید تعلیمی تجربہ ہے۔ خود اس مدرسہ کے اصول اور طریق عمل پر بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سلسلہ میں ایک مضمون عنایت فرمایا ہے۔ جو انشاء اللہ آیندہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔ اس سلسلہ مضامین سے ناظرین کرام کے سامنے جرمنی کی تعلیمی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ پیش ہو جائے گا جو اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ایک جرمن ماہر تعلیم کے قلم سے نکلا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک کے لئے اپنی موجودہ تعلیمی کشمکش میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ترجمہ کے لئے ہم اپنے کرم فرما جناب سید عابد حسین صاحب بی۔ اے متعلم دارالفنون برلن کے ممنون احسان ہیں۔ مدیر

جرمنی، فرانس، اور انگلستان مغربی یورپ کی تعلیمی زندگی کے تین مخصوص نمونے پیش کرتے ہیں۔ انھیں فرانسیسی نظام تعلیم میں سب سے زیادہ مرکزیت (یعنی پیرس میں تعلیمی نظم و نسق کا مرکز ہونا) اور انگریزی طریقہ میں سے سب سے زیادہ آزادی (یعنی معاملات تعلیمی کا شخصی رجحان پر چھوڑ دینا) ہے۔ جرمنی میں نظم و نسق تعلیمی کا طریقہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ طرز تعلیم ہر جگہ کم و بیش یکساں رکھا گیا ہے، لیکن اس کا حل و عقد مرکزی دار الحکومت کے نہیں بلکہ مختلف ریاستوں کی مقامی حکومتوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ طرز عمل میں مختلف ریاستوں کی مقامی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ اختلاف بھی نظر آتے ہیں۔

اہل یورپ کی امتیازی خصوصیت تاریخ کے متعلق ان کا رویہ ہے۔ ان کے نزدیک زمانہ حال کے حالات و خیالات کا سچا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ ان کے معرض وجود میں آنے کے طریقہ سے یعنی ان کی تاریخی رفتار سے بھی واقفیت ہو۔ اس اعتبار سے یورپ کا رویہ گویا رویہ تقفا ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی انقلاب کے کٹر حامیوں کا بھی بغیر اس کے کام نہیں چلتا کہ زمانہ گزشتہ کی تصویر اپنے (مثلاً اشتراکی) رنگ میں کھینچیں اور پھر اسے اپنے معنی پہنائیں۔ لیکن اہل یورپ کی یہ تاریخی پس بینی محض پردۂ خود فریبی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ان کی طبیعت اور ان کی کارگزاری کی حقیقی سیرت پر ہے۔ البتہ بالکل حال میں غالباً مشرقی فلسفہ کے اثر سے غیر تاریخی طرز خیال کی علامت دن بدن بڑھتی نظر آتی ہے۔ یہاں کی تعلیمی تاریخ کا تعلق صرف مغرب سے ہے اور چند دن کی بات ہے کہ مشرقی تعلیمی تجربات مثلاً ٹالسٹائے اور ٹیگور کی کوششوں کی طرف توجہ منعطف ہوئی ہے۔ تعلقات تاریخی کی وسعت کے اعتبار سے جرمنی کی تعلیمی زندگی سب سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ فرانس میں تو اس پر زیادہ تر ۱۷۸۹ء کے انقلاب اور نپولین اول کے اثرات کا پرتو ہے اور انگلستان میں یہ کہیں قرون وسطیٰ سے متعلق ہے اور کہیں بلا روایات۔

جرمنی کی یونیورسٹیاں مثل تمام مغربی یورپ کے دار العلوموں کے قرون وسطیٰ یعنی بارہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی کے ختم تک عالم وجود میں آئیں۔ ان یونیورسٹیوں کے قیام

کی تحریک اس زمانہ کے فلسفہ سے ہوئی جو عقلی طریقہ سے فلسفۂ یونان اور کلیسا کے اصولوں میں تطابق کی کوشش کرتا تھا اور جسے عام طور پر "اسکولاسٹک" (Scholastic) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں سب سے مشہور پیرس میں تھی۔ ادھر کولون اور اسٹراسبرگ کے دار العلوم جرمنی میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن جب پندرہویں صدی کے آخری حصہ میں قرون وسطیٰ کے مجموعی تعقل عالم کی عمارت مسمار ہوگئی تو ان یونیورسٹیوں کے سر بھی قضا منڈلانے لگی کیونکہ (Scholastic) کی ساری طاقت اب ختم ہو چکی تھی۔ اس موقعہ پر یونیورسٹیوں پر ایک دوسرے انداز خیال کا تسلط ہو گیا جو خود اسی عہد قدیم کا نام لیوا تھا جسے "ہومانزم" (Humanism) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر پندرہویں اور سولہویں صدی میں یہ یونیورسٹیاں اپنے عالم شباب تک پہونچیں۔ پھر خود کلیسائی تجدید سے جو (Lutne) لوتھر اور میلانکتون (Melanchton) کے ہاتھوں عمل میں آئی اس سے بھی یونیورسٹیوں کو کچھ نہیں تو اتنی تقویت تو ضرور پہونچی کہ بزرگ ترین (Humanist) فاضل اراسمس (Erasmus) راٹرڈمی کے یونانی علوم میں فضل و کمال سے۔ لیکن تجدید کلیسا کی تحریک سے عقائد کا تضاد یونیورسٹیوں تک پہونچا، چنانچہ اب تک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یونیورسٹیاں الگ الگ ہیں یہاں تک کہ ایک ہی ریاست میں دونوں موجود۔ مثلاً بادن میں فرائی برگ کیتھولک یونیورسٹی ہے، بخلاف اس کے ہائیڈلبرگ پروٹسٹنٹ۔ ہومانزم کے اثر سے بتدریج مغربی علوم و فنون، یعنی قانون، طب اور فلسفہ علوم دین سے علحدہ ہو گئے، لیکن آج تک یونیورسٹیوں کی اسناد اور دفتری کاروبار کا لاطینی زبان میں ہونا اس کا شاہد ہے کہ یونیورسٹیوں کے تمدن کا مورث اعلیٰ کون عہد ہے۔ اس طرح آج تک جرمن یونیورسٹیوں کی روایات کی بنیاد (اگرچہ اس حد تک نہیں جیسے انگلستان میں) زمانہ پیشیں پر اس سے زیادہ ہے جس قدر کہ جدید صنعتی اور فلسفیانہ اسپرٹ کے مطابق ہونا چاہیے تھی۔ پہلے پہل سترہویں صدی یعنی مشہور فلسفی لائبنز (Leibnitz) کے زمانہ میں لوگوں کو ڈلتے ڈلتے یہ بہت

ہوئی کہ یونیورسٹی کی کرسی سے جرمن زبان کا استعمال کریں۔ یونیورسٹیوں کو اپنے ارتقا میں تین مدارج طے کرنے پڑے۔ پہلے یہ کلیسا کی لونڈی بنی، پھر قدیم یونان و روما کی تعلیم کی خردہ فروش اور آخر میں اعلیٰ مغربی تعلیم کا جامع مرکز کیونکہ آج کل خود دینیات تعلیم دنیوی کا ایک جز بن گئی ہے۔ اگر انیسویں صدی میں سائنس کے داخلے اور صنعتی یونیورسٹیوں کے قیام سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو سترہویں صدی کے بعد یونیورسٹی میں کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا۔

قرون وسطیٰ کی تمام تر درسی تعلیم مذہبی حیثیت رکھتی تھی اور کلیساؤں اور خانقاہوں میں اس کا مقام تھا۔ معاشرتی مدارج کے لحاظ سے یہ امیروں کی تعلیم تھی۔ عوام شہری، اور کسان کسی باقاعدہ مدرسہ میں تعلیم نہ پاتے تھے، ان کی تعلیم عموماً جاہل آدمیوں کے سپرد ہوتی تھی جو خود بھی مشکل سے لکھ پڑھ سکتے تھے اور اپنا کم مایہ علم قمچی کے ذریعے شاگرد کے گلے اتارتے تھے۔

لوتھر نے آکر تعلیم کو عوام تک وسعت دینے کی تحریک کی۔ اس نے قرون وسطیٰ کی خانقاہ کی تعلیم پر الزامات لگائے۔ کہ "راہبوں نے اپنے شاگردوں کو اس طرح مقید رکھا ہے جیسے پنجرے میں چڑیاں بند کی جاتی ہیں" اس نے تمام شہروں کے سرپنچوں، مجلس انتظامی کے اراکین، اور میر مجلسوں کو ایک تحریر بھیجی (۱۵۲۴ء) تاکہ وہ پبلک مدارس قائم کریں جس میں عوام کم سے کم انجیل پڑھنا سیکھ سکیں۔ اس طرح تعلیم عوام کی ابتداء پھر مذہب سے ہوئی اگرچہ نیا دارو کا انجیل اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی بیاض و اصول ایمان پر مبنی تقویٰ زمانہ پیشین کے کلیسائی اور راہبانہ عقائد سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن لوتھر شروع ہی سے اپنی عملی جدوجہد میں مدرسوں کے خیال سے بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ "ہمیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے عمدہ مدارس کی ضرورت ہے تاکہ مرد ملک اور قوم پر بخوبی حکمرانی کر سکیں اور عورتیں گھر بار۔ بال بچوں اور نوکروں چاکروں کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکیں"، تاہم ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مدت درکار تھی۔

سب سے پہلے اعلیٰ طبقوں کی تعلیم ہومانی (Humanistic) مدارس میں جن کے جانشین مدارس ہمارے نزدیک موجود ہیں ان مصلحین اور جیسوئیٹ لوگوں (Jesuits) کے اہتمام میں

ہوتی رہی۔ ان میں لاطینی زبان کا درس سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اسکول کی زبان لاطینی
تھی، مدارس کے تماشہ گاہوں میں تماشے لاطینی میں ہوتے تھے۔ اس تعلیم میں سب سے زیادہ توجہ کتابی
سبق یعنی تدریس پر کی جاتی تھی نہ کہ اس چیز پر جو انسان کو انسان بناتی ہے یعنی تعلیم و تربیت۔ یونہی
جرمن اسکولوں نے تعلیم کے حقیقی مسائل کو کچھ دن پہلے تک ہمیشہ درسیات کے پردہ میں پوشیدہ
رکھا۔ چنانچہ جرمن مدارس صنعتی تعلیم میں تو ہمسایہ ملکوں پر بہت ترجیح رکھتے تھے لیکن یہاں وہ
حقیقی مردم آفریں تعلیم نہ تھی جس پر انگلستان اور امریکہ کے مدارس بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔
سترہویں صدی میں اعلیٰ مدارس کی اصلاح کے لیئے دو پہلوؤں سے معرکہ آرائی شروع
ہوئی۔ ایک طرف تو درس و تدریس سے لاطینی زبان کو خارج کرنے اور جرمن زبان کو اس کے
شایاں شان جگہ دینے کی کوشش شروع ہوئی اور دوسری طرف اس کی منطقی خشونت اور سختی
پرحملہ [illegible] کے لیے لڑنے والے راٹکے (Ratke) اور
[illegible] کے لیے خود اپنے مدارس قائم کیے۔
ماریت [illegible] کے خلاف اس اصول کی تلقین شروع ہوئی کہ "ہر چیز بغیر جبر
کے" "ہر چیز قدرت کے نظام قانون کے مطابق"، اس طرح تعلیم کا ایک جدید مطمح نظر قائم ہوا جسکی
بنیاد بہتر درسیات اور آسان طرز تعلیم پر تھی۔ اس موقع پر میرے نزدیک جزوی تفصیل کی بہ نسبت
نشو و نما کی عام رفتار کا دکھانا زیادہ اہم ہے۔ اس مذکورہ بالا معرکہ آزادی کے بعد عوام کی
ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نئے سرے سے اُٹھایا گیا۔ اس بار بھی اس کی کفیل پروٹسٹنٹ مذہب کی وہ
کلیسائی تحریک تھی جو عقائد جمود کے خلاف بلند ہوئی۔ دیہات کی خاموشی میں رہنے والے
مذہبیں (Pietists) نے اس نئی تعلیمات کی بنیاد ڈالی جس نے دینیات اور جرمن زبان کے
درس کے ساتھ دستکاری اور علم الاشیاء کو بھی مدرسہ میں داخل کیا۔ چنانچہ بلا پس و پیش
کہا جا سکتا ہے کہ ان مدارس میں وہ تخم بویا گیا جس کا پھل ہمارے زمانہ کے اوبرریال شولے
(Oberrealschule) ہیں یعنی وہ مدارس جن میں تعلیم کا جزو غالب سائنس ہے۔ اس تعلیم میں

بس ایک چیز کی کمی تھی یعنی ہنسی خوشی اور کھیل کود کی جو بچوں کے سن کے لیے مناسب ہوں۔
اس کی وجہ یہ کہ بچہ کی ذات کی گہری واقفیت ابھی حاصل نہ کی گئی تھی۔ یہ واقفیت اٹھارہویں صدی
کا الہام وانکشاف تھی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس شدید عقل پرست صدی کا حریف کہا جائے کہ نئی تعلیمات
کا درس سرد مہرانہ اور خشک معقولیت پر مبنی نہیں بلکہ اس کی رگوں میں ایک نہایت شدید احساس کا
خون دوڑتا ہے۔ اس حقیقی وتعلیمی صدی میں "فطرت" کا نعرہ گونجتا ہے جسے سب سے پہلے راٹکے
(Ratke) ڈرتے ڈرتے زبان پر لایا تھا۔ انگریز لاک نے اس درس کی بنیاد رکھی
فرانسیسی روسو نے اپنے مہتم بالشان تعلیمی ناول میں اس کی تکمیل کی اور المانی سوئیزرلینڈ
کے پستالوزی نے اپنی قلمی اور عملی جدوجہد سے اس کی تائید کی۔
انسان کے خاطی اور عاصی ہونے کے خلاف روسو بہ بانگ دہل کہتا ہے کہ "انسان قدرتاً نیک
ہوتا ہے، تمدن نے اسے خراب کر دیا ہے" روسو ہی کے زمانہ سے یورپ کی جدید تمدنی یاس مشربی
شروع ہوتی ہے۔ روسو خراب شدہ دنیا کو مخاطب کرکے کہتا ہے "واپس چلو، لوٹو" اسی ابتدائی
بدی سے محفوظ فطری زندگی کی طرف! کہ یہی اس کے نزدیک خدا شناسی کی زندگی ہے۔ بچے کے
دماغ میں علوم وفنون کا ٹھونسنا اسے برباد کرنا ہے۔ پس پبلک مدارس سے دور رہنا چاہیئے۔
ایک شاگرد کے لیے ایک اُستاد درکار ہے جو اپنے آپ کو بس اسی کے لیے وقف کردے یہاں تک
کہ وہ بیس سال کی عمر تک پہونچ جائے اور یہ اس انسانی پودے کو مضر اثرات سے بچاتا رہے
اور اسے اپنے آپ بڑھنے اور پھلنے پھولنے دے۔ انسان کے کردار کے لیے درست وہ چیز ہے
جو قلب اور جذبات سے پیدا ہو نہ وہ جس کا تقاضا عقل وفہم کریں۔
ہر بچے کے لیے علحدہ اتالیق کی تجویز کو روسو عملی جامہ نہ پہنا سکا لیکن اس سے پستالوزی نے
کام لیا۔ اس نے باوجود خارجی مصائب کے ہمیشہ غریب ترین لوگوں کے بچوں کے لیے پدرانہ شفقت
کے ساتھ تعلیمی جماعت قائم کی چنانچہ جرمن دیہاتی مدرسوں نے آج تک اس کے مشفقانہ طرز تعلیم
سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہی نہیں، اس سے بڑے بڑے مشاہیر نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً فروبل

(Froebel) نے خرد سال بچوں کی تعلیم میں، گوئٹے (Goethe) نے اپنے ناول " ولہلم مایسٹر (Wilhelm Meister) میں جہاں اس نے ایک تعلیمی حکومت کی تجویز پیش کی ہے (جس کا بنیادی قانون خود اختیاری ادب ہے) اور فشٹے (Fichte) نے قومی تعلیم کے خیالات میں۔ یہ الفاظ مختصر پستالوزی ہماری فطرت کی قوت مجموعی یعنی ہماری "انسانیت"، ہماری "آدمیت" کی ایسی تربیت چاہتا ہے جو واضح مطمح نظر پر مبنی ہو۔

پستالوزی سے کچھ عرصہ پہلے ہی جرمن میں "حب الناس" کی تعلیمی رو نما ہو چکی تھی۔ اس کے متبعین اعلیٰ تعلیم میں روسو کے اُصول پر عمل پیرا تھے اور بہ حیثیت محبان انسانیت اُنھوں نے اپنے خاص نمونہ کے مدارس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان مدارس نے محض مادی اور خارجی علم کو توپس پشت ڈالا، اور تربیت قلب پر زیادہ توجہ کی اور طالب علم کے لیے بہت وسیع آزادی بہم پہونچائی۔ بہت سے خیالات جدیدہ کو ہم اُن کے مدارس میں اچھی ترقی یافتہ شکل میں موجود پاتے ہیں۔

جذبات کی اس رو نے اگرچہ تعلیمات کو بھی اپنی قوت اور اہمیت سے بہت کچھ حصہ دیا تاہم اسے خود بھی منظم اور مرتب ہونے کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ یہ کام کانٹ (Kant) کے عقلی خیالات نے انجام دیا اور اس کے بعد ہربارٹ (Herbart) نے اگرچہ اس کی استدلالیت نے اس تحریک کو کچھ نقصان بھی پہونچایا۔ ساری کی ساری انیسویں صدی خیالات تعلیمی کی توسیع میں صرف ہوئی اور یہ اس طرح کہ قدیم تعلیمات انفرادی کے بجائے جدید تعلیمات اجتماعی یعنی خود حیثیت اجتماعی کی تعلیم کا مسئلہ روز بروز زیادہ قوی ہوتا گیا۔ ہمارے معاصرین میں سے ماربرگ کے مشہور فلسفی ناٹورپ (Natorp) نے اس مسئلہ پر اور اس کے نظری اُصولوں پر خاص طور سے بحث کی ہے۔ بہت سی علامتیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ بیسویں صدی کو بھی تعلیمی اعتبار سے ایک مخصوص اہمیت حاصل ہوگی۔ چنانچہ جرمنی میں آج ہر طرف جدید تعلیمی تجاویز کی بھرمار ہے جن کا ذکر میں اگلے مضامین میں کروں گا۔

ایک مختصر سے مضمون کی حدود میں مختلف مذاہب تعلیمی کی تاریخ کا محض ایک بیرونی خاکہ ہی

دیا جاسکتا تھا لیکن امید ہے کہ تربیت عقلی و ذہنی کے مقابلہ میں تربیت قلبی و جذباتی کی ترجیح کا نکتہ واضح ہوگیا ہوگا، نیز یہ امر کہ قرون وسطیٰ سے لیکر جب بچہ کی ذاتی قدر سے بہت کم واقفیت تھی اور تصویروں تک میں اسے گویا ایک بڑے آدمی کو چھوٹا بنا کر ظاہر کیا جاتا تھا بچہ کی کیفیات دماغی کے انکشاف تک کیا تغیر ہوا ہے، تربیت و تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت نے محض مضامین درسی کے مقابلہ میں کس طرح اپنے کو آگے بڑھایا ہے اور میدان تعلیم میں جو اصلاً انفرادی تھا شعور اجتماعی کس طرح داخل ہو چلا ہے۔

بس اب ایک بات اور قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ اگر اٹھارویں صدی نظریات تعلیم کی پیدائش میں بہت پیش پیش تھی تو انیسویں صدی کی خصوصیت امتیازی سرکاری مدارس کی تنظیم کو بتایا جاسکتا ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی نے اگر تعلیمی فلسفی پیدا کیے تو انیسویں نے اس کے مقابل مدارس کے مختلف عہدہ دار اور متدین منتظم۔ یوں تو "مذہبیت" کے اثر سے ۱۷۱۷ء ہی میں پروشیا کے اندر ۵ سے ۱۲ سال تک بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہو گئی تھی، بادشاہ وقت نے تقریباً دو ہزار مدارس قائم کرادیے تھے، لیکن جدید مدارس کے قیام کا باضابطہ کام، مختلف نمونوں کی تکمیل، امتحانات اور نصاب کی تنظیم، اساتذہ کی تعلیم، یہ سب انیسویں صدی ہی میں عمل میں آئے۔ چند اہم واقعات درج ذیل ہیں:-

۱۸۳۴ء میں پروشیا میں میٹرک کا امتحان جاری کیا گیا تقریباً اسی زمانہ میں جدید ہیومانسٹک (Humanistic) تحریک کے باعث گنازیم (جرمنی میں ایک خاص قسم کے مدارس کا نام ہے، مختلف اقسام کی مضامین میں ہوگی) زیادہ بار آور ہوئے۔

۱۸۰۹ء میں وہ جامع حیثیات اور ہمہ داں عالم ولیم ہمبولٹ برلن میں وزارت داخلہ اور تعلیم پر مامور ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں فوقانیہ مدارس میں درس دینے والے اساتذہ کے لیے امتحان کے قواعد شائع ہوئے ۱۸۱۷ء میں وزارت تعلیمی کا بجائے خود ایک مستقل عہدہ قائم کیا گیا، نصاب تعلیم تیار ہوئے اور ان میں ترمیم و تنسیخ برابر جاری رہی یہ تمام کارروائیاں زمانہ جنگ عظیم تک جاری رہیں۔ پھر یہاں ہو نکلکر جدید تعلیمی اصلاحات کا باب شروع ہوا۔ اس ساری داستان میں ایک چیز برابر محسوس ہوتی ہے یعنی احساس تاریخی کی روز افزوں شدت۔

مرزا کرمانی

مرزا رضا کرمانی سید جمال الدین افغانی کے ان خاص معتقدین میں سے تھے جو انقلاب ایران کے بانی کہے جاتے ہیں۔ ناصر الدین شاہ فرمانروائے ایران کا قتل انہیں کے ہاتھ سے عمل میں آیا اور بیان یہ کیا جاتا ہے کہ اس کا علم سید موصوف کو بھی تھا۔

(مدیر)

قدرت کی بہترین طاقتیں عموماً کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتی ہیں اور جو طاقت جس قدر دیر میں نمایاں ہوتی ہے اسی قدر اس کے نتائج مفید اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ نسیم سحر کے جھونکے روز چلتے ہیں لیکن ان سے کوئی موسمی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ آندھیاں سال کے خاص خاص اوقات میں چلتی ہیں اور انہیں کے ساتھ ساتھ برق و سحاب کا قافلہ بھی چلتا ہے جو بظاہر مہیب اور خوفناک نظر آتا ہے لیکن دنیا کی کھیتیاں انہی سے سرسبز و شاداب ہوتی ہیں۔

مادی دنیا کی طرح غیر مادی دنیا میں بھی قدرت اسی اصول پر عمل کرتی ہے مثلاً سیاسی دنیا میں تملق، خوشامد، چاپلوسی، عجز، درماندگی اور طوع و رضا کی نمائش روزانہ ہوتی رہتی ہے اور معمولی سے معمولی حکام کی چوکھٹ بھی سجدہائے نیاز کا بہترین ذخیرہ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے لیکن ان سے شخصی، انفرادی اور جزوی فوائد کے سوا کوئی قابل یادگار نتیجہ نہیں نکلتا مگر بہترین اخلاقی طاقتیں یعنی عزم و استقلال، صبر و ثبات، جوش و از خود رفتگی، ایثار و قربانی، شجاعت و دلیری ایک باوقار اور ضابط النفس شخص کی آغوش روح میں پرورش پاتی رہتی ہیں اور جس طرح آندھیاں دامن کوہ سے اٹھکر تمام دنیا میں زلزلہ ڈال دیتی ہیں اسی طرح اس عظیم الشان آدمی کے اندر اور طاقتوں کا طوفان اٹھتا ہے اور جبر و استبداد، ظلم و جور، اور قساوت و سنگدلی کی بنیادوں کو دفعۃً متزلزل کر دیتا ہے۔ سیاسی اصلاح میں اس شخص کو باغی، فتنہ گر اور مفسد کہا جاتا ہے لیکن قومی دنیا میں اسی شخص کا نام قوم پرست، جاں نثار ملک اور محب وطن ہے اور کسی قدر بے پروائی

کے ساتھ کبھی کبھی اسی کو "انقلاب کوش" بھی کہہ دیتے ہیں۔

یہ "مفسد" یا "محبِ وطن" یا "انقلاب کوش" انسان جب اپنے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے اُٹھتا ہے تو جبر و استبداد اور ظلم و جور کی تمام طاقتیں اس کے مقابلہ میں صف بستہ ہو جاتی ہیں اور فریقین کی آویزش و کشمکش اپنے معمولی درجے سے شروع ہو کر نہایت خوفناک حد تک پہنچ جاتی ہے اور جب تک ان کے ترکش عمل و قوت کے تمام تیر ختم نہ ہو لیں یا ان میں سے ایک فنا نہ ہو جائے اُس وقت تک کوئی بھی فتح و شکست کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور یہ آویزش ختم نہیں ہوتی۔ فریقین اپنے کام کو تدریجی طور پر بڑھاتے اور پھیلاتے ہیں مثلاً استبداد سب سے پہلے ترغیب و تحریص کے ذریعے اس کا مقابلہ کرتا ہے وہ اس کے سامنے ہر قسم کے اعزاز و اکرام، جاہ و منصب اور خطاب و امتیاز کو پیش کرتا ہے۔ اب اگر اس کی انقلابی روح اپنے اندر استقامت، استقلال، پختگی، اور کمال نہیں رکھتی تو وہ اسی جام سے مدہوش ہو کر اپنے مقاصد کو فراموش کر جاتا ہے لیکن یہ روح کامل ہے اور اپنے اندر استقلال و استقامت رکھتی ہے تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس منزل سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

اس ناکامی کے بعد استبداد فوراً اپنی دوسری قوتوں کی طرف توجہ کرتا ہے اور جس روح پر مال و زر، اعزاز و اکرام اور منصب و امتیاز کے ذریعے فتح حاصل نہ کر سکا تھا اب خشم و عتاب، تشدد و سخت گیری، بند و زنداں اور دار و رسن کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ حملہ پہلے سے کسی قدر سخت ہوتا ہے لیکن انقلابی روح کی پختگی و استقامت اس کو بھی آسان کر دیتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ استبداد کی دردناک سختیاں انقلاب کوش انسان کی جسمانی کمزوری و اضمحلال کا ذریعہ بن جائیں لیکن وہ اس کے مقاصد کی بالیدگی اور ترقی کو نہیں روک سکتیں۔ تشدد اور سخت گیری خود استبداد کے لئے زہر قاتل ہے لیکن انقلابی روح کے لیے آبِ حیات۔ انقلاب کی روح ہنگامی طور پر دبائی جا سکتی ہے لیکن فنا نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ پودا ہے جو ایک مرتبہ جم کر برگ و بار لائے بغیر خشک نہیں ہوتا۔ فقید الشرق سید جمال الدین افغانی نے کس قدر صحیح لکھا ہے کہ

"انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نیست" صاحب عزم و نیت کو فنا کر دینا اس کی نیت کو فنا کرنے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔
میرزا احمد رضا کرمانی فنا کر دیئے گئے لیکن ان کا مقصد فنا نہیں کیا جا سکا۔ مرزائے مرحوم کی موت نے تمام ایران میں حریت و انقلاب کی روح پھونک دی اور جو کچھ اپنی زندگی تک صرف وہی کہتے تھے ان کی موت کے بعد ہر شخص کہنے لگا۔

لیکن آؤ، ہم یہاں ان واقعات کی تشریح سے الگ ہو کر صرف مرزا مرحوم کی انقلابی روح کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ اپنے اندر کیا خصوصیات رکھتی تھی ؟

نظام عالم کی مشین خیالات، عقائد اور ایمان ہی کے کل پرزوں سے چلتی ہے۔ جو عقیدہ بھی دنیا میں پھیلا دیا جائے اور لوگ اس کو قبول کر لیں وہی نظام عالم کے قیام و بقا کا ذریعہ یقین کر لیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ سے استبداد کا وجود اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ غالب و فاتح اقوام نے استبداد کو برحق سمجھ لینے پر مفتوح و مغلوب قوموں کو مجبور کیا اور رفتہ رفتہ اقوام عالم میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا اور وہ استبداد کو جائز و برحق سمجھنے لگیں۔ لیکن ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ ہر ذی روح جو زندگانی اور حیات کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ وہ اپنے اندر کچھ خاص قوتیں رکھتا ہے اور یہ اس کی فطرت و طبیعت کا اقتضا ہے کہ اس کو ان قوتوں کے بڑھانے ان کو اپنے صحیح موقع پر عمل کرنے اور ہر طرح تکمیل کو پہونچنے کا پورا موقع ملے۔ اس احساس کے ساتھ اس نے استبداد کے طرز عمل پر غور کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے اس فطری اقتضا کے بالکل مخالف ہے۔ اس کو زندگی کی ہر منزل میں قدم قدم پر یہ علانیہ نظر آیا کہ اس کو اپنی قوتوں کے بڑھانے اور تکمیل تک پہونچانے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ اس احساس نے دنیا کی ہوا بدل دی اور خیالات میں عام انقلاب پیدا ہو گیا تو اس عام عقیدہ کے خلاف دوسرا عقیدہ پیدا ہوا یعنی اب استبداد کی جگہ حریت، آزادی اور مساوات نے لے لی لیکن جانتے ہو کہ جن عظیم الشان انسانوں نے انسانیت کے اس مخفی و ضعیف احساس کو تیز، قوی اور مشتعل کر کے دنیا میں بڑے بڑے انقلابات برپا کیے، ان کے آئینہ اخلاق کا نمایاں جوہر کیا تھا ؟

(۱) صبر و استقلال اور ہر قسم کی مصیبت کو خوشی سے برداشت کر لینا۔

"جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ تم اپنے عقائد کے لیے نہایت خوشی سے مصائب برداشت کرتے ہو اور اپنے مذہب کی خاطر موت کو قبول کرنا پسند کرتے ہو تو وہ اُس وقت یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تم میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک کسی بات کی سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہ دیکھ نہ لے کہ لوگ اس حقیقت کے لیے جان دینے پر آمادہ ہیں۔ خطرات کا مقابلہ، قید کی زنجیریں اور پھانسی یہ تینوں دلیلیں لوگوں کو سچائی کا یقین دلا سکتی ہیں۔ اگر تم ان مصیبتوں کو خوشی برداشت کرنے سے انکار کرو گے تو گویا تم دوسرے اشخاص کو اپنے مذہب میں لانے کے تمام ذرائع کو اپنے ہاتھ سے کھو دو گے" (ٹالسٹائے)

مرزا رضا نے اپنے عقائد و خیالات کی خاطر نہایت خندہ پیشانی سے مصائب برداشت کیے تم نے ان کے بیان میں پڑھا ہوگا کہ ان کی جائداد و املاک سے ان کو محروم کر دیا گیا لیکن وہ اس پریشان حالی میں بھی اپنے مقاصد کی طرف سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہ ہوئے۔ ان کو بارہا قید و بند کی سختیاں برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کی پیشانی ہمت پر نہ بل تھا نہ شکن۔ ان کو وحشیانہ جسمانی تکلیفیں پہنچائی گئیں مثلاً ڈنڈے اور کوڑے لگائے گئے لیکن اس حالت میں بھی ان کی زبان حقگوئی سے باز نہ رہی۔ بیوی اور بچے دنیا میں بڑی چیز ہیں اور ان کے لیے انسان ہر قسم کی کفر بے ایمانی پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن مرزا رضا نے اپنے اعلیٰ ترین مقاصد کے مقابلہ میں ان متاعہائے گرانمایہ کو بھی کوئی وقعت نہ دی۔ اپنی زندگی کے پیہم مصائب کا ایک نمایاں نتیجہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی بیوی نے ان سے طلاق لے لی۔ ایک بچہ اپنے والدین کے آغوش محبت سے جدا ہو کر غیر کے سایۂ رحم و شفقت میں پناہ لینے پر مجبور ہوا اور ایک کمسن اور محبوب بچے نے بیکسی و کس مپرسی کے عالم میں سرِ راہ جان دی۔ لیکن ان تمام مصائب و شدائد کے باوجود مرزا رضا کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ مصائب کی سختیاں جتنی بڑھتی گئیں، ان کا عزم و استقلال، صبر و ثبات بھی اور زیادہ ترقی کرتا گیا۔ سچ ہے دنیا کی مصیبتیں ایک بلند پایہ انسان کے اخلاقی قوتوں

کو تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں اور قدرت اسی ذریعے سے ان کے اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر کرتی ہے۔

(۲) مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی

لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ غیر معمولی صبر و ثبات، یہ ناممکن فنا ضبط و استقلال کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے تو جواب یہ ہوگا کہ مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی سے۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہوگی ناممکن ہے کہ انسان جانکاہ مصیبتوں کے لیے تو کیا کسی معمولی سے معمولی مصیبت کو بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہو۔ دنیا میں جن عظیم الشان لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتوں کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، وہ سراپا عشق و شیفتگی کا پیکر مجسم تھے۔ مرزا رضا نے بھی آزادی کی راہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور جس جانبازانہ طریقے سے انجام دیے ہیں، ان میں بھی اپنے مقاصد کے ساتھ اسی جذبۂ عشق و شیفتگی کو دخل تھا۔ وہ قطعاً ان لوگوں میں سے نہیں جن کو خوف و ہراس نے دلیر اور بہادر بنا دیا ہو۔ مصائب شدائد کے مقابلہ میں ان کی دلیری اور بہادری اپنے عظیم الشان مقاصد سے ساتھ عشق و شیفتگی کا نتیجہ تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو ایران سے باہر قسطنطنیہ میں اطمینان و عزت کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کے بیان کے گزشتہ صفحات میں تم یہ پڑھ چکے ہو کہ جب وہ قسطنطنیہ گئے تو نہایت عزت و احترام کے ساتھ سید جمال الدین افغانی کے یہاں رہتے تھے لیکن وہ اس اطمینان و احترام کے طالب نہ تھے۔ وہ اپنے عظیم الشان مقاصد کے آگے ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ اگر قسطنطنیہ میں اس عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے تھے تو پھر ایران کیوں چلے آئے کہ یہاں اگر زید، عمر، بکر سے امن و امان کے لیے درخواستیں کرنا پڑیں تو انھوں نے صاف طور پر کہا کہ

> "ہاں میں یہاں آیا اور امن و امان کا طالب رہا۔ لیکن میرے آنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اپنے مقصد (قتل نائب السلطنت یا قتل شاہ) کو عمل میں لاؤں۔"

کیا ان الفاظ کے پردہ میں مقصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کا وہ حسن جلوہ آرا نہیں ہے جس نے ان کو دنیا اور دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ناصر الدین شاہ کا قتل ہے جس کے ذریعے سے انھوں نے تمام ایران کو نہ صرف نہایت خوفناک اور وحشیانہ مظالم سے نجات دلائی بلکہ ایک حد تک اس کو تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔ اگر قتل فی نفسہ کوئی قابل تعریف اور پسندیدہ عمل نہیں لیکن کیا ایک سفاک، خونریز اور قاتل انسان کا قتل بھی جرم ہے۔ اور اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر الہامی شریعتیں بھی قتل قصاص کے جواز کی بنا پر مورد الزام قرار پائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل میں عامل کی نیت کو دیکھنا چاہیے۔ مرزا احمد رضا نے اپنی نیت کو ایک سوال کے جواب میں ان الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے۔

"مغرب (یورپ) کی تاریخ پر نظر ڈالو جب تک کسی بڑے مقصد کے لیے قتل اور خونریزی عمل میں آئی وہ مقصد پورا نہ ہوا"

مرزا رضا نے بھی ایک بڑے مقصد (آزادی ایران) کی خاطر اور اس مقصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کے جذبہ میں آکر ناصر الدین شاہ کو قتل کیا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ظالم و سفاک انسان کو قتل کر کے ایک قوم اور ملک کو زندہ کر دینا کوئی جرم ہے۔

(۳) قناعت و استغنا۔

دنیا میں اس قسم کے جتنے جانباز و سرفروش گزرے ہیں ان سب کے آئینہ اخلاق کا مشترک جوہر قناعت و استغنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان میں قناعت و استغنا نہ ہو وہ کبھی جانبازانہ خدمت کے لیے اپنے کو پیش نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جس نے مال و زر کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہو، صرف زر و مال ہی کا پرستار ہو کر رہے گا۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایک نادار و حریص انسان ایک دولتمند انسان کے آگے انتہائی عاجزی و فروتنی کے ساتھ کیوں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا اصلی و حقیقی مقصد حصول زر قرار دے لیا ہے اور یہ اس کو صاف

طور پر نظر آتا ہے کہ وہ دولتمند انسان اس کے اس مقصد زندگی کا مالک ہے۔ اس لیے وہ اس امید پر کہ شاید اس ذریعے سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو، اس کے آگے ہر طرح کی ذلت و بے عزتی کو اپنی انتہائی عزت و سربلندی سمجھکر بخوشی برداشت کرلیتا ہے۔ بخلاف اس کے جس شخص نے سونے اور چاندی کے انبار اور تودۂ خاک کو برابر سمجھ لیا ہو وہ ایک گدا کو جس طرح بے نیازانہ نگاہ سے دیکھے گا، اس سے کہیں زیادہ بے پروائی کے ساتھ ایک شاہنشاہ دوراں پر بھی اس کی نظر پڑے گی۔ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے دولتمند انسان کی عزت و احترام کے لیے اپنے اندر کوئی جذبہ نہ پائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے شخص کی زندگی دولت و امارت کے ساز و سامان سے خالی ہوگی۔ اور وہ تنگ خیال مفلس کہا جائے گا لیکن کیا افلاس کوئی عیب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ افلاس فی نفسہ کوئی عیب نہیں یہ صرف اس وقت مذموم ہے جب کاہلی، بے اعتدالی، تن آسانی یا بیفکری اس کا سبب ہو۔ مگر اس دلیر، جفاکش، جانباز اور پرستار حق و صداقت انسان کے لیے جو ان اوصاف کے ساتھ ساتھ قانع اور بے نیاز بھی ہو، افلاس درحقیقت بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی دلیل ہے۔

مرزا احمد رضا بھی دنیا کے ایسے ہی بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگوں میں تھے۔ ان کی زندگی ان کی تنگحالی و پریشان حالی کی ایک زبردست شہادت ہے۔ اُنھوں نے انتہائی عسرت و افلاس میں زندگی بسر کی لیکن اپنی قبائے قناعت کو حرص و طمع کے گرد و غبار سے آلودہ ہونے نہ دیا بلکہ اس سے کچھ اور زیادہ یہ کہ غیر تو غیر اپنے دوستوں کا رہین منت ہونا بھی گوارا نہ کیا۔ ان کے بیان میں تم نے پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایرانی ان کے ساتھ خدمت ملک و ملت کے لیے ہم قول و ہم عہد ہوئے تھے لیکن جونہی مرزا رضا گرفتار کر لیے گئے، سبھوں نے اپنی اپنی راہ لی اور خوف سے چھپے چھپے رہنے لگے۔ مرزا رضا نے باوجود مصائب و شدائد ان میں سے کسی ایک کا نام ظاہر ہونے نہ دیا۔ اس اخفاء راز کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہو گئی تھی کہ مرزا صاحب آزادی کے بعد اگر ان کے پاس جاتے تو وہ یقیناً شکریہ کے طور پر ان کی بڑی مدد کرتے اور اس طرح مرزا رضا کے پاس مال و دولت کا خاصہ سرمایہ جمع ہو جاتا۔ لیکن اس نازک اور سخت نازک موقع پر مرزا رضا کی

قناعت پسندی، بلند نگاہی سے ان کو جس فیصلہ پر آمادہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

دیدم نامرد ہستند، گرسنگی خوردم و ذلت کشیدم دست پیش اعدے دراز نکردم	میں نے دیکھا یہ لوگ نامرد ہیں۔ اس لیے مصیبتیں برداشت کیں، بھوکا رہا، لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔

(۴) اخفائے راز

روح انقلاب کا ایک ممتاز خاصہ اخفائے راز بھی ہے۔ یعنی یہ روح رکھنے والے اشخاص انتہا درجہ اپنے راز کو مخفی رکھتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو استبداد کی ذکی الحس اور خوفناک قوت کے مقابلہ میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ بہت واضح اور ظاہر امر ہے اس لیے اس پر کچھ زیادہ لکھنا محض تضیع اوقات۔ تمام دنیا کی انقلاب پسند جماعتوں کا ابتدائی اور اساسی اصول اخفائے راز رہا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی انقلاب پرست جماعتوں میں یکساں طور پر اس کو بنیاد کار قرار دیا گیا ہے۔ مرزا احمد رضا نے بھی انتہا درجہ رازداری کا ثبوت دیا۔ مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ تم کو وہ واقعہ یاد ہو گا کہ جب ڈکیل الدولہ کے گھر پر ان سے اصرار کیا گیا کہ اپنے ہمخیالوں اور ساتھیوں کے نام بتائیں تو اس نازک اور تنگ حالت سے نکلنے کے لیے مرزا رضا نے اپنا پیٹ چاک کیا اور ہر طرح کی مصیبت برداشت کی لیکن اپنے ساتھیوں میں سے ایک کا بھی نام نہ بتایا۔ مرزا رضا کے اس زبردست کیرکٹر کی شہادت ناظم الاسلام کرمانی مصنف تاریخ "بیداری ایرانیاں" ذیل کے لفظوں میں دی ہے:-

در فتوت و مردانگی مسلم و متفق علیہ است چہ در حبس آنچہ کردند یکنفر از آشنایاں و دوستاں خود را اکبرند و نام نیک خود را در صفحۂ روزگار باقی گزارد	ان کی جوانمردی و مردانگی مسلم تھی، ان کے استقلال و پامردی پر ہر شخص کو اتفاق تھا، کیونکہ قید خانہ میں ان پر کیسی کچھ سختیاں نہ کی گئیں لیکن انھوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی کا نام ظاہر نہ کیا اور اس طرح دنیا میں اپنی نیکنامی چھوڑ گئے

(۵) فخر و ناز

کمال کی داد چاہنا انسان کا فطری جذبہ ہے اور اپنے کمال پر فخر و ناز کرنا اس جذبہ کی تسکین کی

"میں آیا، میں نے دیکھا، اور میں فتحیاب ہوا"

کیا ان الفاظ کے پردہ میں کمال پر فخر و ناز کی روح نہیں پائی جاتی؟ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر صاحب کمال نے اپنے کمال کی داد چاہی ہے اور یہ کوئی معیوب امر نہیں۔ یہ صرف اسی حالت میں معیوب ہے جبکہ بیجا طور پر فخر و ناز کا اظہار کیا جائے۔ جس قول کی تائید عمل سے ہوتی ہو وہ یقیناً بیجا فخر و ادعا کے دائرہ سے باہر ہوگا اور ایک عمدہ کارنامہ کا اظہار خواہ کسی قدر بلند و شاندار الفاظ میں کیا جائے ہرگز معیوب نہیں کہا جا سکتا۔

مرزا رضا نے بھی جابجا اپنی حیثیت، اپنی شخصیت، اور اپنے قابل فخر کارنامہ پر اظہار فخر کیا ہے۔ مثلاً

"ہاں جبکہ بحمداللہ یہ بڑا کام (قتل شاہ)، قضا و قدر کے حکم سے میرے ہاتھوں عمل میں آیا"

"بڑے تعجب کی بات ہے، میں ایک ضعیف العقل انسان کے ساتھ ایسی صحبت رکھوں جس میں وہ گفتگوئے صحبت کی مناسبت سے کوئی شعر پڑھے"

"یقین کرو میں حاجی احمد کو ایک سفیہ انسان سمجھتا ہوں۔ میری جیسی حیثیت کا شخص جو اس قسم کے بڑے کام کرنا چاہتا ہو، وہ ہرگز ایسے لوگوں سے اپنی قصد و نیت کو ظاہر نہیں کر سکتا"

"اس کے بعد ہی بادشاہ آئے اور پھر پیش آیا جو کچھ پیش آیا۔ میں نے ایران اور اہل ایران کی یہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے"

بے شبہ ان الفاظ کے پیکر میں فخر و ناز کی روح موجود ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مرزا احمد رضا مرحوم کے لیے بھی یہ فخر فخر بیجا ہے۔

مرزائے مرحوم کی یہی وہ اخلاقی خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کی انقلابی روح کو پختہ و مستحکم تر کر دیا

تھا۔ چنانچہ انھوں نے استبداد کے انتہائی ظلم موت تک کو نہایت خوشی برداشت کرلیا۔
انسان کے تمام محامد و محاسن میں اگر سب سے اول درجہ دیا جاسکتا ہے تو اخلاقی محاسن ہی کو دیا جاسکتا ہے
یہ وہ فضیلت ہے جس کو تمام انسانی فضائل پر تفوق حاصل ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسان کے اخلاقی فضائل
دوسری بہت سی فضیلتوں کا سرچشمہ ہیں۔ اخلاقی محاسن اپنے اندر کچھ ایسی حقانیت و صداقت رکھتے
ہیں کہ دشمن و دوست سب کو ان کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو مرزا رضا نے ناصر الدین شاہ کو قتل کیا
باپ کے قاتل پر کس بیٹے کو رحم آسکتا ہے؟ مظفر الدین، شاہ مقتول کا لڑکا ہے، حکمران وقت ہے،
وہ ایک مرزا نہیں بلکہ ایسے ایسے سیکڑوں اشخاص کو آن کی آن میں قتل کرا سکتا ہے لیکن بایں ہمہ وہ
مرزا رضا کے قتل کو ٹال جاتا اور ان کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ اس کے ارکان حکومت اصرار کرتے
ہیں، قتل قصاص پر اس کو ابھارتے ہیں مگر اخلاقی فضائل کا کس قدر قوی اثر ہے کہ وہ اب بھی اس کے
لیے آمادہ نہیں نظر آتا اور اپنے مشیروں کو اس اعتراف آمیز جملہ میں جواب دیتا ہے کہ

این شخص قابل کشتن نیست — یہ شخص قتل کیے جانے کے قابل نہیں ہے

بہرحال بالآخر مرزا رضا کو موت آنا تھی، آئی اور دنیا میں آج تک وقت آجانے پر کس نے اس کے
پنجہ سے رہائی پائی ہے۔ وجود بجائے خود عدم کا پیغام ہے لیکن بعض موتیں ایسی موتیں ہوتی ہیں جن پر
ہزاروں زندگیاں قربان کردی جاتی ہیں۔ ہم بغیر کسی شک و تذبذب کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ
مرحوم مرزا رضا کی موت بھی اس قسم کی موت تھی۔

ابوالحسنات ندوی

جہانگیر و نور جہاں

ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

مسٹر بینی پرشاد، اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ ہند، الہ آباد یونیورسٹی کی ایک محققانہ تصنیف "تاریخ جہانگیری" کے نام سے انگریزی زبان میں حال میں شائع ہوئی ہے۔ فاضل مصنف نے "نور جہاں" کے عنوان سے ایک باب میں جہانگیر اور نور جہاں کے متعلق بعض مشہور واقعات کی تغلیط کی ہے۔ "زیب النساء" اور "مضامین عالمگیر" کے قارئین کے لیے ہمارے خیال میں یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، لہذا مصنف کے ذرائع معلومات سے کام لے کر یہ بحث روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے ناظرین جامعہ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

تاریخ کے بعض واقعات کچھ اس طرح مسلم اور صحیح سمجھے جاتے ہیں کہ ان کے متعلق نہ صرف معمولی تعلیم یافتہ اور متعلمیں مدرسہ یقین رکھتے ہیں بلکہ اہل علم اور اساتذۂ فن بھی کسی قسم کے شک و شبہ کے روا دار نہیں۔ اسی قسم کے واقعات میں جہانگیر و نور جہاں کے درمیان بزمانۂ ولیعہدی عاشقانہ تعلقات، اکبر کا نور جہاں کی شادی جہانگیر کے بجائے شیر افگن کے ساتھ کرا دینا اور پھر موخر الذکر کا جہانگیر کے ایماء سے قتل کیا جانا ایسے واقعات ہیں، جو آج بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ اور جنھیں الفنسٹن اور اس قبیل کے دوسرے انگریزی مورخین نے اپنی تصانیف کا مایہ افتخار سرمایہ بنا لیا ہے۔ اس واقعہ پر تفصیل سے بحث کرنے اور نقلی و عقلی دلائل سے غلط ثابت کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ پہلے وہ سادہ واقعات جو عام طور پر مشہور ہیں ایک بار نظر کے سامنے آجائیں۔

واقعات جو عام طور پر مشہور ہیں

مرزا[1] غیاث بیگ، مغربی تاتار کا ایک غریب تعلیم یافتہ، شریف النفس شخص تھا۔ ایک خاتون سے محبت ہوگئی اور بالآخر اس سے شادی کر لی۔ تنگدستی اور افلاس سے عاجز آکر اس نے ہندوستان کا رُخ کیا، ایک گھوڑے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور

---

[1] یہ پورا قصہ ڈاؤ کی "تاریخ ہند" اور دوسری انگریزی تصانیف نیز فارسی تاریخوں میں ملتا ہے۔

خود پاپیادہ ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑا بہت جو کچھ بھی سرمایہ تھا، راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ مجبوراً فقرو فاقہ پر گزرنے لگی۔ تین دن کی فاقہ کشی کے بعد اس کی بیوی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ تھوڑی دیر وہ اس انتظار میں رہے کہ شاید کوئی مسافر ادھر آجائے اور ان کی کچھ دستگیری کرے لیکن آخر کار شب کے خوف سے وہ اس صحرائے لق و دق کو چھوڑ کر آگے بڑھے۔ 'اقتضائے بشریت' اور 'اقتضائے ضرورت' میں کچھ دیر بحث و تکرار رہی لیکن انجام کار اُنھوں نے اس نوزائیدہ بچے کو پتوں سے چھپا کر ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ ابھی تھوڑی دور بھی نہ گئے تھے کہ ماں کی مامتا نے بچہ کو یاد کیا، گھوڑے سے اُتر آئی اور بے اختیار پکاری "بچہ! بچہ!" باپ بچہ کو لینے کے لیے اُلٹے پاؤں پھرا اور کیا دیکھتا ہے کہ بچہ کے گرد ایک کالا سانپ حلقہ باندھے بیٹھا ہے۔ اس نے بچہ کو موت کے منہ سے نکالا اور لاکر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ غرض بہ ہزار دقت وہ لاہور پہونچے۔ خوش قسمتی سے کسی ایک دوست کی معرفت دربار شاہی تک اُس کی رسائی ہوگئی اور جلدی کسی اونچے منصب پر جگہ مل گئی۔ لڑکی کا نام اُنھوں نے مہرالنسا رکھا جو اپنے سن شعور کو پہنچکر حسن و جمال، موسیقی و مصوری، شعر و سخن میں تمام خواتین مشرق پر فوقیت لے گئی۔ مہرالنسا نے شہزادہ سلیم کے کشور دل پر بھی قابو پانا چاہا اور بالآخر ایک دعوت کی تقریب میں سلیم اس کے دام محبت میں آ ہی گیا لیکن اس کی شادی ایک ایرانی امیر شیر افگن کے ساتھ کر دی گئی۔ جہانگیر جب تخت حکومت پر جلوہ افگن ہوا تو اس نے مہرالنسا کو شیر افگن کے پنجہ سے چھڑانے کی تدبیریں کیں۔ بالآخر ایک ملاقات کے بہانہ سے بنگال کے گورنر قطب الدین نے اس کو مار ڈالا اور مہرالنسا امرائے شاہی کے ہاتھ آئی۔ اس نے ان سے کہا کہ جب میرے شوہر کو اپنی شکست کا پورا یقین ہو گیا تو اس نے یہ وصیت کی تھی کہ میں بلا تامل بادشاہ کی خواہشات پر راضی ہو جاؤں۔ لیکن بادشاہ نے اپنے رضاعی بھائی قطب الدین کے غم میں اس کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن کچھ عرصہ مہرالنسا کا جادو چل ہی گیا اور جہانگیر اس کے بس میں ہو گیا۔

واقعہ بہ روایت دیگر | تغیر الفاظ اور اختلاف جزئیات کا لحاظ کیا جائے تو یہ واقعہ متعدد طریقوں سے

نقل کیا جاسکتا ہے لیکن تمام روایتوں میں صرف ایک روایت ایسی ہے جو نوعیت کے اعتبار سے مذکورہ بالا
بیان سے بہت کچھ مختلف ہے اور جو انگریزی مدارس کی درسی کتابوں کے ذریعہ عام طور پر مشہور ہے۔
مذکورالصدر روایت میں عشق و محبت کا اظہار نورجہاں کی جانب سے ہے لیکن اس روایت میں اُنس و
شیفتگی کا اظہار تمام تر جہانگیر کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس بنا پر زمانۂ ولیعہدی میں جہانگیر کا نورجہاں
پر عاشق ہونا، اکبر کا نورجہاں کی شادی جہانگیر کے بجائے شیر افگن سے کرا دینا، عہدِ حکومت
میں جہانگیر کے ایما پر شیر افگن کا قتل کیا جانا اور پھر نورجہاں کا اپنے عزیز شوہر کے سوگ میں
کئی سال گزار دینا اور بالآخر جہانگیر کے اصرار سے شادی کرنے پر مجبور ہونا یہ تمام واقعات اس
سلسلۂ روایت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بہرحال اس سے غرض نہیں کہ اقدامِ عشق کس کی جانب سے
ہوا اور آیا نورجہاں جہانگیر سے روٹھی یا یہ اس سے ناراض رہا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کی
مدافعت کرکے دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانا ہمیں منظور نہیں بلکہ سرے سے واقعہ کی اس نامکن
صورت کو مٹانا مقصود ہے اور ان جزئی واقعات کی تغلیط کرنی ہے جنھوں نے ایک سادہ واقعہ کو
بدل کر اسے حسن و محبت کا افسانۂ رنگیں اور جور و ستم کی داستانِ خونیں بنا دیا ہے۔ اور جو کچھ
بیان کیا گیا وہ عام روایت کی رو سے ہے جو بہ اختلافِ جزئیات ہر خاص و عام کی زبان پر ہے
اور جو تمام انگریزی تصانیف اور بعض بعد کی فارسی تاریخوں میں مذکور ہے۔ اسی کے متوازی ہم
مصنف کی تحقیق کی رو سے اصل واقعہ کو بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں اور پھر جہاں ہر دو روایات
میں فرق یا تناقض نظر آئے گا، اس پر آگے چل کر بحث کریں گے۔

اصل واقعہ مصنف کی تحقیق کی رو سے

نورجہاں کے جدِ امجد خواجہ محمد شریف تاتار سلطان بگلر بیگی خراسانی کے وزیر
تھے سلطان کی وفات کے بعد وہ قزاق خاں (جانشین سلطان بگلر بیگی)
کے عہد میں بھی اپنے عہدہ پر معمور رہے۔ اس کے انتقال کے بعد شاہ طہماسپ کے زمانہ میں وہ
اس جگہ سے منتقل کر دیا گیا۔ ۱۵۷۷ء میں اس کا خود انتقال ہو گیا اس کے بعد اس کا ستارۂ اقبال
بھی ڈھلنے لگا۔ اس کے بیٹے مرزا غیاث الدین محمد کو جو عام طور پر غیاث بیگ کے نام سے مشہور

ہی' ایران کی زمین تنگ معلوم ہوئی اور اُنھوں نے ہندوستان کا قصد کیا۔ اپنے دو بیٹوں محمد شریف اور ابوالحسن، اپنی لڑکی اور بیوی کو جو اس وقت حاملہ تھی، ہمراہ لیکر ایک بڑے تاجر ملک مسعود کے کاررواں کے ساتھ روانہ ہوا۔ ایران سے ہندوستان تک کا راستہ ایسا پُرخطر اور غیر محفوظ تھا کہ بڑی سے بڑی جماعت کی بھی رفاقت سفر حفاظت جان و مال کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ غیاث بیگ کا سارا مال و اسباب بجز دو خچروں کے لٹ گیا۔ قندھار پہنچکر اس کی بیوی کے لڑکی پیدا ہوئی۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ غریب جچہ و بچہ کی اس حالت میں پرداخت و پرورش بھلا کیونکر ممکن تھی۔ ملک مسعود کو ان کی اس حالت پر رحم آیا اور اس نے ان کی تمام ضروریات کی کفالت کر لی۔ اس بنا پر دونوں میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ ہندوستان پہنچکر ملک مسعود نے غیاث بیگ کو شہنشاہ اکبر کے دربار میں روشناس کرایا اور وہ فوراً خدمات شاہی کے سلسلہ میں لے لیا گیا۔

غیاث بیگ مرزا غیاث بیگ جس کی زندگی میں ولادت بچہ نے ایک نیا دور پیدا کیا، ایک تعلیمیافتہ شخص تھا۔ ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت و جفاکشی کی بھی عادت تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کافی اثر اور عزت پیدا کر لی۔ ۱۵۹۵ء تک وہ سہ صدی کے منصب پر پہنچ گیا اور اخیر میں دیوان کابل کے عہدہ پر معمور کر دیا گیا۔

مہرالنسا اسی دوران میں وہ چھوٹی لڑکی بھی جس کا نام مہرالنسا رکھا گیا سن بلوغ کو پہنچی اور ایک ایرانی نوجوان مسمّی بہ علی قلی استاجلو کے ساتھ بیاہ دی گئی۔

شیر افگن علی قلی، ایران کے بادشاہ اسمٰعیل ثانی (۱۵۷۶ء سے ۱۵۷۸ء) کا سفرچین تھا۔ سلطان کی وفات یا قتل کے بعد اسے اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ ایک مدت کی بادیہ پیمائی کے بعد وہ قندھار کے راستہ ملتان پہنچا اور وہاں عبدالرحیم خانخاناں کی فوج میں شامل ہو گیا جو اس وقت ٹھٹھہ فتح کر رہی تھی۔ اس مہم میں علی قلی نے اپنی دلیری اور پامردی کی بدولت کافی شہرت حاصل کر لی۔ خانخاناں کی نظر جب اس پر پڑی تو اس نے اپنی مراسلت میں شہنشاہ سے تذکرہ کیا

اور اس کے لیے ایک عہدہ حاصل کرلیا۔ اس مہم کے ختم ہونے پر ۱۵۹۴ء میں خانخاناں اسے اپنے ہمراہ لاہور (جو اس وقت سلطنت مغلیہ کا پایہ تخت تھا) لے گیا اور اسے حلقہ خواص میں متعارف کیا۔ کچھ عرصہ بعد غیاث بیگ کی لڑکی سے اس کی شادی ہوگئی۔ ۱۵۹۹ء میں وہ شہزادہ سلیم کے اسٹاف میں داخل کرلیا گیا جو اس وقت میواڑ کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ علی قلی نے ایک بار ایک شیر مارا اور اسی ہمت و دلیری نے شہزادہ کی زبان سے اسے "شیر افگن" کا لقب دلایا۔ نیز اس کارنامہ پر شہزادہ اس سے بیحد خوش ہوا۔ بغاوت میں اس نے جہانگیر کا ساتھ دیا لیکن پھر چھوڑ کر اکبر کے پاس چلا گیا اور تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے اس کی بے وفائی سے چشم پوشی کی اور بردوان (بنگال) میں جاگیر دیکر ایک بڑے عہدہ پر مقرر کردیا۔

شیر افگن کا قتل

بنگال اس زمانہ میں بدامنی اور شورش، بغاوت اور سازش کا منبع تھا اور تمام ناراض شدہ افغانیوں کا مرکز۔ جہانگیر کو شیر افگن کے متعلق بغاوت کا شبہ ہوا، قطب الدین خاں کو جو مان سنگھ کی بجائے ۱۶۰۶ء میں بنگال کا گورنر مقرر ہوا تھا، یہ حکم ملا کہ شیر افگن دربار میں حاضر کیا جائے اور بہ صورت عدم حاضری قطب الدین کو سزا دینے کا اختیار بھی دیا گیا۔ مارچ ۱۶۰۷ء میں قطب الدین، بردوان کو روانہ ہوا اور کہلا بھیجا کہ شیر افگن اس سے آکر ملے۔ شیر افگن مع دو آدمیوں کے گورنر کی ملاقات کو آیا۔ خیمہ میں داخل ہوتے ہی لشکر شاہی کو حکم ہوا کہ اسے ہر چہار طرف سے گھیر لیں۔ یہ دیکھ کر وہ بہت غصہ ہوا اور قطب الدین سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ قطب الدین یہ بتانے کے لیے آگے بڑھا، شیر افگن غصہ میں تو تھا ہی، تلوار نیام سے کھینچی اور گورنر پر ایک وار کیا، پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ انبہ خاں کشمیری نے ایک ہاتھ مارا گو خود بھی زخم کاری کھایا۔ بیچارے شیر افگن پر تمام سپاہی ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ انبہ خاں تو اسی دم ختم ہو گیا لیکن قطب الدین کوئی بارہ گھنٹہ تک زندہ رہ کر دم توڑا۔

اس واقعہ نے جہانگیر پر اس قدر گہرا اثر ڈالا کہ وہ اس کو بیان نہیں کرسکتا تھا۔

جہانگیر و نورجہاں کی شادی

شیر افگن کے قتل کے بعد اس کی بیوی مہرالنساء اور لڑکی جس کا نام

لاڈلی بیگم تھا، دونوں دربار شاہی میں چلی آئیں۔ یہاں آکر مہرالنسا سلطان سلیمہ بیگم کی خدمت میں مقرر ہوئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں اتفاقیہ جہانگیر کی نظر اس پر پڑ گئی اور اخیر مئی تک دونوں میں شادی ہوگئی، یہ ہے حقیقت اس مشہور و معروف شادی کی۔

فن تاریخ اور محکمہ قضا یہ صحیح ہے کہ فن تاریخ اور محکمہ قضا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مورخ کا واقعہ نگار قلم اور جج کا فیصلہ کن بیان دونوں ایک نہیں ہو سکتے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ تاریخ میں اکثر ایسے بحث طلب متنازعہ فیہ مسائل آتے ہیں جہاں مورخ کو جج کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بنا پر عام تاریخی روایتیں اور ہمارا تحقیق کردہ بیان دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد اختلاف واقعہ اور تناقض روایت کے لحاظ سے حسب ذیل چار تنقیحات قائم کی جا سکتی ہیں:-

۱۔ آیا جہانگیر کے زمانہ ولیعہدی میں جہانگیر و نورجہاں کے درمیان عشق و محبت کے تعلقات تھے؟

۲۔ آیا اکبر نے جہانگیر کو شادی کرنے سے باز رکھا اور نورجہاں کی شادی شیر افگن کے ساتھ کرادی؟

۳۔ آیا جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرایا اور اس غرض سے کہ اس کی بیوی ہاتھ آئے؟

۴۔ آیا نورجہاں نے جہانگیر کی شادی کے متعلق متعدد درخواستوں کو ٹھکرایا؟

معاصرانہ تاریخیں تنقیحات بالا پر عقلی دلائل سے بحث کرنے سے قبل دیکھو کہ معاصرانہ تاریخیں کہاں تک ان واقعات کی تائید کرتی ہیں۔ بلا شبہ سب سے پہلے جس تاریخ کا نام زبان پر آئے گا وہ تزک جہانگیری ہے جو اواخر سولھویں صدی اور سترھویں کے ابتدائی نصف صدی کی مستند ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے، جہانگیر نے اس میں شیر افگن کے بعض حالات اور اس کے قتل کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے نورجہاں سے شادی کرنے کی غرض سے اس کو قتل کرایا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انسان اخلاق کے اس بلند درجہ تک ابھی تک نہیں پہنچا ہے کہ وہ اپنے معائب کو اسی صحت و صداقت کے ساتھ بیان کرے جس خوبی سے وہ اپنے محاسن کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ بھی کیا ضرور تھا کہ جہانگیر ضمناً بھی

شیر افگن کے قتل کا ذکر کرتا ہے اپنے دامن اخلاق پر ہمیشہ کی بدنامی کا دھبہ لگانے کے لیے سامان خود ہی مہیا کرتا۔ اس کے علاوہ معتمد خاں نے تزک کی تکمیل شاہجہاں کے عہد حکومت میں کی۔ کامگار حسینی کی تصنیف میں بھی شاہجہاں کو بہت کچھ دخل تھا۔ شاہجہاں اور نورجہاں کے تعلقات جس قدر کشیدہ تھے، وہ بھی آپ سے مخفی نہیں، ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ ہر دو مورخین اپنے آقا شاہجہاں کی خوشنودی اور پاسداری کے خیال سے اس قسم کا کوئی واقعہ جو نورجہاں اور جہانگیر کے اخلاق پر برا اثر ڈال سکے، لکھنے سے باز رہتے لیکن صراحۃً یا کنایۃً اس قتل اور متعلقہ واقعات کا کوئی ذکر نہیں۔ عبدالحمید لاہوری اور شاہجہانی کے دوسرے مورخین نورجہاں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن اس کو کوئی نہیں لکھتا کہ نورجہاں نے اپنے سابق شوہر کے "قاتل" کے ساتھ "مجبور ہو کر" شادی کی۔

یورپین مورخین ممکن ہے ہمارے معترضین حضرات اس کے مقابل میں یہ پیش کریں کہ درباری مورخین نے جہانگیر کی ذاتی بدنامی سے پورے خاندان مغلیہ پر دھبہ لگنے کے اندیشہ سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اولاً تو ان مورخین سے اس دوراندیشی اور پیشبندی کی توقع رکھنی بعید از قیاس ہے، دوسرے اگر انھوں نے ایسا کیا بھی ہو تب بھی یہ حالات یورپین سیاحین اور تجار کے قلم سے کیونکر چھوٹ سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مشرق و مغرب میں آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا اور یورپین اشخاص تجارت، سیاحت سفارت نیز دیگر اغراض سے ہندوستان آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی طویل قیام بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ہندوستانیوں کے عادات و اطوار، رسم و رواج، سیاست و معاشرت غرض ہر چیز ان کی نظر میں عجیب و غریب معلوم ہوتی، جس کا ذکر وہ عموماً اپنے خطوط یا تحریروں میں کرتے رہتے تھے معمولی سے معمولی واقعہ بھی اگر سن پاتے تو اس کا ذکر بھی کسی طرح کر دیتے تھے۔ شہزادہ سلیم اور اس کی سوتیلی ماں، نورجہاں اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان ناجائز تعلق کی کہیں سے اڑتی اڑاتی سن لی اور اس کو فوراً لکھ لیا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ نورجہاں و جہانگیر کے یہ واقعات جس کے لیے انھیں کافی مواد بھی مل سکتا تھا، ان کے قلم سے بچ نکلتا۔ نورجہاں کے ابتدائی حالات، اس کے شوہر کا قتل، جہانگیر کے ساتھ شادی اور اخیر زمانہ حکومت میں اس کا ہمہ گیر اثر ان میں سے ہر ایک کا

ذکران یورپین مصنفین کے ہاں ملے گا لیکن اس کا کہیں نہیں پتہ چلتا کہ ہر دو کے درمیان ابتدائی عشق و محبت کے تعلقات تھے اور اسی وجہ سے جہانگیر نے شیر افگن کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا۔ ہاکنس جو ترکی زبان سے بخوبی واقف تھا، شیر افگن کے قتل سے کچھ عرصہ بعد شاہی دربار میں پہنچا، منصبداروں کے زمرہ میں داخل ہوا، بہت سی ملاقاتیں پیدا کیں اور جہانگیر سے شادی ہونے کے کچھ عرصہ بعد چلا گیا لیکن اس مفروضہ داستان عشق و محبت اور اس مصنوعی قتل کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ سر طامس رو بسلسلہ سفارت ۱۶۱۶ء میں یہاں آیا بعض تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے امرائے سے ملا۔ خود جہانگیر کی معیت میں مانڈو اور احمد آباد تک سفر کیا۔ اس عرصہ میں اور اس طرح کے قیام میں جہانگیر اور نور جہاں کے یہ واقعات اس کے کانوں تک پہونچنے سے رہ نہ گئے ہونگے۔ سر طامس رو نے جہانگیر، نور جہاں اور شاہجہاں وغیرہ سب کے حالات سے بحث کی ہے، ناممکن تھا کہ ان واقعات سے چشم پوشی کرتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے خوشامد یا خوف کے خیال سے ایسا کیا ہو جبکہ اس کو اپنے مقصد میں بھی جہانگیر کی طرف سے ناکامی ہوئی اور جس کی جرأت اخلاقی اور خودداری کا یہ حال کہ دربار شاہی میں پہنچ ہی تو آداب سلام کے خلاف اس کا سر نیاز زمین سے جا نہیں لگتا بلکہ معمولی طریقہ کے مطابق سلام کرتا ہے۔ ایڈورڈ ٹیری بھی کئی برس دربار مغلیہ میں مقیم رہا اور اس وقت جبکہ نور جہاں کے اثر و اقتدار کا عین شباب تھا لیکن وہ صرف اس قدر لکھتا ہے کہ جہانگیر نے "نور جہاں[۵۱] کو ایک معمولی خاندان سے رتبہ اعلیٰ پر گویا فرش سے عرش پر پہنچا دیا"۔ ۱۶۲۳ء میں پیٹرو ڈیلاویل نے گو اپنا سفر مغربی سواحل تک محدود رکھا لیکن شاہی دربار کے یہ حالات اس سے مخفی نہ رہے ہوں گے وہ اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"وہ[۵۲] (نور جہاں) ایک ایرانی کپتان کی بیوی تھی جو مغلیہ خدمات کے سلسلہ میں تھا۔ اپنے شوہر کی

۵۱؎ "مشرقی ہند کا سفر" صفحہ ۴۰۴، مصنفہ ایڈورڈ ٹیری

۵۲؎ "سفرنامہ پیٹرو ڈیلاویل" حصہ اول صفحہ ۵۳

وفات کے بعد اُسے نہ جانے کیسے ایک بہتر موقع ہاتھ آگیا جیسا اکثر نوجوان مسلمان عورتوں کو ملجاتا ہے
شاہ سلیم نے اُسے دیکھ لیا اور دونوں میں محبت ہوگئی"

گو تاریخی حیثیت سے یہ بیان قابلِ وقعت نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے پیش کرنے سے مقصود صرف یہ تھا کہ صاحب سفرنامہ نے اس واقعہ کا ذکر بھی کیا تو مبحوث فیہ مسائل کی تصدیق کے کیا معنی اُسکی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ سر طامس ہربرٹ جہانگیر کے اخیر زمانہ حکومت میں آیا، اس نے جہانگیر کے عہد حکومت کے بہت سے حالات قلمبند کیے۔ پیٹر منڈی نے اپنے سفرنامہ میں یورپ اور ایشیا کے حالات ۱۶۰۸ء سے ۱۶۶۷ء تک کے لکھے ہیں اور وہ خود بھی ۱۶۲۸ء سے ۱۶۳۴ء تک ہندوستان میں موجود تھا، جہانگیر اور نورجہاں کے حالات دونوں نے تحریر کیے ہیں لیکن ان واقعات کے متعلق ان میں سے کسی کے ہاں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ برنیر ایک عرصہ کے بعد آیا اور اس نے جو اپنا سفرنامہ لکھا ہے اس میں جہانگیر کے اخلاق، نورجہاں کے اثر، شاہجہاں، جہاں آرا اور روشن آرا کے متعلق بہت سی افواہیں نقل کی ہیں لیکن ان نام نہاد تاریخی واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہیں غرض ان یورپین مورخین کے سفرناموں اور تحریروں میں شروع سے آخر تک چراغ لیکر ڈھونڈھو لیکن جہانگیر اور نورجہاں کے درمیان عشقیہ تعلق اور اس کی وجہ سے اول الذکر کے ایما سے نورجہاں کے شوہر شیر افگن کے قتل کا سراغ کہیں نہیں پاؤ گے۔ یہ مغربی مصنفین ہندوستان کی بری بھلی ہر بات پر گوش بر آواز رہا کرتے تھے، ناممکن تھا کہ یہ واقعات ان کے قلم سے بچ جاتے۔

واقعات کی تحقیق فنِ درایت کی رو سے

جہاں تک روایت کا تعلق تھا، خواہ وہ درباری مورخین کی رہی ہو یا غیر ملکی سیاحین و مصنفین کی، ہم نے ہر چند چھان بین کی ان واقعات کا کہیں نہیں پتہ چلتا۔ آیئے لگے ہاتھوں درایت کی کسوٹی پر بھی پرکھیں۔ سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ جب جہانگیر و نورجہاں میں شادی کی ٹھہر گئی تھی تو اکبر کو اس سے انکار کر کے شیر افگن کے ساتھ کرا دینے کی کیا وجہ تھی؟ ہمارے گزشتہ بیان سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ مرزا غیاث (الملقب بہ شیر افگن)، کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کے ہاتھ میں کبھی حکومت

ایران کا قلمدان وزارت رہ چکا تھا۔ گردشِ ایام سے مرزا غیاث گو ہندوستان آیا لیکن اقبال نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا اور وہ حرمِ شاہی کا "افسر مطبخ" (جو بے شبہ حکومت مغلیہ میں ایک معزز اور ممتاز عہدہ سمجھا جاتا تھا) مقرر کیا گیا۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اکبر نے شادی کے معاملہ میں مداخلت کی ہو جبکہ سلاطین مغلیہ میں شادی کے متعلق نسل و قوم کا چنداں لحاظ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ امر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کی منظورِ نظر اس سے چھوڑا کر شیر افگن سے منسوب کی جاتی اور جہانگیر و شیر افگن کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوتی۔ برعکس اس کے دیکھا جاتا ہے کہ ۱۵۹۹ء میں اکبر جیسا دور اندیش حکمراں اسی شیر افگن کو میواڑ کی مہم میں جہانگیر کے ہمراہ کرتا ہے۔ اس حالت میں تم بس سے انکار کر دگے، شہنشاہ اکبر کی دور اندیشی سے یا نفسِ واقعہ کی صحت سے؟ نہ صرف یہی بلکہ آگے چل کر دیکھو کہ اس کے ساتھ کیا کچھ سلوک کرتا ہے۔ کنایۃً یا صراحۃً اس مہم میں جہانگیر کے رویہ کی کوئی شکایت نہیں معلوم ہوتی بلکہ خود شیر افگن جہانگیر کی بغاوت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر سے مل جاتا ہے لیکن جب وہی جہانگیر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو انتقام کی بجائے اس کے اعزاز و اکرام میں مزید اضافہ کرتا ہے اور "شیر افگن" کا لقب خود اس کی شہادت دیتا ہے۔ جہانگیر کو شیر افگن کا "قاتل" بتانے والے مورخین نہ جانے اس کا کیا جواب دیں گے؟ تیسرے یہ کہ نور جہاں جیسی عالی نصب اور شریف و باکباز عورت اگر یہ سمجھتی ہوتی کہ جہانگیر کا ہاتھ اس کے عزیز شوہر کے خون سے لال ہے تو وہ کبھی اس کی رفیقِ حیات بننے پر آمادہ نہ ہوتی۔ اس نے جہانگیر کے ساتھ جس اُنس و محبت، اخلاص و وفا شعاری کی زندگی گزاری، وہ خود اس کی عفت و عصمت کی ایک بیّن دلیل ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بنگال میں قطب الدین خاں کا تقرر گورنری اس مصلحتِ خاص سے کیا گیا تھا کہ شیر افگن کو قتل کر کے نور جہاں حاصل کی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو کی بغاوت ختم ہونے پر جہانگیر نے بعض سابق حکاموں کو جو اس کی پالیسی کے موافق نظر نہ آتے تھے علیحدہ کر دیا۔ راجہ مان سنگھ، سابق گورنر بنگال اسی وجہ سے وہاں سے ہٹائے گئے اور ان کی

جگہ پر قطب الدین کا تقرر عمل میں آیا۔ رہا شیر افگن کا قتل اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے اس زمانہ کی بنگال کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اس وقت بنگال کی سیاسی فضا شورش بغاوت اور خفیہ سازشوں سے پُر تھی۔ سترہویں صدی کی ایک شخصی حکومت میں ان جرائم کا انسداد قتل و گردن زدنی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر ایک ایرانی جانباز سے جو ایک بار بغاوت کے سلسلہ میں بے وفائی کا ثبوت دے چکا ہے، یہ کچھ بعید نہ تھا کہ ایسی فضا میں وہ کروہ کوئی دن علم بغاوت بلند کر دے، ایسی حالت میں اگر شیر افگن کے قتل کی یہ وجہ سمجھی جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سلسلہ میں دیگر اشخاص کا خون ہوا یا خود شیر افگن کی سزا کا کوئی اور استعمال کیا جا سکتا تھا، بہر حال ان کا ذمہ دار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ قطب الدین کا طرز عمل ہے۔ خاوند کے انتقال کے بعد نور جہاں کا دربار شاہی میں آنا لازمی امر تھا کیونکہ اس کے باپ اور بھائی اب تک یہاں بڑے بڑے عہدوں پر موجود تھے۔ یہاں آکر مینا بازار[۵] میں جہانگیر کی نظر نور جہاں پر پڑنی اور پھر بعد میں اس کا حرم شاہی میں داخل کیا جانا یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔

یہ واقعات کیونکر اور کیسے مشہور ہوئے

روایۃً آپ نے دیکھ لیا کہ معاصرانہ تاریخوں میں ان واقعات کا کہیں نشان نہیں۔ درایت کے درباے سے بھی یہی حکم ملا کہ واقعات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مروجہ تاریخوں میں یہ اس قدر جلی حروف میں کیسے نظر آ رہے ہیں؟ جہانگیر سے تقریباً دو نسل گزر جانے تک ان واقعات نے تاریخ میں جگہ نہیں پائی تھی۔ اس کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل واقعہ کے شرارے نے رفتہ رفتہ کوہ آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی۔ شیر افگن کے قتل کے بعد نور جہاں کے حرم شاہی میں داخل ہونے نے دو صدی بعد تاریخ کی غبار آلود فضا میں یہ شبہ ضرور پیدا کر دیا ہوگا کہ شیر افگن کے قتل سے جہانگیر کا مقصد حصول زن تھا۔ اس کے لیے یہ امر ثابت کرنا ضروری ہوا

---

[۵] ایک قسم کا بازار لگا کرتا تھا جس میں نفیس اور عمدہ اشیاء سے دکانیں مزین ہوتی تھیں۔ شہزادیاں اور امراء کی خواتین کاندار ہوتیں اور شہزادے و امراء خریدنے آتے۔ خرید و فروخت میں جو لطف اندوزی ہوتی وہ ان کے عیش پسندی کا ایک طریقہ تھا۔

کہ جہانگیر و نورجہاں میں ابتداءً عشق و محبت کے تعلقات تھے۔ اس کے باوجود بھی نورجہاں، جہانگیر کی بجائے شیر افگن سے منسوب ہوئی، اس کی تاویل اس سے بہتر اور کیا کی جاسکتی تھی کہ شہنشاہ اکبر مانع رہا اور اسی نے شیر افگن سے شادی کرادی۔ یہ ہی ان واقعات کی تصنیع کے متعلق نفسانی تحقیق۔ رہی یہ بحث کہ یہ واقعات کن ذرائع سے رائج ہوئے اس کے لیے تاریخی سراغرسانی یہ پتہ دیتی ہی کہ محمد صادق تبریزی کے بیان پر خافی خاں، بجن رائے اور دیگر مصنفین نے حاشیہ آرائی کرتے ہوئے یہ تمام واقعات نقل کیے ہیں کہ کس طرح شہزادہ سلیم اور مہرالنسا دونوں باہم کھیلا کرتے تھے اور جب سلیم نے اُسے اپنی آغوش میں لیا تو کس طرح مہرالنسا نے اسکی شکایت حرم سرا کی دوسری شہزادیوں سے کی اور کیسے یہ خبر اکبر کے کانوں تک پہنچی اور اس نے غصہ ہو کر شادی کو روک دیا پھر کس طریقے سے جہانگیر نے قطب الدین کی وساطت سے نورجہاں کے حاصل کرنے کی کوشش کی، وغیرہ وغیرہ یہ قصہ طبع انسانی کے لیے جس قدر دلچسپ ہی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہی کہ قلم سے نکلتے ہی آتش صحرا کی طرح ہر چہار طرف پھیل گیا۔ سترہویں صدی کی ابتدائی نصف میں اس کا کہیں پتہ نہیں لیکن بعد کی تصنیفوں میں صاف نظر آنے لگا۔ فارسی مورخین اس کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ راجپوت بھاٹوں نے اس کی مزید تائید کر دی۔ اختتام صدی کے قریب اطالوی سیاح منوسی نے اس پر خوب رنگ آمیزی کی۔ اٹھارہویں صدی میں ڈاؤ وغیرہ نے اس کے بقیہ خدوخال کو بھر کر ایک اچھا خاصہ مرقع بنا دیا۔ انیسویں صدی میں الفنسٹن نے خافی خاں سے لیکر بعد کے مورخین کو دیا اور یہی آج عام طور پر زینت دہ تاریخ ہی اور بچہ بچہ کی زبان پر رائج، تصویر کا ایک طرف وہ پہلو سامنے آتا ہی اور دوسری جانب یہ رخ دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل پڑتا ہی کہ

ع۔ کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

سعید انصاری، متعلم جامعہ

معاشی تاریخ ہند

کا

ایک ورق

"یہ مختصر سا مضمون اُس عہد سے تعلق رکھتا ہی جبکہ یورپی سوداگروں کی جماعتیں ہندوستان میں بحیثیت تاجر مقیم تھیں اور انجام کار ایسٹ انڈیا کمپنی (انگلستان کی ایک سوداگر جماعت) ایک مدت کے بعد نہ صرف تاجروں کی حیثیت سے رہی بلکہ جیسا کہ معلوم ہی رفتہ رفتہ منافقانہ و جارحانہ حکمت عملی کے ساتھ ایک حکمراں جماعت بن گئی۔ اس کا عہد عروج جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) سے شروع ہو کر عہد تخت نشینی ملکہ وکٹوریہ (۱۸۳۷ء) تک جبکہ حکومت ہند تاج انگلستان (کراؤن آف انگلینڈ) کو منتقل ہوتی ہی ختم ہو جاتا ہی۔ یہ عرصہ اسی برس کا تاریخ ہند میں بلحاظ تباہی صنعت و تجارت افلاسِ عامہ ایک حیرت انگیز و خوفناک عہد ہی جس کی مثال کسی ملک کی تاریخ بھی آسانی سے نہیں پیش کر سکتی۔"

مورخین تاریخ ہند نے جو زیادہ تر انگریز ہی ہیں ہندوستان میں برطانیہ کے سیاسی و فوجی کارناموں و حسن انتظام کی مدح سرائی میں نہایت قابلیت کے ساتھ اعلیٰ معلومات کا ایک کثیر ذخیرہ بہم پہونچایا ہی لیکن تاریخ باشندگان ہند، اُن کی تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور نیز اُنکی اقتصادی حالت کے متعلق تقریباً خاموشی ہی اختیار کی ہی۔

سلطنت برطانیہ کی ترقی مشہور ولیم پٹ (۱۷۰۸–۱۷۷۸ء) کے عہد وزارت میں ہوئی۔
فریڈرک اعظم حلیف انگلستان نے پرشیا (جرمنی) کو زیر کیا اور فرانس کو شکست دی۔
وولف نے ۱۷۵۹ء میں کوبلک (کناڈا) فتح کیا اور تمام کناڈا فرانسیسیوں سے لے لیا۔
کلایو نے ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح حاصل کی اور جنرل آیر کوٹ نے فرانسیسیوں کو ۱۷۶۱ء میں شکست دی۔ اس قلیل عرصہ میں انگلستان یورپ کی ایک طاقتور سلطنت شمار کی جانے

گی۔ اور ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اب ایک تجارتی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ ہندوستان کے سیاسی اُمور میں بھی کسی نہ کسی طرح حصہ لینے لگی۔ بنگال اور مدراس کے نوابوں اور راجاؤں کا لڑائی میں (جو اکثر انہیں کے ہتکنڈوں کا نتیجہ ہوتی تھیں) ساتھ دیا اور انجام کار ایک دوسرے کو آپس میں لڑا کر اُن کو سخت نقصان پہونچایا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

آجکل قحط و گرانی کا غیر مختتم سلسلہ اور افلاس عامہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سرے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہندوستان کبھی خوشحال بھی رہا ہے یا نہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ ملک غیر زرعی ہے یا یہاں کے باشندے کاہل الوجود واقع ہوئے ہیں؟

یہ نہایت فخر کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بہت سے احسانات کیے ہیں جو دوسرے ممالک میں دیگر حکومتوں کے ماتحت حاصل نہیں۔

اوّل تو ایک ملک کی بہبودی کے لیے جو چیز سب سے بڑی نعمت ہو سکتی ہے امن وامان ہے۔

دوم۔ نظام حکومت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے کہ غیر ممالک کے حملہ کا اندیشہ قریب قریب بالکل ناممکن ہے اور اندرونی فتنہ و فساد کا بہت ہی کم خطرہ ہے۔

سوم۔ اعلیٰ و بہترین قوانین بنائے اور جابجا عدالتیں قائم کیں۔

چہارم۔ ہندوستان کی قدیمی تہذیب کو مغربی تہذیب علوم و فنون جدیدہ سے منور کر دیا۔

پنجم۔ ہر شخص کو اُس کا فطری حق یعنی آزادی دی اور اشیائے آسائش اور وسائل آمد و رفت ریل وڈاکخانہ وغیرہ قائم کیے۔

آجکل ہندوستان کا ہر ایک شخص جاہل سے جاہل بھی جانتا ہے کہ ان تمام احسانات سے وہ کس قدر متمتع ہوا ہے اور دیگر ممالک کے مقابلہ میں وہ کس قدر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں کیا کسی مصنف نے ایمانداری کے ساتھ اس سبب کے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان اس قدر مفلس کیوں ہے؟ اور ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک پندرہ ملین آبادی جو

ستان کی آبادی کا نصف ہی کیوں فنا ہو گئی؟ قحط اس کا سبب بتلایا جاتا ہے۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے
ہندوستان کی آبادی پیداوار کے تناسب سے بہت بڑھ گئی تھی اور کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ
شتکاروں کی عدم واقفیت اور لاپرواہی اس کا سبب ہیں اور مہاجنوں کی بڑھتی ہوئی شرح سود
بھی اس کا باعث ہے۔ لیکن اگر واقعی جواب حاصل کرنا ہو تو مندرجہ ذیل امور میں تلاش کیجئے۔
(۱) ناقابل برداشت ٹیکس مالگزاری۔ اس کے حصول کے مختلف طریقہ اور غیر محل خرچ۔
(۲) تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ کی تباہی اور برطانیہ کی خود غرضی کی پالیسی۔
(۳) نظام حکومت میں عدم اختیارات۔
(۴) انگلستان کے لیے اصول امتناعی قانون تجارت اور ہندوستان
کے لیے آزاد تجارت
(۵) قرضہ ہند

ان میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن اس وقت یہاں ہندوستان کی تجارت
عت و حرفت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ اوائل اور مابعد کی حالت پر نظر ڈالنا مقصود ہے کیونکہ کسی
ک کی ترقی و بہبودی کا دارومدار زیادہ تر اسی پر ہوتا ہے۔

ٹ انڈیا کمپنی اور بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی انگلستان کی ایک تجارتی جماعت تھی جو دیگر یورپین
ام کی تجارتی جماعتوں کی طرح ہندوستان میں آئی تھی۔ یوں تو ہندوستان کی زرخیزی اور
ر پیداوار نے ہر ایک کو گرویدہ کر لیا تھا لیکن انگلستان کی جماعت کامیاب ہے۔ فرانسیسی اور
چ (ہالینڈ کے باشندے) کمپنیاں نیست و نابود ہو گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف ساٹھ
زار پونڈ کے سرمایہ سے تجارت شروع کی تھی اور ایک صدی کے اندر ہی اندر نہ صرف بے انتہا
نفع اُٹھایا بلکہ اپنی حکومت کی بنیاد بھی ڈال دی اور یہاں کی فرمانروا بن گئی۔ بنگال اور
نوبی ہند کے نوابوں اور راجاؤں سے شروع میں تو چند مراعات حاصل کیں اور بعدہٗ جارحانہ
یسی سے کام لینا شروع کر دیا۔

بنگال کے نواب میر قاسم نے انگریزوں کو اندرون تجارت کی آمدورفت پر محصول معاف کر دیا
اور کلکتہ میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دیدی اور ان کی درخواست پر اُس کی حفاظت
کے لیے انگریزوں کی ایک جماعت کے رکھنے کا بھی حکم دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کو آہستہ
آہستہ دست درازی کا خوب اچھا موقع ہاتھ آیا۔ جن جن طریقوں سے عوام اور ملازمین
نواب کو پریشان، ذلیل و رسوا کیا اُس کی داستان بہت طویل ہے۔ نواب میر قاسم نے اس کو
روکا تو انگریزوں نے میر جعفر سے مل کر اُس کو تخت سے معزول کر دیا۔ اس کے صلہ میں میر جعفر نے
۲۳۸۹۷۵ پونڈ عطا فرمایا اور کلائیو نے علاوہ اس کے ایک اعلیٰ جاگیر اور ۳۱۵۰۰ پونڈ حاصل
کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ان سے بھی بگڑ گئی اور میر قاسم دوبارہ تخت نشین ہوئے۔
اس مرتبہ کمپنی نے ۲۰۰۲۶۹ پونڈ حاصل کیا لیکن کمپنی نے دست درازی بدستور جاری رکھی۔
میر قاسم نے تنگ آ کر کمپنی کے ساتھ پھر سختی شروع کی۔ نتیجہ ظاہر تھا میر قاسم معزول کر دیے گئے
اور میر جعفر پھر نواب بن گئے۔ اس دفعہ ۵۰۰۱۶۵ پونڈ کمپنی کو ملا اور بعدہٗ ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ
تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ۲۳۰۳۵۶ پونڈ اور ملا۔ غرضکہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں بنگال کے
نوابوں سے ۵۹۴۰۴۹۸ پونڈ وصول کیا اور ہمیشہ کے لیے بنگال دیوالیہ ہو گیا۔ یہ کمپنی بہت مالدار
ہو گئی اور ۱۷۶۵ء میں شاہ دہلی سے دیوانی کا فرمان حاصل کر کے بنگال کی مالک بن گئی۔
اب کمپنی کو پورے اختیارات حاصل تھے اور تجارت کو جائز و ناجائز طریق سے بے انتہا فروغ دیا
جس کی وجہ سے مقامی کاریگروں کو بے حد نقصان پہونچا اور ان کی وجوہ سے قحط پڑ گیا۔
۱۷۷۰ء میں بنگالہ کی ایک تہائی آبادی موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ اموات اس کثرت سے ہوئیں
کہ لوگوں میں ہمدردی کا مادہ قریب قریب مفقود ہو گیا تھا۔ اور مابعد ہیسٹنگز نے کٹرہ اور الٰہ آباد
بھی حاصل کر لیا اور نواب اودھ کو ۵۰۰۰۰۰ پونڈ کے عوض دے دیا (یہ قبضہ عارضی ہی تھا)۔
روہیلوں کے خلاف نواب اودھ کو ایک فوجی دستہ دیکر ۴۰۰۰۰۰ پونڈ وصول کیا۔
جنوبی ہند میں بھی یہی بازار گرم تھا۔ اور ملکی قبضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ

مقامی تجارت کی تباہی کی کوشش بھی شروع ہو جاتی تھی۔ اور انگریزی مال جو ساخت میں بھدا اور کمزور ہوتا تھا بازاروں میں بکنے لگا۔ لوگ مجبوراً خریدتے تھے اور زیادہ گراں ملتا تھا۔

کمپنی کی تجارت

اٹھارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان نہ صرف ایک اعلیٰ زراعتی ملک تھا بلکہ دنیا کے بہترین تجارتی ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ خاصکر کپڑے کی تجارت کے لیے دنیا میں اس سے بہتر کوئی ملک نہ تھا۔ جیساکہ آیندہ چل کر معلوم ہوگا یہاں کا اونی ۔ سوتی ۔ ریشمی زربفت غرضکہ ہر قسم کا کپڑا تمام ایشیا۔ یورپ حتیٰ کہ امریکہ کے بازاروں میں بکثرت جاتا تھا۔

جنگ پلاسی (۱۷۵۶ء) کے بعد جو واقعات و تغیرات وغیرہ ظہور پذیر ہوئے اس کی تیزی رفتار حیرت انگیز ہے۔ انگلستان کو جو اسی عہد میں مختلف قسم کی ایجادیں کر رہا تھا۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن کے لیے خام اشیاء خاصکر روئی وغیرہ حاصل کی جائے۔ ہندوستان اس کے لیے نہایت موزوں نظر آیا۔ اب کیا تھا انگلستان میں سیکڑوں کارخانے کھل گئے۔ ہندوستان میں کپڑے کی تجارت تو بالکل ختم ہوگئی اور روئی بہت زیادہ پیدا کرنے لگا۔ یہاں سے ایجنٹوں کے ذریعہ روئی بہت سستی خرید کی جاتی تھی اور انگلستان سے سوتی مال تیار ہوکر آنا شروع ہوگیا اور بہت گراں فروخت ہوتا تھا۔

ان وسٹمینٹ

ہندوستان کی اقتصادی حالت یونہی کیا کم خراب تھی کہ ایک نئی اسکیم کا نفاذ اور ہوگیا جس کو انوسٹمنٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۸۱۲ء میں دارالعلوم (انگلستان) میں جو رپورٹ پیش ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی مالگزاری کا ایک حصہ خام اشیاء کے خرید کے لیے علیٰحدہ کرلیا جاتا ہے جو انگلستان بھیجدی جاتی تھیں اور حکومت انگلستان اُس کو گراں فروخت کرکے کثیر منافع حاصل کرتی تھی۔ ہزاروں جہاز یہاں کی تمام اشیاء سے بھرے ہوئے انگلستان جاتے تھے۔

ہندوستانی تجارت کی تباہی | کمپنی کے انگریز ملازمین ہندوستان میں اپنے گماشتوں کے ذریعہ مقامی اشیاء سستی خرید کرتے اور مہنگی فروخت کرتے۔ حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ان کے قبضہ میں تھیں۔ جو اشیاء کہ انگریز فروخت کرتے ہندوستانی اُن کو نہیں بیچ سکتے تھے۔ یہ کوئی سرکاری قانون نہ تھا لیکن بُری طرح انسانیت سوز سزائیں دے کر زیر کر لیا تھا۔ اور کپڑا وغیرہ تو ولایتی ہی فروخت ہونے لگا تھا۔ ہندوستان کے تاجر جو کچھ بھی اپنا مال باہر ملکوں میں بھیجتے اُن پر محصول اتنا زیادہ تھا کہ فائدہ تو درکنار مال کی قیمت بھی مشکل سے ملتی تھی اور برخلاف اس کے ولایتی مال پر بہت کم محصول لیا جاتا تھا۔ تباہ کرنے کی کوئی صورت نہ چھوڑی۔ مقامی کاریگروں پر محصول لگا دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملازمین کمپنی نے یہاں کارخانہ کھولے اور کاریگروں کو جو محصول ادا نہیں کر سکتے تھے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اور اگر یہ نہیں ہوتا تو کم تنخواہوں پر (جو ضرورت زندگی کے لیے ناکافی ہوتی تھیں) ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ خام ریشم بہت تیار ہوتا تھا جو انگلستان بھیج دیا جاتا تھا۔ اِنویسٹ منٹ کا روپیہ سنہ ۱۷۹۲ء سے سنہ ۱۸۱۳ء تک ۲،۶۷۴،۳۱۵،۲ پونڈ ہوا۔ اس زمانہ میں (مرتو) نے اپنی شہادت میں پارلیمنٹ انگلستان کے سامنے بیان کیا کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی ہے۔ ہندوستانی جس کی ماہواری اوسط آمدنی ۶ شلنگ یعنی تین روپیہ ہے وہ کیونکر انگریزی مال خرید سکتا ہے سنہ ۱۸۱۳ء میں چارٹر کی رو سے کمپنی کا اجارہ موقوف کر دیا اور انفرادی تجارت کا عام استحقاق حاصل ہو گیا۔ ایچ ایچ وِلسن مشہور مورخ لکھتا ہے کہ سنہ ۱۸۱۳ء کے پارلیمنٹ کے مباحثات میں ہندوستانی لوگوں کی اقتصادی ترقی کے لیے کوشش کی گئی لیکن تاجران انگلستان نے اس کی بہت سخت مخالفت کی کیونکہ اس سے ان کو اپنے مفاد کا خطرہ تھا اور وہ کامیاب ہو گئے۔

سنہ ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی رو سے کمپنی کے ہندوستانی تجارتی حقوق بالکل منقطع ہو گئے لیکن چین اور دیگر جزائر سے ہنوز باقی تھے۔ کمپنی نے مدراس۔ بمبئی اور بنگال سے روئی بہت زیادہ خرید کی۔ اِنویسٹ منٹ سے ۸۰۰۰ گٹھے ۲۵۰ پونڈ وزنی خریدے اور سنہ ۱۸۲۶ء میں

۶۸ ملین پونڈ وزنی روئی خریدی جس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ پونڈ (۱۵ ملین روپیہ) ہوئی انگلستان کو غلہ۔ شکر۔ جار۔ شورہ۔ لوہا۔ چاندی۔ سونا۔ تانبا وغیرہ بکثرت جاتا تھا۔

وہ اشیاء جو انگلستان کو ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۹ء تک گئیں۔

روئی	۱۶۰	سے	۱۲۷،۲۴	تک گھٹ گئے
سوتی کپڑا	۱۴۸۱۷	〃	۱۰۴	〃 〃 〃
ریشم خام	۲۱۳	〃	۷،۰۰۰	〃 〃 〃
ریشمی کپڑا	۱۵۵۸	〃	۴۶۸	〃 〃 〃
نیل	۱۲۸۱۱	〃	۲۷،۰۰۰	صندوق گئے

نقشہ بالا سے معلوم ہوگا کہ انگلستان کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ کس قدر گئی اور باقی اشیاء کس قدر کم گئیں۔

نیل :- یورپین پلانٹرز جن کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی ہندوستانی کاشتکاروں کو زر پیشگی بطور ٹھیکہ دے کر ایک مقررہ آراضی پر نیل کی کاشت کراتے تھے۔ اگر کاشتکار اس کام سے فراغت پا کر اپنی ذاتی زمین جوتتے تو سخت سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ کوڑے لگوائے جاتے تھے زمینیں۔ کھیتیاں وغیرہ ضبط کر لی جاتی تھیں۔ بڑے بڑے جرمانے کیے جاتے تھے۔ جیلخانہ میں لمبی لمبی سزائیں کاٹتے تھے اور اسی حالت میں کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔ بعض ہندوستانی بھی نیل کی تجارت کرتے تھے مگر وہ مخالفانہ کارروائیوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے۔ ان انگریز پلانٹروں میں سے اکثر بہت ہی کم سرمایہ رکھتے تھے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی سرکاری ایجنسی ہاؤس سے قرض دیا جاتا تھا۔ بنگال میں جیسور کرشناگڑھ اور ترہٹ میں ۴۰۰ سے زائد فیکٹریاں قائم تھیں۔ نیل کی کاشت دہلی تک کرائی جاتی تھی۔ ۱۸۷۹ء میں ۹،۰۰۰۰۰ پونڈ وزنی نیل انگلستان گیا۔ جس وقت کلکتہ میں آ کر نیل جمع ہوتا تھا تو ۰۰۰،۳۰۴،۲ پونڈ قیمت کا ہوتا تھا۔ اور انگلستان میں ۰۰۰،۰۰۶،۴ پونڈ کو

فروخت ہوتا تھا۔ نیل کی کاشت اس کثرت سے ہوئی کہ سینٹ ڈامنگو جو انقلاب فرانس سے بیشتر ممالک کو نیل مہیا کرتا تھا اب تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب ہندوستانی مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور محنت شاقہ کا نتیجہ تھا جس کو انگریز صاحبان اپنی حلال روزی سمجھتے تھے۔

۱۸۳۷ء میں جب کمپنی کی حکومت مستحکم ہو گئی تو ایک چارٹر کی رو سے تاج انگلستان کو منتقل ہو گئی۔ ملکہ وکٹوریہ تخت پر جلوہ افروز ہوئیں۔ اور ہندوستانی تاریخ کا نیا باب شروع ہو گیا۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کمپنی کے عہد گزشتہ سے بالکل مختلف ہے۔

محمد عبدالحمید خاں۔ متعلم جامعہ

اقطاب انگورہ

علامہ فتحی بے وزیر داخلہ انگورہ

۴ر اگست ۱۹۱۴ء کا دن جبکہ جنگ فرنگ کا آغاز ہوا، اپنے اندر بصیرت وعبرت کے بہت سے مظاہر پوشیدہ رکھتا تھا، چنانچہ جس طرح دنیائے امن سکون میں جنگ جرمنی نے ایک تہلکہ ڈالدیا اُسی طرح مارچ ۱۹۱۷ء میں رُوسی قوم کا انقلاب اور بالشویزم تحریک نے کائنات عالم کو چونکا دیا' مغرب کی یہ دونوں تحریکیں' قومیت'' کے نقطۂ نظر سے اپنی اپنی جگہ نہایت وقیع اور منفعت بخش تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان دونوں تحریکوں نے سوسائٹی کے لیے جو تباہ کن اثرات پیدا کیے اُس کے نتیجہ میں بلجیم کی عبرت اندوز تباہی شمالی فرانس کی اندوہ ناک بربادی' یوگوسلافیہ کی دلگداز برہمی اور مملکت روسیہ میں خونریز طوائف الملوکی اور قتل عام کے مناظر انسان کو ہمیشہ آبدیدہ کرتے رہیں گے' ظاہر ہے کہ ان دونوں عیسوی تحریکوں نے جس طرح انسانی سوسائٹی کو ہلاکت بار گڑھے میں دھکیل دیا' اُس کے مقابل ۲۰ر مارچ ۱۹۲۰ء کی وہ ایک کمزور تحریک جو انگورہ سے شروع ہوئی انسانی سوسائٹی کے لیے ایک حیاۃ آفریں پیغام لیکر آئی، مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے جس تحریک کا آغاز کیا، کون جانتا تھا کہ اس تحریک کے ذریعہ ایشیا کی ان گنت آبادی میں عروج وارتقار' اور'' نظم وجامعیت'' کی ایک نئی روح پیدا ہوجائے گی؟ مگر چند سالہ واقعات نے بتلادیا کہ تحریک انگورہ نے اناطولیہ کے ویرانوں سے لیکر حدود پشاور تک لاتعداد بنی نوع بشر میں حیاۃ کامرانی، عزت وخودداری' اور نظم ووحدت کے وہ ولولے پیدا کردیئے جن کے ذریعہ سے مشرق کا دھندلا اُفق از سر نو جگمگا اوٹھا'

سیاست شناس دماغ جانتے ہیں کہ ترکان انگورہ نہ صرف اناطولی میدانوں میں سرگرم عمل تھے بلکہ اُن کی یہ نہایت محتاط تحریک قفقاز وترکستان اور خیوا وافغانستان میں بڑی

سرعت سے کام کر رہی تھی، ہز اکسلنسی آنور پاشا، نوری پاشا، خلیل پاشا اور جمال پاشا اس بیدار کن تحریک کے ممتاز ترین لیڈر تھے، جن کی حیرت انگیز جد وجہد اور سیاسی و دینی نے آج سارے مشرق کو مغرب کے مقابل لاکھڑا کر دیا ہے، اور اسی طرح ایشیائے کوچک میں جن ترکی دماغوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اُن کے باعث مغرب کی وہ خطرناک تحریک ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ ہو گئی جو پورے ایشیا کو چٹ کر جانے کے لیے پاؤں پھیلا رہی تھی، لہذا بربنائے حالات کہا جا سکتا ہے کہ آج مشرق میں حیاۃ و کامرانی کا جو چمکیلا آفتاب طلوع ہو رہا ہے وہ ترکان انگورہ ہی کے دم قدم کا نتیجہ ہے، اور ایشیائے کوچک میں جو میدان کارزار گرم ہوا تھا وہ انسانی موت و زندگی کا ایک متضاد مظاہرہ تھا جس کے ذریعہ بعض اقوام عرصۂ دراز کے لیے فنا ہو گئیں اور بعض نے ایک نئی زندگی حاصل کی، بارے اس کشمکش کی آخری ساعت ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو "لوزان" میں ختم ہو گئی اور ایک معاہدہ کے ذریعہ مغرب نے مشرق کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ تسلیم کر لیا اور بہ ہمہ وجوہ تسلیم کر لیا ضرورت ہے کہ آپ کے سامنے اُن ارباب بست و کشاد اور اصحاب فکر و عمل کے سوانح لائے جائیں جنھوں نے انگورہ کی بلندیوں سے پورے ایشیا کو نہضت و بیداری اور استقلال و خودداری کا روح پرور پیام پہونچایا،

کسے خبر تھی کہ ایشیا کا وہ "مرد بیمار" جو یورپ میں اپنی تلخ و ناکام زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا اپنے آغوش میں ایسے نوجوان و ہونہار فرزند بھی رکھتا ہے جو ایک دن اپنی شجاعت و سیاست سے دانایان فرنگ کے چھکے چھڑا دے گا، لیکن جب "لوزان" میں حکیمان انگورہ کی ایک بالغ نظر جماعت نے عقلائے فرنگ کو بساط سیاست پر دے پٹکا تو دنیا نے معلوم کر لیا کہ سیاست و دانش آموزی دانایان فرنگ ہی کی جائداد نہیں بلکہ اُس سے ارباب انگورہ بھی بدرجہ وافر بہرہ اندوز ہو چکے ہیں اور اُن کا ایک سپاہی جو عمر کے تیئس ۲۳ سال میدان جنگ و قتال میں گزار چکا ہے وہ سیاسیات کے نکات و غوامض پر بھی حاوی ہے

اور اچھی طرح حاوی ہی،

ٹرکی میں کئی فتحی بے گزرے ہیں، ایک فتحی بے وہ ہیں جو جنگ بلقان میں ہوائی جہاز سے گر کر شہید ہوئے، دوسرے فتحی بے جنگ طرابلس میں سرگرم عمل رہ چکے ہیں، لیکن ہمارے فتحی بے کا نام نامی احمد فتحی بے آف قازان ہی، آپ کا سلسلۂ خاندان قازان کے ایک ممتاز پاشا سے ملتا ہی آپ کی عمر ۴۰ برس کی ہی، آپ "ترکی"، فارسی، عربی، فرنچ، اور "انگریزی" زبان میں کامل مہارت رکھتے ہیں، آپ زبردست اور ممتاز ادیب ہیں، علامہ فتحی بے عام ترکی مدبرین کی طرح ترکی اجتماعی زندگی میں ایک سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن خداداد قابلیت کی وجہ سے بہت جلد آپ کیپٹن بنا دیئے گئے، اور کوئی چار سال تک آپ فوج میں معقول خدمات انجام دیتے رہے، اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپ شاہی باڈی گارڈ کے افسر اعلیٰ رہے، پھر انتظاماً آپ ارض روم بھیج دیئے گئے جہاں آپ کو ایک سال تک رہنا پڑا، فتحی بے نے فوجی لائن میں جو خدمات انجام دیں اُن کے ساتھ ہی ساتھ آپ کی انتظامی قابلیت نے آپ کو ترکی وزارت کی نظروں میں زیادہ وقیع بنا دیا یہ وہ زمانہ ہی کہ آپ "انقلابی" خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے، آپ کے ایک دست جو ۱۹۱۳ء میں ٹرکی وزیر مال تھے اُنھوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ وہ ملازمت ترک کر کے ترکی میں انقلابی جماعتیں مرتب کریں، چنانچہ فتحی بے نے ملازمت سے استعفا دیدیا، مگر سلطان المعظم نے اسے منظور نہ کیا اسی عرصہ میں مملکت فرانس میں ترکی سفارت بدل گئی اور آپ فرانسیسی سفارت میں بحیثیت ملٹری اٹاچی پیرس بھیج دیئے گئے، جہاں آپ کامل ۲ برس تک ترکی سفارت خانہ میں فرائض انجام دیتے رہے، پیرس کے قیام میں فتحی بے نے علاوہ فرنچ زبان کے فرانسیسی رسائل عامہ اور سیاسیات کا کافی مطالعہ کیا، اس کے بعد آپ سالونیکا میں کمانڈر مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ ہی جب سلطان المعظم اعلیٰحضرت حضور مغفور سلطان عبدالحمید خاں سالونیکا میں نظربند تھے، جب سلطان مرحوم نے نظربندی سے تنگ آ کر احتجاجاً فتحی بے سے شکایت کی تو ممدوح نے یہ نہایت قیمتی مشورہ دیا کہ آپ زمانہ نظربندی میں اپنی سوانح اور عہد حکومت کے

حالات لکھیے، اس کے بعد فتحی بے مملکت بلغاریہ میں ترکی سفیر مختار کی حیثیت سے بدل دیے گئے، اور
یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ترکی وزارت نے فتحی بے کی سیاسی علو مرتبت کو پہچان کر انہیں یہ جلیل القدر
سیاسی عہدہ تفویض کیا، جب آپ صوفیہ میں سفارت کے عہدہ پر مامور ہوئے تو موجودہ ترکی کے
مجدد مارشل مصطفےٰ کمال پاشا آپ کے ملٹری اٹاچی مقرر ہوئے، صوفیہ میں ان دونوں انقلابی
خیالات کے آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہونا ملک قوم کے لیے نہایت مفید تھا، اگرچہ مارشل
مصطفےٰ کمال پاشا سے فتحی بے کی ملاقات سالونیکا میں ہو چکی تھی لیکن اس قربت نے دونوں کے
عزائم میں مزید تقویت پیدا کر دی، اب فتحی بے ممدوح کا اصل عہد سیاست شروع ہوتا ہے یعنی
آپ "انجمن اتحاد و ترقی" کے سکریٹری منتخب ہوئے ظاہر ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی کی نظامت
ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتی تھی، جہاں تمام امور جہاں بانی اور داخلی اصلاحات کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے
چنانچہ فتحی بے نے اس عہدہ کا چارج لیتے ہی اس قدر محنت و قابلیت سے کام لیا کہ دوسرے ترکی
مدبرین آپ کی سیاست دانی پر ششدر رہ گئے، آپ کی محنت و سرگرمی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ ایک مرتبہ
آپ نے رومانوی سفیر سے خفیہ ملاقات کی جس کا سلسلہ کامل پانچ گھنٹہ رہا، اُس کے بعد آپ ترکی صدر اعظم
سے ملنے گئے جہاں آپ کو شام ہو گئی، پھر آپ سیدھے دفتر تشریف لے آئے جہاں آپ رات بھر
کام میں مصروف رہے اور اس تمام عرصہ میں آپ نے صرف دو مرتبہ چائے پی، جب بلغاری فوجوں نے
ایڈریانوپل پر چڑھائی کی تو فتحی بے چالیس ہزار جرار لشکر کے ساتھ گیلی پولی میں مصروف کارزار
ہو گئے گویا یہ دوسرا موقع تھا جب آپ ملک و ملت کی مدافعت کے لیے سیاسیات سے نکل کر فوجی
لائن میں کام کرنے لگے، گیلی پولی میں تنہا فتحی بے ایسا عظیم الشان کمانڈر تھا جس نے بلغاری
فوجوں کو ایڈریانوپل پر حملہ کا موقع ہاتھ نہ آنے دیا غرض یہ اور اسی قسم کی متعدد جنگی و سیاسی خدمات
تھیں جن کے ذریعہ ترکی میں ممدوح کی گوناگوں قابلیتوں کا شہرہ ہو گیا، اور آپ ترکی کے مسلمہ
لیڈر مان لیے گئے، جب جنگ فرنگ کا آغاز ہوا اُس وقت آپ عارضی طور پر بصرہ کے لفٹنٹ گورنر
تھے، لہذا جب برطانی فوجوں نے مقام "قرنہ" پر حملہ کیا تو آپ نے ان کی پرزور مدافعت کی

لیکن کافی سامان رسد اور کمک کے نہ ملنے پر آپ کی فوجوں کو ہتیار ڈال دینا پڑا، اور آپ شام
میں مارشل جمال پاشا کے پاس چلے آئے، آپ کے اس معرکہ کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کی
طرف سے جو اطلاع شائع ہوئی تھی وہ یہ ہے، دہلی ۹ر دسمبر ۱۹۱۴ء سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے
کہ فتحی بے گورنر بصرہ نے شمالی بصرہ کے مقام "قرنہ" میں کمانڈ کرتے ہوئے ہتیار ڈال دئے"،
اُس وقت آپ شام و کردستان میں علی احسان پاشا کے ساتھ فوجیں بھرتی کرتے رہے یہاں تک
کہ جب مارشل عزت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے تو فتحی بے ترکی کے وزیر داخلہ بنائے گئے جو آپکی
سرکاری خدمات کا آخری عہدہ تھا،

۱۹۱۴ء کا وہ خونریز سال شروع ہوا جس میں ترکی قوم کی تباہی و بربادی اور ہلاکت و خسران
کے نہایت ہی صبر آزما زمانہ تھا، جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں مشہور معاہدہ سیورے مرتب ہوا اُسی وقت
فتحی بے ایوان حکومت کے رکن رکین تھے لیکن حقیقت میں یہ ایوان حکومت فتحی بے ایسے سچے
خیر خواہ ملک و وطن کے لیے ایک قید خانہ سے زیادہ تکلیف دہ تھا کیونکہ ایک طرف تو قومی سیاسیات
کا تقاضہ تھا کہ ملک و ملت کی رہنمائی اور خدمت سے خود کو کسی طرح علیحدہ نہ کیا جائے لیکن
سیاسی ماحول خصوصاً اتحادیوں کی مداخلت روز بروز آپ کو دل برداشتہ کرتی جاتی تھی، یہ حالات
آخر ۱۹۱۸ء کے ہیں جبکہ آپ مارشل احمد عزت پاشا اور مارشل رضا پاشا کے ساتھ کام کرتے تھے
لیکن آپ بڑی جرأت سے اُس پالیسی کے مخالف تھے جو اتحادیوں کے مفید مطلب بعض ملت
فروش ترکی وزراء اختیار کر رہے تھے، یہاں تک کہ فتحی بے نہایت جرأت و دیانت سے ملک و
قوم کی خدمت میں مصروف رہے، ادھر انگورہ تحریک کا آغاز ہو چکا تھا جب ترکی دار المبعوثین
میں احرار انگورہ کے خلاف تجاویز سوچی گئیں تو آپ نے نہایت دلیری سے ان کی مخالفت کی،
پس یہی وجہ تھی کہ اتحادیوں نے آپ کی حریت پسندی اور وطن پرستی کا اندازہ کرتے ہوئے
اوائل ۱۹۲۰ء میں آپ کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا، آپ کی نظر بندی محض ترکان احرا

کی حمایت میں تھی اور اسی طرح آپ کے تمام وہ رفقاء بھی گرفتار کرلیے گئے تھے جو آپ کے خیالات کے موید تھے، ان معزز رفقاء میں سعید حلیم پاشا صدر اعظم، کوچک جمال پاشا، حسین رؤف پاشا، کرنل قرہ وصاف پاشا، ڈاکٹر عمر نسیم پاشا، ڈاکٹر جلال نوری بے ایڈیٹر "جون ترک"، شاہزادہ ابراہیم آفندی، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں فتحی بے اور آپ کے رفقاء کی یہ وہ مقتدر جماعت تھی جو ڈیڑھ دو سال مالٹا میں نظر بند رہی چونکہ اس جماعت میں ہر شخص علم و فضل میں ممتاز مرتبہ رکھتا تھا بالخصوص علامہ فتحی بے ایسا فاضل روزگار ادیب مالٹا میں بیکار نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ ممدوح نے بعض نادر الوجود انگریزی کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا، علامہ فتحی بے کی یہ خدمت ایسی تھی جس پر تمام یورپی اخبارات نے علامہ ممدوح کی علمی مرتبہ پر مقالات لکھے تھے، علامہ فتحی بے نے ان انگریزی کتابوں کو ترکی زبان میں ترجمہ کرکے ثابت کر دیا کہ وہ ایام تعطیل میں بھی اپنی قوم کی خدمت سے غافل نہیں۔

اگست ۱۹۲۱ء میں معرکہ سکاریہ کے بعد ترکان انگورہ کی جنگی و سیاسی پوزیشن نہایت مستحکم ہو چکی تھی، اتحادیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے خود اندرون قسطنطنیہ ترکان احرار کے موئدین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا کہ اسی دوران میں علامہ فتحی بے مالٹا سے رہا ہو کر انگورہ پہونچ گئے، علامہ ممدوح کی سیاسی قابلیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب آپ مالٹا سے رہا ہو کر انگورہ جانے والے تھے اُسی وقت سے انگورہ پارلیمنٹ نے علامہ ممدوح کے لیئے وزارت داخلہ کی کرسی خالی کرکے آپ کو وزیر داخلہ نامزد کر دیا تھا، جس وقت یہ حضرات انگورہ پہونچے تو تمام اعیان حکومت نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا، خود رئیس جمہوریت مارشل مصطفیٰ کمال پاشا مع اپنے جنگی اسٹاف کے اسٹیشن پر موجود تھے، علامہ فتحی بے اگرچہ دو سال کی نظر بندی اور قید کی تکالیف سے چُور ہو رہے تھے مگر حب الوطنی کا جوش اس قدر غالب تھا کہ آپ نے انگورہ پہونچتے ہی وزارت داخلہ ایسی اہم ذمہ داری کو قبول فرما لیا، اور نہایت قابلیت سے فرائض انجام دینے لگے، ادھر حضرت حسین رؤف پاشا صدر اعظم انگورہ مقرر ہوئے، ان حضرات کے تقرر سے یورپ کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اور اخبارات

نے صاف صاف لکھدیا تھا کہ اب انگورہ گورنمنٹ کا ترقی کن دور شروع ہوگیا ہے علامہ فتحی بے اُس وقت سے لیکر اِس وقت تک برابر وزیر داخلہ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

فروری ۱۹۲۲ء میں جب حضرۃ بکر سمیع کا مصالحانہ وفد انگلستان میں ناکام رہا، تو انگورہ گورنمنٹ نے اتمام حجت کے لیے وسط ۱۹۲۲ء میں پھر ایک سیاسی مشن یورپ روانہ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ اتحادیوں کو جنگ ترکی و یونان کے التوا اور مصالحت کے لیے آمادہ کیا جائے، لہذا اس اہم سیاسی مقصد کے لیے انگورہ گورنمنٹ نے علامہ فتحی بے ہی کو منتخب کیا جن کی انگریزی دانی اور فرنچ آگاہی ترکوں میں مشہور تھی، علامہ فتحی بے اس سیاسی مشن کو لیکر جب انگلستان پہونچے تو انگلستان میں لارڈ کرزن ایسے عالی دماغ اور سیاست آگاہ شخص نے فتحی بے سے ملنے کی درخواست نامنظور کردی کیونکہ مآل اندیش لارڈ کرزن سمجھتے تھے کہ ترکان انگورہ بالآخر یوناں سے شکست کھائیں گے، جب لارڈ کرزن نے فتحی بے سے ملنا نامنظور کیا تو یہ سیاست آگاہ اور ترکی کا عظیم الشان جنگی و سیاسی ماہر انگلستان سے مسکراتا ہوا چلدیا اور پیرس پہونچکر اُس نے انگورہ کے چیف آف دی اسٹاف کو تار دیدیا کہ بڑھو اور بزدل یونانی افوج پر ٹوٹ پڑو۔

حضرۃ فتحی بے کی انگلستان میں موجودگی کو عام طور پر سمجھا گیا تھا کہ انگورہ گورنمنٹ نے آپ کو انگلستان و فرانس اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان دونوں عیسوی حکومتوں کی منت سماجت کرکے کسی طرح یونانیوں سے پیچھا چھوڑالیں لیکن اصلیت اس کے بالکل خلاف تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ ترکان انگورہ کو اتحادیوں سے نہ کبھی پہلے کوئی توقع تھی نہ اس وقت اُنھیں صلح و امداد کی توقع پیدا ہوئی تھی البتہ یہ انگورہ گورنمنٹ کی بے مثل سیاسی چال تھی کہ اُس نے فتحی بے ایسے جنگی و سیاسی لیڈر کو دول اتحاد کے دارالحکومتوں میں بھیجا تاکہ وہ وہاں یونانیوں کے حق میں دول اتحاد کی رائے عامہ کا اندازہ کریں اور معلوم کریں کہ اگر ترکی لشکر یونانیوں پر حملہ آور ہوں تو دول اتحاد کی رعایا اُس وقت کیا طرز عمل اختیار کریگی؟ یہ تھا وہ اہم سیاسی مقصد جس کے حصول کے لیے فتحی بے یورپ تشریف لائے تھے اور گو لارڈ کرزن کے نہ ملنے پر انگریزی حلقوں میں خوشیاں منائی گئیں مگر فتحی بے

نے اس چند روزہ خموش قیام میں یہاں کی حالت کا صحیح اندازہ کرلیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ہی انگورہ گورنمنٹ کا وہ عظیم الشان اور تاریخی حملہ شروع ہو گیا جس نے یونانیوں کا استیصال کامل کر دیا۔

جب ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو یہ حملہ فتح سمرنا کی کامیابی پر ختم ہو گیا تو انگورہ کی وزارت داخلہ کے لیے نظم و انصرام اور داخلی بندوبست کا ایک عظیم الشان سلسلہ شروع ہو گیا، دہانہ سکاریہ سے لیکر اسکی شہر افیون قرہ حصار، اور اسمد، و سمرنا تک تمام برباد شدہ علاقہ اور غیر منتظم اور پراگندہ رعایا کا حفظ و اجتماع، تجارتی کاروبار کی اصلاح، برباد شدہ آراضی کو قابل کاشت بنانا، آبپاشی، سلسلہ رسل و رسائل، شہروں میں سیاسی و انتظامی محاکم کا انعقاد، سرکاری اور غیر مصافی عمارتوں کی تعمیر، مدارس و مکاتب کا افتتاح، ریلوے لائن کی تعمیر و درستی، ٹیکس و محاصل کا انصرام وغیرہ یہ تمام اہم داخلی معاملات وزارت داخلہ ہی سے متعلق تھے لہذا فتح سمرنا کے بعد ہی علامہ فتحی بے بحیثیت وزیر داخلہ ان مہمات مسائل کی اصلاح کے لیے سرگرمی اور پوری محنت کے ساتھ مصروف عمل ہو گئے حکومت انگورہ کی اس سرکاری رپورٹ میں جو نومبر ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں پڑھی گئی ان خدمات کے مفصل اعداد و شمار بتلائے گئے ہیں اور یہی وہ اعداد ہیں جو فتحی بے کے متجر دماغ اور عملی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں، اس رپورٹ میں وزارت داخلہ انگورہ کی خدمات کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

"وزارت داخلہ نے امن و انتظام کو قائم کرنے کے بعد اپنے افسر مقرر کیے جو قوانین کی تنفیذ اور اجرا کریں، چونکہ محکمہ تفتیش دو سال قبل توڑ دیا گیا تھا اس لیے بعض لوگوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی اس بنا پر پھر محکمہ تفتیش (خفیہ) قائم ہو گیا، جس نے نہایت جانفشانی سے اپنے کاموں کو انجام دیا، اس محکمہ نے (۹۴) افسروں کے متعلق رپورٹ کی جس میں سے تحقیق کے بعد (۳۰) کلکٹر اور (۵) ڈپٹی کلکٹر برخاست کیے گئے، محکمہ تفتیش نے (۲۶۲) حلقوں کی تحقیق کی اور ہلال احمر کی جماعتوں میں سے (۱۵) جماعتوں میں کام کیا، وزارت داخلہ نے واپس شدہ علاقوں میں جو عدالتیں قائم کیں ان میں (۱۴) کورٹس آف اپیل عدالت ہائے خفیفہ محاکم شرعیہ (۹۰) جنیس (۵۶۰) قاضی اور (۲۲) جج مقرر ہو چکے ہیں"

(توید، ۱۶- اپریل ۱۹۲۳ء)

یہ ہیں وہ مختصر خدمات علامہ فتحی بے کی جو مجھے میسر آئیں، ورنہ اصلیت میں فتحی بے ممدوح کی خدمات اس سے کہیں زیادہ کثیر اور اہم ہیں، جب کوئی ترکی قلم "تاریخ انگورہ" لکھے گا تو محترم فتحی بے کی خدمات اور سرگرمیوں سے اس کے صفحات جگمگا اٹھیں گے، اور دنیا کو معلوم ہوگا کہ ممدوح جہاں ایک ماہر جنگی لیڈر تھے وہاں ایک نادر دماغ سیاسی مدبر بھی تھے کاش ہمارے نوجوانوں میں بھی خصوصاً طلبہ میں اس قدر وسیع ہمہ دانی کا ولولہ پیدا ہو، اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کو منتہائے کمال سمجھنے کی حوصلہ شکن عادت اُن سے دور ہو۔

حُلیہ اور خصائل — علامہ فتحی بے نہایت خلیق اور نرم مزاج آدمی ہیں، بہت کم بولتے ہیں مگر دوستوں کی جماعت میں وہ زیادہ خوش طبع آدمی واقع ہوئے ہیں، فیلڈ مارشل فوزی پاشا کمانڈر انچیف انگورہ آپ کے خاص دوست ہیں، سیر و تفریح کا بہت کم شوق ہے البتہ اخبارات کا مطالعہ آپ کے لیے نہایت دلچسپی کا سامان ہے قد درمیانہ بھرا ہوا جسم، ہلکی نیلی آنکھیں، یورپی فیشن کی نصف مونچھیں ڈاڑھی صاف باوجود یورپ میں عرصہ تک قیام رکھنے کے آپ نے کبھی یورپی ٹوپی استعمال نہ کی،

"توحیدی"

رفتار تعلیم

رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا زمانۂ حیات ایک سو برس ہو چکا گزشتہ ماہ جولائی میں اس کی صدسالہ سالگرہ بڑی دھوم سے منائی گئی جس میں سلطنت برطانیہ میں تقریباً تمام علمی انجمنوں کے مندوبین شریک ہوئے۔ شہزادہ ویلز نے اس کا افتتاح کیا۔

سوسائٹی مذکور کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے اس کے گزشتہ صدی مجلدات کے مضامین اور اہم شذرات کی فہرست سے جو بہ لحاظ مصنفین اور بہ لحاظ ممالک مرتب کی گئی تھی، ہر مندوب کو تقسیم کی گئی۔ ہندوستان سے متعلق مقالات و شذرات ضخامت میں تمام دیگر ممالک سے متعلق مضامین کے برابر ہیں، غرض اس ایک صدی میں سوسائٹی مذکور نے ایشیا اور بالخصوص ہندوستان کے علوم و فنون کی تحقیق و تفتیش اور نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو گرانبہا خدمات انجام دی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر کوئی شخص جو ذرا بھی علوم شرقیہ سے مس رکھتا ہے، لارڈ مکالے کے ان جذبات کے اظہار کی جو اس نے ۱۸۳۵ء کی "تعلیمی یادداشت" میں کیے ہیں، جرأت نہیں کریگا۔ سوسائٹی نے نہ صرف علوم شرقیہ کی نشر و اشاعت سے عام اشخاص کی معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ اس نے نوجوانوں میں بھی علوم قدیمہ کی تحقیق کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیس سال سے اس نے تاریخی مضامین پر تمغے اور کتابیں بطور انعام دے کر ہمت افزائی کرتی رہی ہے۔ ہر طرف مزید ایشیائی انجمنیں کھل رہی ہیں، یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ سوسائٹی مذکور کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لارڈ چالمرس کی صدارت میں سوسائٹی کی دوسری صدی شروع ہو رہی ہے۔ جس کی آیندہ ترقی کا دارومدار علمائے فن کی کوشش و عمل پر ہے۔ اخیر میں ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ اراکین و کارکنان ایشیاٹک سوسائٹی میں "ایشیائی" اشخاص کی تعداد میں اضافہ ہو۔

انجمن قومی تعلیم، امریکہ نے تمام عالم کی مجالس تعلیمی کا ایک اجلاس بمقام سین فرانسسکو منعقد کیا ہے

جس کا مقصد یہ بتایا جاتا ہی کہ تمام اقوام میں باہمی اتحاد و اتفاق قائم ہو، برکات تعلیم عام ہوں، اور
ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو شاہراہِ امن کی طرف لیجاتی ہوں۔ چنانچہ مضامین زیر بحث یہ ہوں گے۔
بین الاقوامی اتحاد عمل، معلومات تعلیمی کی اشاعت، تخیلات بین الاقوامی، تعلیم صحت جسمانی وغیرہ وغیرہ
دنیا اپنے درد کا علاج مختلف طریقوں سے ڈھونڈھ رہی ہی۔ دیکھئے کوئی نسخہ اکسیر کب ہاتھ آتا ہی
جس سے امن و چین نصیب ہو۔

واقعاتِ عالم اور رفتارِ زمانہ کا گہرا مطالعہ کرنے والے حضرات اس امر سے بے خبر نہ ہوں گے کہ
تہذیب و تعلیم ایشیا و یورپ سے کھسکتی ہوئی امریکہ کی طرف جارہی ہی۔ چنانچہ حال میں خواتین امریکہ نے
۲۰ لاکھ ڈالر (۶۰ لاکھ روپئے) اس غرض سے فراہم کیے ہیں کہ ان سے عورتوں کو علوم شرقیہ کی تعلیم
کے لیے کالج قائم کیے جائیں۔ اس وقت، تعلیم گاہوں کے کھولنے کا قصد کیا جارہا ہی جن میں سے
۳ ہندوستان میں ہونگی۔

مصر کے جدید نظام دستوری کی رو سے ذکور و اناث ہر دو اصناف کے لیے ابتدائی تعلیم لازمی
قرار دی گئی ہی اور اس کے لیے مصر کے چہل سالہ (۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۲ء تک) تعلیمی ترقی کی
ایک یادداشت شائع کی گئی ہی، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۸۸۲ء میں حکومت مصر اور محکمہ اوقاف
کے ماتحت مدارس کی مجموعی تعداد ۱۰۵ تھی جن میں ۱۰۳۸۳ طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ آج ۴۵۷
سرکاری اسکول ہیں اور ۳۱۹۱ صوبہ کی کونسل کے ماتحت ہیں، ان ہر دو اقسام کے مدارس میں
طلبہ کی مجموعی تعداد ۳۲۱۸۲۱ ہی۔

روپیہ کی کمی کے سبب سے پہلے تعلیم کا کوئی معقول بندوبست نہ تھا، ابتدا میں وظائف طعام و
قیام کے اخراجات نیز آیندہ ملازمت کی امیدیں دے دلا کر طلبہ فراہم کیے جاتے تھے۔ اور گورنمنٹ
کو چونکہ اشخاص کی ضرورت تھی اس لیے اس نے دل کھول کر ایسا کیا۔

تعلیم نسواں کے معاملہ میں یہ ترقی ذرا دھیمی تھی۔ سب سے پہلا اسکول لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم

کے لیے سنہ ۱۸۷۳ء میں کھولا گیا لیکن سنہ ۱۸۸۲ء تک اس میں کچھ ترقی نہ ہوئی - صرف ایک اسکول تھا جس میں ۹۹ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں اور پھر بھی ان کی تعلیم کے لیے عورتیں نہ تھیں سنہ ۱۹۱۰ء میں ۵ لڑکیوں نے پرائمری سرٹیفکیٹ امتحان پاس کیا جس سے وزارت کو امید ہوئی اور عورتوں کے لیے ایک ٹریننگ کالج کھولا گیا۔ آج قریباً ۲۴۷ گرلز اسکول ہیں جن میں ۵۸۹۴۹ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں معقول ترقی ہوئی ہے۔ طلبہ اسکول سنہ ۱۸۲۷ء میں، جانوروں کے علاج دایوں کی تربیت، قانون کی تعلیم کے لیے مدارس کھلے ہوئے ہیں - ان کے علاوہ اور بہت سی تعلیمگاہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ انگلستان بھیجے گئے، اس کے بعد سے فرانس، سویزرلینڈ بھی بھیجے جانے لگے، صنعت و حرفت اور تجارت کی تعلیم کا بھی انتظام ہے ایک اسٹیٹ یونیورسٹی کھولنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔

بصرہ کے اراکین وزارت آیندہ سال متعدد مدارس کھولنے پر غور کر رہی ہے جن میں ایک لڑکیوں کا اسکول بھی ہوگا جس کے اساتذہ مصر سے بلا لیے جائیں گے۔

بالخصوص قومی تعلیم کے حلقہ میں یہ خبر بہت ہی رنج و افسوس کے ساتھ سُنی جائیگی کہ آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک نے ۶ ہزار پونڈ سالانہ حکومت انگلستان سے لینا منظور کر لیا ہے۔

سر رابرٹ بیڈن پاول تحریک سکاوٹ کے مشہور بانی ہیں، اُنھوں نے امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اپنی تحریک کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس تحریک کا منشا تندرست ہشاش بشاش اور کارآمد شہری پیدا کرنا ہے۔ اس کا طریقہ عمل صرف چند کھیلوں پر مبنی ہے۔ اپنی زندگی کے قلیل عرصہ میں (پندرہ سال جن میں پانچ سال گزشتہ جنگ کے بھی شامل ہیں) اس تحریک نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ اس کے ممبروں کی تعداد ۲۰ لاکھ لڑکے

اور لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ طلبا کے سرپرستوں اور ماہر تعلیم نے بھی اسے پسند کیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج
اس کی شاخیں تمام متمدن ممالک میں قائم ہو گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے تحریک کی صورت "بین الاقوامی
اخوت" کی سی ہو گئی ہے۔ بانی تحریک نے یہ دیکھ کر کہ تعلیم خواہ علمی حیثیت سے کتنی ہی ترقی کر جائے
لیکن معاشرتی ضروریات کے لیے پھر بھی ناکافی رہ جاتی ہے اور آیندہ کی مزید ضروریات کے لیے
اور بھی نیز ارتکاب جرم، بداخلاقیاں، افلاس، خرابی صحت، باہمی و قومی مناقشات غرض ہر طرح
کی برائیاں موجودہ سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں اور جو خود انسانوں کی پیدا کردہ ہیں اور جن کا
بہترین علاج وہی خود کر سکتے ہیں، اس لیے بہترین طریقہ علاج اخلاق انسانی کی اصلاح ہے جو
تحریک اسکاوٹ کا مقصد عظیم ہے۔

تحریک کے اغراض اور وجوہ آغاز سے اُس کے مفید ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس
"پردہ زنگاری" میں کوئی "معشوق" پنہاں نہ ہو۔

"معلم"
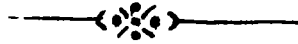
مطبوعاتِ جدیدہ

فتح المعالی ترجمہ صحف الغزالی ۔ مترجمہ حضرت حافظ فیض احمد صاحب مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ قیمت عہ
یہ رسالہ جیسا کہ دیباچہ میں ظاہر کیا گیا ہے امام غزالی کی وفات کے بعد اُن کے بھائی نے فضائل الانام کے نام سے مرتب کیا تھا جو درحقیقت امام صاحب کے مکتوبات کا مجموعہ ہے جس کا ایک قلمی نسخہ سرسید احمد خاں کے پاس تھا اور اُنہیں نے پہلی مرتبہ اُس کو طبع کرایا۔ اس رسالہ کا ترجمہ اب حاجی محمد محی الدین صاحب تاجر کتب بنگلور کی فرمائش سے ہوا ہے ۔ ترجمہ برجستہ و بامحاورہ ہے لیکن جناب مترجم نے اکثر مقامات پر اپنے نوٹ اور اپنی رائے اس بے ترتیبی سے شامل کی ہے کہ بہ یک نظر یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اصل مضمون کتاب ہے یا حاشیہ مترجم۔
رسالہ ہذا میں سلاطین، و امراء، و وزراء کے نام بھی خطوط ہیں اور علماء عصر و فقہائے عہد کے نام بھی مختلف مسائل پر مکتوبات موجود ہیں۔ آخر میں بعض نصائح شامل کیے گئے ہیں۔
امام غزالیؒ کی تصنیف کا ترجمہ شائع کر دینا بجائے خود ایک خدمت ہے جس کے لیے ہم جس قدر ممنون ہوں بجا ہے۔
کتاب معمولی کاغذ پر صاف چھپی ہے اور حاجی محی الدین سوداگر کتب لشکر بنگلور سے ملتی ہے۔
مثنوی بحرالمحبت۔ مصنفہ شیخ مصحفی، مرتبہ مولوی عبدالماجد، بی۔ اے مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ قیمت ۱۲ر
میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق کا اگرچہ اس زمانہ میں کچھ زیادہ چرچا نہیں ہے لیکن ایک وقت گزرا ہے کہ شائقین ادب کے لیے وہ سرمایۂ ناز تھی اور اب بھی پچھلی صحبتوں کے دیکھنے والے دریائے عشق کا اس شوق سے نام لیتے ہیں گویا ادب اُردو کا ایک انمول موتی ہے۔ غالباً اسی شہرت و ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر میر کے ہمعصروں کو اسی زمین میں بادیہ پیمائی کی فکر ہوئی، اور بھی مثنویاں ہوئی ہوں گی لیکن شیخ مصحفی کی بحرالمحبت نے خصوصیت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف

کھینچی۔ کچھ تو شاعری کی شخصیت، پھر بحر المحبت کی ٹکر اور سب سے نیا تحفہ کہ آخری مثنوی نے پہلی کا تتبع اس شدت سے کیا تھا کہ جزئیات، خیالات اور طرز بیان تک کی تقلید میں دریغ نہیں کیا، خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو مقابلہ کرنا پڑتا اور اس طرح بحر المحبت کا چرچا بھی زبان زد خلائق ہو گیا۔ لیکن بہت کم ایسے لوگ تھے جنھوں نے بحر المحبت کو خود دیکھا ہو یہ جناب عبدالماجد صاحب کا احسان ہی کہ اس نادر الوجود ادبی یادگار کو اُنھوں نے نہایت خوبی سے حال میں طبع کرایا ہی اوّل ایک مختصر دیباچہ، پھر مقدمہ اور اس کے بعد ایک مفصل تبصرہ ہی جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہی کہ بحر المحبت شاید دریائے عشق سے بھی بہتر ہی شاید کا لفظ اس لیے استعمال کیا جاتا ہی کہ خود جناب عبدالماجد صاحب کو بھی اپنی رائے پر پورا وثوق نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ دونوں مثنویوں کا بالتفصیل مقابلہ کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں قلمبند فرمایا ہی:-

"تصریحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ میر و مصحفی دونوں نے ایک ہی بحر میں شناوری کی ہی۔ میر کی فضیلت و اولیت تمام اردو شاعروں کے مقابلہ میں مسلم ہی، لیکن اس مخصوص میدان میں جیسا کہ اوپر کئی بار اشارہ کیا جا چکا ہی مصحفی کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہی، اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ اُن کے سامنے ایک نمونہ پیشتر سے موجود تھا اور نقش ثانی ہمیشہ نقش اوّل کے مقابلہ میں آسان تر و بہتر ہوتا ہی، خواہ کچھ اور ہو واقعہ بہرصورت یہ ہی کہ مصحفی کی مصوری مقتضائے حال سے قریب تر اور جذبات بشری کے زیادہ مطابق ثابت ہوئی۔

بایں ہمہ میر پھر میر ہیں۔ اُن کے قلم سے متعدد اشعار اس قدر دلنشیں اور ڈھلے ہوئے نکلے ہیں، اور جن میں اس مخصوص افسانہ سے قطع نظر کر کے عام واردات قلب اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ بے اختیار زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔"

واقعات اور بڑی حد تک طرز بیان چونکہ ایک ہی اس لیے مقابلہ کا بہت موقعہ ہی جس سے جناب مرتب نے کافی فائدہ اُٹھایا ہی لیکن بہت کم ایسے مواقع ہیں جہاں مصحفی کی برتری ثابت ہو گئی ہو۔ اور ایسے مقامات بھی بہ کثرت نظر آتے ہیں جہاں مصحفی کا بیجا طول یا بے لطف بیان بغیر نقل کیے

چھوڑ دیا گیا ہے۔ حسین بیتی۔ درویش پریس۔ دہلی قیمت ۸ ر

حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کی یہ تازہ تصنیف ہے جو واقعات کربلا و حادثۂ شہادت کے بیان میں اُنھوں نے حال میں مثنوی کی بحر میں مرتب فرمائی ہے اور جس کو ملا محمد الواحدی صاحب نے شائع فرمایا ہے۔ چار جزو کی مثنوی چھوٹی نہیں ہوتی اور جناب فراق نے ان صفحات میں کربلا کے واقعات پر شاعرانہ حیثیت سے خوب گلفشانی کی ہے۔ زبان صاف اور بیان موثر ہے۔ خواہ مرثیہ کے طرز سے بہتر ان واقعات کے لیے کوئی دوسرا انداز بیاں نہ ملے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کربلا کے چند واقعات کو جس طرح وسعت دی گئی ہے اور جس طرح نئے اسلوب اور نئے انداز سے اس کی اشاعت اور اس کے مظاہرے ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا اگر مثنوی کے عام فہم سلیس اور بامزہ بحر کو اس داستان کے لیے انتخاب نہ کیا جاتا۔

مجموعہ کلام جوہر (طبع ثانی) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ قیمت ۶ ر

مولانا محمد علی مدظلہ کا مجموعہ کلام جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ ملیہ نے ماہ دسمبر میں شائع کیا تھا جو اپنی خوبی و دلکشی و نیز کلام کی مقبولیت و عام عقیدتمندی کے باعث ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ کارپردازان مکتبہ نے اب دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے ایک گرانبہا اضافہ عبدالماجد صاحب بی۔ اے کے قابل قدر مقدمہ کی صورت میں ہوا ہے۔ عبدالماجد صاحب نے علاوہ مولانا کے کلام کے ریویو کرنے کے اُن عظیم الشان انقلابات کا بھی ذکر کیا ہے جو مولانا کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذہبی و سیاسی مباحث کے بعض نکات پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

مولانا کے کلام کے متعلق اُن کا ایک جملہ ملاحظہ ہو۔

"محمد علی کا اصلی موضوع حسن کی رعنائی، جمال کی زیبائی نہیں، بلکہ وہ دل کی چوٹ، عشق کی تڑپ، جذبات کے سوز کو سامنے لاکر رکھ دیتا ہے، اور یہی اُس کے کلام کی تاثیر کا راز ہے آقا لاکھ کریم و فیاض ہو، اُس کے بیان میں وہ درد و اثر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جو غلام کی جانب سے

محتاجی و درماندگی کے عرض حال میں ہوگا۔"

اوّل ابتدائی کلام ہے جس میں بعض غزلیں زمانۂ طالب علمی علیگڈھ کالج (۱۹۰۳ء) کی شامل ہیں۔ اس کے بعد وہ مجموعہ ہے جو اس سے قبل بھی شائع ہو چکا ہے۔

آخر میں کلام جدید کے عنوان سے وہ تمام غزلیں ہیں جو حال میں بیجاپور جیل میں تصنیف ہوئی ہیں اور ایک زندانی کی واردات قلب ہیں۔ وہ زندانی جو ہندوستان کی آب ہوا میں اپنی آزاد روح کے لیے قید و بند کی پابندیوں کو نام نہاد آزادی سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ مجموعہ جیبی تقطیع پر نہایت خوشنما چھپا ہے۔ سر ورق رنگین نہایت دیدہ زیب ہے۔ شروع میں مولانا محمد علی صاحب کا دستخطی فوٹو ہے جو مقدمہ کراچی کے دوران میں لی گئی تھی اور اس اعتبار سے گویا اُن کی تازہ ترین تصویر ہے۔ حجم ۰، صفحہ سے زاید ہے۔ قیمت ۶ر

درویش، پندرہ روزہ رسالہ۔ اڈیٹر ملا محمد الواحدی، دہلی چندہ سالانہ دو روپیہ ۲ عہ۔

رسالہ خطیب کی قدیم تقطیع پر "درویش" نئی آب تاب سے حال میں شائع ہوا ہے دو نمبر اس وقت تک نکل چکے ہیں جو ترتیب مضامین، خوبی کتابت و طباعت کے لحاظ سے بلا شبہہ قابل داد ہیں۔ رسالہ کی حیثیت مذہبی و تمدنی ریفارمر کی ہے لیکن سیاسیات و ادبیات نیز علوم و فنون کے متعلق بھی کافی دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے زور قلم کا جو لانگاہ اس وقت "درویش" معلوم ہوتا ہے اور چونکہ خواجہ صاحب کو مسئلہ تبلیغ اسلام سے اس زمانہ میں بہت دلچسپی رہی ہے اس لیے "درویش" کے متعدد صفحات اسی مبحث سے پُر ہوتے ہیں مقالات، سیاسیات، مواعظ حسنہ، اصلاح اعمال، قصص، خرافات وہ عنوانات ہیں جو ہر اشاعت میں نظر آتے ہیں اور اکثر نامور اہل قلم کے قابل قدر مضامین پیش کرتے ہیں۔ تجلیات البتہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے مخصوص انداز میں اُنھیں کے قلم سے جلوہ افگن ہوتی ہیں

ملا محمد الواحدی صاحب کی ادارت میں جو رسالہ بھی شائع ہوا اُس کے متعلق کسی بد مذاقی کا تو تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن موضوع کے اختلاف سے ممکن ہے کہ مختلف طبائع کے لیے وہ

یکساں دلچسپ ہو۔ لیکن "درویش" کے متعلق بلاخوف وتردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر طبقہ وہر مذاق کے علم دوست حضرات کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور ۰۴ صفحہ کا حجم اور مضامین کی خوبی دیکھتے ہوئے قیمت دو روپیہ سالانہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ رسالہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرے گا۔

لسان الملک۔ اڈیٹر سید محمد ضامن کنتوری و سید منظر علی اشہری

مطبوعہ عماد پریس حیدرآباد قیمت سالانہ ص ریاست حیدرآباد سے یہ دوسرا رسالہ ہے جو نہایت خوبی کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور جس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔

حیدرآباد کو وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں وضع الفاظ کا بھی موقعہ ہاتھ آجاتا ہے اس لیے وہاں کے کاغذات و اخبارات میں نئے الفاظ نظر پڑتے ہیں مجلس "تقدم العلوم" کے عنوان سے ایک علمی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور اُسی کے زیرنگرانی "لسان الملک" کا اجرا عمل میں آیا ہے۔

یہ رسالہ ۲۶ × ۲۰ سائز اور سفید کاغذ پر اچھا صاف چھپا ہے۔ حجم چار جزو ہے۔ مضامین میں تنوع کا خاص اہتمام ہے تاریخ، فلسفہ، ادب، ہر قسم کے مضامین قابل مضمون نگاروں کے قلم سے شائع ہوئے ہیں جہاں "اردبیل" جیسے ٹھوس مضامین ہیں وہاں فسانہ و ادب لطیف کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ امید ہے کہ دو چار نمبر دیکھنے کے بعد ہم اُس کے متعلق بہتر رائے قائم کرسکیں گے۔
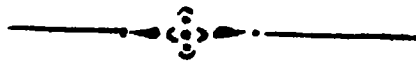
کلام اقبال

(خاص "جامعہ" کے لیے مرحمت فرمایا)

علامہ اقبال کی نظر لطف کا یہ ثمر اولین ہے جس کو ہم کمال افتخار و انبساط کے ساتھ آج جامعہ میں شائع کرتے ہیں، شکر نعمت و اظہار عقیدتمندی کے لیے الفاظ کہاں سے آئیں کہ جذبات دلی کی ترجمانی کر سکیں، لیکن یہ توقع بیجا نہیں کہ مولانا محمد علی مدظلہٗ کی تشریف آوری کے بعد ہم کو اس بار سے سبکدوشی ہو جائے گی اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب اُس وقت جو کچھ عنایت فرمائیں گے وہ تقاضائے محبت ہو گا محض ہماری خاطر نہیں - مدیر

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

حذر از خرد کہ بندد ہمہ نقش نامرادی
دل ما برد بسازے کہ گسستہ تار بادا

نہ بہ جادۂ قرارش نہ بہ منزلے مقامش
دلِ من مسافر من کہ خدایش یار بادا

تپش است زندگانی تپش است جاودانی
ہمہ ذرہ ہائے خاکم دل بے قرار بادا

تو جوانِ خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ مے سرایم بتو سازگار بادا

چو بجانِ من در آئی دگر آرزو نہ بینی
مگر اینکہ شبنم تو یم بے کنار بادا

جامعہ ملیہ

(نتیجۂ فکر جناب سید نواب علی صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر بڑودہ کالج)

مندرجۂ ذیل نظم "جامعہ ملیہ" کی وہ تحسین ہے جو ناشناسوں کے قلم سے نہیں بلکہ ایک نکتہ سنج کی زبان سے ادا ہوئی ہے نیز سید صاحب کی یہ عنایت اُس غائبانہ و بے منت شفقت کا تقاضا ہے جو داد طلبی کجا، دنیا کی اکثر نعمتوں سے زیادہ عزیز و بالطف ہے۔ مدیر

جامعہ چرچے ترے اب جابجا ہونے لگے
آئینۂ جوہر ترے نام خدا ہونے لگے

درد ملت دل میں، سودائے محبت سر میں ہے
چاہنے والے ترے تجھ پر فدا ہونے لگے

کامیابی کے لیے دیوانگی اک شرط ہے
کیوں نصیب دشمناں عاقل بھلا ہونے لگے!

سیکھ لیں بیتابیوں سے تیری چشمک برق کی
وہ جو جگنو کی طرح جلوہ نما ہونے لگے

مسلم اے بندہ خدا کے کچھ تو غیرت چاہیئے
بت کے جو بندے تھے وہ بھی باخدا ہونے لگے

زندہ باد اے "جامعہ" تو ہے حیاتِ طیبہ[1]
تھے جو فرسودہ طریقے وہ فنا ہونے لگے

والضحٰے سے ہو گیا نواب پھر روشن ہمیں
وہ جو تھے بھٹکے ہوئے خود رہنما ہونے لگے

---

[1] اس میں آیۂ شریفہ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً کی طرف اشارہ ہے۔

شذرات

آج متمدن دنیا کا ہر فرد اور مغربی ممالک کے تمام ممتاز مدبرین جن کو سیاسیات مشرق سے کچھ بھی تعلق ہے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آل عثمان کی عظمت گزشتہ کو دوبارہ حاصل کرنے میں لازین کانفرنس سے زیادہ کامیاب اور جنرل عصمت پاشا سے بہتر وکیل کوئی ثابت نہیں ہوا۔

خدائے کارساز کی رحمت کاملہ کے جو مناظر ان مجالس اور اس میدان میں نظر آئے اُن کے لیے ایک مدت سے آنکھیں بیتاب تھیں اور خدا کا شکر ہے کہ دنیائے اسلام کی یہ کامیابی ہی نہیں بلکہ لائڈ جارج، لارڈ کرزن اور اُن کے رفقا رنے بھی وہ سب کچھ دیکھا جس کو وہ نہ دیکھنا چاہتے تھے۔

بلاشبہ یہ تاریخ کا پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں نے دول اتحادسے بالکل مساویانہ صلح کی ہے" (سر آغا خاں) اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ عظیم الشان کامیابی محض ترکوں ہی کی نہیں بلکہ ترکوں کے ذریعے تمام ایشیا کی فتح قرار دیجائے تو بیجا نہیں۔

مولانا محمد علی مدظلہٗ کی رہائی محض ایک واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتی کہ اُس پر صحافی طرز میں چند سطور لکھ دی جائیں بلکہ شوق و عقیدت کی فراوانی، طوفان تکلم و ذوق خامہ فرسائی دونوں سے بے نیاز، جوش عقیدت نہ اظہار جذبات کی تاب لاسکتا ہے اور نہ خیر مقدم کے رسمی قیود سے اُس لطف خاص کو بے مزہ کرنے پر آمادہ ہے جو محض مولانا کی زیارت اور ع

"وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے" کے بلیغ و نشاط انگیز الفاظ میں مضمر ہے۔

یوں تو انتظار کے دن اور بیقراری کی راتیں اس دو برس میں بارہا آئیں اور گزر گئیں لیکن اس مہینے کی بیقراریاں اور انتظار کی گھڑیاں کچھ عجیب شان محبوبی رکھتی تھیں، اطلاع رہائی پر بعض حضرات نے دیوان حافظ کھولا تو یہ غزل نکلی۔

درنماز م خم ابروے تو چوں یاد آمد — حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

ازمن اکنوں طمع صبر و دل و ہوش مدار — کاں تحمل کہ تو دیدی ہمہ برباد آمد

بادہ صافی شد و مرغان چمن مست شدند — موسم عاشقی و کار بہ بنیاد آمد

اے عروس ہنر از دہر شکایت منمائے — حجلۂ حسن بیارائے کہ داماد آمد

برزلیخا ستم اے یوسف مصری مپسند — زانکہ از عشق بر او اینہمہ بیداد آمد

دلفریبان نباتے ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

زیر بارند درختاں کہ تعلق دارند — اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

مولانا نے زندان فرنگ سے ایسے وقت قدم باہر نکالا ہے کہ ملک کی آب و ہوا جیل کی تنگ و تاریک فضا سے بھی زیادہ مسموم اور اہل ملک کی حالت زندانیوں سے بھی زبوں ہے لیکن مولانا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بقول جیل کا دروازہ جب اُن کے لیے کھلا تھا تو زمین پنجاب اور واقعہ جلیانوالہ باغ کسی خیر مقدم و تقریب تہنیت کی دعوت نہیں دے رہے تھے بلکہ اُن آنے والے طوفانوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو بالآخر بپا ہوئے اور انجام کار کراچی اور بیجاپور کی آبادی کا بھی باعث بنے اُس وقت مولانا نے جیل سے نکلتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہو گی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے!

آج بھی وہ اسی طرح اُن کے حسب حال ہے جس طرح اسی غزل کا دوسرا شعر جو صدارت مسلم لیگ کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور مولانا کی موجودہ حیثیت یعنی منتخب شدہ صدر انڈین نیشنل کانگریس کے لیے بھی یکساں موزوں ہے۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تجھے جوہر

لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے!

یورپ نے علوم شرقیہ کی تحصیل و تحقیق میں جو ناموری حاصل کی ہے محتاج بیان نہیں، فرانس، جرمنی اور ہالینڈ نے جو مستشرق پیدا کیے ان کی تحقیقات علمیہ کے آگے خود فضلاے مشرق کو سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔ افسوس ہے کہ اس بزم میں انگلستان کی کرسی بہت نمایاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ مصر اور ہندوستان کے دیرینہ اور حاکمانہ تعلقات کے سبب سے اسے اس مجلس میں چمکنے کا موقع ہر ملک سے زیادہ تھا۔ یوں تو آجکل ولایت میں لائق ہندوستانی طلبہ کی بدولت مستشرق کا لقب بہت گراں نہیں۔ پھر بھی انگلستان کے معدودے چند شائقین علوم مشرقی میں سر جیمس لایل کی ذات مغتنم روزگار تھی۔ افسوس ہے کہ ادبیات عربی کا یہ شیدائی بھی سنہ ۱۹۲۰ء میں ۷۶ سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہو گیا اور انگلستان کو علماے زبان عربی سے خالی کر گیا۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص کو تین سال ہندوستان کے نظم حکومت میں اور بارہ سال انڈیا آفس میں نہایت مصروف زندگی بسر کرنا پڑی ہے تو اس کی تحصیلات اور تحریرات پر سخت حیرت ہوتی ہے اپنی فرصت کے گھنٹے اس نے عربی نظموں کے مطالعہ پر صرف کیے اور اس کمال سے ان کے ترجمے کیے کہ جرمنی کی علمی مجلس ڈی ایم جی کا اعزازی ممبر بنایا گیا اور سٹریسبرگ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی اکسفرڈ کے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگریاں عطا ہوئیں۔ ان کی دو تالیفات نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا ایک تو سبعہ معلقہ، قصائد اعشیٰ، مالہ عبید بن الابرص کی تخریج دوسرے مفضلیات کے متن و ترجمہ و حواشی کی اشاعت۔ ان کے علاوہ ان کی مرتبہ کتب ذیل قابل ذکر ہیں۔

دیوان عبید بن الابرص اسدی۔ دیوان عامر بن الطفیل، عامر بن صعصعہ جو دنیا میں پہلی مرتبہ برٹش میوزیم کے قلمی نسخوں سے مرتب کر کے مع ترجمہ و حواشی شائع ہوئے۔ کلام عمرو بن قمیئہ کی تدوین و ترجمہ۔ کلام جاہلیین کا ترجمہ مع مقدمہ و حواشی دوسرے تراجم کے مقابلہ میں نہایت مستند تسلیم کیا جاتا ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے۔ ان اشعار عرب کی

ترتیب ترجمہ تحشیہ کے علاوہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ان کے بہت سے عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہوئے۔ مثلاً قدیم کلام عرب کی مصوری، قدیم کلام عرب اور معلومات تاریخی کی حیثیت سے، قدیم کلام عرب کا تعلق عبری ادبیات توراۃ سے، تابط شرا کے چار قصائد۔

سر لایل کی علمی زندگی میں نوجوانان مشرق کے لیے سخت عبرت و بصیرت پوشیدہ ہے جن کو ہمیشہ علمی مشاغل کے لیے وقت کی کمی اور افکار دنیاوی کی زیادتی کی شکایت رہتی ہے مگر سر لایل کے سیاسی اور انتظامی فرائض کے ساتھ یہ دماغی مشقت ایسے عذرات کو ہیچ کیے دیتی ہیں۔

بقدر الکد تکتسب المعالی   ومن طلب العلی سھر اللیالی

ماہ جون میں ہم نے مولانا محمد علی کی ایک غزل کا عکس شائع کیا تھا تاکہ لطف کلام کے ساتھ اُن کے سواد خط سے بھی ناظرین محظوظ ہو سکیں ہیں اپنی اس خدمت کی داد ایک خریدار سے جن الفاظ میں ملی ہے اُس کو بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں اور اپنے ناظرین کی سخن فہمی سے امید ہے کہ وہ اس معمہ کو حل کر سکیں گے۔

"جامعہ نمبر ۲ موصول ہوا، افسوس ہے کہ صفحۂ اول میں" تحریر دستخطی خاص جناب مولانا محمد علی مدظلہ"، جو شائع ہوئی تھی وہ کاٹ لیکر اس کے بجائے ایک قلمی غزل بعنوان "غزل دیگر" لگائی گئی ہے جو ۹ بیتوں پر مشتمل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

براہ کرم وہ تحریر خاص، ضرور بھیجیئے اور تحقیق کیجئے کہ کس انسان کی یہ کارروائی ہے؟ تاکہ آیندہ ایسی شرمناک کارروائیوں کا انسداد ہو!"

"یورپ کے ساتھ جب مذہبیت کا ذکر ہوتا ہے تو بالعموم اُس سے مراد کسی ایسی جدت سے ہوا کرتی ہے جس سے مذہب پرست لوگ قطعاً ناآشنا ہوں چنانچہ حال میں نیویارک (امریکہ) کے مقام بروکلین میں چند عیسائی، یہودی اور مسلمان اشخاص نے باہم ملکر ہرسہ مذاہب کی ایک متحدہ انجمن قائم کی ہے سوسائٹی مذکور کا آغاز اگرچہ گزشتہ ماہ دسمبر میں ہوا لیکن اس کا اعلان ابھی حال میں بروکلین کی "مجلس موسیقی" کے ایک جلسہ عام میں کیا گیا ہے۔ انجمن کے صدر ریورنڈ الفرڈ جے بینی ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی یہ کوشش جو وہ "توحید کے قائل تین بڑے مذاہب کی انجمن قائم کرنے کے لیے فرما رہے ہیں تعصب کے مٹانے اور تمام معتقدات اور مذاہب میں یگانگت پیدا کرنے کی ایک بڑی تحریک ہو گی"۔ انجمن نے جو مقصد پیش نظر رکھا ہے وہ یہ کہ "مسائل متفقہ پر مزید زور دیا جائے اور جن امور میں اختلاف ہے انہیں مٹایا جائے"۔"

ان ناآشنایان دین و مذہب سے کوئی پوچھے کہ اس سعی لاحاصل سے کیا نتیجہ۔ اس اتحاد و یگانگت کی کیا ضرورت۔ یہ تینوں مذہب نہ تو کوئی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ہر ایک دوسرے سے کوئی غیر متعلق وجود ہے۔ بلکہ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی تکمیل کو آیا اسلام اس سلسلہ کی۔ آخری کڑی تھا۔ اس ترتیب کا ذکر آج سے تیرہ سو برس قبل بہ بانگ دہل کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۔ بے شک ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ ۵ ۞

آگے چلکر یہ بیان کرنے کے بعد کہ کس طرح سے یہودیوں نے احکام توریت کو پامال کیا خدا تعالیٰ نے انجیل کے نزول کا ذکر فرمایا۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا

اور بعد کو ان ہی کے قدم بقدم ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا کہ وہ توراۃ کی جو ان سے پہلے تھی تصدیق کرتے تھے اور ان کو ہم نے انجیل دی

بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ۸ پ

جس میں ہدایت اور نور ہے اور تورات جو اس کے پہلے سے موجود تھی یہ انجیل اس کی تصدیق بھی کرتی ہے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

توریت کی طرح جب انجیل کے احکام کی بھی نافرمانی کی گئی اور دنیا ظلمت و تیرگی کا گھر بنی ہوئی تھی اس وقت اس سلسلہ کی آخری کڑی آئی اور خدا تعالے نے اس طرح ارشاد فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۝ ۶ پ

اور اے پیغمبر ہم نے تمھاری طرف کتاب برحق اُتاری کہ جو کتابیں اس کے پہلے سے ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ بھی ہے۔

---

۲۶ اگست کی تاریخ ہندوستان کے ہر گوشہ میں فیصلہ کینیا پر بطور احتجاج کے منائی گئی۔ کینیا کیا ہے؟ کہاں ہے؟ مسئلہ کینیا سے کیا مراد ہے؟ فیصلہ کی کیا نوعیت ہے؟ ان کے جوابات کے لیے ان صفحات میں گنجائش نہیں لیکن مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ کینیا جنوبی افریقہ کے شرقی ساحل پر ایک نوآبادی ہے جہاں پر کچھ عرصہ قبل ہندوستانی کثیر تعداد میں "تلاش روزگار" جاکر بس گئے۔ اسی طرح کچھ باشندگان فرنگ بھی اپنا وطن مالوف چھوڑ کر وہاں گئے لیکن ان کا مقصد "تلاش زر" تھا۔ اس اجتماع اضداد یعنی "سفید و سیاہ" "زر و محنت" کے فرق کو نمایاں کر دیا۔ ہندوستانیوں اور یورپینوں کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کے باشندے بھی آباد ہیں ان کے نام اور اعداد ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق

یورپین	۹،۶۵۱
ہندوستانی	۲۲،۸۲۲
عرب	۱۰،۱۰۲
افریقی	۲۵،۵۰۰۰۰۰

ان اعداد کو پیش نظر رکھ کر وہاں کی حکومت میں ان کا جو عنصر ہے وہ بھی دیکھیے۔

یورپین	۱۱ ممبران
ہندوستانی	۵ "
عرب	۱ منتخب ممبر علاوہ سرکاری نامزد کے
افریقی	۱ غیر سرکاری نامزد ممبر جو وہاں کے مسیحی مشنریوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے

اعداد بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی اور یورپین آبادی میں ۲ و ۱ کی نسبت ہے اور حکومت میں ۱ و ۲ کی ہے یعنی نمایندگی کا تناسب ۱ ہندوستانی بمقابلہ ۲ یورپین کے ہے اور جبکہ ایک جماعت جمع مال کے لیے ہمہ تن مصروف ہو اور حکمران طبقہ کی ہم قوم ہم مذہب اور ہم رنگ بھی ہو تو پھر ایسی صورت میں ان مشکلات کا پیش آنا ایک لابدی امر تھا۔ جب کبھی حکومت "نوآبادیات میں" "بلند مقامات ہندوستانیوں کو دیے جانے" اور "انتخاب عام" کا سوال آتا، اس وقت یورپین باشندے تیغ و تفنگ کی دھمکی دیتے۔ لیکن باوجود اس کے اب کے بار امپیریل کانفرنس کے رزولیوشن کے مطابق امید تھی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حقوق میں انصاف سے کام لیا جائے گا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ اسی کوشش میں ہندوستان سے ایک وفد گیا لیکن تمام امیدوں کے خلاف نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا گیا فیصلے سے سفید و سیاہ کا صاف امتیاز نظر آ رہا ہے۔ ہندوستان متعجب ہے کہ اس کی پذیرائی کیوں نہ ہوئی لیکن شاید وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ "جب تک وہ اپنے بند غلامی نہ توڑے، دوسرے کو آزاد نہیں کرا سکتا"

مندرجہ صدر شمار و اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی باشندوں سے بدتر حالت وہاں کے

عربوں کی ہی جن کا منتخب شدہ ممبر صرف ایک ہی لیکن ان کے حقوق کی پامالی، ان کے ساتھ تشدد، ناانصافی کے قصے کبھی سننے میں نہیں آتے۔ ہندوستانیوں میں تو بارے خدا خدا کر کے اپنے ہم قوم باشندوں کے ساتھ ہمدردی کا احساس پیدا ہو گیا ہی کہ سمندر پار کب سے بچھڑے ہموطنوں کے رنج وغم میں شریک ہو کر نالہ و فریاد تو کیا کرتے ہیں لیکن کیا جزیرۃ العرب کے بسنے والوں سے بھی یہی توقع ہو سکتی ہی کہ وہ اپنی ہم قوموں کے شریک غم ہوں گے، سچ تو یہ ہی کہ ع آں خویشتن گم است کرا رہبری کند "متاع کارروان" کے لٹنے کا اتنا افسوس نہیں جتنا رنج اس امر پر ہی کہ ع کاررواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | صفر ۱۳۴۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۳ء | نمبر ۳

جرمنی کی تعلیمی زندگی

اعلیٰ مدارس (۲)

(ڈاکٹر فرنیڈرش ایرنٹ رایش نے خاص جامعہ کے لیے تحریر فرمایا)

پہلے مضمون میں ہم دکھا چکے ہیں کہ جرمن تعلیمات کی تاریخ میں یونیورسٹی نے کس قدر اہم حصہ لیا ہی۔ ساتھ ہی یہ کہہ دینا بھی ضروری ہی کہ مجموعی تعلیمی زندگی میں یونیورسٹی گویا قدامت پسند عنصر رہا کی ہی جرمنی میں آجکل ایک درجن سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سب سے قدیم قرون وسطیٰ میں قائم ہوئی تھیں اور بعض مثلاً (Frankfort) فرانکفورٹ اور ہیمبرگ Hamburg بالکل حال میں معرض وجود میں آئی ہیں۔ علوم کے لحاظ سے یونیورسٹیاں چار (Faculties) شعبوں میں تقسیم ہوتی ہیں دینیات (پروٹسٹنٹ یا کیتھولک) فلسفہ (جس میں علم الالسنہ، سائنس اور ریاضی وغیرہ بھی شامل ہیں) قانون اور طب۔ بعض یونیورسٹیوں نے ریاضی اور سائنس کو فلسفہ سے الگ کرکے پانچواں مستقل شعبہ بنا دیا ہی۔ یونیورسٹیوں کا نظم و نسق ایک ریکٹر (ناظم) کے ہاتھ میں ہوتا ہی جو جماعت اساتذہ میں سے ہر سال منتخب کیا جاتا ہی جماعت اساتذہ یا مجلس شوریٰ (Senate) مستقل پروفیسروں عارضی پروفیسروں پرائیویٹ درس دینے والوں اور لیکچراروں

پر مشتمل ہوتی ہے۔ شعبوں کے صدر (Deacon) کہلاتے ہیں۔ معلمی کی کرسی پر وہ شخص جگہ
پا سکتا ہے جس نے ڈاکٹر کی سند حاصل کرنے کے بعد کوئی علمی تصنیف کامیابی کے ساتھ انجام کو
پہونچائی ہو یہ (ab BiBittenschritf) معلمانہ تصنیف کہلاتی ہے۔ پرائیویٹ درس دینے
والوں کو حکومت کی طرف سے کوئی مشاہرہ نہیں ملتا۔ چنانچہ صرف مرفہ الحال لوگ اس شغل کو اختیار
کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے قیام اور ترقی کا مدار ظاہر ہے کہ محض اُن کی علمی قابلیت پر ہے۔ لیکچرار وہ
تنخواہ دار نائب ہیں جو یونیورسٹی میں ہر طرح کے علمی کام خصوصاً ممالک غیر کی زبانوں کے درس
کو انجام دیتے ہیں۔ پروفیسروں کا تقرر وزارت تعلیم/معارف کی طرف سے ہوتا ہے۔

جرمن یونیورسٹیاں اپنے نشو و نما اور نظم و نسق کے لحاظ سے کتنی ہی قدامت پسند کیوں نہ ہوں
تاہم اُن کا وہ مخصوص حق جس پر اُنھیں ناز ہے پڑھنے اور پڑھانے کی آزادی ہے۔ یعنی یونیورسٹی
کا ہر معلم جس مضمون پر چاہے لیکچر دینے کا اعلان کرتا ہے۔ برخلاف اس کے ہر طالب العلم اپنی مرضی
سے فیصلہ کرتا ہے کہ کون کون سے لیکچر سنے گا۔

پروفیسروں میں طالب العلموں کی حاضری نہیں لیجاتی۔ اس معاملہ میں ہر طالب العلم اپنی ذاتی ذمہ داری
سے کام لیتا ہے جس کا حساب اُسے آخری امتحان کے وقت دینا ہوتا ہے جس میں ۸ سے لیکر
۱۲ ٹرم تک (۴ سے لیکر ۶ سال تک) لگتے ہیں۔ اصل میں یونیورسٹی کا صرف ایک امتحان
ڈاکٹر کی سند کے لیے ہے۔ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی اجازت عام طور پر ہائی اسکولوں
کے آخری امتحان (Abiturient) کے پاس کرنے پر ملتی ہے یعنی عام طور پر یونیورسٹی۔
داخلہ کا کوئی علحدہ امتحان نہیں ہوتا۔

پروفیسروں کے لیکچر جن کا اعلان سیاہ نوٹس بورڈ پر ہوتا ہے اکثر پرائیویٹ ہوتے
ہیں یعنی سامعین کو کچھ معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض مختصر۔ عام۔ بلامعاوضہ
لیکچر ہوتے ہیں جو اکثر فنون لطیفہ یا عام علوم پر ہوتے ہیں۔ لیکچروں کے ساتھ ساتھ علمی
مشق کے کلاسوں کا (جو ایک طرح سے اسکول کے کام کا مزید سلسلہ ہیں) اور سیمینار

کا اعلان ہوتا ہی۔ یقیناً یہ بہت ضروری بات ہی کہ اسکول کی پابندی اور نگرانی سے
نکل کر دفعتاً جو (Academic) یونیورسٹی کی زندگی کی آزادی ملتی ہی اُس کا استعمال
احتیاط کے ساتھ اور صحیح کیا جائے بہت سے نوجوان ابتدا میں اس بات کو نہیں سمجھتے
اور اپنا سارا وقت لہو و لعب میں گزارتے ہیں، اس اعتبار سے انگلستان کی یونیورسٹیوں
میں اپنے طالبعلموں کو تضیع اوقات سے بچانے کا بہتر انتظام ہی اور ان کے لیے دارالاقامے
بھی مہیا کیے جاتے ہیں درآنحالیکہ کوئی جرمن طالبعلم یونیورسٹی یا "کالج" میں نہیں رہتا ہی
لیکن پھر بھی یونیورسٹی کی آزادی کا صحیح استعمال سیکھنا جرمنی میں بڑی عزت کی نظر سے
دیکھا جاتا ہی۔ یونیورسٹی کے اکثر شعبوں میں بالخصوص سائنس میں تعلیم کا ایک جزو علمی
سفر (Tour) بھی ہی

بالعموم طالبعلم لکچروں کے اہم حصوں سے متعلق ایک کاپی پر یادداشت لکھ لیتے ہیں۔ بعض
پروفیسر اپنے درس کے ختم پر اس کا خلاصہ بھی لکھوا دیتے ہیں سب سے اہم علمی کام سیمینار میں
ہوتا ہی۔ سیمیناروں میں داخلہ ٹرم (Term) کے بعد اور اکثر ایک مختصر سا امتحان لیکر
کیا جاتا ہی۔ یہاں طالبعلم پروفیسر کی نگرانی میں اور اُس کی مدد سے اپنے مضمون میں پوری طرح
کام کرتے ہیں اور انھیں علمی تنقید کی تعلیم دی جاتی ہی۔ یہاں ایک طرح سے امتحان کی ضروریات
کے لیے طیاری ہوتی ہی۔ پروفیسروں اور طالبعلموں کے تعلقات تعلیم و تعلم سے گزر کر ذاتی
دوستی تک بدقسمتی سے جرمن پروفیسروں کی عدیم الفرصتی اور کام کی بیحد کثرت کے سبب سے
صرف بعض صورتوں میں پہونچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالبعلموں کو اُن معاملات میں جو
خود اُن سے تعلق رکھتے ہوں (مثلاً جلسے اور جشن وغیرہ ممالک غیر کے طالبعلموں کا مسئلہ
ورزش جسمانی۔ پبلک تقریریں) بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہی جس کا استعمال طالبعلموں
کی پارلیمنٹ کرتی ہی جو ۱۹۱۸ء میں انقلاب کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے جرمن طالبعلموں
میں سیاسی اختلافات کے سبب سے سخت نااتفاقی ہی اور اس اعتبار سے سیاسی رواداری

ں کی اصلاح چاہنے والوں کی کوشش یہ ہے کہ بے جان مشین کی طرح کے نظام
ں کو بدلیں اور امتحانوں کی مخالفت ہمیشہ سے بڑھتی رہی ہے۔ لیکچروں کی تعداد کم کیا جائے
کے کلاسوں کے اوقات میں اضافہ کیا جائے اور علوم کو جن کی موجودہ تاریخ اور
وں کی مہارت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور جو نئے سرے سے ترتیب
ئے ہیں، اشتراکی اور (Communist) یونیورسٹی کے خلاف اسی حیثیت سے
ا ہیں کہ یہ خالص سرمایہ داروں کا (Institution) ہے اور یہ لوگ علمی دولت
ہر فرد بشر کے لیے عام کر دینے کے حامی ہیں۔

تحریک کی بنا پر ۱۹۱۹ء سے تمام شہروں میں وہ دار العلوم جن کو لوگوں نے Volks
hoch schu عام لوگوں کی یونیورسٹی کا نام دے رکھا ہے قائم ہوئے ہیں جو عام علوم
م شعبوں میں اوسط اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو بلا امتحان کے تعلیم دیتے ہیں۔ اسی طرح سے
پہلے وہ طالب علم جو اشتراکیت سے متاثر تھے بڑے شہروں کے بے مایہ لوگوں میں
ؤں کے کسانوں میں جا کر ابتدائی تعلیم مثلاً حساب، ممالک غیر کی زبانوں، علم ادب اور
روں کے تماشوں وغیرہ کے ذریعہ سے تربیت مذاق کرتے ہیں۔ چنانچہ جینا۔ فرائی
۔ بادن اور میونک میں ساری یونیورسٹیوں کی خوبصورت عمارتیں جو تعمیر کے اعتبار سے
سرمایہ داروں کے مذاق کے Facade اور علمی متانت سے نہیں بلکہ اشتراکیت کا احساس
ظاہر کرتی ہیں اس اعتبار سے ابھی اور تغیرات ہوں گے۔ یونیورسٹیوں کے پہلو بہ پہلو نئے
بنانے والوں کی حیثیت سے اُنیسویں صدی میں اعلیٰ صنعتی مدارس قائم ہوئے ہیں جو
وی داخلہ کے شرائط کے ساتھ سائنس، میکینکل اور ترقی انجنیری، فن تعمیر اور جہاز سازی
رہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسے عظیم الشان عملوں کے سبب سے ان کو بڑی اہمیت حاصل
ئی ہے اور ان کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ طرز تعلیم اور نظم و نسق ان میں یونیورسٹیوں
ے مطابق ہے۔

اگر اعلیٰ صنعتی مدرسہ کو یونیورسٹی کا سب سے چھوٹا بچہ کہا جائے تو اس کے کئی اور بھائی بہن ہیں مثلاً فنون لطیفہ کی اکاڈمی، موسیقی کا اعلیٰ مدرسہ لیکن یہ دونوں فن لطیف کے قدر دان کے کام کے نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جنھیں نقاشی مجسمہ سازی یا موسیقی سے خاص مناسبت ہو۔ گانے اور آرگن بجانے کی تعلیم کے لیے کلیسائی موسیقی کا اعلیٰ مدرسہ ہے اور خود یونیورسٹیوں میں بھی فن موسیقی پر عام لکچر ہوتے ہیں۔ اسی طرح تھیٹر کے مدرسہ میں ایکٹری کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اسے اعلیٰ مدرسہ کی حیثیت حاصل نہیں ہے ان میں سے اکثر کسی بڑے شہر کے تھیٹر سے ملحق ہوتے ہیں۔

تجارت پیشہ لوگوں کے لیے بھی کچھ دن سے ایک طرح کے پیشہ دری کے سے اعلیٰ تجارتی مدرسوں کے نام سے قائم ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور یونیورسٹیوں کی طرح ان میں بھی لکچر اور مشق کے کلاس کا خصوصاً اقتصادیات اور قانون میں انتظام کیا گیا ہے لیکن ان مدرسوں کے لڑکوں کا طالبعلموں میں شمار نہیں

اصل معنی میں اعلیٰ مدارس صرف یونیورسٹیاں، اعلیٰ صنعتی مدرسے، اکادمی ہیں لیکن ان کے بعد اس لفظ کے بہت وسیع معنی اختیار کر لیے گئے ہیں۔ دروس جسمانی اور جمناسٹک کے لیے بھی ایک مخصوص اعلیٰ مدرسہ برلن میں قائم ہوا ہے۔

سیاسی معلومات اور مدنیت کی تعلیم کے لیے حکومت نے ایک اعلیٰ سیاسی مدرسہ قائم کیا ہے جس میں ہر سیاسی پارٹی کے نمایندے لکچر دیتے ہیں تصور عالم رکھنے والی جماعتیں خیالات میں عبدیت اور ہندو فلسفہ کے مخلوط ہوتے ہیں اور اپنے خاص اعلیٰ مدرسے رکھتے ہیں دروس جسمانی اور فن لطیف کے مطابق رقص کے لیے بھی ایک دو مدرسے قائم ہیں جو ایک طرح کے پوشیدہ اعلیٰ مدرسہ ہیں۔

اس خاکہ سے جرمن اعلیٰ مدارس کے نظم و نسق اور یونیورسٹی کی زندگی کا کسی حد تک تصور حاصل ہو گیا ہوگا۔ یونیورسٹیاں اب تک عہد قدیم کے ستونوں کی طرح مستحکم کھڑی ہیں لیکن آجکل کے

موسم بہار کے طغیان ابر و باد سے گرتی ہوئی ہیں۔ علم النفس، تعلیمات، برقی کیمیا وغیرہ اور پرانے کلاسیکل پہلو بہ پہلو جگہ پاتے ہیں۔ صنعت و تجارت مستقل مضمون بننے کا استحقاق جتا رہے ہیں اشتراکیت کا نعرہ تعلیم عام کر لینے کے لیے قدیم علم و فضل، جمہوریت یونیورسٹیوں کے دروازہ سے ٹکرا رہا ہے۔ چنانچہ عین اسی زمانہ میں ہر چیز کے عضو عضو میں نئی زندگی کا احساس ہو رہا ہے اور نئی روح، نئے علوم اور زندگی سے آشنا علم و دانش پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

گیتا

ہندؤں میں جو مقبولیت اور وقعت گیتا کو حاصل ہی وہ ویدانت۔ سانکھ۔ نیا ر وغیرہ ہندوستانی
فلسفہ کے کسی شعبہ کو نہیں حاصل ہی۔ مگر ساتھ ہی اس کے خرابی یہ ہی کہ گیتا کے مداحوں نے اس کی
تعلیم کو ایک لاینحل معمہ بنا رکھا ہی۔ جس قدر اختلافات گیتا کے مطالب و نکات کے متعلق ہیں
دنیا میں کسی تحریر یا تقریر کے متعلق نہیں ہیں۔ مختلف اشخاص نے مختلف شرحیں لکھی ہیں اور ہر
شارح کے مقلدین کی ایک جماعت ہی جو دوسری جماعتوں کے بیان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں
ہی بلکہ اُن پر غلط بیانی کا الزام لگاتی ہی۔ چنانچہ ایک گروہ سری شنکراچاریہ کا مقلد ہی اور اُنھوں نے
جو شرح لکھی ہی اُس کے مقابلہ میں تمام دوسری شرحوں کو غلط سمجھتا ہی۔ دوسرا گروہ وَلبہ کی شرح کو
مانتا ہی۔ تیسرا رامانوج کا قایل ہی۔ چوتھا مادھو کا مقلد ہی۔ پانچواں گروہ پنڈت گورہ گووندے
کو صحیح سمجھتا ہی۔ چھٹا گروہ ارباب تھیاسوفی کا ہی جن کا خیال ہی کہ گیتا کے اصلی مطالب صرف
مسز اینی بسنیٹ کے (گیتا کے) انگریزی ترجمہ میں پاے جاسکتے ہیں۔ ساتواں گروہ اُن
لوگوں کا ہی جو کسی طرح کے پابند نہیں ہیں بلکہ اپنی آزاد رائے رکھتے ہیں البتہ دوسری جماعتوں
کی طرح اس بات کے قایل ضرور ہیں کہ گیتا کی تعلیم مکمل اور بے نقص ہی۔ آٹھواں گروہ بھی گیتا
کے پڑھنے اور سمجھنے میں اپنی آزاد رائے سے کام لیتا ہی مگر اس کی تعلیم کو ناقص خیال کرتا ہی۔
ان حالات میں گیتا پر کوئی ایسا مضمون لکھنا جو ہر لحاظ سے جامع ہو اور ہر شارح کے نقطہ نظر سے
مطابقت کرسکے ناممکن ہی بلکہ میرا خیال تو یہ ہی کہ ایک ضخیم کتاب بھی اس مدعا کو بمشکل سے
پورا کرسکتی ہے۔

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اس قدر اختلاف آرا کا اصلی سبب کیا ہی؟ حقیقت
یہ ہی کہ گیتا کی تعلیم میں اکثر بے ربطی اور اجتماع ضدین پایا جاتا ہی اور اس کے اشلوک جابجا بیحد
مغلق ہیں۔ اس لیے ہر شرح لکھنے والے نے جداگانہ مطالب بیان کیے ہیں اور ہر شخص اپنے

مطلب کی بات نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔
بہرحال ان جھگڑوں سے قطع نظر کرکے میں گیتا کی تعلیم مختصراً قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔
گیتا کی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ ایک فلسفیانہ۔ دوسرا مذہبی۔
فلسفیانہ حصہ میں خدا۔ روح اور جسم کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

حقیقت خدا

گیتا کا روجود خداوندی کی تین صورتیں بیان کرتا ہے۔
پہلی صورت یہ ہے کہ خدا نرگن (تمام اوصاف و خواص سے معرا یعنی وجود محض) ہے اور کوئی فعل اُس سے صادر نہیں ہو سکتا۔
دوسری صورت یہ ہے کہ خدا سارے عالم کا پیدا کرنے والا۔ قائم رکھنے والا اور نیست کر دینے والا ہے۔ اور عالم کا ہر جزو اس کے اندر ہے اور وہ عالم کے ہر جزو میں ہے۔ وہ سب سے اعلیٰ۔ برتر اور ہمہ گیر ہستی ہے جس کے اندر تمام ہستیوں کا وجود ہے اور وہ تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ ہر شے اُس میں ہے اور وہ ہر شے میں ہے۔ وہی نگاہ حقیقت بیں ہے جو اُس مالک کل کو موجودات کے ہر فرد میں یکساں طور پر موجود دیکھے۔
یہ عالم جس کو خدا نے پیدا کیا ہے چار قسم کے موجودات پر مشتمل ہے:—

(الف) قوائے دماغیہ:—

(۱) بُدھی (یعنی قوت فیصلہ)

(۲) اہنکار (یعنی احساس خودی)

(۳) مَن (یعنی قوت فکریہ)

(۴) حواس خمسہ علمیہ اور حواس خمسہ عملیہ

(ب) کوائف دماغی مثلاً خواہش۔ حظ۔ کرب وغیرہ

(ج) حواس علیہ کے محسوسات یعنی صورت - ذائقہ - بو - لمس - اور موت - اور
(د) عالم مادی جو خاک - باد - آب - نور - اور بسط سے مرکب ہے۔

یہ تمام عالم جو خدا کا مخلوق ہے بحیثیت مجموعی پراکرتی یا شیتر یعنی جد خداوندی کہلاتا ہے۔

اس پراکرتی کے علاوہ ایک دوسری پراکرتی ہے جس کا تعلق خدا سے ہے۔ اس کو اَویکتا۔ یا مول پراکرتی یا پرادھانا کہتے ہیں۔ اس (یعنی مول) پراکرتی کو ماننے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ گیتا کار کے قول کے مطابق خدا یا برہما خود نرگن ہے اور نہ تو عالم کو پیدا کر سکتا ہے نہ قائم رکھ سکتا یا مٹا سکتا ہے۔ لہٰذا اُس سے افعال صادر کرانے کے لیے ایک دوسری ہستی کی ضرورت ہوئی اور وہ مول پراکرتی یا پرادھانا ہے۔ جب اس سے وہ متصادم ہوتا ہے تو خالق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ برہما کہتا ہے۔ "اپنی پراکرتی پر قابو حاصل کر کے میں ان تمام ہستیوں کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہوں۔" "پراکرتی میرے ذریعہ سے تمام متحرک اور غیر متحرک اشیاء کو پیدا کرتی ہے۔" "مہت برہما (یعنی مول پراکرتی) میرے لیے رحم کا کام دیتی ہے جس میں میں بیج ڈال دیتا ہوں اور اُس سے تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔"

اسی طرح۔ گویہ کہا گیا ہے کہ خدا یا برہما اِس عالم کو نیست کر دینے اور مٹا دینے والا ہے۔ نیستی اور بربادی سے مراد تمام موجودات کا مول پراکرتی میں جذب ہو جانا ہے۔

پس مول پراکرتی کی عدم موجودگی میں تخلیق و تخریب دونوں برہما کے لیے ناممکن ہے۔

اس دوسری صورت میں خدا سب کا دوست ہے۔ یا تمام مخلوقات کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے۔ نہ کسی سے نفرت کرتا ہے۔ نہ کسی سے محبت۔ وہ توبہ کو قبول کرتا ہے اور معافی دینے والا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام موجودات اور تمام کائنات کا مالک ہے۔ وہ کرتو ہے۔ سوادہ ہے۔ جھاڑیوں کا پھول اور پھل ہے۔ مقدس کتاب ہے۔ اگنی ہے۔ قربانی ہے۔ اس عالم کی ماتا۔ پتا۔ خالق اور مالک ہے۔ اوم ہے منتہائے نظر ہے۔ نگہبان ہے۔ تیا مگاہ ہے۔

جائے پناہ ہے۔ دوست ہے۔ وسیلہ ہے۔ حیات ابدی بھی ہے اور موت بھی۔ موجود بھی۔ اور معدوم بھی۔

وجود خداوندی کی تیسری نوعیت یہ ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے کو انسانی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے "گو کہ میں کسی سے پیدا نہیں ہوا ہوں اور لاتناہی ہوں اور تمام موجودات کا مالک ہوں تاہم میں اپنی پراکرتی کو قابو میں لاتا ہوں اور اپنے مایا کے ذریعہ سے پیدا ہوں"۔ جب کبھی تقوٰی اور پرہیزگاری روبہ انحطاط ہوتی ہے اور فسق و فجور میں ترقی ہوتی ہے تو میں اپنے کو پیدا کرتا ہوں۔ "میں نیک کرداروں کی حفاظت۔ بدکرداروں کی تباہی اور لوگوں کو متقی بنانے کے لیے ہر زمانہ میں پیدا ہوتا رہتا ہوں"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برہما پراکرتی کے علاوہ مایا بھی رکھتا ہے اور یہاں پر مایا سے مراد وہ صفت خداوندی ہے جو اُس کو پیدا ہونے کے قابل بناتی ہے۔ گو حقیقتاً وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے مگر مایا کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اپنی اصلیت اور حقیقت سے مختلف نظر آتا ہے ایک دوسرے موقع پر برہما کی اصلی شان میں بظاہر فرق پیدا کرنے والی چیز کو بجائے مایا کے یوگ کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ برہما کہتا ہے "سارے عالم میں غیر محسوس طریقہ پر حاوی۔ ساری تمام ہستیاں مجھ میں ہیں لیکن میں اُن میں نہیں ہوں اور پھر بھی تمام ہستیاں مجھ میں نہیں ہیں میرے یوگ کو دیکھو"۔ یعنی اصل میں برہما ہر شے میں ہے اور ہر شے اُس میں ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہے اور ساری کائنات اُس میں ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ میرے یوگ کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تمام ہستیاں مجھ میں ہیں مگر میں اُن میں نہیں ہوں" اور کبھی ایسا بھی نظر آتا ہے کہ "یہ ہستیاں بھی مجھ میں نہیں ہیں"۔ چنانچہ ایک جگہ گیتا کار کہتا ہے کہ "برہما یوگ مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اُس کا علم نہیں ہو سکتا۔

الغرض۔ خدا ہر اُس شے کو جانتا ہے جو موجود ہے۔ یا موجود رہی ہے یا آئندہ وجود میں آنیوالی ہے۔ اُس سے برتر کوئی ہستی نہیں۔ وہ پانی میں پانی کا مزہ ہے۔ وہ آفتاب و رماہتاب کی

روشنی ہے۔ ویدوں میں "اوم" ہے۔ بسط میں صوت ہے۔ اور جو انسانیت میں انسانیت ہے۔ زمین میں وہ خوشبو ہے۔ آگ میں آگ کی لپٹ ہے۔ تمام موجودات کی زندگی ہے اور ہر شے کا ازلی اور ابدی بیج ہے وہ قوت ہے جس کے ساتھ صاحب قوت کی طرح تمنائیں اور خواہشیں وابستہ نہیں ہیں۔ وہ محبت ہے جو تقوے کے مخالف نہیں ہے۔ نیکی۔ تاریکی۔ جذبہ حیوانی سب اُسی سے ہے۔ وہ ان میں نہیں ہے۔ لیکن یہ سب اُس میں ہیں جو کچھ ہم دیکھتے یا سنتے ہیں ان سب سے جدا ایک غیر محسوس ازلی ہستی ہے جو دائم و قائم ہے۔ تمام ہستیاں برباد ہو جاتی ہیں مگر وہ برباد نہیں ہوتی۔ وہی ہر شے کی ابتدا ہے اور انتہا اُس کی صورتیں بے شمار ہیں۔ نہ اُس کی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ نہ اُس کو موجود کہہ سکتے ہیں۔ نہ معدوم۔ اُس کے ہر طرف ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھیں۔ سر۔ چہرہ اور کان ہیں اور وہ دنیا کی ہر چیز میں ہے۔ وہ تمام حواس کی صفات سے متصف ہے۔ پھر بھی تمام حواس سے معرا ہے۔ وہ بے تعلق ہے۔ تاہم سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ تمام اوصاف سے خالی ہے۔ پھر بھی اوصاف سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کے اندر ہے اور ہر شے سے باہر۔ متحرک بھی ہے اور غیر متحرک بھی۔ اُس کے وجود کی نزاکت و لطافت اُس کے علم کی مانع ہے۔ وہ نزدیک بھی ہے۔ اور دور بھی۔ وہ مختلف چیزوں میں مختلف نہیں ہے۔ البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہی ساری کائنات کا سنبھالنے والا اور ہر شی کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور پھر سب کچھ اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ وہ روشن اجسام کی روشنی سے پرے ہے۔ وہ علم ہے۔ مقصود علم ہے۔ حاصل علم ہے اور سب کے دل میں ہے۔

حقیقت روح

آتما یا روح انسانی اور چیزوں کی طرح خدا کی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ ہر انسان کی آتما خدا کا ایک جزو ہے۔ (جزو کا لفظ محض استعارۃً استعمال کیا گیا ہے) جب تک آتما کا تعلق جسم اور حواس سے رہتا ہے اُس تک اُس کو جیو کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو ایشور یا مالک بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جسم و حواس پر حکومت کرتی ہے۔ جب آتما جسم اور حواس کو چھوڑتی ہے تو حواس اور

قوائے دماغیہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے جس طرح ہوا خوشبو اڑا لے جاتی ہے۔ آتما یعنی اصلی روح انسانی کو پُرش بھی کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وجود خداوندی کی جو تین صورتیں بیان کی گئی ہیں اُن میں سے روح انسانی کس کا جزو ہے؟ اس کا جواب گیتا کار یہ دیتا ہے کہ روح انسانی وجود خداوندی کی پہلی صورت کا جزو ہے۔ اگر ہم کسی فرد انسانی میں سے جسم اور تمام جسمانی افعال و خواص علیحدہ کردیں تو آتما یا پُرش ہی باقی رہ جاتا ہے اور وہی روح انسانی کی اصلی حالت ہے۔ اور جسم کے اندر بھی یہی حالت قائم رہتی ہے اس لیے کہ روح میں تغیر نہیں ہوتا اور یہی وہ حالت ہے جس کو روح مکتی یا آخری آزادی حاصل کرنے پر "اپنی اصلی حالت" کی حیثیت سے معلوم اور محسوس کرے گی۔ پس جبکہ آتما وہی ہے جو جسم اور تمام جسمانی افعال و خواص مثلاً بدی۔ انہکار۔ من۔ جنانا اندریاں (حواس علیہ) کرم اندریاں (حواس عملیہ)۔ خواہش۔ خوشی۔ نفرت۔ حظ۔ کرب وغیرہ کے علیحدہ کرلینے پر بچ جاتا ہے تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ روح انسانی کی اصلی حالت یعنی آتما یا پُرش وجود خداوندی کی پہلی نوعیت کی طرح نرگن اور کرتا ہے۔

چونکہ آتما اور خدا یا برہما کی حقیقت ایک ہے اس لیے آتما بھی کسی سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نہ مردہ یا معدوم ہو سکتی ہے۔

آتما کے لیے جسم سے قطعی طور پر رہائی حاصل کرلینا (جس کو مکتی کہتے ہیں) بہت ضروری ہے مگر موت کے ذریعہ سے یہ ممکن نہیں۔ آتما کو جسم سے قطعی طور پر چھٹکارا اُسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جبکہ اپنا اور خدا کا اور اپنے اور خدا کے تعلقات کا پورا گمان یا علم ہو جائے اور یہ علم کرم جوگ بھکتی اور ابھیاس جوگ پر (جن کا ذکر آئندہ عرض کیا جائے گا) عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ موت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آتما۔ پراکرتی یا جسم سے قطعی طور پر آزاد ہو جاتی ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آتما ایک پراکرتی سے دوسری پراکرتی میں چلی جاتی ہے۔ جس طرح ہم جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہوتے ہیں یا پُرانے کپڑے پھینک کر نئے کپڑے پہن

لیتے ہیں۔

چونکہ آتما اور حقیقت خداوندی میں عینیت ہے اس لیے آتما ماری نہیں جاسکتی اور چونکہ وہ نرگن اور کرتا ہے اس لیے خود کسی کو مار بھی نہیں سکتی۔ چنانچہ گیتا کار کہتا ہے "جو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما مارسکتی ہے اور جو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما ماری جاسکتی ہے۔ وہ دونوں کچھ نہیں جانتے۔ آتما نہ کسی کو مارتی ہے۔ نہ خود ماری جاسکتی ہے۔"

اس سے صاف اور لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر انسان کی آتما جو اس وقت موجود ہے۔ ازلی اور ابدی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ جیسا کہ گیتا کار کہتا ہے۔ "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نہ رہا ہوں۔ یا تم نہ رہے ہو۔ یا یہ لوگ نہ رہے ہوں جو انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ لی نہ آیندہ کبھی ایسا ہوگا کہ ہم میں کسی کا وجود مٹ جائے۔" انسان میں جو شے خراب و برباد ہوتی ہے وہ اس کی پراکرتی یا جسم ہے۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ جسم کی خرابی و بربادی کے ساتھ ساتھ آتما بھی خراب و برباد ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جبکہ آتما جسم کے اندر موجود ہوتی ہے اس وقت بھی وہ جسمانی نقصانات سے متاثر نہیں ہوتی۔ جسم کو کچھ نہ کچھ تکلیف۔ کرب یا بے چینی ہو آتما پر اس کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔ بقول گیتا کار کے کہ کوئی ہتیار اس کے کاٹ کا نہیں ہوسکتا آگ اس کو جلا نہیں سکتی۔ پانی اس کو تر نہیں کرسکتا۔ ہوا اس کو خشک نہیں کرسکتی۔"

اس کے علاوہ آتما ہمہ گیر ہے اور سب میں جاری و ساری ہے۔ یہ تغیر پذیر نہیں ہے۔ اس کا وجود محسوسات سے بالاتر ہے۔ اس کو خیال میں لانا محال ہے۔

حقیقت جسم

پراکرتی یا دیہہ یا قالب انسانی مخلوق اور تغیر پذیر ہے اور تباہ و برباد ہونے والی شے ہے۔ تمام افعال انسانی کی فاعل بھی ہے۔ آتما کرتا ہے۔ اس کو افعال انسانی میں کوئی دخل نہیں۔ قالب انسانی میں رہ کر اس کا صرف یہ کام ہے کہ پراکرتی کے افعال انسانی اٹھائے نیز اس کے تمام اوصاف و خواص سے محظوظ ہو۔ گو اس غصہ پر اس کی حکومت ہوتی ہے اور

ہ تمام محسوسات کے لطف سے بہرہ اندوز ہوتی ہی۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ آتما اپنی حقیقت سے ناواقف کیوں ہوتی ہی؟ اور باوجود رگن اور اکرتا ہونے اور شان الوہیت رکھنے کے قالب انسانی میں (جس کو گیتا کار بُرائی سے تعبیر کرتا ہی اور کہتا ہی کہ اس سے قطعی طور پر چھٹکارا حاصل کر لینا آتما کے لیے ازبس ضروری ہی) بھنستی کیوں ہی؟ اور دوسرے (پراکرتی) کے اعمال کا خمیازہ کیوں بھگتی ہی؟

پہلے سوال کے جواب میں بجائے کسی دلیل کے گیتا کار صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہی۔ وہ یہ کہ یوں ہی آتما قالب انسانی میں داخل ہوتی ہی۔ اُس کی نیز دوسری چیزوں کی حقیقت کا علم اس سے پوشیدہ ہو جاتا ہی اور صرف گیتا کے بتائے ہوئے طریقۂ عمل پر کاربند ہونے سے یہ علم حاصل ہو سکتا ہی۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے اوپر سوال کیا ہی) اگر جہالت۔ انسانی قالب میں داخل ہونے کا لازمی نتیجہ ہی تو آتما اُس میں داخل ہی کیوں ہوتی ہی؟ اس کے جواب میں گیتا کار کہتا ہی کہ آتما قالب انسانی میں اس وجہ سے آئی کہ پچھلی زندگی میں اُس کو اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی اور تعلق تھا۔ اور پچھلی زندگی میں اس وجہ سے جسم اختیار کرنا پڑا تھا اُس سے پہلے کے جنم میں اُس کو اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی تھی۔ اور یہی سلسلہ برابر جاری ہی۔ جسم سے ہمیشہ کے لیے اُسی وقت رہائی مل سکتی ہی جبکہ کرم جوگ بھگتی کے مطابق عمل کیا جائے۔ جہاں آتما کو ایک بار اپنا اور خدا کا اور اپنے اور خدا کے باہمی تعلقات کا علم ہوا پھر اُس کی جہالت اور اعمال سے وابستگی ہمیشہ کے لیے جاتی رہے گی اور جب یہ حالت حاصل ہو جائیگی تو اُس کو جسم اختیار کرنا پڑیگا اور ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے گی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہی کہ جو آتما اس وقت جسم کے اندر موجود ہی وہ ہمیشہ سے جاہل چلی آرہی ہی اور معلوم نہیں کتنے قالبوں سے گزر کر موجودہ قالب میں آئی ہی۔ مگر یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہی۔ کرم جوگ بھگتی پر عمل کرنے سے اس کا خاتمہ ہو سکتا ہی۔

اب ہم کو اپنے تیسرے سوال کا جواب تلاش کرنا ہی۔ کہ دوسرے کے اعمال کا بھوگ آتما کو کیوں اُٹھانا پڑتا ہی؟ اس سوال کا جواب گیتا کار یہ دیتا ہی کہ گو آتما اصلی فاعل نہیں ہی لیکن اپنی

فطری جہالت کے باعث پراکرتی کے تمام افعال اور اعمال کو غلطی سے اپنے افعال اور اعمال سمجھتی ہے۔
اس غلط فہمی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو (پراکرتی کے) تمام اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی
ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے اُس کو اُن کا بھوگ اُٹھانا پڑتا ہے۔ اور اُس وقت تک بھوگ اُٹھاتی رہتی
جب تک کہ کرم جوگ بھگتی پر کما حقہ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اگر جسم میں آتما کی گرفتاری پچھلی زندگی
کے اعمال کا نتیجہ ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ گرفتاری عمل میں کیونکر آتی ہے اور آتما جسم میں پھنستی کس طرح
ہے؟ گیتا کار کہتا ہے کہ پراکرتی کے تین گن یا خواص ہیں۔ ستو۔ راجو اور تامو۔ یے گن رسی کا
کام دیتے ہیں جس سے گویا آتما جسم بندی ہوتی ہے۔ اور جیوں ہی تر گن آتما۔ گنوں سے متصادم
ہوتی ہے بڑے بڑے نتائج ترتیب ہونے شروع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ستو گن سے متصادم ہونے کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کا رجحان انبساط اور علم کی طرف ہوتا ہے۔ راجو گن سے متصادم ہونے کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کو حرص۔ خواہش۔ بے اطمینانی وغیرہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ تامو گن سے متصادم
ہونے پر آتما۔ لاپروائی۔ سستی۔ خواب وغیرہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ تینوں گن ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ مگر مساوی درجہ پر نہیں۔ کسی میں ستوگن
زیادہ ہوتا ہے۔ بقیہ دو گن کم ہوتے ہیں۔ کسی میں تاموگن کی زیادتی ہوتی ہے۔ اور کسی میں راجوگن
کی۔ یہ کمی بیشی ہر شخص کے پچھلے جنم کے طرز زندگی پر منحصر ہے۔ اور ہر شخص کے فرائض اُس گن
کے مطابق ہوتے ہیں جس کی اُس میں زیادتی ہوتی ہے۔

ان تینوں گنوں کو بحیثیت مجموعی مایا بھی کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے گیتا کی فلسفیانہ تعلیم (بالاجمال اور بالاختصار) بیان کرنے
کی کوشش کی ہے۔ مگر گیتا کی خصوصیت اس کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ اس کی مذہبی تعلیم ہے۔ اس کا
وہ حصہ جس میں روح۔ خدا۔ اور جسم کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے صرف مذہبی تعلیم کو قوی اور بار آور
بنانے کے لیے ہے۔ جب تک انسان کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ روح۔ جسم اور خدا کیا ہے اور
اُن کے تعلقات کیا ہیں اور جو معیار زندگی یا نصب العین مذہب اُس کے سامنے پیش کرتا ہے

اُس کی حقیقت کیا ہی۔ اُس وقت تک مذہبی تعلیم بے سود ہی۔ اس لیے کہ اُس سے دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ نہ اُس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوسکتا ہی۔

گیتا کی مذہبی تعلیم کرم جوگ بھگتی اور ابھیاس جوگ پر مشتمل ہی۔ جس کے ذریعہ سے آتما ہمیشہ کے لیے جسم سے آزاد ہوسکتی ہی اور انسان مکتی اور حیات ابدی حاصل کرسکتا ہی۔

اِس وقت (مع تنقید) انشاءاللہ آیندہ قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

سید کامل حسین ایم۔ اے

تاریخ صلح لوزان کانفرنس

در صنعت زبر و بینات غیر منقوط

(فن تاریخ میں یہ وہ صنعت ہی جس کو غیر معمولی کمال سمجھا گیا ہی۔ سب سے اول بلگرامی نے دربار اودھ میں اس صنعت میں تاریخ پیش کرکے داد علم حاصل کی تھی۔ اس زمانہ میں مرزا طاہر مرادآبادی نے دربار رامپور میں اس کمال کو دکھا کر انعام و اکرام حاصل کیے۔ اب یہ فخر قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی کو حاصل ہی کہ صاحب موصوف نے دربار خلافت کے لیے اس صنعت میں تاریخ پیش کرکے اہل علم و قلم سے داد لی ہی)

حصول کام دل کردہ امام عاصم و کامل
ملک عبدالمجید سرور اہل ہمم و اصل

ودود و داور داور کرد الہام ناظم را
سر و سالار عصر و احلم عالم حد ل عادل

سنہ ۱۳۴۱ھ

پیام مشرق

ڈاکٹر اقبال کا یہ تازہ دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں۔ اس لیے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کو نہ تنقید سمجھنا چاہیے نہ تقریظ۔

یہ دیوان جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جرمن زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چونکہ میں گوئٹے سے آشنا نہیں ہوں اس لیے مقابلہ کی جلوہ آرائی کا لطف نہیں اُٹھا سکا۔ لیکن مشرقی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اُس نے مغرب کو مخاطب کیا۔ اور ایشیا کے سینہ کی برقی حرارت یورپ کے برفستان میں پہونچانے کی کوشش کی۔

دیباچہ | شروع میں ایک چھوٹا سا دیباچہ ہے جس میں گوئٹے کی شاعری میں جو مشرقی رنگ ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی ذیل میں جرمن ادبیات پر عجمی شاعری کا جو اثر پڑا ہے اس کی نہایت مختصر تاریخ لکھی ہے۔ یہ مضمون مفید اور پُر از معلومات ہے۔ اگرچہ اگا نہ بسط کے ساتھ لکھا جائے تو نہایت کار آمد ہو۔

دیباچہ بھی بجائے اردو کے اگر فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ سارا دیوان فارسی میں ہے۔

زبان | ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی تو شروع شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کیے۔ لیکن اب اُنھوں نے اپنے ذہن وقاد اور طبع نقاد سے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آ گئے۔ اس تمام مجموعہ میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہے حقیقت میں اُنھوں نے کوہکنی کی زحمت گوارا کر کے ایشیائی اقوام مسلمہ کے لیے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہے ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے ؎

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے

ہوئے ہیں تو اہل مصر جو اس معاملہ میں یورپ کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں اور جنھوں نے ٹگور تک کا ترجمہ عربی میں کر لیا ہے اس اپنی بضاعت طیبہ کو بلا عربی میں منتقل کیے ہوئے نہیں رہیں گے۔

شاعری | بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جو زمانہ جہالت میں ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ع

دکانِ عاشقی را بسیار مایہ باید

بے شک جاہلی شاعری کی زبان میں سادگی اور طرز ادا میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ لیکن شعر کی خوبی انھیں چیزوں پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کے سوا اس میں معنوی خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو زیادہ قدر کے قابل ہیں۔ اور یہ بلا علم کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

با فہم و عقل و دانش داد سخن تواں داد چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد

ذوقِ صحیح جذبات عالیہ کی اُن لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے جن سے دل کے تار بجتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری اہل فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لیے ایک میوۂ پُرمایہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ علوم دینی و دنیوی اور مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوق صحیح۔ دلِ دردمند اور طلاقت لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہونچی ہوئی ہے۔ اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے کھلے زمین سے آسماں تک کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں۔ مرغانِ اولی اجنحہ کے ساتھ اُڑتے ہیں۔ ساکنانِ حرمِ قدس سے ملتے ہیں۔ بزم انجم و کواکب کے رموز سنتے ہیں۔ شبنم اور آفتاب کے باہمی راز۔ گل و بلبل کے ناز و نیاز اور پروانہ و شمع کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں۔ سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں۔ قطرۂ اشک میں سوزشِ دل کا تب و تاب اور دانۂ گوہر میں حیات معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔

غرض عالمستانِ معنی ہے جس کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے جواہر پارے چنتے ہیں اور جذبات علیہ و دینیہ کا پیکرستاں تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز بیں ہے کہ ایک ہی چیز پر نہیں رُکتی

بلکہ نتائج سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہی۔

تہدیہ کتاب کو کسی کے نام سے معنون کردینا ایک عام رسم ہوگئی ہی۔ حالانکہ اس کا موقع صرف وہ ہی جبکہ کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہل نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبکساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا۔ جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوگئی تھی کہ اللہ اکبر۔ اسرار خودی کی تعلیم۔ اور اس پر یہ بیخودی سے

چو روئے خویش در آئینہ می توانی دید　　چرا نظر بجمال کسے دگر داری

مگر یہ تو خود اللہ تعالےٰ نے شاعروں کے حق میں فرما دیا ہی کہ "یقولون مالا یفعلون"
شکر ہی کہ اس دیوان کے بارے میں مجھے یہ شکایت نہیں ہی۔ کیونکہ اس میں اُنھوں نے کسی شخص کو نہیں بلکہ درحقیقت ایک قوت کو خطاب کیا ہی۔ جو اُن تعلیمات کی جو اس کتاب میں دی گئی ہیں صحیح مخاطب ہی۔ یعنی امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان۔

خطاب کا مضمون اور انداز نہایت دلکش اور بلیغ ہی۔ عالم اسلامی کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ صرف چند شعروں میں کھینچ دیا ہی۔

دیدۂ اے خسروِ کیواں جناب　　آفتاب ما توارت بالحجاب
ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت　　از دم او سوز الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل　　سست رگ تورانیانِ ژندہ پیل
آل عثماں در شکنج روزگار　　مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئین سلمانی نماند　　خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند
سوز و ساز زندگی رفت از گلش　　آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلمِ ہندی شکم را بندۂ　　خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند | خالد و فاروق و ایوبی نماند

درخواست یہ ہے۔

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد | از غم دین سینۂ صد چاک داد
جانِ تو بر محنت پیہم صبور | کوش در تہذیب افغانِ غیور
تا ز صدیقانِ ایں امت شوی | بہر دیں سرمایۂ قوت شوی

لالہ طور دیوان کا پہلا جز ہے۔ اس میں ۵۵ رُباعیاں ہیں جو ایک ہی وزن پر ہیں۔ یہ فلسفہ زندگی کے اسرار اور معدن حکمت کے گوہرہائے آبدار ہیں۔ دو چار درج کرتا ہوں۔

دلِ من روشن از سوز دروں است | جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد | کسے کو عشق را گوید جنون است

دمادم نقشہائے تازہ ریزد | بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوش است | بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

مگو کارِ جہاں نااستوار است | ہر آنِ ما ابد را پردہ دار است
بگیر امروز را محکم کہ فردا | ہنوز اندر ضمیرِ روزگار است

رمیدی از خداوندانِ افرنگ | ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی | ز سنگِ راہ مولائے تراشی

افکار دیوان کا دوسرا جز کم و بیش ۴۰ صفحہ ہے۔ اس میں قطعات اور مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ ہلال عید کے متعلق کہتے ہیں۔

نتواں ز چشمِ شوق رمیدائے ہلالِ عید | از صد نگہ براہِ تو دامے نہادہ اند

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج ۔۔۔ در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

نخبر فطرت کے عنوان سے ابلیسؔ آدم کا جو قصہ لکھا ہے اس کا پرواز نہایت شاندار ہے۔ سجدہ سے انکار کے وقت ابلیس کا متکبرانہ لہجہ اس کی تعلّی کی کیسی عجیب تصویر ہے۔

نوری نادان نیم ۔ سجدہ بآدم برم ۔۔۔ او بہ نہاد ست خاک ۔ من بہ نژاد آذرم

می تپد از سوزِ من ۔ خونِ رگِ کائنات ۔۔۔ من بہ دوِ مرصرم من بہ غوِ تندرم

من ز تنک مائگاں گدیہ نکردم سجود ۔۔۔ قاہرِ بے دوزخم ۔ داورِ بے محشرم

آدم ایک نافرماں لڑکے کی طرح جو باپ کے گھر سے نکلنے پر آزادی کا سانس لیتا ہے جنت سے خارج ہو کر خوشی کا راگ گاتا ہے۔ یہ راگ نہایت دلفریب ہے۔ خاصکر یہ شعر

بگداز ہائے پنہاں ۔ بہ نیاز ہائے پیدا ۔۔۔ نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

لیکن صبح قیامت کو جناب باری میں اس کا یہ جواب

تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز ۔۔۔ بستنِ زنار او بود مرا ناگریز

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را

اہرمن شعلہ زاد ۔ سجدہ کند خاک را

مبہم ہے۔ اس کے سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ کیونکہ ابلیس کی تعبیر فطرت کے ساتھ کسی طرح قرآن سے مطابقت نہیں کھاتی۔ اس جواب کا دوسرا شعر۔

ریخت ہنرہائے من بحرِ بیک نائے آب ۔۔۔ تیشۂ من آورد از جگرِ خارہ شیر

کسی قدر فصاحت سے گر گیا۔ کیونکہ گو جائز سہی لیکن بہر صورت ماضی اور مضارع کا تقابل ناہموار ہے۔

بوئے گل کی حقیقت پر شاعرانہ تخیل کی لطافت قابل دید ہے۔

حورے بکنج گلشنِ جنت تپید و گفت ۔۔۔ مارا کسے از آنسوئے گردوں خبر نداد

نایدبفہم من سحر و شام و روز و شب ۔۔۔ عقلم ربود اینکہ بگویند مُرد و زاد

گردید موجِ نکہت و از شاخِ گل دمید ۔۔۔ پا اینچنیں بعالم فردا وے نہاد

واکرد چشم و غنچہ شد و خندہ زد دمے گل گشت و برگ برگ شد و بر زمیں فتاد

رندانئے کہ بند زبانش کشادہ اند

آسیے گذاشتست کہ بونام دادہ اند

لیکن پہلے مصرع میں تپید کا لفظ بر محل نہیں واقع ہوا۔ کیونکہ بے خبری تو وجہ تپش نہیں ہو سکتی۔ اور آخری مصرع میں " آسے گذاشتست" مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کو دوسرے لفظ سے ادا کرتے تو بہتر تھا۔

شاہین و ماہی کی گفتگو کس قدر ترانہ انگیز لہجہ میں لکھی ہے۔

ماہی بچۂ شوخ بشاہیں بچہ گفت این سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست

دارائے نہنگان خروشندہ تر از میغ در سینۂ او دیدہ و نادیدہ بلاہاست

با سیل گراں سنگ زمیں گیر و سبک خیز با گوہر تابندہ و با لولوئے لالاست

بیروں نتواں رفت ز سیل ہمہ گیرش بالائے سرماست۔ تہ پاست۔ ہمہ جاست

ہر لحظہ جوان است و روان است و دوان است از گردش ایام نہ افزوں شد و نے کاست

ماہی بچہ را سوز سخن چہرہ برافروخت شاہیں بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست

زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمیں چیست صحراست کہ دریاست تہ بال و پر ماست

بگذر ز سر آب و بپہنائے ہوا ساز

ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

مے باقی یہ تیسرا جز بھی کم و بیش چالیس صفحوں کا ہے۔ اس میں غزلیں ہیں جن کی زبان کی سلاست ترنم ریز اور معنوی لطافت وجد انگیز ہے دو ایک نمونتاً درج کرتا ہوں۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

بر سر بام آ نقاب از چہرہ بیباکانہ کش نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر

بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش از نگہ بافم بر خسار تو روبندے دگر

یک نگہ۔ یک خندۂ دزدیدہ۔ یک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

عشق را نازم کہ از بے تابیِ روزِ فراق
جانِ ما را بست با دردِ تو پیوندے دگر

تا شوی بے باک تر در نالہ اے مرغِ بہار
آتشے گیر از حریمِ سینہ ام چندے دگر

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلگدازے

بمتاعِ خود چہ نازی کہ بشہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسمِ ایازے

ہمہ نازِ بے نیازی ہمہ سازِ بے نوائی
دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے

ز مقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے نہ فرازِ من فرازے

رہ عاقلی رہا کن کہ باو تواں رسیدن
بدلِ نیازمندے بہ نگاہِ پاکبازے

بہ رہِ تو ناتمامم۔ ز تغافلِ تو خامم
من و جانِ نیم سوزے تو و چشمِ نیم بازے

رہِ دیر تختۂ گل ز جبینِ سجدہ ریزم
کہ نیازِ من نگنجد بہ دو رکعتِ نمازے

ز ستیزِ آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے نگہے بہانہ سازے

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلّیِ دگرے در خورِ تقاضا نیست

اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دلگرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

تو رہ شناس نئی وز مقامِ بیخبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست

نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم
جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست

ز قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست

مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت
بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و صحرا نیست

شریکِ حلقۂ رندان بادہ پیما باش　　حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست
برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک غزل میں ایک شعر کیا بلند حوصلگی کا کہا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مولانا روم نے بھی فرمایا ہے ؎

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن شاعرانہ خیالات کا تضاد احسن تقویم اور اسفل سافلین کا کیسا صحیح منظر پیش کرتا ہے۔ کہ کہاں آدم خاکی کا یہ جوش و خروش اور کہاں وہ نگاہ میں اس قدر حقیر کہ اللہ تعالےٰ اسے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ

نقش دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار　　لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدا را

نقشِ فرنگ۔ یہ چوتھا جز ۴۰ صفحہ سے کچھ کم ہے۔ اس میں اہل مغرب کے خیالات اور ان کے متعلق رائیں ہیں۔ ان مضامین سے ایشیائی شاعری ابتک قطعاً روشناس نہ تھی۔ آغاز اس پیام سے ہوتا ہے۔

ازمن اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ　　عقل تا بال کشودہ است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند　　عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ　　آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری　　عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تر است
علم و حکمت اگرش خوئی سگی باز دہد　　آدمی زادۂ دانا ز دداں خوار تر است
خواجہ را قیمتِ عیش است اگر مزدِ غلام　　بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است

رفتگانِ عالم بالا کی صحبت بھی نہایت دلچسپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی حکما نے وہاں جاکر

سیاسی مذاکرے شروع کر دئے ہیں

روس کا مشہور حکیم ٹالسٹائے کہتا ہے

بارکش ابرمن لشکر بے شہریار | از پئے نانِ جویں تیغ ستم برکشید
زشت بخشش نکوست۔ مغز نداند ز پوست | مردکِ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
دار و بے بیہوشی است تاج۔ کلیسا۔ وطن | جانِ خدا دا د را خواجہ بجامے خرید

مزدک ایران کے اباحیہ مذہب کا پیشوا اپنی تعلیم کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بر دمید | مرگِ نو میر قصد اندر قصر سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرودی سوزد خلیل | تا تہی گردد حرمش از خداوندانِ پیر
دورِ پیرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز | نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

"کشتۂ پرویز" ناکام گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب کو کن بھی اس مجلس میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است | ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم | زبانِ او ز ہیچ و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد | ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ایک نظم میخانۂ فرنگ کی یاد میں ہے۔ اس میں کہتے ہیں۔

خشم مستاں مے فروشش بادہ را پروردگار | بادہ خوار انرا نگاہِ ساقیش پیغمبر است

یہی وہ جرم ہے جس پر ملا شیدا غریب شاہجہانی علماء کے فتووں کی بنیاد پر دہلی سے نکالا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے | حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا نظامی گنجوی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور اکثر ایرانی استادوں نے اس کے جوابات لکھے ہیں۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نبد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم در نکشود
پاسے از شب بگذشت بیشترک یا کمتر رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوئے کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند کہ تو دیر آئی و در صف پیش استی زود
ایں خرابات مغانست درو رندانند شاہد و شمع و شراب شکر و نائے سرود
ہر چہ در جملہ آفاق دریں جا حاضر مومن و برہمن و گبر و نصارےٰ و یہود

گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

ڈاکٹر صاحب خرابات فرنگ کے عنوان سے اسی نہج پر ایک قطعہ لکھتے ہیں۔

دوش رفتم بتماشائے خرابات فرنگ شوخ گفتاری رندے دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود
ایں خرابات فرنگست و ز تاثیر مئش آنچہ مذموم شمارند نماید محمود
نیک و بد را بترازوئے دگر سنجیدیم چشمہ داشت ترازوئے نصارا و یہود
خوب زشت است اگر پنجہ گیرات شکست زشت خوبست اگر تاب و توان تو فزود
تو اگر در نگری جز بہ ریا نیست حیات ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود نبود
دعوی صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست پیر ما گفت مس از سیم بباید اندود

فاش گفتم بتو اسرار نہانخانۂ زیست
بکسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

دماغ مغربیہ نے جو جمعیت اقوام قائم کی ہے وہ شاعر کو اس شکل میں نظر آتی ہے:

برفقد تا روشِ رزم دریں بزم کہن	دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند	بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

دردمندانِ جہاں کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔
مولانا وحشی کا یہ قطعہ "برادر و تقسیم نابرابر" مشہور ہے۔

زیبا ترا نچہ ماندہ زِبابا از آنِ تو	بدلے برادر از منِ اعلیٰ از آنِ تو
ایں طاسِ خامی از من و آں کوزہ کہ بود	پارینہ پر ز شہد مصفّا از آنِ تو
یا بوئے ریسماں گسل و میخ کن زمن	ہمیز کلہ تیز مطلا از آنِ تو
ایں دیگِ لب شکستہ صابون پزی زمن	واں حجچہ حریرہ و حلوا از آنِ تو
ایں اشترِ خموش لگد زن از آنِ من	واں گربۂ مصاحبِ بابا از آنِ تو

از صحنِ خانہ تا بلبِ بام از آنِ من
وز بام تا بہ سقفِ ثریا از آنِ تو

اسی لطیف طرز پر ڈاکٹر صاحب نے قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور لکھا ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن	گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد زمن	باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد از آنِ من	صہبائے پاکِ آدم و حوا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من	ظلِّ ہما و شہپرِ عنقا از آنِ تو

ایں خاک و انچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلّےٰ از آنِ تو

پیغام ۔ عجمی شاعری نے اوّل اوّل حسن و عشق کے گہوارہ اور سلاطین و امرار کی مدّاحی کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوف کا رنگ چڑھایا۔ خاصکر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے

پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پالیا۔ یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آوازِ بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اب زمانہ نے دوسری کروٹ بدلی۔ اور امت اسلامیہ غیروں کے پنجۂ تسلط میں پڑکر مصائب و آلام میں مبتلا ہوگئی۔ اس وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا۔ اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر۔ ایران، ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا۔

ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں۔ لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی نے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے۔ وہ دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے۔

(۱) ان قومی شعراء کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہونچتی ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کل امت اسلامیہ ہے یعنی ان کا خطاب صرف جذبۂ اسلامی سے ہے نہ کہ ایرانی یا تورانی سے۔ اس لیے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "ملیّات" کے لقب کی مستحق ہیں۔

(۲) دوسرے شعراء جذبات عام کو لیکر نظم کا لباس پہناتے ہیں۔ بخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی طبع خداداد حیات ملیّہ کے اسرار خود اخذ کرکے ان کو شاعری کے قالب میں ڈھالتی ہے۔

کسی کا قول ہے۔

اگرچہ شاعران نغز گفتار ز یک جامند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں خمار چشم ساقی نیز پیوست
مبیں یکساں کہ در اشعار ایں قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

"چیزے دگر" وہی رموز لطیفہ ہیں جن کو پیغامی شاعر کے سوا کوئی دوسرا نہیں پا سکتا۔
ڈاکٹر صاحب امت اسلامیہ کے لیے ایک پیغام رکھتے ہیں ان کا یہ دعوے صحیح ہے۔

بخامہ کہ خط زندگی رقم زدہ است نوشتہ اند پیامے بہ برگ رنگینم

وہ اپنا پیغام بھی صاف ظاہر کرتے ہیں۔

زشاخِ آرزو برخوردہ ام من	بہ رازِ زندگی پے بردہ ام من
بترس از باغباں اے ناوک انداز	کہ پیغامِ بہار آوردہ ام من

ان کے پیغامی شاعر ہونے کے متعلق غالباً آیندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر لکھ سکینگے۔ عجمی شاعری جس نے تصوف کی خدمت گزاری کی اُس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے۔ وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین کرتی ہے۔ اور یہ خودی اور زندگی کی۔ وہ تند مزاجوں کو برف بناتی ہے اور یہ افسردہ دلوں کو برق۔

تعلیمات| ڈاکٹر صاحب حسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے دل کو اللہ تعالےٰ نے حیاتِ مِلّیہ کے اسرار سے بھر دیا ہے۔ وہی شیرہ ان کے کلام سے ٹپکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تا مرا رمزِ حیات آموختند	آتشے در سینہ ام افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام	عشق را عہدِ شباب آوردہ ام
آشنائے من ز من بیگانہ رفت	از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی اورا دہم	تختِ کسرےٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من	رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید	آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در برگرفت	صحبتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک و دیں برمن کشود	نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

ان کی ساری شاعری انہیں رموز کی تعلیمات سے لبریز ہے۔ یہاں تک کہ قطعات اور غزلیات بھی۔ اس جگہ اجمالاً چند عنوانات لکھتا ہوں۔

خودی| یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص مضمون ہے۔ جس پر ان کی مستقل مثنوی موجود ہے۔ خودی سے مراد خود پسندی نہیں بلکہ خودشناسی ہے یہ مجموعہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

چہ پرسی از کجایم چیستم من ــــ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بے قرارم ــــ اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

شبنم

گفتند فرود آئے ز اوجِ مہ و پرویز ــــ بر خود زن و با بحر پر آشوب بیامیز
با موج در آویز
نقش دگر انگیز
تابندہ گہر خیز

من عیش ہم آغوشیِ دریا نخریدم ــــ آں بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

زندگی | اس عالم کائنات کا ذرہ ذرہ سرگرم پیکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہی پیکار اصل زندگی ہے۔ اخلاقیات کے نامور معلم شیخ سعدی نے کہا تھا کہ

اگر خواہی سلامت بر کنار است.

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا ــــ نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز ــــ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مولانا بیدل نے کسی غزل میں کہا ہے "بشکند رنگم بدریا چوں حباب بشکند" اس پر کہتے ہیں۔

از نزاکتہائے طبع موشگافِ او مپرس ــــ کز دم بادے زجاجِ شاعرِ ما بشکند

سے کہ تو اند گفت شرح کار زار زندگی می پرد رنگش بدریا چوں حباب بشکند

وہ اس عالم ہی کو پسند نہیں کرتے جس میں یزداں کے مقابلہ میں اہرمن نہ ہو۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عمل | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام درحقیقت درس عمل ہے۔ اور یہی نوائے وقت ہے۔ ستاروں کی زباں سے فرماتے ہیں۔

خنک انساں کہ جانش بے قرار است سوار راہوار روزگار است

قبائے زندگی بر قامتش راست کہ او نو آفرین و تازہ کار است

ہاتف کے جواب میں کہا ہے

ساحلِ افتادہ گفت۔ گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد۔ آہ کہ من چیستم

موج ز خود رفتۂ۔ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم۔ گر نروم نیستم

اسلام | ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصلی سر چشمہ قرآنِ عظیم ہے۔ اسی کے رموز کو لیکر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دینِ اسلام ہر قسم کی انسانی صلاح و فلاح پر حاوی اور دینی و دنیوی ترقیات کا کفیل ہے۔

ایک غزل میں کہتے ہیں۔

تو رہ شناس نئی وز مقام بے خبری چہ نغمۂ ایست کہ در بربطِ سُلیمے انیست

ایک دوسری غزل میں کہا ہے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

مغربی تہذیب جو بد بختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے ان کے نزدیک نہایت نااستوار بنیاد پر قائم ہے۔ اور وہ ایک ملمع کاری ہے جس کی تہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام و نشاں نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید حذر کہ شیوۂ او رنگِ جوزنی دارد

درہوائش گرمیِ یک آہ بے تابانہ نیست | رندِایں میخانہ رایک لغزش مستانہ نیست

مسلمانوں پر مدتہائے دراز سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں جو افسردگی پیدا کر رکھی ہے اس سے بھی وہ سخت بیزار ہیں۔ اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

دگر بدشتِ عرب خیمہ زن کہ بزم عجم | مے گذشتہ وجامے شکستنی دارد

اخوۃ اسلامی | مسلمانوں نے جہالت کی وجہ سے جو نسلی اور ملکی امتیازات پیدا کرکے باہمی تفرقے ڈال رکھے ہیں ان کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن نے کل مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنادیا ہے۔ اور یہی اخوت اسلامی ملّت کی اصلی طاقت ہے۔ فرماتے ہیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

محنت | دنیا میں ہر شخص فطرتاً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کل ثمرہ اس کو ملے۔ لیکن دول مغربیہ کی سرمایہ پرستی کی وجہ سے عالم کی اقتصادی حالت اس قدر پریچ ہوگئی ہے کہ مزدور اپنا پورا حق نہیں پا سکتا۔ بلکہ سرمایہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یورپین ممالک میں سرمایہ اور محنت کی جنگ نہایت اہمیت پکڑ گئی ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ روس کی طرح دیگر مغربی سلطنتیں بھی اس کی رو میں بہ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے خلاف جہادِ عظیم میں مصروف ہیں۔

موسیو لینن صدر جمہوریۂ روس کی زباں سے کہتے ہیں۔

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن | مثالِ دانہ تہِ سنگ آسیا بودہ است

فریبِ زاری و افسونِ قیصری خوردہ است | اسیرِ حلقۂ دام کلیسا بودہ است

غلامِ گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر | قمیصِ خواجہ کہ رنگیں ز خونِ ما بودہ است

شرارِ آتشِ جمہور کہنہ ساماں سوخت | ردائے پیرِ کلیسا قبائے سلطاں سوخت

کارل مارکس کی زبان سے جو رفتگانِ عالم بالا میں سے ہے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

رازدانِ جزو کل از خویش نامحرم شدہ است | آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدہ است

ٹالسٹائی کہتا ہے۔

عقل دور و آفرید فلسفۂ خود پرست | درس رضا میدہد بندۂ مزدور را

یہ درد اُن کے دل میں اس قدر ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے دلفریب مناظر میں بھی اس کو یہی جستجو

کشمیری کہ با بندگی خوگرفتہ | بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے | خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او | نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے | نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

تبلیغ اسلام | اسلام کی تبلیغ اہم ترین فریضۂ امت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو بعض ہندوستانی مغربی ممالک میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں یہ کہاں تک بجا ہے جبکہ خود ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں لاکھوں کروروں مسلمان جاہل اور گمراہ پڑے ہوئے ہیں۔ غیر اقوام کو مسلمان بنانے کی بہ نسبت ان کی تعلیم اور ہدایت مقدم ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب فرنگستان میں تبلیغ کی اس وقت ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور ایسے مبلغوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

زمانہ باز بر افروخت آتشِ نمرود | کہ آشکار شود جوہرِ مسلمانی
بیا کہ پردہ ز داغِ جگر بر اندازیم | کہ آفتاب جہانگیر شد ز عریانی
ہزار نکتہ ز دی پیشِ دلبرانِ فرنگ | گداختی صنما نرا بعشم برہمانی
خبر ز شہر سلیمیٰ بدہ حجازی را | شرارِ شوق فشاں در ضمیر تورانی
رہ عراق و خراساں زن اے مقام شناس | بہ بزمِ عجمیان تازہ کن غزل خوانی
بسے گذشت کہ در انتظارِ زخمہ ورست | چہ نغمہا زنہ خون شد بہ سازِ افغانی
حدیثِ عشق باہلِ ہوس چہ میگوئی | بچشمِ مور مکش سرمۂ سلیمانی

جمہوریت | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آبِ گِلِ حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے لیکن ان کا یہ قول

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی خرِ نا شخص نکلے تو پھر کہ ہوگا۔ کیونکہ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملائکہ کا جو استاد ہے وہی راندۂ درگاہ اور ملعون بارگاہ ہوگا۔ وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

بر درِ نوشتہ بود کہ ملعون شود یکے — بردم گماں بہر کس و بر خود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملہ میں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورہ میں دو فائدے ہیں۔

(۱) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا "شاورہم فی الامر" کا حکم دیا گیا۔

(۲) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاق صحیح موجود ہوتا ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کے واسطے "امرہم شوریٰ بینہم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کر لوں۔

خاتمہ | ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے۔ لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے۔ یعنی فصاحتِ لفظی اور بلاغتِ معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔ جو مضمون ہے وہ نہایت صاف۔ برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ اندازِ بیاں اور طرزِ ادا انوکھا اور دلکش ہے۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے۔ لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ

سے جانے نہیں دیتے۔

ان کا قدم کسی کے جادۂ تقلید سے قطعاً بری ہے۔ گو کہیں کہیں مغز سخن اُنہوں نے مولانائے روم سے اخذ کیا ہو لیکن اپنا راستہ جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے خود ہی نکالا ہے۔

ان کا جامِ شاعری اس سوگواری کی تلخی سے بھی پاک ہے جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں۔ ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں۔

طباعت | اس دیوان کی چھپائی کی خوبیوں کی داد نہ دینا بھی ایک قسم کی بیداد ہے۔ ہمارے ملک میں مطبوعات کی تصحیح بڑی مشکل چیز ہے۔ میں خود اپنی تصنیفات ہر چند اہتمام سے چھپواتا ہوں لیکن پھر بھی ان میں غلطیاں رہ جاتی ہیں جن سے خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔ لیکن اس دیوان میں مجھے شروع سے آخر تک کہیں ایک نقطہ کی بھی غلطی نظر نہیں آئی۔ کاغذ چکنا دبیز۔ لکھائی اعلیٰ درجہ کی اور چھپائی بہت صاف ہے۔

الغرض یہ دیوان صورتاً اور معناً ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

اقطابِ انگورہ

ڈاکٹر رضا نور بے وزیر حفظان صحت حکومت انگورہ

مشاہیر انگورہ میں ڈاکٹر رضا نور بے کی شخصیت وہ ممتاز و سربلند شخصیت ہے جو جدید ترکی تحریک میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے، یہ وہی ڈاکٹر رضا نور بے ہیں جنھوں نے مشہور مجلس "لوزان" میں حکومت عالیہ انگورہ کی نمایندگی کرتے ہوئے موسیو پوانیکار صدر اعظم حکومت فرانس، سائینور مسولینی صدر اعظم حکومت اٹلی اور لارڈ کرزن وزیر خارجہ حکومت انگلستان ایسے عظیم الشان یورپی مدبرین کا دندان شکن مقابلہ کیا۔

ممدوح کا سال پیدائش ۱۸۷۸ء ہے، ابتدائی تعلیم "قسطنطنیہ کالج" موسومہ "مکتب سلطانی" میں ہوئی، اس کے بعد آپ نے فرانس میں سلسلہ شروع کیا اور پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹری میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی پھر آسٹریا اور روس کی سیاحت کے بعد آپ نے آستانہ میں ڈاکٹری شروع کی، چونکہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کو مبداء فیاض سے غیر معمولی دل و دماغ عطا ہوا ہے اس لیے گو آپ ڈاکٹری پیشہ آدمی تھے لیکن ترکی سیاسیات کے ماحول نے آپ کو ملکی و قومی معاملات و مسائل میں حصہ لینے کی طرف ہمیشہ مائل رکھا اور آپ برابر سیاسیات میں حصہ لیتے رہے، ڈاکٹر صاحب ترکی زبان کے نہایت ممتاز شاعر و ادیب بھی ہیں اور تقریر میں تو اس درجہ ملکہ بڑھا ہوا ہے کہ اپنے ملک کے بہترین مقرروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب "ترکی" "فرنچ" اور "روسی" زبانوں میں کامل مہارت رکھتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے علمی اور سیاسی بلند پایگی سے تمام ارکان حکومت اچھی طرح واقف تھے، لہذا ۱۹۰۸ء کے انتخاب پارلیمنٹ کے موقع پر آپ مقام "سینوب" کی طرف سے ترکی پارلیمنٹ میں نمایندہ مقرر ہوئے، لیکن پارلیمنٹ میں ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ آپ کو ارکان انجمن اتحاد و ترقی کے ساتھ بعض اصول کار میں اختلاف پیدا ہو گیا، چونکہ ڈاکٹر صاحب ایک زبردست اور مضبوط دل و

دماغ کے آدمی ہیں لہذا آپ نے اپنے ضمیر کے موافق نہایت جرأت و بے باکی سے ارکان انجمن اتحاد و ترقی کی مخالفت شروع کر دی اور یہ مخالفت اس درجہ بڑھی کہ ارکان حکومت کو ڈاکٹر صاحب کی مقتدر اور باثر شخصیت سے خوف پیدا ہو گیا آخر کار انجمن اتحاد کے سربرآوردہ ارکان نے آپ پر انجمن کے خلاف سازش کا الزام لگا کر ۱۹۰۹ء میں آپ کو قید کر دیا[۹]

ڈاکٹر صاحب کے عائد شدہ الزامات میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ فرید پاشا اور کامل پاشا کے موئد و معاون ہیں حالانکہ واقعہ اس کے خلاف تھا، چند ماہ بعد جب آپ رہا ہوئے تو آپ آستانہ کی سکونت کو ترک کر کے سوئٹزرلینڈ چلے گئے اور شہر "برن" میں ڈاکٹری پریکٹس شروع کر دی، گو ڈاکٹر صاحب اس وقت ارکان انجمن اتحاد و ترقی سے سخت نقصان و تکالیف اٹھا چکے تھے لیکن اس پر بھی آپ نے ان اصول کی مخالفت سے منہ نہ موڑا جن کی بنا پر آپ قید و گرفتار کیے گئے تھے، اور سوئٹزرلینڈ سے آپ نے مشہور اتحادی صدر الصدور حسین جاہد بے کو ایسے معرکۃ الآرا خطوط لکھے کہ بالآخر انھیں اخبار "طنین قسطنطنیہ" میں ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگنا پڑی، ڈاکٹر صاحب شہر "برن" میں چند ماہ قیام فرمانے کے بعد "جینوا" چلے گئے، شہر جینوا سوئٹزرلینڈ کا ایک نہایت دلکش و پرفضا مقام ہے جہاں ڈاکٹر صاحب کے ادبی کمالات نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا، اور چونکہ آپ فرانسیسی زبان کے بے مثل ماہر ہیں لہذا آپ نے جینوا میں دو فرانسیسی ڈراموں موسومہ "شمسون" اور "دلیلہ" کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا، اور موسیقی کے راگوں کو ترجمہ میں اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا، ترجمہ کے اختتام پر آپ پیرس گئے تاکہ یہاں ماہرین فن کے مشورہ

---

[۹] جمال پاشا مرحوم نے اپنے تذکرہ میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے اور انھیں کی کوشش سے ڈاکٹر رضا نور کو اُس وقت انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت نے کافی روپیہ دیکر اس وعدہ پر یورپ بھیجا تھا کہ وہ ایک مدت تک قسطنطنیہ واپس نہ آئیں۔ خاندان شاہی کے بعض افراد جو حکومت قسطنطنیہ کے مخالف تھے واقعی ڈاکٹر رضا نور کے مربی تھے اور ڈاکٹر کو اُن سے خاص تعلق تھا (مدیر)

سے ان ڈراموں کے گائین کو ترکی گائین کے طریقوں پر ترتیب دیں اور پھر فرانسیسی گائین سے ان کا مقابلہ کریں، ڈاکٹر صاحب کی اس گزاری سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ڈاکٹر ممدوح نے غربت و مسافرت کی حالت میں بھی اپنی قوم کی دماغی و ذہنی خدمت و اصلاح سے گریز نہ کیا، اور اپنے علمی تبحر اور فیضان سے وہ قوم و زبان کو برابر فائدہ پہونچاتے رہے۔

مذکورہ واقعہ اپریل ۱۹۱۴ء کا ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب پیرس میں مقیم تھے، ابھی آپ سوئٹزرلینڈ واپس ہونے والے تھے کہ جنگ یورپ کا آغاز ہوا، اور آپ ڈاکٹر صاحب کا سوئٹزرلینڈ یا قسطنطنیہ جانا ناممکن ہوگیا، دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ آپ کے پاس خرچ بھی نہ رہا جس کے ذریعہ وہ پیرس کے شاہانہ مصارف برداشت کرتے، لیکن پھر بھی باحوصلہ ڈاکٹر نے ان مشکلات کو اہمیت نہ دی اور اپنی اہلیہ کے زیورات فروخت کرکے اوقات بسر کرنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو آپ دسمبر ۱۹۱۴ء میں مصر چلے گئے جہاں آپ نے "شارع عبدالعزیز" پر اپنا مختصر سا مطب کھولا، ابتدا میں مصر والوں نے آپ کی اچھی طرح خاطر مدارت کی اور کافی تعداد میں مریضوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، لیکن یکایک آپ کا کام رک گیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کے بعض ترک دشمنوں نے برطانوی فوجی حکومت سے آپ کی شکایت کی اور اُدھر آپ کے ہم پیشہ ڈاکٹروں میں یہ افواہ اڑائی کہ ڈاکٹر رضا نوربے برطانیہ کی فوجی حکومت کی نگرانی میں ہیں اور سادہ لوح عوام پر ظاہر کیا کہ جو لوگ ڈاکٹر رضا نوربے کے مطب میں جاتے ہیں وہ ممکن ہے کہ نظربند کرلیے جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کے دشمنوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ وہ برابر برطانوی فوجی حکومت کے افسروں کے پاس جاکر ڈاکٹر ممدوح کی طرف سے اُن کو بدگمان کرتے رہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو فوجی حکام نے بلایا اور جوابات طلب کیے روز روز کی اس مصیبت نے ڈاکٹر صاحب کے صبر و استقلال کو رخصت کردیا اور دنیا اُنکی آنکھوں میں تاریک ہوگئی

ایسی حالت میں اگر اُن کے ساتھ اُن کی اہلیہ محترمہ ہوتیں تو وہ اس پریشان کن زندگی سے اس امر کو بہتر خیال کرتے کہ اپنے کو قید یا نظر بند کرا لیتے جیسا کہ آپ نے اپنے دوستوں سے بار بار اس خیال کا اظہار کیا تھا۔

جب درہ دانیال پر معرکہ آرائی نے شدت اختیار کر لی اور انگریزی بحری بیڑہ کو متواتر ناکامیاں اُٹھانی پڑیں تو برطانوی اس سے بہت متاثر ہوئے اور اسی زمانہ میں مصر کی فوجی حکومت نے ڈاکٹر رضا نوبے کو طلب کیا' اس بلاوے سے ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا کہ اب وہ گھر واپس نہ آئیں گے اور نظر بند کر دیے جائیں گے اُس وقت آپ کے پاس کافی روپیہ نہ تھا جو اپنی اہلیہ کی ضروریات کے لیے محفوظ رکھ دیتے اس لیے آپ نے اپنے بعض دوستوں کو وصیت کی کہ وہ اُن کی بیوی کی خبر گیری کرتے رہیں' پھر شام کے ایک معتمد شخص سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اُن کی بیوی کے پاس اپنی بیوی کو رکھیں' اور مصائب و آزمائش کا دور ختم ہونے تک اس احسان کو جاری رکھیں' یہ تمام انتظامات کرنے کے بعد ڈاکٹر رضا نوبے "سوائے ہوٹل" میں پہونچے اور اُس چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوئے جس میں چھ فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے' ان میں دو افسر بڑے درجہ کے تھے' ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک بڑے افسر نے اُن کو مخاطب کر کے کہا'

"ڈاکٹر شاید آپ ہمارے احسانات بھول گئے' ہم نے اُس وقت تک وہ معاملہ آپ کے ساتھ نہیں کیا جو دشمن کی رعایا کے ساتھ کرنا چاہیے"

ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کے اس سلوک کا شکر گزار ہوں۔

افسر۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ نے اپنے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا' اور آپ نے اطمینان و سکون سے رہنا پسند نہیں کیا جس کی ہم کو آپ سے امید نہ تھی بلکہ آپ نے اتحاد و ترقی کا پروپگنڈا مصر میں شروع کر دیا' اور آپ یہاں بھی برابر تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو جو اطلاع ملی ہے غلط ہے' میں انجمن اتحاد و ترقی کا دشمن ہوں اور

عثمانی پارلیمنٹ میں بحیثیت ایک ممبر کے میں ہمیشہ انجمن اتحاد و ترقی کا مخالف رہا ہوں اور اس کا
ثبوت میرے مضامین اور وہ پمفلٹ ہیں جو میں نے شائع کیے ہیں علاوہ ازیں میری حیثیت مصر میں
ایک اجنبی شخص کی سی ہے، نہ مصری زبان سے واقف ہوں اور نہ مصری لیڈروں سے میرے
تعلقات ہیں، لہذا میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حالت میں مجھ پر کیوں یہ الزام لگایا گیا کہ میں برطانیہ کے
خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہوں؟ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک عزلت نشین شخص ہوں اور بجز ڈاکٹری
کے میرا اور کوئی کاروبار یا تعلق نہیں ہے۔

افسر۔ کیا آپ اس کا وعدہ کرتے ہیں اور حلف اُٹھاتے ہیں کہ آپ سیاسیات میں کسی قسم کا
کوئی حصہ نہ لیں گے اور کوئی کام ایسا نہ کریں گے جو ہمارے لیے نقصان رساں ہو۔

ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کو کسی قسم کا ضرر پہونچانے سے عاجز ہوں، میں ایک غریب الوطن آدمی
ہوں، ہاں اگرچہ مجھ میں اس کی قدرت ہوتی کہ میں اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکتا اور یہاں
رہ کر آپ کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا تو میں ضرور ایسا کرتا، لیکن اب کہ میں ایسا نہیں کر سکتا مجھے
توقع ہے کہ آپ میرے خلاف شکایتوں پر کان نہ دھریں گے اور اگر آپ کا ایسا ہی ارادہ ہے تو
میں قید و نظر بندی کے لیے تیار ہوں، آپ جہاں چاہیں مجھے اور میری بیوی کو نظر بند کر دیں۔

افسر۔ آپ کے ایک دوست نے آپ کے متعلق ہم سے جو باتیں بیان کی ہیں اور اگر آپ
فی الحقیقت انجمن اتحاد و ترقی کے دشمن ہیں تو پھر آپ کیوں نہیں ہماری مدد کرتے؟ ہم چاہتے
ہیں کہ آپ کو اپنے بیڑہ کے ساتھ دردانیال کے معرکہ میں بھیجدیں جہاں آپ انگریزی فوجوں کی
رہنمائی کریں اور انہیں داخلہ قسطنطنیہ میں مدد دیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ جناب اَلا دردانیال پر آپ کی ڈیڑھ لاکھ سپاہ پڑی ہوئی ہے اور پوری
کوشش سے کام کر رہی ہے لیکن باایں‌ہمہ وہ آستانہ میں داخل نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں
کیا آپ مجھ کو اپنے بڑے بڑے جنگی اور ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں؟ اس
موقع پر میں آپ کو اس امر سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ میں "ترکی النسل" ہوں، قوم پرست

ہوں، پکا مسلمان ہوں'' پھر کیا آپ مجھ سے ملک مذہب کا خائن بنانا چاہتے ہیں؟ میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ میں ارکان انجمن اتحاد و ترقی کا دشمن ہوں لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ میں ملک مذہب اور اپنی قوم کا خائن بھی ہوں' یاد رکھئے میں ترک ہوں اور مجھ سے اس قسم کا مطالبہ میری توہین ہے۔

افسر۔ معاف کیجئے اس گزارش سے آپ کی توہین مقصود نہ تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ آپ اپنے اثر و اقتدار سے انجمن کے ارکان کو نقصان پہونچانے میں مدد دیں جو ترکی قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ اس وقت آپ سے تنہا ارکان انجمن جنگ آزما نہیں ہیں بلکہ پوری ترکی قوم آپ کے مقابلہ میں درہ دانیال پر کھڑی ہے' بہتر ہو کہ آپ مجھ سے اس قسم کا مطالبہ نہ کریں' ورنہ بصورت دیگر آپ شوق سے میرے ساتھ دشمن کی رعایا کا سا سلوک کریں'

افسر۔ ڈاکٹر صاحب آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کی بات پر ہم کو کامل یقین ہے' اس لئے آپ مصر میں آزاد زندگی بسر کریں آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

یہ کہہ کر دونوں فوجی افسروں نے ڈاکٹر صاحب کو دروازہ تک رخصت کیا اور گفتگو کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اُس کی معذرت چاہی' اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جنگ یورپ کا سارا زمانہ مصر میں گزارا اور پھر اُن سے کوئی بازپرس نہ ہوئی۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جب ترکی اتحادی معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو ڈاکٹر بقا نور یہ آستانہ تشریف لے گئے' اُس وقت قسطنطنیہ کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی' ترکی گورنمنٹ پر خانیوں کا قبضہ تھا جو سب کے سب اتحادیوں کے زیر اثر تھے' اور تمام ترکی مدبرین اپنی آزاد خیالی کے باعث قید و گرفتار ہو رہے تھے' ترکی ممالک پر اتحادی اور یونانی فوجیں قبضہ جما رہی تھیں غرض ان حالات کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب گو نہایت رنجیدہ اور افسردہ خاطر تھے لیکن وہ تنہا اس غاصبانہ غلبہ کا مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے آخر کار ۱۹۱۹ء میں غازی اعظم مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی تحریک کا

آغاز ہوا، اور آزاد خیال ڈاکٹر رضا نور بے ٹو توغازی اعظم کی جماعت میں جاملے، اور اسی وقت سے ڈاکٹر صاحب کی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی قابلیت ترکی حلقوں میں پہلے ہی مسلم تھی اس لیے اس وقت ڈاکٹر صاحب کا انگورہ پہونچکر احرار کی تحریک میں حصہ لینا محرکین کے لیے عین امداد سے کسی طرح کم نہ تھا، چنانچہ یہ آپ کی مسلمہ اہلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ سب سے پہلے قومی وزارت میں "وزیر حفظان صحت" مقرر ہوئے، اور انگورہ کیبنیٹ میں آپ کی شرکت اطمینان و مسرت کی نظر سے دیکھی گئی،

مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی موجودہ تمام حیرت انگیز کارگزاریاں آج دنیا جہان سے جو خراج تحسین وصول کر رہی ہیں وہ دراصل اُس عہد و ضابطہ کے نتائج و برکات ہیں جو فروری ۱۹۲۰ء کو انگورہ کی قومی مجلس نے منظور و نافذ کیا تھا اور جو "جدید ترکی" کی تاریخ میں ہمیشہ "میثاق ملی" کے نام سے یاد کیا جائے گا، ترکی سیاسیات کا مطالعہ کرنیوالے حضرات اس "میثاق ملی" کی اہمیت اور اُس کی سیاسی مرتبت سے اچھی طرح واقف ہیں جس کی رو سے انگورہ میں ترکی قوم پسندوں نے استقلال و حریت کی آخری مگر خونریز قسم کھائی تھی، یہ اہم ترین میثاق ملی ڈاکٹر رضا نور بے کی سیاسی مآل اندیشی اور دوربینی کا بہت زیادہ مرہون ہے جس میں متعدد واقعات کی ترمیم ڈاکٹر صاحب نے فرمائی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اس عہد نامۂ قومی میں جن دفعات کا اضافہ فرمایا ہے وہ ترکی کے تابناک مستقبل کی زبردست ضامن ہیں، ڈاکٹر رضا نور بے اگرچہ وزیر حفظان صحت تھے لیکن کام کرنے والوں کی ذمہ داریاں ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں چنانچہ اسی زمانہ میں آپ کو محکمۂ تعلیمات عامہ میں بھی خدمات انجام دینی پڑی تھیں اور خالدہ ادیب خانم کی مشہور وزارت میں آپ "ڈائرکٹر تعلیمات" کے فرائض انجام دیتے تھے، ان خدمات نے انگورہ اور مجلس وطنی میں ڈاکٹر صاحب کے اعتماد کو حد درجہ ممتاز بنا دیا لہٰذا آخر ۱۹۲۰ء میں آپ حکومت عالیہ انگورہ کے محکمۂ وزارت خارجیہ میں سے لیے گئے جہاں چند ماہ کام کرنے کے بعد فروری ۱۹۲۱ء میں مشہور سیاست داں

یوسف کمال بے وزیر خارجہ انگورہ کے ہمراہ ماسکو تشریف لے گئے، مملکت روس کے سفر کا منشار یہ تھا کہ حکومت روس سے دوستانہ روابط و علائق پیدا کیے جائیں، انگورہ گورنمنٹ اور روس کی بالشویک گورنمنٹ کے درمیان کسی عہد نامہ سیاسی کا قیام ایک اہم ترین کام تھا جسے بالغ نظر اور پختہ کار ڈاکٹر رضا نور بے نے بکمال خوش اسلوبی انجام دیا، چونکہ ڈاکٹر صاحب اپنے زمانہ سیاحت میں عرصہ تک "ماسکو" میں رہ چکے تھے اس لیے روسی ارباب سیاست آپ کی مسلمہ قابلیت سے پہلے ہی مرعوب تھے اس لیے ڈاکٹر صاحب کی تمام تر جدوجہد نہایت مفید و منفعت بخش طریق پر کامیاب ہوئی انگورہ گورنمنٹ اور روس گورنمنٹ کے دوستانہ تعلقات کے حصول و قیام کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کو دو مرتبہ مملکت روس کا سفر کرنا پڑا، اور یہ دونوں سفر سیاسی نقطۂ نظر سے نہایت کامیاب رہے، اس کے بعد اندرون انگورہ خصوصاً مجلس وضع آئین و قوانین میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات و اصلاحات کا تذکرہ ایک طویل فرصت چاہتا ہے جس کی حیرت انگیز اہمیت کو جدید ترکی کی تاریخ ہی پیش کر سکتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں بندرگاہ مدانیہ میں ترکی اتحادی فوجی افسروں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کا مقصد ترکی و یونانی جنگ کا التوا اور اتحادیوں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں ایک عام مجلس صلح کا انعقاد تھا، مدانیہ کانفرنس میں متارکہ قرار پایا تھا اُس کی تعمیل میں ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء سوئٹزرلینڈ کے مقام "لوزان" میں وہ ہنگامہ آرا صلح کانفرنس منعقد ہوئی جو سیاسیات مشرقیہ اور بین الاقوامی مجالس میں اپنی نظیر آپ ہے۔

انگورہ گورنمنٹ کی طرف سے جو وفد مصالحت تدبیر پناہ مارشل عصمت پاشا کی سرکردگی میں منتخب ہوا اس میں ڈاکٹر رضا نور بے نائب رئیس وفد کی طرف سے نومبر ۱۹۲۲ء میں لوزان بھیجے گئے، اس وقت لوزان میں جن ممالک کے وفود گئے تھے اُن کی تعداد دس تھی، ان میں حسب دستور وفد کے ۳۵ ممبر تھے جن کی مجموعی تعداد ۳۵۰ تھی گویا ۳۵۰ مغربی سیاست داں اصحاب کے مقابلہ میں یہ ۳۵ آدمی تھے جنہیں سیاسیات و معاشرت، تجارت و قانون،

مالیات، و بین الاقوامی مسائل مہمہ میں ان پختہ کار مغربی سیاست آگاہ افراد کا مقابلہ
کرنا تھا اور اطلاعات سے ثابت ہے کہ ترکی وفد کی طرف سے ڈاکٹر رضا نور بے نے جس قدر
کام کیا ہے اور آپ نے جس قدر دماغی محنت کی ہے عصمت پاشا کے بعد کسی دوسرے ترکی
نمایندہ نے نہیں کی، جس کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ لارڈ کرزن، موسیو پائنیکا، اور
سائنیور مولینی، ایسے عظیم المنزلت سیاسی نمایندوں کو "لوزان" میں جو شکست ہوئی وہ
وہ ڈاکٹر رضا نور بے ہی کے دانش پناہ دماغ اور سیاسی تبحر کا نتیجہ ہے؛

۲۱ر دسمبر ۱۹۲۲ء میں لارڈ کرزن ایسے پختہ کار مدبر نے جس وقت مسئلہ موصل کے متعلق
بحث چھیڑی اور موصل کو عراق کا جزو صحیح ثابت کرنے کے لیے اُس نے دلائل و براہین سے
کام لیا، تو یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں خیال کیا جانے لگا تھا کہ لارڈ کرزن کے دلائل کا رد ترکی
وفد کے لیے ناممکن ہے اور یہ واقعہ ہے کہ لارڈ کرزن نے مسئلہ کو جس اہم پیمانہ پر مجلس صلح میں
اُٹھایا تھا اُس کی اہمیت اسی قدر وقیع تھی، کیونکہ اس وقت سب سے بڑی مشکل ترکوں کے لیے یہ
کہ لارڈ کرزن کی موافقت میں فرانس و اٹلی اور جاپان و امریکہ کے تمام نمایندے شامل ہے
ادھر خود عراق میں غدار فیصل اور اوس کے باغی اسلام بھائی امیر عبد اللہ اور زید نے
موصل اور علاقہ عراق میں ترکوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا، پھر اندرون کانفرنس
غدار شریف مکہ کا بے حمیت نمایندہ جعفر پاشا موجود تھا جو بڑے پیمانہ پر یہ ثابت کرتے آیا تھا
کہ موصل ہر طرح عراق کا حصہ ہے اور یہ عراقی حکومت یعنی انگریزوں ہی کے قبضہ میں رہنا چاہیے
لارڈ کرزن کی اس تیاری کے بعد ترکی وفد کے لیے جس قدر مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اُنھیں کچھ
سیاسی دماغ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں، بالآخر ڈاکٹر رضا نور بے کو جوش آیا اور ممدوح نے ہزار گونہ
سیاسی مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے لارڈ کرزن کی یادداشت متعلقہ موصل کا جواب لکھنا شروع
کیا، اور جس وقت یہ جوابی یادداشت مجلس صلح میں آپ نے پیش کی تو اس کے استدلال اور
تاریخی استناد، اہم اعداد و شمار اور مسکت جوابات کا یہ اثر ہوا کہ لارڈ کرزن کو یہی کہتے

ہی کہ اچھا تو اس مسئلہ کو اب "جمعیۃ الاقوام" ہی کے سپرد فرما دیجئے، ڈاکٹر توفیق نادی بے مالک اخبار "حاکمیت ملیہ انگورہ" اور مسٹر وارڈ پرائس نامہ نگار امریکن پریس نے ایک موقع پر بیان کیا تھا کہ ہم ڈاکٹر رضا نور بے کی اس جوابی یادداشت کی بالغ نظری اور ہمہ گیر جامعیت پر مجلس صلح میں حیران رہ گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ طرز عمل بھی قابل ذکر ہی کہ اُنھوں نے اس مجلس میں جس میں چاروں طرف طاقتور سے طاقتور دشمن نظر آ رہے تھے اور اتحادی جنگی جہازوں کا سمندر ودرہ دانیال، اور شمالی شام میں فرانسیسی فوجوں کا مظاہرہ ہو رہا تھا آپ نے قومی ترجمانی اور نمایندگی میں اس جرأت و بے باکی سے کام لیا کہ گویا ان مشکلات کا ایک حق پرست پر کوئی اثر نہ تھا مثلاً جس وقت قلیل التعداد اقوام کے تحفظ اور آزادی کے لیے مجلس صلح میں بحیثیت صدر جلسہ لارڈ کرزن نے آرمن قوم کے حفاظت و آزادی کے لیے ایک مدلل استدعا پیش کی اور ترکی حکومت کے ایک سرکاری اعلان مصدرہ ۱۷ ر فروری ۱۹۲۰ء کے حوالہ سے اس استدعا کو قانونی مرتبہ دیا تو باستثنائے روسی نمایندہ تقریباً تمام نمایندوں نے لارڈ کرزن کی اس استدعا سے اتفاق رائے کیا خصوصاً موسیو بیرر اور موسیو بمبارڈ فرانسیسی نمایندوں اور موسیو دنیز یلاس یونانی نمایندہ، اور مسٹر گورونی نمایندہ امریکہ نے اس تحریک کا پرزور خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے اتفاق کا اظہار کیا، لیکن غیور و شیر دل ڈاکٹر رضا نور بے فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ببانگ دہل ان یورپی نمایندوں سے کہہ دیا کہ

"غدار ارمنوں کے لیے ترکی میں نہ کوئی زمین ہی اور نہ ہی ہم اس مسئلہ کو جمعیۃ الاقوام میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ہم اپنی ماتحت رعایا کو فوجی خدمت سے کبھی مستثنیٰ نہیں کر سکتے"

ڈاکٹر موصوف کی اس جرأت و گرم گفتاری سے شرکائے مجلس جس قدر مرعوب ہوئے اُس کا معمولی نمونہ یہ ہی کہ ایک موقع پر ڈاکٹر اس قدر غضب ناک ہوئے کہ کرسی کو پھینک کر مجلس سے چلدیئے جس پر تمام شرکا نے مارشل عصمت پاشا سے شکایت کی یورپی مجلس صلح میں شاید یہ

سب سے پہلا واقعہ تھا کہ ایک ایشیائی نمایندہ یا ترکی وکیل نے مغرور و سرکش یوروپین مدبرین کو اس قدر درشت اور منہ توڑ جواب دیا۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ اگرچہ آپ ترکی وفد کے نائب مشیر لیکن قومی حمایت کا یہ عالم تھا کہ اپنے سردار مارشل عصمت پاشا کی تمام کارگزاری کی نگرانی کرتے تھے اور ایک موقع پر آپ نے مجلس ملیہ انگورہ کو صاف صاف لکھ دیا کہ عصمت پاشا مجلس مصالحت میں نرمی اور اعتدال سے کام لے رہے ہیں جو قومی وقار کے منافی ہے۔

غرض یہ اور اسی قسم کے طویل واقعات ہیں جو شیر دل اور سیاست آگاہ ڈاکٹر رضا نور بے کی ممتاز و مستثنیٰ فضیلت کے آئینہ دار ہیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان کو چاہتی ہے، کاش ہمارے وہ نوجوان طلبہ ڈاکٹر صاحب کی ہمہ دانی اور فضیلت پناہ شخصیت کا اندازہ کریں جو میٹرک پاس کر کے کسی اخبار کی ایڈیٹری یا ملک و قوم کی لیڈری اختیار فرمانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

حلیہ ڈاکٹر رضا نور بے ایک دراز قامت اور نہایت تنومند شخص ہیں، رنگ نہایت سفید اور نیلی آنکھیں، سر کے بال اڑے ہوئے، اور یوروپین لباس خصوصاً ٹائی کا لرکا ہر وقت خیال رکھتے ہیں۔

'توحیدی'

تصحیح

گزشتہ نمبر میں علامہ فتحی بے کی جو سوانحعمری شائع ہوئی ہے اس میں اُن کا نام غلطی سے احمد فتحی لکھا گیا، حالانکہ علی فتحی بے ہونا چاہیئے۔

مطبوعات جدیدہ

برہان القرآن پنجاب میں مولانا عبداللہ صاحب مرحوم چکڑالوی حجیت حدیث کے قائل نہیں تھے۔ اس وقت سے یہ مسئلہ مابین اہل قرآن و اہل حدیث کے زیر بحث چلا آتا ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی کتاب مذکورہ بالا ہے۔ جس میں مولوی احمد الدین صاحب امرتسری امام اہل قرآن اور مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری صدر اہل حدیث کے مابین اس مسئلہ پر جو تحریری مناظرہ واہے تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ دونوں فرقوں کے علماء فحول جس بحث میں تقریباً ایک ربع صدی کا زمانہ گزار چکے اور اب تک کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہونچے اس کے متعلق ہمارا کوئی فیصلہ ناطق نہیں ہو سکتا لیکن اس بحث کی نوعیت کے متعلق ہم کچھ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حدیث حجت ہے یا نہیں۔ مسئلہ زیر بحث صرف اسی قدر ہے۔ اور یہ آج سے نہیں ہے بلکہ جس زمانہ میں حدیث کی تدوین شروع ہوئی اسی زمانہ سے ایک جماعت اہل اسلام کی حجیت حدیث کی منکر چلی آتی ہے۔ اور دینی امور میں حدیث کو لاشی سمجھتی ہے۔

مگر یہ بحث صرف اس بات پر مبنی تھی کہ آیا حدیث ذریعہ علم ہے یا نہیں۔

منکرین حدیث یہ کہتے تھے کہ دنیا کی کسی عدالت سے تم اس قسم کی شہادت پر کہ میں نے زید سے سنا۔ اس نے بکر سے سنا اس نے خالد سے سنا۔ اس نے عبداللہ سے سُنا۔ اس نے احمد سے سنا۔ اس نے محمدؐ سے سنا ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔ پھر کس اصول سے تم ہم کو مجبور کرتے ہو کہ حدیثوں کو جو تمامتر اسی قسم کی شہادت پر مبنی ہیں ہم امور دین میں دلیل سمجھ لیں۔

قائلین حدیث کہتے تھے کہ چونکہ یہ معتمد اور موثوق ذرائع سے ہم کو موصول ہوئی ہیں اس لئے قابل استناد ہیں۔ ان میں سے جو متواتر ہیں ان سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ اور جو غیر متواتر ہیں ان سے ظنی۔

منکرین کہتے تھے کہ متواتر کوئی حدیث نہیں ہے۔ تمامتر احاد ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ ظنی ہو سکتی ہیں لیکن دین کے معاملہ کو ظنیات پر رکھنا ممنوع ہے۔ قرآن یقینی ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے۔

الغرض یہ بحثیں اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر ان تمام بحثوں میں کا دارمدار صرف اس امر پر تھا کہ حدیث مفید علم ہوتی ہے یا نہیں۔ اس امر میں سب متفق تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے۔

اب اس بحث میں ایک نیا باب کھلا۔ یعنی خود آنحضرتؐ کے متعلق لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ آپ کے اقوال شرعی وہی ہیں جو بذریعہ وحی کے فرماتے تھے۔ اور وہ صرف قرآن ہے۔ باقی عام معاملات میں جو اقوال تھے وہ تشریعی نہیں۔ تشریع کا اختیار صرف اللہ تعالے کو ہے رسول کا کام محض احکام الہی کی تبلیغ ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک حدیث چاہے متواتر ہو یا غیر متواتر تاریخ دینی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ نہ اس کی تحلیل سے کوئی چیز حلال ہو نہ اس کی تحریم سے کوئی شے حرام۔ اب قرآن وحدیث کے متعلق مسلمانوں میں کئی خیال کی جماعتیں ہو گئی ہیں۔

(۱) قرآن اور حدیث دونوں اصل دین ہیں۔ اور دونوں کے رتبے جہاں تک عمل کا تعلق ہے برابر ہیں۔

یہ جمہور کا مذہب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ میں افراط اور تفریط ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس کے بھی قائل ہیں کہ کہیں آیات قرآنی حدیثوں کو اور کہیں حدیثیں قرآنی آیتوں کو منسوخ کر دیتی ہیں۔

(۲) قرآن کو حدیث پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی آیتیں حدیثوں کو منسوخ کر سکتی ہیں لیکن حدیثیں ان کی ناسخ نہیں ہو سکتیں۔

یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بھی حدیثوں کا یہ منصب رکھتے ہیں کہ وہ قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام۔ مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید کر سکتی ہیں نیز ان سے زیادت علی الکتاب بھی ہو سکتی ہے۔

(۳) دین اسلام صرف قرآن ہے۔ حدیثوں کا ثبوت چونکہ آنحضرتؐ تک یقینی نہیں ہے۔

اس لیے وہ امر دین میں کار آمد نہیں۔

اہل علم کی ایک مختصر جماعت اس خیال کی چلی آتی ہے۔ خود امام شافعیؒ نے کتاب الامّ میں ایک منکر حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے دلائل لکھ کر ان کی تردید کی ہے۔

مصر میں بھی علماء اور ادباء کا ایک گروہ اس عقیدہ کا ہے۔ جن میں حافظ ابراہیم وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر توفیق صدقی مرحوم بھی اس خیال کے تھے۔

(۴) قرآن ہی اصل دین ہے۔ حدیثیں دین میں مطلقاً حجت نہیں۔ خواہ ان کا ثبوت ہو یا نہ ہو۔

یہ دعویٰ ہند کی جماعت اہل قرآن کا ہے۔ یہ لوگ خالق اور مخلوق کی اطاعت میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سرچشمۂ شریعت صرف خالق ہے جو اپنی منشاء کو بذریعۂ وحی نبی کے قلب پر نازل کر دیتا ہے۔ نبی اسی پر عمل کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دیتا ہے۔

اہلحدیث نبی کو بہ تفہیم الٰہی قرآن کا مفسر اور شارح قرار دیتے ہیں اس لیے حدیث جو اقوال و اعمال نبویہ کا نام ہے ان کے نزدیک واجب العمل ہے۔

جماعت سوم کی بحث تک جو نوعیت حدیث کے متعلق ہے کہ ان کا ثبوت آنحضرتؐ تک یقینی نہیں ہے ہم حصہ لے سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک علمی بحث ہے جس میں بدعقیدگی کا شائبہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ خود ائمہ حدیث کی تصریح ہے کہ اخذ حدیث میں حسن ظن جائز نہیں ہے خوب تحقیق کر لینی چاہیئے۔

لیکن جماعت چہارم کی بحث نفس رسول اللہ کی ذات کے متعلق ہے جن کی نسبت خود قرآن تصریح کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ وہ معلم۔ مزکی اور مطاع امت ہیں۔ اس لیے اس تلخ بحث میں پڑنا ہم روا نہیں سمجھتے۔ جس کو دونوں فریق کے دلائل دیکھنے کا شوق ہو وہ اس کتاب کو جو ۸۰ صفحہ کی ہے اور جس کی لکھائی چھپائی اچھی ہے چار آنہ کا ٹکٹ بھیجکر میاں مولا بخش و اللہ بخش صاحبان سوداگران صابون بازار سرکی بنداں امرتسر سے طلب کرلے۔

جغرافیہ برہما۔ مصنفہ عبدالرحمٰن ندوی مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈھ

اُردو زبان میں جو درسی کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے اُسی سلسلہ میں عبدالرحمٰن صاحب ندوی کی اس کوشش کا بھی شمار کرنا چاہیئے جنھوں نے برہما کا جغرافیہ نہایت عمدہ طرز پر اُردو زبان میں ترتیب دیا ہے۔ اُمید ہی کہ برہما کے قومی مدارس اس کی خاص طور پر قدر کریں گے۔ قیمت درج نہیں ہی۔

رپورٹ قومی تعلیمی کانفرنس۔ کاشی ودیاپیٹھ۔ بنارس

قومی تعلیم کا مسئلہ ہنوز فیصلہ کن صورت نہیں اختیار کر سکا تھا کہ بعض اکابرین قوم "سوراج" کی تعریف اور اس کی ہیئت کو واضح کرنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے بالآخر بابو بھگوان داس صاحب مشہور فلسفی وعالم کی پیہم کوشش نے مسٹر سی آر داس کو مجبور کیا کہ وہ سوراج پارٹی کی طرف سے ایک مکمل دستور اساسی شائع فرما دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اگرچہ ملک نے اُس پر ایسی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔

اسی طرح مسئلہ قومی تعلیم کے متعلق کافی اختلاف خیالات رہا اور مختلف حضرات نے جداگانہ نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھا۔ بالآخر بھگوان داس صاحب نے ایک تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ضروری سمجھا جس میں تقریباً پندرہ دن کی مسلسل نشست کے بعد تقریباً تمام اصولی و فروعی مسائل کے متعلق قابل عمل تجاویز منظور کی گئیں۔ یہ رپورٹ انہیں تجاویز سے بحث کرتی ہی جس پر مفصل تبصرہ انشاءاللہ آیندہ کیا جائے گا۔

نوید امید

(از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ)

مولانا محمد علی کی تقریب تشریف آوری نے مولانا اسلم صاحب کو اپنی عرصہ کی خاموشی کو خیرباد کہنے پر مجبور کر ہی دیا اور اس موقع پر جو نظم آپ نے تحریر فرمائی وہ بلاشبہ اُن خاص چیزوں میں ہے جو دل ہی سے نکلتی ہیں اور دل ہی میں گھر کرتی ہیں۔ ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس گرانقدر تحفہ کے لئے صاحب نظم کا شکریہ ادا کریں یا مولانا محمد علی صاحب کا، جن کی دوبارہ رہائی نے یہ دوسری نظم اسلم صاحب سے لکھوائی ہے۔ مدیر

امتحانگاہِ عمل ہے یہ جہانِ گیرودار
ذرہ ذرہ اس کے عنصر کا ہے گرمِ کارزار

ہے غرض حسنِ عمل۔ بازیچۂ طفلاں نہیں
یہ حیاتِ بے بہا ملتی نہیں ہے بار بار

سعیِ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

سوزِ دل نے پھونک ڈالے خطرہائے موت و زیست
ہو گیا پروانۂ آتش بجاں شعلہ شکار

مایۂ ارزندگی ہیں یہ تکالیفِ عمل
ہے بقدرِ سعیِ مردوں کا جہاں میں اعتبار

جو عزیزِ حق ہے اُس کو خوار کر سکتا ہے کون
عزت و ذلت کا بندوں کو نہیں ہے اختیار

گو شہیدوں کی یہ صورت ہے کہ خاک و خوں میں ہیں
اُن کی رعنائی یہ ہوتی ہیں مگر حوریں نثار

شانِ منصوری کوئی پیدا کرے تو دیکھ لے
تختِ شاہی سے بھی ہے رُتبہ فزوں پائے دار

ہے یہ شرطِ عشق محمل پر نظر ہر دم رہے
پاؤں مجنوں کے ہوں گو خارِ بیاباں سے فگار

رہروانِ راہِ حق کو کب ہے منزل کی تلاش
ہر قدم پر شاہدِ مقصود سے ہیں ہمکنار

سوز و سازِ بندگی ہی اصلِ رازِ زندگی — ہی اسی قوت کے قبضہ میں عنانِ روزگار

ساری دنیا ہی وراثت بندگانِ خاص کی — دوسرے ہرگز اُٹھا سکتے نہیں عالم کا بار

ہی سلیمانی کا منصب کارِ نظمِ ملک و دیں — اس کو کیا انجام دے سکتی ہی موِرِ نّلہ خوار

اِس جہاں کا دورِ مستقبل ہی صرف اسلام کا — آرہا ہی اپنے مرکز پر زمانہ کا مدار

چند گھڑیاں رہ گئی ہیں آزمائش کی فقط

مژدہ باد اے حامیانِ دین و اے مردانِ کار

خدا بھی ہی

تری قسمت میں ہی سرِ خدا کا راز داں ہونا

تو مشتِ خاک ہی لیکن ہے تجھ کو اک جہاں ہونا

ابھی ہی تو وہ قطرہ جو نہیں شرمندۂ ساحل

تجھے صحرائے ہستی میں ہی بحرِ بیکراں ہونا

ابھی بے بال و پر ہے مرمِرنا اتفاقی سے

اخوت کے گلستاں میں ہی تجھ کو نغمہ خواں ہونا

تجھی کو اے اسیرِ دامِ آب و گل بقا بھی ہی

تجھی کو زور والوں سے یہ کہنا ہی "خدا بھی ہی"

"صہبائے خاموش"

ھوالموجود

(از نتائجِ افکار جناب مولوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

امینِ رازِ ہستی ہی کہیں نابود ہوتا ہی — ہمیشہ دردِ دل میں کچھ نہ کچھ موجود ہوتا ہی
نظر آتا تو ہی دریائے عرفان خوب ہی دلکش — سمجھ کا دائرہ لیکن بہت محدود ہوتا ہی
بچھا کر دیکھ لے آنکھیں تو اسکی راہ میں کوئی — وہ خود اپنی خوشی سے آپ آ موجود ہوتا ہی
پڑے پرتو جو خورشیدِ تجلی کا تو روشن ہو — کہ ذرہ بھی کوئی اس دشت کا نابود ہوتا ہی!
فنا کیا ہی بقا کیا ہی ہم اُس کو کچھ نہیں سمجھے — مگر اتنا کہ جو موجود تھا موجود ہوتا ہی
خزاں کیا ہی بہارِ بوستانِ آفرینش کیا! — فقط اک انقلابِ دورِ ہست و بود ہوتا ہی!
مقدر ہی حقیقت میں اگر نابود ہو جانا — عبث یارب ظہورِ ہستیِ نابود ہوتا ہی
حصولِ مدعا ہی مدعا سے ہاتھ اُٹھا لینا — نقابِ چہرۂ مقصود خود مقصود ہوتا ہی
ہم اُس توحید کی باز آئے تصدیق تصور سے — انا لا غیر جس میں حرفِ شرک آلود ہوتا ہی
خود اپنی بندگی کیجئے خدا کی بندگی کیسی — جو معشوقِ خیالی ہی وہی معبود ہوتا ہی
ہزاروں دل میں ایسے سو سے آتے ہی بیٹھے — جو اک مقبول ہوتا ہی تو اک مردود ہوتا ہی
ہم اُس معبود کے صدقے ہم اُس مسجود کے قرباں — کہ جب کوئی نہیں ہوتا تو وہ موجود ہوتا ہی
حریفِ نغمۂ آزاد ہوتا ہی وہ محزوں دل — جو درد آلود ہوتا جو غم فرسود ہوتا ہی

گاندھی جی کی جے

وہ خوشی کی دھن وہ خاطر خواہ لے — مژدہ لایا قاصد فرخندہ پے
غم کو لازم ہو کہ اب ہم کم کریں — جام و مینا پر بڑھائیں چنگ و نے
چار دن کے سب تماشے ہیں یہاں — اب کہاں بزمِ جم و کسریٰ و کے
ہو گئے سرکار کے بھی دستخط — صلح کی شرطیں تو تھیں پہلے سے طے
ہو گئی ترک اور انگلش سے بھی صلح — بولیے آزاد گاندھی جی کی جے!

نوحہ

ازافادات مولانا محمد علی جوہر مدظلہٗ

نوحہ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسین
حق ہی شاہد کہ شہادت ہی تھی شایان حسین

آج ہے اُمت احمد کے لیے فخر کا دن
آج کے روز ہوئی فتح نمایان حسین

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسان حسین

جو افق پر نظر آتا ہے محرم کا ہلال
ہے ہمارے لیئے وہ مہر درخشان حسین

کربلا تب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ
دین ہی امی و عالم کا اب ایمان حسین

شکر حق ہی کہ ابھی حق کی حمایت کے لیے
جان دینے کو ہیں موجود غلامان حسین

اُن سے پوچھو کہ جنھیں جان ہو ایماں سے عزیز
کم تھی کس جان سے بتلاؤ تمھیں جان حسین؟

اس کو سینچا ہے شہیدوں نے لہو سے اپنے
سبز و شاداب نہ پھر کیوں ہو گلستان حسین

یاں نہ گلچیں کی رسائی نہ خزاں کا ہے گزر
غم سے واقف ہی نہیں بلبل بستان حسین

تب سے جاری ہے یہاں صبر و رضا کا لنگر
دل حاسد کی طرح تنگ نہیں خوان حسین

دولت ایثار کے بٹتی ہے یہاں صدیوں سے
ختم ہوتا ہی نہیں گنج فراوان حسین

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعان حسین

نہیں میدان عمل تنگ مسلماں کے لیے
ہے یہی گوے حسین اور یہی میدان حسین

ان کی تقلید کے دعوے کی کسے جرأت ہے
کہہ سکے کون کہ ہیں ہم بھی مریدان حسین

نام میں اُن کے اک جد سے ہے نسبت تو مگر
ق
اور دل سے بھی ہے ہر وقت ثنا خوان حسین

گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر
رہے کوثر یہ بھی وابستہ دامان حسین

شذرات

ہندوستان کا سیاسی مطلع اختلافِ آرار، باہمی مناقشات اور مختلف فسادات نے اس قدر تیرہ تاریک کر رکھا تھا کہ عام مایوسی بڑھتی جاتی تھی اور اکابرین قوم کی معذوری و خاموشی نے ملک کو اور زیادہ بےچین کر دیا تھا کہ بالآخر کانگریس کے اجلاس خاص کی تجویز منظور ہوئی اور دہلی میں ایک ہفتہ سیاسی مباحث اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہوا۔

کانگریس کا یہ جلسہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے کلکتہ کے اجلاس خاص سے کسی طرح کم نہ تھا، کلکتہ نے اگر ترک موالات کی ابتدا کی تھی تو دہلی میں اس عظیم الشان تحریک کو اس کے پُرخطر دورسے بچانے اور آیندہ کے لیئے وسائل کامیابی تلاش کرنے کا اہم و نازک مسئلہ درپیش تھا۔ عام طور سے جو تجاویز دہلی میں منظور ہوئی ہیں اُس پر اطمینان ظاہر کیا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دہلی کا اجلاس کامیاب خیال کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا خطبہ صدارت علاوہ اپنے خطیبانہ انداز اور ادبی خوبیوں کے سیاسی مباحث و معاملات ملکی کے متعلق اس قدر واضح، روشن، اور قطعی دلائل سے بحث کرتا ہے جس کے بعد اختلافی مسائل میں جو ناگواری پیدا ہوگئی تھی وہ باقی نہیں رہتی۔ نکتہ چینی کے لیے بہت گنجایش ہے اور بالخصوص وہ حضرات جو خود میدان عمل کے تلخ و ناگوار تجربوں سے دور اپنے نشیمن میں لطف و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن کے لیے تو یہ کام علاوہ دلچسپ ہونے کے بعض حالات میں ضروری بھی ہو جاتا ہے اس لیے اس قسم کے بعض مضامین جواب بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں خطبہ صدارت کی وقت نظر اور اصابت رائے کے مقابلہ پر ایک لمحہ کے لیئے بھی قابل التفات نہیں قرار دیئے جا سکتے

علم کے ساتھ جو شیفتگی انسان کو ہر زمانہ میں ہی ہی اُس کا لازمی نتیجہ وہ عظیم الشان کارنامے
ہیں جو صاحبان علم و دانش نے ہر زمانہ اور ہر ملک میں انجام دیئے اور جن کی یاد آج بھی دنیا کیلئے
سرمایہ افتخار ہی۔ مسلمانوں نے اپنی علم دوستی و علم پروری کے جو ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیے
اُن کی نظیر اس زمانہ میں اُن کی قوم میں تلاش کرنا تو عبث ہی لیکن اللہ کی مخلوق میں دوسری
قومیں ایسی ہیں جو آج بھی لیلائے علم کے لیے اپنے جنون عشق کو اُسی منزل پر پاتے ہیں جس کا لطف صرف
مجنوں کی خود فراموشی اور منصور کی سرفروشی ہی میں حاصل ہو سکتا ہی۔

مارگریٹ پولیو، سر ماریس پولیو کی لڑکی ہی جس نے اپنے رجحان فطری کے تقاضے سے علم طب
کی تحصیل اپنا مقصد حیات قرار دیا اور بالآخر ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔

اس عرصہ میں اس کو خیال پیدا ہوا کہ علم طب ہنوز سرطان کے علاج سے عاجز ہی اس لیے
ہر شیدائے طب کا پہلا فرض سرطان کا علاج دریافت کرنا ہی چنانچہ مارگریٹ نے سرطان کے
متعلق اپنی تحقیقات اور تجربے شروع کیے یہاں تک کہ خود وہ بھی اس سم قاتل سے محفوظ
نہ رہ سکی اور بالآخر سرطان میں مبتلا ہو گئی۔

اس مہلک مرض کا اُس نے نہایت مسرت سے خیر مقدم کیا اور اُس کو اپنی کامیابی کا ذریعہ
سمجھکر حالت مرض، نتیجہ علاج، اور مختلف تبدیلیوں کے اثرات کے متعلق نہایت صحیح معلومات
فراہم کرتی رہی یہاں تک کہ مرض کی شدت نے بالآخر اس شیدائے علم کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہی
کہ موت سے کچھ قبل تک وہ برابر اپنے نوٹ طیار کرتی رہی!

ایک عرصہ کی خود فراموشی کے بعد سرسید کے "صحیح جانشینوں" کی طرف سے حرکت عمل
میں آئی ہی جس نے بیساختہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی، اور ؏

باز خواں از نجد و از یاران نجد

کہتے ہوئے ہم جناب شیخ عبداللہ صاحب کی ایک "پرایوٹ و کانفیڈنشل تحریر" پر اظہار رائے

کرنے پر مجبور ہوئے جس کو وہ صرف "بعض مسلمان رہنماؤں" کی خدمت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔
لیکن مطبوعہ گشتی تحریر کے لیے پرایوٹ اور صیغہ راز کا لفظ استعمال کرنا بجائے خود مضحکہ خیز ہی اور لسان الغیب ان صاحبان دانش کی خام خیالی کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکا ہے کہ

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا!

بہرحال، یہ تحریر جو ایک جدید انجمن "مجلس اسلامیہ ہند" کے قیام کی تحریک کرتی ہی اُردو میں نہیں بلکہ اپنے "برادران ملت" کے مطالعہ کے لیے انگریزی میں شائع کیگئی ہی، اور ہمارے سنجیدہ کی روایات قدیم کے مطابق سر سید کی پالیسی اُس کے بعد اور اُس کے نتائج سے ابتدار کی گئی ہی، نواب محسن الملک کا لارڈ منٹو کی خدمت میں کامیاب وفد، ہز ہائنس سر آغا خاں کی زیر نگہ مسلم لیگ کا انعقاد گویا کامیابیوں کی غیر محدود فہرست ہی اور تاریخ قدیم کے وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جن کی یاد دلا کر "برادران ملت" کو پھر راہِ حق کی طرف دعوت دی جاتی ہی۔

کیا یہ قابل افسوس نہیں کہ اب بھی فریب نفس اس قدر آسان ہی کہ نواب محسن الملک مرحوم کے وفد کو ایک محیر العقول کارنامہ قرار دیا جائے اور اُس قرارداد کو جو لارڈ منٹو سے کی گئی مسلمانان ہند اور ہندوستانی قومیت کی فتح عظیم شمار کی جائے؟
ہندوستان گزشتہ دو چار سال میں سیاسیات کے میدان میں کافی ترقی کر چکا ہی یہاں تک کہ اب وفد کا وجود سیاسیات ہند میں قابل وقعت نہیں بلکہ ایک گونہ قابل ملامت ہو گیا ہی نیز لارڈ مارلے کے تذکرہ کی اشاعت نے منٹو۔مارلے اصلاحات کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہی اُس نے لارڈ منٹو کی اُس قرار داد اور وفد کی حقیقت کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہی لیکن وہ جماعت جس نے وفد کی خاطر شملہ کے سفر کے بعد پھر زاویہ عزلت سے قدم ہی نہ نکالا ہو بلکہ بالقصد اپنے کانوں اور آنکھوں کو واقعات عالم اور سیاسیات ملکی سے بیگانہ محض

بنا رکھا ہو۔ اگر اُس فدکو فتح مبین قرار دے تو اُس کو معذور رکھا جائے کہ واقعی اُن کی فکر رسا اور اُن کے ماموں معصون زندگی کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہی۔

شیخ عبداللہ صاحب نے اپنے اس مخفی مراسلہ میں جن امور کا ذکر کیا ہی اگرچہ اُن میں کوئی بات بھی قابل اخفا نہیں لیکن شاید اس رازداری کے حصار سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے ایک دل کی بات بھی کہدی ہی اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعی راز کی بات ہی جس کو اب تک اُنھوں نے مجمع عام میں کہنا گوارا نہ کیا تھا۔ تحریک خلافت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ "مجھے اس تحریک سے کامل ہمدردی ہی اور میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے جائز فرائض انجام دیتی رہے یعنی تمام مسلمانان یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے جان و مال اور آزادی کے خلاف مسیحی یورپ کی پالیسی کی مخالفت"، اپنے راز کو اس طرح برملا ظاہر کردینے کے جو نتائج بد شیخ صاحب کو برداشت کرنا پڑیں اُس سے قطع نظر کیجئے پھر بھی ہم کو اُن کی یہ ادا پسند نہیں آئی اس لیئے کہ اس میں تحریک خلافت کے "بعض ناسمجھ لیڈروں" کا انداز پایا جاتا ہی۔ لیکن شیخ صاحب نے اس افشائے راز کا کفارہ اپنے اگلے جملے سے فرما دیا ہی جس میں آپ نے اُن ناسمجھ مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہی جو خلافت کمیٹی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری انجمن یا جماعت کی مسلمانان ہند کے لیے ضرورت نہیں سمجھتے۔ غالباً ان "ناسمجھ لوگوں" کی یہ رائے آپ کے جذبۂ وطن پرستی کے لیے (جس کا اظہار آپ نے سب سے اول کیا ہی) ایک ناگوار ٹھیس ہی۔ ہم کو شیخ صاحب کے جذبۂ وطن پرستی سے بحث نہیں، لیکن اس پردہ میں جو تجویز جناب نے فرمائی ہی اُس کے متعلق ضرور چند الفاظ عرض کریں گے۔

مجلس خلافت ہند کے گزشتہ چند سالہ کارنامے فی الحقیقت عام آزادی کے لیے ایک شدید و سخت جنگ تھی جس میں مسلمانان ہند کو اپنے فطری و جائز حقوق کے لیے ہر ہر قدم

پر لڑنا پڑتا تھا اور ایک وقت تو ایسا آگیا کہ خود مذہبی آزادی خطرہ میں نظر آتی تھی۔

دوسرا اہم مقصد مسلمانان عالم اور بالخصوص ترک بھائیوں کی مدد تھی جو اُس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار تھے اور خلافت عظمیٰ کی حفاظت تھی جو ہر آن خطرہ میں نظر آتی تھی۔ ان اہم مقاصد میں کامیابی کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کے علاوہ بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانان ہند اپنی تمامتر سعی و ہمت کا آماجگاہ اس جماعت کو بنا لیں۔ چنانچہ گزشتہ چند سال کے واقعات شاہد ہیں کہ مسلمانان ہند کی تمام سیاسی جدوجہد کا ذریعہ صرف خلافت کمیٹیاں رہی ہیں ایسی حالت میں کہ اُن کی وقعت ملک میں مسلم ہو کسی جدید جماعت کو قائم کرنا اور اپنے ایک زبردست آرگنائزیشن کو پس پشت ڈال دینا نہ مصلحت کہی جا سکتی ہے اور نہ ضرورت۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ خلافت کمیٹی کی کامیابی اور آئندہ مسئلہ جزیرۃ العرب کے متعلق جدوجہد ابھی سے مسلمانوں کے غمخواروں کو آزار پہنچا رہی ہو اور اُن کو اپنی طمع و فاسرشت کیلئے ایک نئے پلیٹ فارم کی ضرورت ہو۔

ہمارے ایک کرمفرما نے جب اس تجویز کو سُنا تو بیساختہ مولانا رومی کا شعر پڑھا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   نعوذ باللہ

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ہم نہیں چاہتے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کریں کہ شیخ عبداللہ صاحب کی اس تحریر میں "استاد ازل" کا بھی حصہ ہے اور اُن کی "طوطی صفتی" صرف الفاظ ہی تک محدود ہے، لیکن مولانائے روم کا ارشاد نہیں جس سے تفاول نہ کیا جائے!

غضب الٰہی کے جو قصص و حکایات قدیم مذہبی کتابوں میں درج ہیں اُن کی اس زمانہ میں کافی تاویلیں کی گئیں اور ہر واقعہ کے لیے موجودہ حالات اور سائنس کے نظریات سے منطبق ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن عین اسی زمانہ میں جبکہ یہ جنون دانش اپنے شباب پر ہے

دنیا کو ایسے واقعات سے بھی واسطہ پڑتا ہے جن کے متعلق بجز قہر الٰہی کے دوسرا لفظ زبان سے نہیں نکلتا۔ جاپان کا زلزلہ اور اس کی تباہی قوموں کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عین اُس وقت جبکہ دولت و ثروت کی فراوانی، سامان تعیش و تنعم کی کثرت روز افزوں اقتدار سیاسی کی عظمت سے جاپان حالت سُکر میں تھا اُس کی غفلت و نشہ حکومت کے لیے یہ زلزلہ تازیانہ کا کام دے گیا۔

حال میں جو صحیح اعداد و شمار ان نقصانات کے حکومت جاپان کی طرف سے شائع ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے اور تقریباً پندرہ لاکھ مجروح و معذور ہیں اور اسی قدر بے خانماں ہو چکے ہیں جو با وجود انسانوں کی آبادی اور شہروں میں ہونے کے بہائم کی طرح بے در و دیوار میدانوں میں نظر آتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ صرف دو روز کے اندر ہو گیا، نہ سامان ہلاکت کے لیے کسی اہتمام و صرف کی نوبت آئی اور نہ تباہ ہونے والوں کو اپنی مدافعت و پسپائی کا موقع مل سکا!

ہمارے نامہ نگار خصوصی (برلن) نے خالدہ خانم ادیب مشہور ترکی خاتون سے ملاقات و گفتگو کی جس کی نہایت دلچسپ کیفیت پچھلی ڈاک سے ہمیں موصول ہوئی ہے۔ جس کو ہم بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں۔

خالدہ خانم مشہور ترکی خاتون جو گزشتہ جنگ یونان کے موقع پر معمولی سپاہی کی حیثیت سے خود شریک جنگ ہوئیں اور حکومت انگورہ کے پر خطر و نازک دور میں مختلف خدمات سیاسی انجام دیتی رہی ہیں اب چند ماہ آرام کرنے کے خیال سے جرمنی تشریف لائی ہیں اور جس وقت ہم کو اطلاع ملی وہ میونک میں مقیم تھیں۔ ہم جس وقت پہنچے ہیں وہ ہمبرگ جانے کی طیاری میں مشغول تھیں اور باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے اُنھوں نے ازراہ کرم ہم کو ملاقات کا وقت دیا اور تقریباً دو گھنٹہ سلسلہ کلام جاری رہا۔

ممدوحہ کے بچے امریکہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے ہمراہ تھے اور تعطیل جرمنی میں
گزارنے کا ارادہ تھا۔
اثنار گفتگو میں خالدہ خانم نے سیاسیات ہندوستان سے بہت دلچسپی کا اظہار فرمایا
مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی کے متعلق دیر تک تفصیلی حالات دریافت کر
رہیں اور قومی تحریک کی عام حالت کے متعلق بھی سوالات کیئے۔
تعلیم نسواں سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور ہندوستانی عورتوں کے متعلق نہایت پُرلطف
گفتگو رہی۔ ممدوحہ پردہ کی مخالف ہیں لیکن فرماتی تھیں کہ ہندوستان میں پردہ کے ترک پر
ابھی اصرار نہ کرنا چاہیئے اول تعلیم دلاؤ پردہ خود ہی کم ہو جائے گا۔
اس کے بعد ہم نے ترکی کے متعلق سوالات کیئے آپ نے مختصراً جواب دیئے اور آخر میں فرمانے
لگیں کہ یوں تو بڑے بڑے پروگرام پیش نظر ہیں لیکن جب کچھ ہو جائے تب کی بات ہے۔
جنگ کے باعث مردوں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے پھر یونانیوں نے پسپائی میں بستیاں
بستیاں تباہ و برباد کر ڈالی ہیں کہ آج تو وہ خاک بھی نظر نہیں آتا ایسی حالت میں ہمارے
سب سے پہلا کام معاشی اور پھر تعلیمی ہے۔
گزشتہ جنگ کے ہولناک واقعات کی نسبت فرماتی تھیں کہ آج تک اُن کا کسی کو علم
اس لیئے کہ جو قلیل التعداد جماعت اُس وقت دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی اُس کو اپنی مصروفیتوں
اتنی مہلت نہ تھی کہ بیرونی دنیا کو اپنے حالات سے مطلع کر سکے۔
خاتون موصوف نے ہندوستانی مسلمانوں کی اعانت و ہمدردی کا نہایت خلوص سرگرمی سے شکریہ ادا
اور فرماتی تھیں کہ تمام ترکی قوم اُن کی ممنون احسان ہے۔
خالدہ خانم نہایت شستہ دروان انگریزی بولتی ہیں۔ زمانہ قیام جرمنی میں اپنے ایک ناول کا ترجمہ
انگریزی میں کیا ہے جو امریکہ میں شائع ہو رہا ہے۔ بعد اشاعت اُس کے اُردو ترجمہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔ رسالہ
کا بھی ہم نے ذکر کیا اور آپ نے فوراً مضمون عنایت فرمانیکا وعدہ کیا۔ لیکن چونکہ اُسی وقت بمبئی تشریف لیئے جا رہی تھیں
کچھ نہ لکھ سکیں ۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

(شیخ علی بن عثمان ہجویری رح)

"تصوف کا اثر ہندوستان پر اس قدر شدید و وسیع ہے کہ اُردو زبان باوجود اپنی کم عمری کے قدم قدم پر تصوف کی ممنون ہے، فن شعر جو ایشیائے ادب کا جزو اعظم ہے تصوف ہی کے سہارے اوج رفعت پر پہونچا ہے حتیٰ کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی مسائل تصوف پردار و مدار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُردو میں تصوف کے متعلق کوئی مفید و مستقل تصنیف تو درکنار، فارسی کتابوں کا معقول و قابل فہم ترجمہ بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے جب سے رمز شناسی کو فلسفہ دانی پر ترجیح دی اُن کے قلم سے اس مسئلہ پر متعدد مضامین شائع ہوئے، لیکن آج جس مضمون کے شائع کرنیکا فخر ہمیں حاصل ہے وہ محض ایک آرٹیکل نہیں بلکہ مستقل تصنیف

"تاریخ تصوف" کا ایک باب ہے جو باقساط جامعہ میں شائع ہوگا۔

مدیر

عربی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کا نام کتاب اللمع ہے۔ جس سے ہم روشناس ہوچکے
فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کشف المحجوب ہے۔ کتاب اللمع آج سے چند سال قبل د
کے لیئے معدوم تھی، اور اب بھی مشرق کے لیئے اس کا عدم، اس کے وجود سے کچھ ہی بہتر ہے۔
خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں۔ داتا گنج بخش لاہوری کا نام اکثر و
زبان پر ہے، بالائی ہند کے بہ کثرت گھرانے اس ذات کے ساتھ عقیدتمندی کے مسکن ہیں۔ لاہور
مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہوچکا ہے۔ اُردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ چند سال ہوئے
سینٹ پٹرسبرگ یونیورسٹی (روس) کے پروفیسر "جوکودوسکی" کے زیر اہتمام کتاب یورپ
چھپنے والی تھی، ممکن ہے چھپ چکی ہو۔ یہ سب کچھ ہے تاہم استفادہ کرنے والوں کا حلقہ اب بھی
ہے اور تصنیف و مصنف کے تعارف کرانے کی ضرورت باقی ہے۔

(۱) مصنف

مصنف علیہ الرحمۃ کا پورا اسم گرامی ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلالی الہجویر
اللاہوری ہے۔ ہندوستان میں عرف عام داتا گنج بخش مشہور ہے وطن غزنین تھا۔ مضافا
غزنین میں، ہجویر و جلاب دو قریہ ہیں۔ دونوں میں قیام رہا، آخر عمر میں لاہور میں سکونت ا
فرمائی تھی۔ یہیں انتقال کیا۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس ساری نقل و حرکت کے اظہار
نام کے ساتھ غزنوی۔ جلابی ہجویری لاہوری کا ضمیمہ لگا ہوا ہے۔
سید حسنی نے شجرۂ نسب بعض تذکروں میں یوں دیا ہے۔ علی بن سید عثمان بن سید
بن عبدالرحمٰن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حس
علی مرتضیٰ۔ بیعت شیخ ابوالفضل بن حسن سے تھی۔ جو شیخ ابوالحسن حصری کے مرید تھے۔
طریقت سید الطائفہ جنید بغدادی تک پہونچتا ہے۔ متعدد دیگر مشائخ کبار سے بھی استفاد

کشف المحجوب میں جابجا ان مشائخ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اپنے اور اُن کے تعلقات پر روشنی ڈالتے جاتے ہیں، مثلاً امام ابو العباس اشقانی کے تذکرہ میں کہتے ہیں:۔

"مرا با وے اُنسے عظیم بود، و وی را بر من شفقت صادق، و اندر بعضے علوم اُستاد من بود"

(کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۱)

شیخ ابو القاسم گرگانی اور اپنے تعلقات کے تذکروں میں ایک دلچسپ واقعہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"روزے من اندر پیش شیخ نشستہ بودم، و احوال ها و نمودہائے خود را بر می شمردم، بہ حکم آنکہ روزگار خود بر وے سرہ (؟) کنم، کہ ناقد وقت است، و وے بہ کراہتے آں از من می شنید و مرا نخوت کودکی و آتش جوانی بر گفتار آں حریص می کرد، و خاطر بے صورت می بست کہ مگر ایں پیر را در ابتداء دریں کوے گزرے نبودہ است کہ چندیں خضوع می کند اندر حق من و نیاز می نماید۔ اندر باطن من آں بدید، و گفت اے دوست پدر (؟) ، آنکہ ایں خضوع من نہ با ترا و حال تر است کہ محول احوال بر محل محال آید (؟) بلکہ ایں خضوع من محول احوال را می کنم، و ایں عام باشد مر ہمہ طلاب را نہ خاص ترا۔ چوں ایں بشنیدم از دست بیفتادم، وے اندر من بدید، و گفت اے پسر آدمی را بدیں طریقت نسبت بیش ازاں نبود کہ چوں وے را بہ طریقت باز بندد۔ پندار یافت ما بگزارند تا چوں ازاں معزول کنندش بہ عبارت پندارش برسد۔ پس نفی و اثبات، نقد و جود وے ہر دو پندار باشد، و آدمی ہرگز از بند پندار نرہد۔ وے را باید کہ درگاہ بندگی گیرد و جملہ نسبتہا را از خود دفع کند بجز نسبت مردمی و فرمانبرداری واز بعد آں مرا باوے اسرار بسیار بود، اگر بہ اظہار آیات وے مشغول گردم از مقصود بمانم۔" (ایضاً، ص ۱۲۲)

ایک جگہ خواجہ ابو احمد مظفر سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے، وہ بھی ارباب حال کے لیے اسی قدر دلچسپ ہے:۔

"روزے من اندر گرمائے گرم بہ نزدیک وے اندر آمدم با جامہ راہ و ژولیدہ موے، مرا گفت یا ابا الحسن، ارادت خود مرا گوے تا چیست گفتم مرا سماع می باید، اندر حال کس فرستاد

تا قوالے بیاوردند جماعتے را از اہل عشرت۔ و آتش کودگی و قوت ارادت و حرکت ابتدا مرا اندر سماع کلمات مضطرب کرد۔ چوں زمانے برآمد و سلطان و غلیان آں طاقت اندر من کمتر شد مرا گفت چگونہ بود مر ترا ایں سماع گفتم ایہا الشیخ سخت خوش بودم گفت وقتے بیاید کہ ایں و بانگ کلاغ ہر دو مر ترا یکساں شود۔ قوت سماع تا آنگاہ بود کہ مشاہدہ نہ باشد۔ چوں مشاہدہ حاصل آید، ولایت سمع ناچیز شود۔ ذکر د (؟) تا ایں را عادت نہ کنی، تا طبیعت نہ شود و باز یداں بمانی،، (ایضاً ص ۱۲۳)

اسی طرح سلطان ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم قشیری وغیرہ دیگر مشاہیر صوفیہ سے اپنی ملاقات کے تذکرے لکھے ہیں:۔

حنفی المذہب تھے۔ امام ابوحنیفہ سے خاص عقیدت تھی۔ اُن کا نام "امام اماماں و مقتدائے سُنیاں، شرف فقہا، و عز علما" کی حیثیت سے لیا ہے، اور اُن کے کمالات کا بیان تفصیل سے کیا ہے (ص ۹۱-۹۲)

اس ضمن میں اپنا ایک خواب بھی تحریر فرماتے ہیں، جس کا اقتباس لطف و نفع سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں۔ کہ

"میں ملک شام میں تھا۔ ایک مرتبہ حضرت بلال رض (موذن) کے مزار کے سرہانے سو گیا۔ خواب میں دیکھتا ہوں، کہ مکہ میں حاضر ہوں، اور پیغمبر خدا صلعم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اور اس طرح کہ کوئی کسی بچہ کو گود میں لیے ہو، ایک مسن شخص کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہیں۔ میں ڈرتا ہوا حضور میں پہونچا، پائے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں سوچنے لگا، کہ یہ مرد مسن کون ہیں۔ حضور صلعم کو میرے مضطر قلب پر اطلاع ہو گئی۔ ارشاد ہوا، کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے، یعنی ابوحنیفہ۔ اس سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بہت کچھ امیدیں ہو گئیں۔ اور اس خواب سے مجھ پر یہ بھی منکشف ہو گیا کہ ابوحنیفہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے صفات ذاتی سے خالی ہو چکے ہیں، اور محض احکام شرعی کے لیے باقی ہیں، اس لیے کہ اُن کے حامل رسول خدا صلعم تھے۔ اگر میں انھیں خود چلتے ہوئے

دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ وہ باقی الصفت ہیں۔ اور باقی الصفت کے لئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے لیکن چونکہ انھیں رسول خدا صلعم کی گود میں دیکھا، اس سے معلوم ہوا کہ اُن کا وجود ذاتی فنا ہو چکا ہے اور اب جو ان کا وجود قائم ہے، وہ رسول خدا صلعم کے وجود سے قائم ہے اور چونکہ رسول خدا صلعم کے لئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں اسلئے جس کا وجود اُن میں فانی ہو چکا ہو وہ بھی امکان خطا سے پاک ہے (ایضاً ص۶۵-۶۶)

سفر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے۔ شام سے لے کر ترکستان، اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً ساری اسلامی مملکت کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربائجان، بسطام، دمشق۔ رملہ۔ بیت الجن۔ طوس۔ فتنہ اور جبل السلام کے نام اپنے سفرناموں کے ذیل میں تصریح کے ساتھ لئے ہیں۔ ایک بتہ دوران قیام عراق میں معلوم ہوتا ہے کہ دولت بہت جمع ہو گئی تھی، اور اُس کے اسراف سے قرضداری کی نوبت آ گئی تھی۔ فرماتے ہیں :-

"وقتے من اندر دیار عراق اندر طلب دنیا و فنا کردن آں تاباکے می کردم (؟) و وام بسیار برآمدہ بود، مشوبہ ہر کسے راکہ بایستے بوشے (؟) رشے بہ من آوردہ بودند، ومن در رنج حصول ہوائے شان ماندہ بودم" (ص۲۶۸)

عرصہ تک پریشانی رہی۔ بالآخر ایک رویش کی موعظت کے اثر سے فراغت نصیب ہوئی۔

قید ازدواج سے غالباً ہمیشہ آزادی رہی۔ البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک بتہ کسی کے خدنگ نظر سے بسمل ہو گئے تھے، اور ایک سال تک اس زخم کی تڑپ نے بیتاب رکھا، بالآخر فضل ایزدی نے زخم کا مرہم بھی پیدا کر دیا عبارت اس قدر مبہم ہے کہ تفصیلات کا پتہ بالکل نہیں چلتا :-

"من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از پس آنکہ مرا حق تعالےٰ یازدہ سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود، ہم تقدیر کرد تا بفتنہ اندر افتادم۔ و ظاہر و باطنم اسیر صفتے یا شد کہ با من کردند (؟) بے آنکہ رویت بودہ، و یکسال مستغرق آن بودم چنانچہ نزدیک بود، کہ دین بر من تباہ شود۔

تا حق تعالے بہ کمال لطف و تمام فضل خود، عصمت را بہ استقبال دل بیچارہ من فرستاد،
و بہ رحمت خلاصی ارزانی داشت" (ص ۲۸۵)

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ لیکن کشف المحجوب کی تصنیف خود اس امر کا
واضح ثبوت ہے، کہ اس کا مصنف علوم ظاہری میں تبحر رکھتا ہے بعض تذکروں میں اجمالاً صرف
اس قدر ہے "جامع بود میاں علوم ظاہر و باطن" اور یہ یقیناً صحیح ہے۔

بعض تذکروں میں ہے، کہ لاہور اپنے مرشد کے حکم سے آئے۔ اور حضرت سلطان المشائخ
نظام الدین اولیا کے ایک ملفوظ میں تو ورود لاہور کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ فوائد الفواد میں ہے
کہ شیخ علی ہجویری و شیخ حسین زنجانی دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت رکھتے تھے۔ شیخ
حسین زنجانی عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک روز شیخ علی ہجویری کو مرشد کا حکم ملا،
لاہور میں سکونت اختیار کرو۔ عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں" مکرر ارشاد ہوا کہ
"تم جاؤ"۔ تعمیل کی۔ شب میں لاہور پہونچے، اسی شب میں شیخ حسین نے انتقال فرمایا، اور
صبح ان کا جنازہ اٹھایا گیا[۵]۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے اپنا مسکن
بنایا تھا۔ لیکن خود کشف المحجوب کی ایک عبارت سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے، کہ لاہور کا قیام مرضی
کے خلاف کسی مجبوری سے تھا۔ فرماتے ہیں، کہ

"کتب من بہ حضرت غزنین ماندہ بود و من در دیار ہند در بلدہ لاہور کہ از مضافات ملتان است در میان ناجنسان گرفتار شدہ بودم (ص ۶۵)	میری کتابیں غزنین میں چھوٹ گئی ہیں اور میں ہندوستان میں شہر لاہور میں ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔

اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ "گرفتاری" کا لفظ فقرہ بالا میں مجازاً استعمال کیا ہے، یا واقعۃً۔

عام لقب گنج بخش مشہور ہے، اس کی بابت یہ روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری
نے آپ کے مزار پر آکر چلہ کیا، اور اکتساب فیوض و برکات کے بعد جب رخصت ہونے لگے، تو

[۵] فوائد الفواد، مرتبہ امیر حسن علاء سنجری، ص ۳۵ (مطبوعہ نولکشور)

کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا
کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

اس وقت سے گنج بخش کا لفظ عام زبانوں پر چڑھ گیا[1]۔

سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ صاحب نفحات الانس خاموش ہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیا
، دو روایتیں دی ہیں۔ ایک سنہ ۴۵۶ھ اور دوسری سنہ ۴۶۴ھ کی بابت[2]۔ آزاد بلگرامی نے
ہمنی موقع پر سنہ ۴۶۵ھ درج کیا ہے[3]۔ نکلسن کا قیاس ہے کہ سنہ ۴۶۵ھ و سنہ ۴۶۹ھ کے درمیان
ت ہوئی[4]۔ مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے، اس سے بھی سنہ ۴۶۵ھ ہی نکلتا ہے۔ راقم سطور کے
یال بھی اسی کو صحیح ماننا چاہیئے۔ مزار شہر لاہور کے باہر سمت غرب میں واقع ہے۔ ہر جمعرات
کو زایروں اور حاجتمندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ چالیس روز متصل، یا چالیس
اے جمعہ کو طواف مزار کرنے سے ہر مشکل آسان اور ہر حاجت روا ہو جاتی ہے[5]۔
اس قدر یقینی ہے کہ تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن آج ان تصانیف کا وجود تو الگ رہا،
کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیا ، اس سے زاید نہ لکھ سکے کہ

"حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است"

البتہ خود کشف المحجوب میں مصنف نے جا بجا اپنی دوسری تصانیف کے حوالے دیئے ہیں۔ ان
رتوں کے یکجا کرنے سے تصانیف ذیل کا پتہ چلتا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔
، قدر تو بہر حال قطعی تھیں :-

نام کتاب	عبارت کشف المحجوب
دیوان	یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بہ خواست (ص۱)

---

[1] خزینۃ الاصفیا، غلام سرور لاہوری، جلد دوم ص۲۳۴ [2] سفینۃ الاولیا، ص۱۶۵
[3] مآثر الکرام ص۶ (نسخہ شائع کردہ، عبداللہ خاں، حیدرآباد دکن) [4] مقدمہ ترجمہ انگریزی کشف المحجوب
[5] سفینۃ الاولیا، ص۱۶۵

۲۔ منہاج الدین — "دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف، نام آں منہاج الدین (ص۱۰)، نیز "پیش ازیں کتابے ساختہ ام مرآں را منہاج الدین نام کردہ اندر شرح مناقب [اہل صفہ] یک یک بہ تفصیل آوردہ" (ص۵۸)
نیز "اندر کتابے کہ کردہ ام بجز ایں منہاج نام" (ص۱۱۱)

۳۔ کتاب الفنا والبقا — "مارا ازیں جنس سخن است اندر کتاب فنا و بقا" (ص۱۴)

۴۔ اسرار الخرق والمؤونات — "مرا اندریں باب کتابے ست مفرد کہ نام آں اسرار الخرق والمؤونات ست (ص۳۵)

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان — "من اندریں معنی تا حال ہدایت کتابے ساختہ ام و آں را کتاب البیان لاہل العیان نام کردہ شد (ص۱۹۵)

۶۔ بحر القلوب — "اندر بحر القلوب اندر باب جمع فصولے گفتہ ام" (ص۱۹۵)

۷۔ الرعایۃ لحقوق اللہ — "طالب ایں علم را ایں مسئلہ از کتاب دیگر باید طلبید کہ کردہ ام، وآں را الرعایۃ لحقوق اللہ نام کردہ" (ص۲۱۱)

ذیل کی عبارتوں میں دو کتابوں کے حوالے اور آتے ہیں، خدا معلوم ان سے مراد کتب بالا ہی ہیں، یا یہ تصانیف ان کے علاوہ ہیں۔ نکلسن کا خیال ہے کہ یہ علیحدہ تصانیف ہیں۔ اس حساب سے دو کتابوں کا اور اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

۸ ۔ "پیش ازیں اندر شرح کلام وے [منصور حلاج] کتابے ساختہ ام" (ص۱۱۱)

۹ "من اندر بیان ایں (ایمان) کتابے کردہ جداگانہ (ص۲۱۵)

آج یہ سب کتابیں عنقا ہیں۔

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے۔ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلم اکابر نے آپ کے مزار پر چلے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کئے ہیں۔ باقی آئندہ

نامۂ جوہر

(۱)

بزرگان قوم کی بعض خصوصیات جو دلیل بزرگی اور وجہ عظمت ہیں قوم کے سامنے اُن کی حیات میں نہیں آتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اکثر اکابر ملت کی زندگی میں ان کے کارناموں کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے اور موت کے بعد لوگوں کو جستجو ہوتی ہے کہ کسی طرح اس بزرگ کی زندگی کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہو سکے فراہم ہو جائے۔ مکتوبات شائع کیے جاتے ہیں، احباب و رفقاء کی یادداشتوں سے کام لیا جاتا ہے، تصنیفات اور تالیفات کی اشاعت کی فکر ہوتی ہے، لیکن جن بزرگوں کی حیات میں علاوہ دیگر کارناموں کے متعلق اس قسم کی معلومات بھی فراہم ہو جائے تو اس کو اُن کی اور قوم دونوں کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے، اُنکی اسلیے کہ انکی زندگی کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی اور قوم کی اسلئے کہ وہ اس سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔

"ہم اس مکتوب گرامی کی اشاعت اپنے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے کی عنایت سے کر رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ سلسلہ کچھ دنوں جاری رہے گا۔" مدیر

چھندواڑہ ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء

مکرمی۔ السلام علیکم۔ عنایت نامہ مورخہ ۷ اگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہیں آپ میری تنقید سے ناراض نہ ہو جائیں[1] مگر نیت بخیر تھی اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ

[1] مکتوب الیہ کا انگریزی رسالہ سائی کالوجی آف لیڈرشپ ۱۹۱۵ء کے آخر میں انگلستان میں شائع ہوا ہے، جون ۱۹۱۶ء میں حضرت جوہر کی نظر سے، زمانۂ نظربندی چھندواڑہ میں گزرا ہے، اور اُنھوں نے اس پر ایک مبسوط اور پر زور تنقید اپنے عنایت نامہ میں لکھکر مصنف کو بھیجی ہے، جس میں زیادہ تر گرفتیں مذہبی نقطۂ نظر سے ہیں۔ مکتوب الیہ نے اس کے لیے شکریہ لکھکر بھیجا ہے، اور ضمناً بعض مسائل کی مزید توضیح کی ہے۔ یہ مکتوب گرامی اسی کے جواب میں ہے، اس کے قبل کے عنایت نامہ افسوس ہے کہ انگریزی زبان میں ہیں، مکتوب الیہ کے پاس ابتک محفوظ ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں ان کا پورا لطف باقی نہیں رہ سکتا۔

افساد اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف و توصیف سے زیادہ پسند ہوگی۔ عریضہ نہایت ہی مفصل تھا مگر پھر بھی اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کرسکتا اس زمانہ میں استبداد و استعباد نے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لئے ہیں ؛ Constructive اور Destructive (تعمیری و تخریبی) اور اس میں سے موٴخر الذکر کو تو ہر سچی تنقید کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اُس عنقا صفت تنقید کے لئے سینت کر رکھا ہے جو آج تک آنکھوں نے دیکھا نہ کبھی کانوں نے سُنا اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ میں کبھی ایک لمحہ کے لیئے بھی جاگزیں ہوا حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا اولین فرض ہوتا ہے کہ اس قصر سر بفلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور ہی میں ہوتا ہے (یا کہیں کہیں کسی شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام میں بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آجاتا ہے) زمین کو صاف کرے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات بدنما جھونپڑے اور تنگ و تاریک بے قاعدہ گلیاں وہاں سے دور کردے بہر حال تعمیر سے پہلے تخریب تھوڑی بہت کرنا ہی پڑتی ہے اگر استبداد کے عام اعتراض میں کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تخریب صرف تخریب کی غرض سے نہ ہو بلکہ تعمیر کا پیش خیمہ ہو سو میں نے جو کچھ بھی لکھا اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات میں سے جو ضروری و مفید معلوم ہوں پیش نظر رکھے جائیں۔

پیغمبر اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے ہیں اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہیں جتنا کہ کوئی پیشوا ہو گزرا ہو جس کی نظیر کتاب میں موجود ہے ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں نپولین وغیرہ کا موازنہ کیا گیا ہو وہاں ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جائے آج کل کی سیاست میں لاقوامی کی اصطلاح

---

۵ کتاب مذکور میں جہاں جہاں قایدین عظام یعنی بڑے بڑے لیڈروں کی مثالیں درج کی گئی تھیں وہاں مصنف نے اپنی جہالت سے حضور سرور عالم صلعم کا اسم پاک بھی درج کیا تھا، اور اگرچہ حضورؐ کی ذات گرامی کو سب سے افضل قرار دیا گیا تھا، تاہم اسی طبقہ میں نپولین، سکندر، دیگر دنیوی سرداروں کا بھی ذکر تھا۔

میں آپ کا "غیر طرفدار" رہنما بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے میں جسے ہر ملت و مذہب الا پڑھے قرین مصلحت تھا میں نے اس خیال (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے اگر اعتراض ہے تو محض طرز عمل (Executiv) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے واضح ہو گیا کہ آپ ہی چاہتے تھے جو میں سمجھا تھا کہ آپ چاہتے ہونگے اس لئے میری تنقید کی نوعیت بھی واضح تر ہو گئی اور وہ اسی طرح باقی ہے یعنی ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے الفاظ اور جملوں کا اور نیز ان موقعوں کا جن پر تذکرہ آنحضرت صلعم کیا گیا ہے ایک حد تک ضرور یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بار بار غور کرے کہ کہیں آپ آنحضرت صلعم کو عار گو لیتے (یہ میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق (Research) کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے رہنما مقرر کئے گئے تھے اس کے علاوہ پیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ کام آپ کا نہ مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لئے میری یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دے کر پڑھیں کہ مصنف کوئی غیر مذہب الا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو تو ضلالۃ کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا چاہتا ہے تاکہ وہ عظمت جو ایک وحی پانے والے رسولؐ کی ان کے دل میں ہو وہ دور ہو جائے اور اس طرح دور ہو کہ خود پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلی خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اس لئے بطور ایک "بئس البدل" کے خلعت نبوت اُتار کر لیڈری کی گون (Gown) پہنا دی ہے یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے مگر جس طرح سے حساب میں بچے اپنے سوالوں کے جوابات کی جانچ کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دے کر دیکھتے ہیں اور تفریق کا ہے تو جمع کر کے اسی طرح ایک پڑھنے والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سلسلۂ تاثر کو اولٹ دیا جائے اور جو تنقید کہ ایک نقاد پیش کرتا ہو اس کو صحیح تسلیم کر کے اور جو اثر کہ تحت کار پڑھنے والوں کے دل پر بقول اُس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اُسے قبول کر کے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر منقش ہو گئے تھے باقی رہتے ہیں یا مٹے جاتے ہیں یہ بھی یاد رہے کہ گھڑی ساز جو گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے

سنبھالنا چاہتا تو خوردبین شیشہ لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے یا اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آ جائے اور اصلاح کی جا سکے، اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اسی غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اُسے لطیف اور باریک بین بننا پڑتا ہے چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ افساد اس لیئے یہ بال کی کھال نکالنا اُس کے لیئے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کے لیئے اصرار کرنا چاہیئے اسی وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام لیں جوہری جب نگین تراشنے میں مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آ سکے بلکہ ایسے باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً ناممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرّے ہوتے ہیں جو تراشتے تراشتے ہی ہوا سے اُڑتی ہے مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اُس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیئے فلسفۂ اجتماع[1] کب تیار ہوئی ؟ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنی طرف سے شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی، اُسے چاہیئے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپیہ صرف کرے تو کم از کم ۲۵۰ روپیہ اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے۔ اخبار والے اُس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے میں نے خود ہمدرد میں یہی کیا تھا مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے آپ بیسویں صدی کی اس ضرورت اور Psychology of the Advertise پر عبدالحق صاحب کو ضرور کچھ لکھیئے۔

نفسیات القرآن[2] پر آپ نے جو لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اُس کے متعلق کیا پوچھ سکتا ہوں کہ

---

[1] مکتوب الیہ کی اردو کتاب کا نام ہے، جو اسی قسم کی مزخرفات سے لبریز تھی، اور جس کی اشاعت اب اس نے دو تین سال سے روک دی ہے۔

[2] مکتوب الیہ کا ارادہ اُس وقت انگریزی میں ایک دوسری کتاب Psychology of the Quran کرنے کا تھا، بلکہ اس کا ابتدائی حصہ تحریر بھی ہو چکا تھا۔

کلام کا "نقشہ" اور "تخمینہ" (بہ اصلاح تعمیرات) کیا ہی میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہونگے
زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے اگر میں
عرض کروں کہ بقول حالی؎ "یاں جنبشِ لب، خارج از آہنگ، خطا ہی" جو کچھ بھی لکھا جائے
وہ یہ سمجھ کر کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہی مگر اس کی تمام Psychology خلاقِ زمین و
آسماں کی ہی غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist
بھی اس طرح انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ واقف ہو سکتا ہی نہ اُن کے اظہار کے لیئے الفاظ
اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہی جس طرح خود اُس ذات پاک نے قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا
عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَۃِ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہی اگر آپ کا یہ خیال ہی تو میدان نہایت وسیع ہی
مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھانا پڑتا ہی، میں ہرگز اُن لوگوں کے طرفداروں میں نہیں ہوں
جو کلام ربانی سے اس قدر خائف ہو جائیں کہ نہ اُسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے
متعلق کچھ سوچیں نہ پوچھیں گچھیں، کلام پاک ریشم کے جزدانوں میں اور الماری کے بالاترین حصوں
میں اور وہاں کی گرد و غبار کے لیئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا
ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان۔ کاغذ کی پٹیاں بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے
اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے
کسی کتاب کو نہیں پڑھتے نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مجھے اُن لوگوں
سے ہمدردی ضرور ہی جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں گو برس دو برس میں
ایک ہی دفعہ کیوں نہو، یہ اُمُّ الکتاب ہی اور اس کا ادب باقی رکھنا اس لیے لازم ہی کہ اگر اتنی احتیاط
نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہی، اور تمام صحف ماقبل اس خطرہ کے بیجا نہ ہونے کا کافی سے زیادہ
اور سخت دلخراش ثبوت ہیں اس لیئے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلا متن میرے پاس ریویو
کے لیئے بھیجا تو میں نے انھیں اطلاع دے دی کہ مجھے ایندھن کی آج کل ضرورت نہیں ہی کیا مسلمانوں
کے لیے یہ بات مایۂ ناز نہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانوں نے اس اُمُّ الکتاب

کو اِس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا ایک زیر زبر کا بھی فرق نہیں ہونے پایا اور تمام
فرقے اِس پر اتفاق کُلّی کرتے ہیں قرآن پاک تو قرآن پاک دوسرے صحائف ہمارے کتب حدیث
کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے قصہ مختصر مجھے اُمید ہے کہ جو کچھ بھی آپ
لکھیں گے وہ ادب قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھیں گے مگر لکھیئے ضرور اس سے ہرگز نہ خائف ہوئیے
یہ تو ایسی سیدھی سادی کتاب (غیر ذی عوج) ہے کہ عرب کے گنوار مدینہ مُنوّرہ جاتے اور
نبی اکرمؐ سے اسے سُنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے مسلمان بن کر اپنے بالوں والے خیموں
اور اپنے ریگستان اور گلّوں میں واپس آجاتے مفسرین کا جہاں شکریہ ادا کرنا ہے وہاں
شکایت بھی باقی ہے کہ باوجود سچی محبت اور احترام کے اُنھوں نے بھی ایک حساب سے ادب قرآن
پاک قائم نہ رکھا جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا کمال تمام اس صحیفۂ اکرم پر صرف
کردیں مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہیں حاشیہ متن کو اپنے بوجھ اور پھیلاؤ سے چھپا اور
دبا نہ لے یہی حال شیکسپیر کے جرمن شارحین کا ہے ان کا ساری دُنیا پر احسان ضرور ہے
کہ شیکسپیر کو خود اس کے ہموطنوں کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکسپیر کو
محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنا لیا ہے خدا مسلمانوں کو قرآن پاک متعلق اس شر سے
بچائے[۱] آمین۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ
میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا رام پور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔
جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے
ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے، خود میرے خاندان
میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے
حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب

---

[۱] ان اشارات و مواعظ عالیہ کی قدر مکتوب الیہ کو ان کے وقت تحریر سے ۶-۷ سال بعد جا کر ہوئی۔

اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل تھے گھر پر بار ہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاران کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں۔ جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی ہو) کہ آیا دہلی سے ایک مشکی خنجر آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا، داغ کی غزل دیکھئے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا ؛ خانۂ عشق بے چراغ ہوا!

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا، اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دئے تھے، جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دئے سن کر پھڑک اٹھے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا، کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کر دوں۔ کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اسکی لونڈیر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۸۱ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میرے Offcial Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرۃ نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی ڈالر

بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے۔ یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے، ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روئی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے۔

آپ نفسیات کے ماہر ہیں، کیا ممکن نہیں کہ میرا لوجنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض لطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن اُستاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سُنئے کہ گیارہ برس کی عمر میں میں علیگڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے۔ اُس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اُس کا مجھے ترجمہ سُنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔" مولانا کو یقین نہ آیا۔ اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اُس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اُسی وقت دیا۔ اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اُسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی۔ اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہمارے لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی۔ تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں

البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعروسخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسین صاحب، آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودہویں کو ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی، کرکٹ کالان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودہویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا

لطفِ مشاعرہ تو گیا چودہویں کے ساتھ — فرشِ زمرّدیں نہیں وہ چاندنی نہیں

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اُتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستورِ عام زُہد و تورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش کا تقاضا اس کا مُحرّک تھا۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کیڑے بھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنگ آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اُس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے۔

کہ پوری غزلیں لکھ بھیجوں۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touch stone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں A poor thing but mine own اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بقول آپ کے میری "اُمت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں"

دولت موریہ

دولت موریہ کا آغاز کیونکر ہوا

۱۔ سکندر رومی کے حملہ سے جو بے ربطی و تو زیت کے عناصر پیدا ہو گئے تھے وہ ایک بردست شہنشاہی کے بال و پر بن گئے جس نے دو سو برس تک ہندوستان پر نہایت سطوت و جبروت سے حکومت کی۔ دولت نندہ کا غیر مستقل اور زوال آمادہ نظام اس طوائف الملوکی کی تاب نہ لا سکا جو رومی حملے سے پیدا ہوئی تھی اور بد نظمی کے پھیلتے ہی خاندان نندہ خیال باطل کی طرح منتشر رہ گیا لیکن قدرت نے اس عام بد نظمی اور بے ربطی میں ایک ایسا بے وطن مشکل پسند شخص پیدا کیا جس نے منتشر قوم کی شیرازہ بندی کی اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سکندر کی فوج میں رہ کر مرتب و مستعد لشکر کے فائدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اُس نے محمد علی پاشا کی طرح محسوس کیا تھا کہ بڑی سلطنتیں جن کا نظام بے ربط ہو آسانی سے دشمن کا شکار بن جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کا وزیر چانکیا۔ دور اندیش اور ہوشیار مدبر تھا جسکی مدد سے اس اولوالعزم نوجوان نے ایک لشکر ترتیب دے کر شاہان نندہ کے دار الامات پٹالی پتر پر قبضہ کر لیا۔ سلطنت موریہ کے قیام سے (یعنی ۳۲۳ سنہ ق۔م سے) ہندوستان کی سیاسی تاریخ حقیقی معنوں میں شروع ہوتی ہے۔

چندر گپت

۲۔ چندر گپت معمولی بادشاہ نہ تھا سکندر کے حملے کے نتائج اُس کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے بادشاہ ہوتے ہی اُس نے ایک بردست لشکر تیار کر کے شمالی ہند پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی کامیابی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ۳۰۵ سنہ ق م میں جب سلوکس نیکاٹار

سلوکس کا حملہ اور اسکی شکست

(فاتح) نے جو سکندر کے ممتاز افسروں میں تھا اور جس نے سکندر کے ایشیائی مقبوضات کو بآسانی فتح کر لیا تھا اپنے نامور آقا کے نقش قدم پر چلنے کے ارادہ سے دریائے سندھ پار کیا تو ایک جرار ہندی لشکر اُس کے مقابلہ کے لیے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر موجود تھا جس نے اچھی طرح اُسے اس گستاخی کی سزا دی اور بالآخر

سلوکس کو اریانہ (دریائے سندھ کا مغربی علاقہ) ہاتھ اُٹھالینا پڑا اور پانچسو ہاتھیوں کے حقیر معاوضے میں کابل قندہار اور ہرات کے صوبے ہندی تاجدار کے نذر کرنا پڑے مزید براں سلوکس کو مجبوراً اپنی لڑکی کا عقد چندرگپت کے ساتھ کرنا پڑا۔ چندرگپت کے بلند دماغ ہونے کی یہ دلیل کیا کم ہے کہ بائیس برس کی قلیل مدت میں جو سکندر رومی اور سلوکس کے حملوں کا فصل ہے اُس نے شمالی ہند کا نظام سیاسی ٹھیک کر لیا اور ایسی فوج تیار کر لی جس سے سلوکس کی یونانی فوج پیش نہ پا سکی۔

ہندی شہنشاہی کے حدود اربعہ

۳۔ یہ امر قابل غور ہے کہ پہلی ہندی سلطنت کے حدود قندہار اور ہرات تک پھیلے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان ہند کی خواہش جہاں ستانی ہندوستان کے عقلی و فطری حدود پر ختم ہوتی تھی جیسا کہ شاہان مغل اور موریہ کے عہدوں میں کابل اور قندہار کے سرحدی صوبے ہونے سے ثابت ہوتا ہے۔

چندرگپت کا تدبر اور سیاست

۴۔ خوش قسمتی سے چندرگپت کے عہد کی دو تصنیفیں موجود ہیں جن سے اُس کے تدبر و سیاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک اُس کے ہوشیار برہمن وزیر اور گرو کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

ارتھاشاستر

یہ کتاب ارتھاشاستر کے نام سے موسوم ہے اس میں علم سیاست پر بحث کی گئی ہے اور اس عہد کے مروجہ حالات درج ہیں دوسری تصنیف یونانی سفیر میگاس تھینز کی ہے یہ سفیر عرصہ دراز تک پاٹلی پتر میں مقیم رہا اس لیے جو کچھ اس نے لکھا ہے ذاتی مشاہدہ سے لکھا ہے ان دونوں کتابوں میں متفق الخیالی پائی جاتی ہے کہ اُن سے چندرگپت کے عہد کے سیاسی حالات صاف صاف معلوم ہو جاتے ہیں اور تخیل پر زور دینا نہیں پڑتا۔ ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ چندرگپت ایک مستقل اور مرتب لشکر طیار رکھتا تھا فوج کو شاہی خزانہ سے ماہوار تنخواہیں تقسیم ہوتی تھیں فوج کے لیے ہتیار بھی شاہی خزانے سے مہیا کیے جاتے تھے چندرگپت کے لشکر میں چھ لاکھ پیدل تیس ہزار سوار اور نو ہزار جنگی ہاتھی تھے۔

موریہ نظارت حربیہ میں تیس رُکن ہوتے تھے یہ تیسوں ارکان چھ چھ کی جماعتوں میں پیدل، سوار۔ رتھ (جنگی)، ہاتھی بری اور بحری فوج کے پانچوں صیغوں کے ساز و سامان کی بہم رسانی کا انتظام کرتے تھے۔

سلطنت کا بطنی نظام

۵۔ سلطنت کا بطنی نظام اس نہج پر تھا کہ شخصی حکومت تھی بادشاہ اوتار سمجھا جاتا تھا مختلف صوبوں پر بادشاہ کے نائب حاکم ہوتے تھے صوبیداروں کی نگرانی جاسوسوں کے سپرد تھی اور جاسوسوں کا محکمہ اعلیٰ درجہ کا تھا شاہی خزانے سے نئی سڑکیں نکلوائی جاتی تھیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت ہوتی تھی شاہی محاصل کا بڑا جزو غالباً اُس عہد میں بھی لگان ہی ہوگا تجارت کے مال کو محصول سے بچانے اور تاجروں کے دوسری قانونی خلاف ورزیوں کے لئے محکمہ علیحدہ تھا آبپاشی پر جیسا کہ ایک ہمدرد حکومت کا فرض ہے۔ چندرگپت کے عہد میں خاص توجہ کی گئی تھی آبپاشی کا محکمہ بالکل الگ تھا اور بادشاہ کو اُس سے خاص دلچسپی تھی کیونکہ کاٹھیاواڑ کے دور اُفتادہ علاقہ میں چندرگپت نے نہایت اہتمام سے رقم کثیر خرچ کرکے نہریں اور تالاب بنوائے تھے۔ یونانی سفیر میگاسس تھینیز تعجب کے ساتھ رقم طراز ہے۔ کہ شاہی افسر مصریوں کی طرح نشیب فراز کی پیمائش کرکے پانی کے بہاؤ کا اندازہ لگاتے ہیں تاکہ پانی متعدد نہروں میں بہے اور ہر شخص حصہ رسدی سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

چندرگپت کے دارالامارت کا بلدی نظام

۶۔ چندرگپت کے دارالامارت کا بلدی نظام حیرت انگیز تھا نظارت حربیہ کی طرح دارالامارت کا بلدی نظام ایک مجلس کے سپرد تھا اس مجلس میں تیس رکن ہوتے تھے یہ ارکان چھ چھ آدمیوں کی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہوتے تھے اور ہر جماعت کے سپرد ایک خاص صیغہ بلدی نظام کا ہوتا تھا۔ شہر کی غیر معمولی وسعت اور آبادی نے از خود بلدی نظام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ مجلس بلدی غیر ممالک والوں کی فہرست طیار رکھتی تھی اور اوزان و پیمانوں وغیرہ کی دیکھ بھال رکھتی تھی۔ اگر یہ صحیح ہو تو پٹالی پتر کسی طرح شاہان فارس کے قدیم دارالسلطنت اصطخر (پرسی پولس) سے کسی طرح آن بان میں کم نہوگا۔

چندر گپت کا حکومت سے دستکش ہونا

۷۔ جن روایات کے مطابق ۲۹۸ء ق۔م میں چندر گپت سلطنت سے دستکش ہو کر خانقاہ نشین ہو گیا اور اُس کا بیٹا بندوسار تاج و تخت کا مالک قرار پایا۔ بندوسار نے یونانیوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے اُس کے دربار میں میگاس تھنیز کے بجائے ۔ڈیمی ماکیو یونان کا سفیر تھا یونانی سفیر کے علاوہ شاہ مصر کا سفیر بھی اس فرماں روا کے دربار میں رہتا تھا کیونکہ چندر گپت کے بادشاہ ہوتے ہی ہندوستان دنیا کے بین الاقوامی سلسلے میں داخل ہو گیا تھا (پرانی دنیا کا یہ بین الاقوامی سلسلہ مصر سے آسام تک پھیلا ہوا تھا)

بندوسار

۸۔ بندوسار کے عہد میں چندر گپت کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور دکن کا علاقہ مگدھ کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا اس بادشاہ کی سیاست داخلی کی شہادتیں موجود نہیں اور بجز اس کے ہم اُس کی تعریف میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے اپنے باپ کا نظام حکومت کامیابی کے ساتھ قائم رکھا بندوسار کی عظمت کے لئے اتنا بس ہے کہ وہ ایک جلیل القدر تاجدار کا نورِ نظر تھا اور ایک عظیم القدر بادشاہ کے باپ ہونے کا فخر اُسے حاصل تھا۔ بندوسار نے ۲۷۳ء ق۔م میں وفات پائی اُس کے بعد اُس کا بیٹا پیادسی تخت سلطنت پر متمکن ہوا جسے تاریخ اشوکھ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اشوک

۹۔ عنفوانِ شباب میں شاہ اشوکھ کو ولیعہدانِ سلطنت کی طرح ملکی و انتظامی مسائل طے کرنا پڑتے تھے کیونکہ باپ ہی کے زمانے میں وہ ٹیک سیلا اور اُجین کی صوبے داریوں کا عامل مقرر ہو چکا تھا یہ دونوں صوبے سلطنت مگدھ کے عظیم ترین صوبہ شمار کیے جاتے تھے شہنشاہ اشوکھ باپ کے تخت پر بغیر کسی مخالفت کے جلوہ افروز ہوا اور چالیس برس تک سلطنت مگدھ کا انتظام کروفر کے ساتھ کرتا رہا اس کے عہد کا پہلا قابل ذکر واقعہ ریاست کالنگا پر فوج کشی کرنی ہے یہ لڑائی غالباً خاندانی روایات کی تقلید میں حدودِ سلطنت کی توسیع کی غرض سے چھیڑی گئی تھی لیکن جنگ و جدال کے خونریز ہنگاموں کا اشوکھ کے نرم دل پر یہ اثر پڑا کہ اُس نے عہد کر لیا کہ آیندہ پھر وہ کبھی لشکر کشی نہیں کرے گا۔ شاید اسی نرم دلی نے اُسے بدھ مذہب

اصول کا پیرو بنا دیا اور انھیں خیالات کی وجہ سے ہم اُس کے ایک جلی کتبہ میں یہ فرمان دیکھتے
ہیں (فرمان نمبر ۱۳) "انسان کی سب سے بڑی کامیابی وہ ہے جو زہد و تقوے سے حاصل ہو"

شوک کے بدھ مذہب اختیار
کرنے سے سلطنت پر اثر پڑا

۱۰- بادشاہ کے خیالات کی تبدیلی امورِ سلطنت میں بھی ظاہر ہونے
لگی آج تک اُس کے کتبہ لافان پہاڑوں اور چٹانوں پر کھدے ہوئے
ملتے ہیں ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوکھ کی زندگی تمامتر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی
میں صرف ہوئی شاہ اشوکھ کے کتبوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہے ان میں چودہ جلی کتبے ہیں
جن میں اشوکھ کے اصولی سیاست کا ذکر ہے۔ آخر۔ آخر میں اُسنے سات عمودی کتبے
کھدوائے تھے جن میں کم و بیش لگلے کتبوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ ان تمام کتبوں میں
ساتواں کتبہ بہت مشہور ہے ان میں وہ سب تدبیریں ایک ایک کرکے گنائی گئی ہیں جو شہنشاہ
اشوکھ نے دھرم پھیلانے کے لیئے اختیار کیں۔ شہنشاہ اشوک کے کتبوں کی حیثیت فرامین سلطنت
کی ہے جو مواعظ حسنہ سے لبریز ہیں۔

شوک اور دوسرے
بادشاہوں میں فرق

۱۱- اشوک کے عہد حکومت میں اور دوسرے بادشاہوں کے عہدوں میں بین فرق
یہ ہے کہ اشوک کی فتوحات کالنگا کی مستثنیٰ مثال چھوڑ کر خالصاً صلح کل اور پُرامن
تھیں جن میں جنگ و جدال کا عنصر داخل نہ تھا بحیثیت بادشاہ کے اشوک اپنی مثال آپ ہے۔
اس کا معیار زندگی بہت بلند تھا کیونکہ ایک کتبہ میں وہ کہتا ہے "مجھے کاروبار سلطنت کی انجام دہی
اور عام بہبودی کی جد و جہد سے کبھی اطمینان نہیں ہوتا" وہ کہتا ہے کہ امیر و غریب سب کو
ذاتی جد و جہد کرنا چاہیئے۔ فرامین کی زندہ مثال بادشاہ کی ذات ہمایوں صفات ہے۔ اِس
تاجدار کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی۔ کیونکہ کتبوں میں اکثر یہ فقرہ نظر آتا ہے کہ رعایا بمنزلہ
میری اولاد کے ہے۔ اس کی ہمہ گیر محبت میدانوں کے متمدن باشندوں تک ختم نہ ہو جاتی
تھی۔ بلکہ پہاڑوں کے وحشی قبایل کے لیئے اس نے اپنے افسروں کو خاص ہدایات دے رکھی
تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ شاہی فرمان تینوں موسموں کی ابتدا میں۔ بآواز بلند عام شاہراہوں پر

پڑھ کر سنائے جائیں۔ تاکہ جہلا بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔

اشوک کی انتظامی قابلیت

۱۲۔ رفاہ عام کے لیئے شاہ اشوک نے متعدد شفاخانے تعمیر کروائے تھے۔ سڑکیں بنوائی تھیں۔ انتظامی امور میں وہ اپنے نامور جد کا ہم آہنگ تھا۔ اس کے عہد میں امن وامان ایکطرح سے قائم رہا۔ شاہ اشوک روشنضمیر بادشاہ تھا اور تمام عمال سلطنت پر اس کی نظر رہتی تھی۔ کیونکہ انہی پر احکام شاہی کے نفاذ کا مدار تھا۔

اشوک نے متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے

۱۳۔ عہد اشوک کا خاص واقعہ یہ ہے کہ اس زریں عہد میں متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے گئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاہان موریہ کے تعلقات۔ خاندان سلوکس (شاہان شام) اور خاندان بطلیموس (مقوقان مصر) سے تھے۔ شہنشاہ اشوک نے جبلی کتبوں میں یہ ارادہ ظاہر کرنے کے بعد کہ وہ قانونی مسایل کی طرف زیادہ اعتبار نہیں کرے گا ان ممالک میں جن سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے متعدد وفود روانہ کیئے تاکہ ان ممالک میں بدھ مذہب اصول کی اشاعت وترویج ہو۔ اس سے قبل محکوم ریاستوں اور سرحدی قبایل میں وفود بھیجے جا چکے تھے۔ لیکن اس سے اس کی پیاس کب بجھنے والی تھی۔ اب ایک وسیع تر میدان کی تلاش ہوئی۔ اور اس نے شریف جوشیلے بدھ مبلغین مصر۔ شام۔ (طرابلس) مقدونیہ اور ایا پیرس روانہ کیئے۔ ان وفود کی کامیابی کے بارے میں مشکل سے کچھ کہا جا سکتا ہے۔ گو سرندیپ کے وفد کو کامیابی ضرور ہوئی۔ اشوک نے اپنے حقیقی بھائی مہندر کو جس نے مذہبی فقیری اختیار کی تھی ایک عظیم الشان وفد کے ساتھ سرندیپ بھیجا تھا۔ اس وفد کی کوششوں سے سرندیپ کا راجہ ٹیسا مع تمام درباریوں کے بدھ مذہب میں داخل ہو گیا۔ راجہ اور اعیان سلطنت کی تبدیلی مذہب نے پورے جزیرہ کو بدھ مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ سرندیپ کے وفد کی کامیابی کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشوک آریہ راجہ رام چندر سے زیادہ کامیاب رہا۔ کیونکہ رام چندر جی کی کامیابی محض جنگی کامیابی تھی۔

اشوک کے حدود سلطنت

۱۴۔ اشوک کے حدود سلطنت جنوبی ہند کے انتہائی سرے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم ان کا یقین صحت کے ساتھ کرسکتے ہیں۔ مغرب میں ہرات اور قندھار۔ مشرق میں آسام۔ سلطنت اشوک کے سرحدی صوبے تھے۔ کشمیر اور نیپال میں شہنشاہ اشوک کے صوبیدار متعین تھے۔ جنوب میں اس کی سرحد موجودہ ریاست میسور کی جنوبی سرحد پر جاکر ختم ہوتی تھی۔

اشوک کے عہد میں بدھ مذہب والوں کا جلسہ

۱۵۔ شہنشاہ اشوک نے اپنے آخری عہد میں بدھ مذہب والوں کا ایک بڑا جلسہ پٹالی پتر میں کیا تھا۔ تاکہ بدھ مذہب والوں کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ ۲۳۲ ق۔م۔ میں اس جلیل القدر شہنشاہ نے وفات پائی۔ سیاست و تدبر میں شاہ اشوک جولیس سیزر اور شہنشاہ اکبر کے ہمدوش نظر آتا ہے۔ مذہبی وتبلیغی الوالعزمی میں وہ کنفوشس۔ پالوس اور جرجیس اعظم سے رتبہ میں کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا۔ میدان جنگ سے پرہیز کرنے اور کسی قسم کا ہتیار استعمال کرنے کی قسم کھائیں اس کی نظیر شاہان عالم میں نہیں مل سکتی۔ وہ ان معدودے چند بادشاہوں میں ہے جو عمر بھر انتہائی بے نفسی کے ساتھ قوم وملک کی خدمت میں مستغرق رہے۔ بلاشبہ قدیم تاریخ ہند میں اشوک کا بزرگ ترین وشریف ترین نام ہے۔ اور دنیا کی عظیم الشان ہستیوں میں یہ ہندی تاجدار صف اول میں رہنے کے قابل ہے۔

اشوک کے بعد سلطنت موریہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی

۱۶۔ شہنشاہ اشوک کے بعد اس کے دو پوتوں نے سلطنت کو مشرقی و مغربی حصوں میں تقسیم کرلیا۔ ان میں سے ایک کا نام دسرتھ تھا اور دوسرے کا سمپرتی۔ اسی طرح پچاس برس تک سلطنت موریا زندگی کے دن پورے کرتی رہی یہانتک آخری موریا تاجدار کو جسکا نام برہدرتھا اسکے رئیس العسکر پشیامترا نے قتل کر ڈالا پشیامترا ہی دوسرے خاندان کی ابتدا ہوئی جو تاریخ میں خاندان سوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ پشیامترا کے عہد میں یونانی بادشاہ مینندر نے حملہ کیا جسے بدھ روایات میں ملیکا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واسومتر نے جو پشیامترا کا پوتا تھا یونانیوں کو سخت شکست دی۔ اس شکست نے یونانیوں کی

حوصلہ مندیوں کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کردیا۔ خاندان سوریا تھوڑے ہی دنوں بعد خاندان
کے بطنی نزاعات سے تباہ ہوگیا۔ شاہان کانوا اس خاندان کے جانشین ہوئے
راجگان کانوا ۲۷ ؁ ق۔م۔ تک حکمراں رہے۔ پھر اندھرا خاندان نے اس خاندان کا
ورق اُلٹ دیا۔

دولت موریہ کی سیاسی اہمیت

۱۷۔ اگرچہ چندرگپت اور اشوک کی سیاسی تعمیر ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں خاک میں مل گئی۔ لیکن شہنشاہی کا خیال سلطنت کے ساتھ مٹنے والا نہ تھا۔ دولت موریہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے سایہ میں پہلی مرتبہ ہندوستان نے متحد ہوکر سیاسی زندگی کا ثبوت دیا۔ آنے والی صدیوں میں شہنشاہی کے دوربلندی تاریخ میں باربار آتے رہے۔ تقریباً ہر صدی میں کسی نہ کسی خاندان نے کوشش ضرور کی کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کمورن تک ایک ہی پرچم کے زیر سایہ کرلے۔ گو شہنشاہی کا تخیل اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے قبل از وقت ضرور تھا۔ لیکن ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ خیال سلطنت موریہ کے اولوالعزم فرمانرواؤں نے بلندی تہذیب میں پیدا کیا تھا۔ اس حیثیت سے چندرگپت۔ بندوسار، اشوک نہ صرف سمدرگپت اور ہارشاوردھن ہی کے اسلاف ہیں بلکہ بابر۔ اکبر اور اورنگ زیب کے بھی ہیں۔

دوسرا باب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر ہندوستان کی اجتماعی و معاشرتی حالت کیا تھی

عہد موریہ اور قرون مابعد کی سب سے بڑی خصوصیت

۱۔ عہد موریا اور قرون مابعد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا ہوا اگرچہ سکندر اعظم کی آمد تک برہمنوں کے رسوخ میں فرق نہ آیا تھا۔ لیکن شہنشاہ اشوک کے مذہبی و تبلیغی جوش نے ایک غیر معروف فرقہ کو عالمگیر مذہب میں تبدیل کر دیا تھا۔ گو بدھ مذہب ہندو مذہب کی اصلاح شدہ اور ترقی یافتہ صورت تھی۔ بااینہمہ اس کی ترویج سے جو اجتماعی انقلاب ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گیا وہ معمولی نہ تھا۔ ہندو مذہب میں قربانیاں بکثرت تھیں جن کی ادائیگی بغیر برہمنوں کے ناممکن تھی۔ کیونکہ یہی گروہ مذہبی باریکیوں کا جاننے والا سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہندو مذہب کی خصوصیات گوتم بدھ سے کہیں پہلے پیدا ہو چکی تھیں دراصل ہندو مذہب کا بدترین پہلو یہ تھا کہ اس میں ادنیٰ طبقہ کی مادی و روحانی فلاح کا مطلق خیال نہ رکھا گیا تھا۔ یہی حالت اب تک چلی آتی ہے۔ بدھ مذہب کے رواج نے ادنیٰ طبقوں میں تمدن کی روح پھونک دی جس کی وجہ سے بدھ مذہب ایک جمہوری اور ہر دلعزیز تحریک بن گیا۔ جس میں ادنیٰ و اعلیٰ بلا تفریق ذات دوش بدوش تھے۔ اگلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیا داسی وحشی قبائل میں گوتم بدھ کا پیغام پھیلانے کا اسی قدر مشتاق تھا جس قدر میدانوں کے متمدن باشندوں میں۔ بدھ مذہب کے عروج کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب کی تبلیغ عام رائج الوقت زبان میں کی گئی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے پالی اور پراکرت مہذب زبانیں سمجھی جانے لگیں۔

بدھ خانقاہیں تعلیمگاہیں بن گئیں

۲۔ بدھ مذہب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس مذہب میں و گروہ

شامل تھے۔ ایک عام لوگوں کا دوسرا خانقاہ نشین راہبوں کا۔ راہبوں میں مرد اور عورتوں کی تفریق نہ تھی۔ شاہانِ موریہ کے عہد میں نیک دل بادشاہوں اور امیروں نے ملک میں بکثرت خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہ خانقاہیں رفتہ رفتہ تعلیم گاہیں بن گئیں جن سے ہندوستان کو پہلی مرتبہ تعلیمی بیداری کا سبق حاصل ہوا سنگھا آشرم میں راہب امرا و غربا کو مساوی طور پر ان انوارِ حقیقت کی تعلیم دیتے تھے جو سانکیا شاہزادہ پر کئی صدی پیشتر منکشف ہو چکی تھی۔ شاہ اشوک کے عہد میں مدور اتک خانقاہوں کا سلسلہ قائم تھا۔ سات سو برس تک خانقاہوں کے بے نفس خادمین نے ایسی جد و جہد کی کہ ہندوستان کے مدارس اور جامع ایشیا میں مشہور ہوگئے اور تحصیلِ علم کے دلدادہ پرانی دنیا کے ہر گوشہ سے جوق در جوق ہندوستان کا دور و دراز سفر طے کرنے لگے۔

بدھ مذہب نے طبقۂ اناث کا پایہ بلند کر دیا

۳۔ بدھ مذہب نے صنفِ ضعیف کا پایہ بھی بہت بلند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے دیرالراہبات کا عام رواج ہو گیا جن میں شریف گھرانوں کی عفت مآب خواتین فقر و ریاضت کی قسم کھا کر داخل ہوتی تھیں۔ راہبات کے زمرہ میں شہنشاہ اشوک کی بیٹی بھی شامل تھی۔ جسے جزیرہ سرندیپ میں بدھ مذہب پھیلانے کے صلہ میں سنگھا مترا (سنگھا کی دوست) کا کبھی نہ مٹنے والا لقب عطا ہوا تھا اگرچہ یہ صحیح ہے کہ وید کے دور میں یا اس کے بعد عورتوں کا رتبہ ہندو مذہب میں نیچا نہ تھا تاہم بدھ مذہب نے طبقۂ نسواں کو ہندو مذہب سے کہیں زیادہ آزادی بخشی اور ان کا پایہ اتنا بلند کر دیا کہ وہ فلسفیانہ اور اجتماعی کاموں میں نمایاں حصہ لینے لگیں۔

بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب پر کیا اثر پڑا

۴۔ بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب کا عالمگیر اثر فنا نہ ہو سکا شہنشاہ اشوک باوجود مذہباً بدھ ہونے کے ہمیشہ برہمنوں کی قدر و منزلت کرتا تھا اور انھیں بیش بہا عطیوں سے سرفراز کرتا رہتا تھا۔ اس نیک دل بادشاہ کو گو بدھ مذہب سے بیحد محبت تھی لیکن اس نے قدیم مذہب میں کسی طرح کی دراندازی

بھیں کی۔ موریا سلطنت کے تباہ ہوتے ہی ہندو مذہب کی تجدید ہونے لگی۔ کیونکہ سوریا۔ کانوا اور اندھرا خاندان جو یکے بعد دیگرے سلطنت موریا کے جانشین ہوئے مذہباً ہندو تھے۔ کانوا برہمن خاندان تھا۔ پشیا مترا نے اسوامیدہ (گھوڑے کو قربان) کرنے کی قدیم رسم کو ادا کیا تھا یہ راجہ ہندو مذہب کا حامی تھا۔ اسی کے عہد سے ہندو مذہب کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے بارہ سو برس کے طویل عرصہ میں بدھ مذہب والوں کو پھر ہندو مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ ہندو مذہب کے ساتھ سنسکرت بھی از سرنو زندہ ہوئی۔ تین سو برس پہلے پنی اشٹادھیا تصنیف کر چکا تھا۔ اشٹادھیا سنسکرت کی سب سے بڑی قواعد ہے اور اسی کی بدولت سنسکرت کو علمی زبان بننے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ پتان جلی سنسکرت کا مشہور قواعد داں جس نے پنی کی شرح لکھی ہے پشیا مترا کا ہمعصر تھا۔

عہد موریہ کا تمدن | موریہ عہد کے تمدن کی شہادتیں یونانی سفرا کی تصنیفوں اور نیز کینیا کے ارتھا ساشتر میں بکثرت موجود ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمدنی حالت پرانی دنیا کی متمدن قوموں سے کسی طرح گھٹ کر نہ تھی یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں متمدن اقوام جزیرہ صقلیہ سے چین کے شہر پیکین تک پھیلی ہوئی تھیں اور یونانی تہذیب کا اثر ہندوستان کے حدود تک پہونچ چکا تھا روم اور مصر مماثل تہذیب کے سرچشمہ تھے ۲۲۰ء ق۔م۔ میں چین کے پہلے شہنشاہ نے اس ملک کو متحد کر دیا تھا ۲۰۶ء ق۔م سے خاندان ہان کی شاندار حکومت کا آغاز ہوا یہ خاندان چار سو برس تک چین پر حکمراں رہا۔ ہندوستان اس بین الاقوامی جماعت کا رکن تھا پٹالی پتر کی مجلس بلدی میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک صیغہ غیر ملک والوں کے اعداد و شمار رکھنے کے لیئے مخصوص تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک غیر سے آمد و رفت بکثرت تھی اور تعلقات بہت زیادہ تھے اگرچہ اس زمانہ میں باربرداری اور درازی مسافت کی دقتیں

ایسی تھیں کہ بین الاقوامی تعلقات سے کوئی بڑی تحریک دوسرے ملکوں میں پھیلائی نہیں جا سکتی
تھی لیکن باوجود ان مشکلات کے اور کوہ ہمالیہ کی دشوار گزار حدِ فاصل کے بدھ مذہب
جس کی نشو و نما ہندوستان میں ہوئی تھی چین کے دور اُفتادہ ملک میں سرعت کے ساتھ
عہد موریہ ہی میں پھیل گیا تھا۔

پٹالی پتر بابل ہمدان اور نینوا سے کم نہ تھا

۶۔ سلطنت موریہ کا دارالامارت پٹالی پتر۔ تجارت۔ نظم و نسق۔ کی خوبی اور شان و شوکت میں بابل ہمدان اور نینوا سے کم نہ تھا۔
دریائے گنگا اور سون کے سنگم پر یہ شہر آباد تھا شاہان موریہ کے درباروں کی عظمت و
جلالت شہنشاہان مغل کے درباروں کی ہم پلہ تھی پری چہرہ خواصوں کے جھرمٹ میں
بادشاہ کی سواری نکلا کرتی تھی یہ خواصیں غالباً باختر اور یونان سے آتی ہوں گی اگنی متر
کے دربار کی حشمت کا ذکر کالیداس نے ایک ناٹک میں کیا ہے۔ کالیداس کے بیان سے
ظاہر ہوتا ہے کہ اس راجہ کا دربار صحیح المذاق اور اعلیٰ تہذیب سے مزین تھا۔ اگرچہ اور
درباروں کی طرح اس دربار میں بھی سازشیں ہوتی تھیں۔ لیکن ادب اور فنون لطیفہ قدر
کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ درباریوں کی دلچسپی کے لیے گوٹے کنچیاں اور ناٹک والے
نہیں رکھے جاتے تھے، ان کے رکھنے سے محض درباریوں کی اخلاقی اصلاح مقصود ہوتی
تھی کنٹلیا نے ارتھاشاستر میں جو اصول سیاست بیان کیے ہیں وہ مکیاولی کے
اصول سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ارتھاشاستر کا مصنف ان اصول کے موجد ہونیکا
دعویٰ نہیں کرتا وہ ایسی باتیں لکھتا ہے جو راجگان سلف برت چکے تھے اس دعوے کے
ثبوت میں متعدد شہادتیں ارتھاشاستر میں پیش کی گئی ہیں جو بدقسمتی سے ہم تک نہیں
پہونچ سکیں۔ اس قدیم زمانہ میں حکومت کی بنیاد جاسوسوں پر تھی حکومت کو خوفناک
سازشوں کے بے رحمی سے فرو کرنے میں پس و پیش نہ ہوتا تھا اشوک کے عہد کو مستثنیٰ
کرکے حکومت کا کوئی خاص سیاسی منشا بجز حاکم کے خود نمائی اور غنیموں کی تسخیر

کے نہ ہوتا تھا۔

شمالی ہند کے مشہور شہر

۷۔ دارالامارت کے علاوہ اور بہت سے شہر شمالی ہند میں تھے جن میں ٹیکسلا اُجین۔ مترا پٹی ۔ بنارس۔ متھرا اور سانچی زیادہ مشہور تھے یہ بڑے بڑے تجارتی شہر تھے اور ان کی آبادی بھی خاص تھی سری نگر کشمیر کے علاقہ میں شاہ اشوک نے طرب گاہ کے طور پر آباد کیا تھا پٹالی پتر کے تفصیلی بیان کے بعد ان شہروں کی عظمت کا ذکر طوالت سے خالی نہ ہوگا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شہر کم و بیش دارالامارت ہی کی وضع پر ہوں گے اور ان میں بھی غالباً مجالس بلدی قائم ہونگی۔ اس دور کی طرز عمارت پر ہم تحقیق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی یادگار سانچی کے پھاٹک کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہی سانچی کے باقی آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندی فن تعمیر حد کمال کو پہونچ چکا تھا موریہ عہد تک زیادہ تر مکانات لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ ایم۔ فاؤشر کی تحقیق کے مطابق تیسری صدی قبل مسیح سے لکڑی کے بجائے پتھر استعمال ہونے لگا بدھ گیا اور بھارت کی سنگی جالیاں اسی قرن کی یادگار ہیں ساناکرمی اور سوریہ خاندان کے حوالے اس کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ جالیاں دوسری صدی۔ق۔م۔ میں بنائی گئی ہوں گی اس میں شبہ نہیں کہ شاہانِ موریہ کو فنِ تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی شہنشاہ اشوک نے بہت سے خوبصورت محل تعمیر کروائے تھے اور اگر وہ محلات نہ بنواتا تب بھی اُس کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے وہ عمودی کتبہ کافی تھے جو ہندوستان کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں فن تعمیر کے علاوہ دوسرے فنون جنھیں سنسکرت میں کالا کتے ہیں کمال کو پہونچ چکے تھے منجملہ اُن کے رقص کی تعلیم شاہی محلوں میں دی جاتی تھی جیسا کہ کالیداس کی ملادی گنگنامتر سے معلوم ہوتا ہے۔ موسیقی اور مصوری عام طور سے پسند کی جاتی تھیں؛ یونانی سفیر کا بیان ہے کہ چندر گپت کے محل کے مذہب ستون سنہری منبت کاری روپہلی چڑیوں سے مزین تھے علم موسیقی ہندوستان کا نہایت قدیم فن ہے اور عہد موریہ سے بہت پہلے ہندوستان اس فن میں کامل ہو چکا تھا۔

ہندی زندگی سیاسیات سے کم متاثر ہوتی ہے

۸۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہندوستان کی حقیقی زندگی سیاسی انقلابات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ زراعت جس طرح عام بسراوقات کا ذریعہ ابھی تک بنی ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں بھی اسی پر عام زندگی کا مدار تھا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ دوسرے پیشے اور دست کاریاں بھی رائج تھیں۔ شاہانہ لباسوں میں عمدہ سے عمدہ ململ استعمال ہوتا تھا۔ نہایت قدیم زمانہ سے ہندوستان بیش قیمت کپڑوں کے لئے مشہور ہے۔ کپڑوں کے علاوہ مٹی کے برتنوں کا کام۔ سونے اور چاندی کا طرح طرح کا کام۔ اور دوسری دستکاریاں شاہان موریہ کے عہد میں فروغ پر تھیں۔ ہر پیشہ کے لحاظ سے پیشہ وروں کی جماعتیں علیحدہ علیحدہ قائم کی گئی تھیں۔ جماعت کے افراد پر جماعت کا پورا قابو ہوتا تھا۔ پیشہ وروں کی جماعتیں شاہان موریہ سے پہلے قائم ہو چکی ہونگی کیونکہ ارتھا شاستر میں ان کا ذکر جا بجا پایا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کے داخلی نزاعات کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ہندی تمدن

۹۔ یہ امر مسلم ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت کے وقت ہندوستان تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کر چکا تھا۔ یہ تمدن عرصہ دراز کی تدریجی نشوونما اور فطری ارتقار کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی فارس اور باختر کے یونانی حکومت کے اثر سے شہنشاہی کے درجہ پر پہونچ چکی تھی اور اجتماعی زندگی نہایت گھرے اور شریف تمدن کا پرتو تھی۔ آئندہ دو سو برس تک یہ فطری ترقی سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے رُکی رہی۔ جس کا ذکر ہم دوسرے باب میں کریں گے۔

مسئلہ کینیا

ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ کینیا کو دیجاتی ہے۔ اعتدال پسند جماعت جو ابتک برطانوی رحم و انصاف پر اعتماد رکھتی تھی اور اُسکے زیر سایہ ہندوستان کے پھلنے پھولنے کی توقعات میں اپنے ہموطنوں کو شوریدہ سر اور قابل ملامت سمجھنے میں باک نہ رکھتی تھی، اب فیصلہ کینیا کے بعد انھیں "شوریدہ سر" اور قابل ملامت لوگوں کے ہم آہنگ ہو کر حکومت کے لطف و کرم سے بے نیازی کا اظہار کر رہی ہے چنانچہ شاستری صاحب جو کل تک امپیریل کانفرنس کی شرکت اور باوجود اپنے سیاہ رنگ ہونے کے وزراء نو آبادیات کے ساتھ ہمنشینی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی سلطنت میں امتیاز نسل و رنگ اُٹھ جائیگا آج سپرو صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ امپیریل کانفرنس میں شرکت سے انکار کریں۔ برطانوی نمایش میں ہندوستانیوں کی شرکت قومی بھی خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حکومت کے طریق عمل پر اظہار ناراضگی کے لئے شرما صاحب سے استعفے کی درخواست کرتے ہیں اور پھر برطانوی مال کے بائیکاٹ کو اپنے مقاصد کے حصول کا واحد ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔

اعتدال پسند جماعت کے رکن اعظم کے خیالات میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا کہ آخر کار وہ بھی ترک موالات پر آمادہ ہوئے؟ ان سوالات کے جواب کے لئے کینیا کی صورت حال اور اس کا طرز حکومت قابل غور ہے۔

کینیا مشرقی، افریقہ میں ایک چھوٹی سی نو آبادی ہے، جس کا رقبہ ۲۴۵۰۶۰ مربع میل ہے اور گزشتہ مردم شماری کے مطابق کل آبادی ۲۷۸۳۹۲۵ ہوتی ہے جس میں ۹۶۵۱ یورپین ہیں ۲۷۰۰۰ ہندوستانی ہیں ۱۰۱۰۲ عرب ہیں اور بقیہ تعداد افریقہ کے دیسی باشندوں کی ہے۔ ہندوستان اور مشرقی افریقہ سے پرانے تجارتی تعلقات ہیں جس کا پتہ پندرھویں صدی سے چلتا ہے، چنانچہ گذشتہ دو تین صدیوں کے اندر ہندوستانیوں کی کثیر تعداد اپنے مفاد نیز افریقہ کے وحشی باشندوں کی فلاح و بہی خواہی کے خیال سے ہندوستان کو چھوڑ کر افریقہ میں آباد ہوگئی ہے اور وہاں انہوں نے اپنی قدیم و زندہ تہذیب کو اپنی مثال سے ہر دلعزیز

بنایا اور اپنی کوششوں سے تجارت وعام اقتصادی حالات کو بہتر بنانیکی کوشش کی۔
لیکن خداوندان آراضی کو یہ کب گوارا ہوتا کہ ایشیا و افریقہ کا کوئی گوشہ اُن کی حکومت سے باہر رہے
اور ہندوستان کے غلام افریقہ میں جاکر آزادی کا دم بھر سکیں چنانچہ برطانیہ نے اپنی حکمت عملی کے ذریعہ
سے ہندوستانیوں کو اپنا رفیق کار بنا کر رفتہ رفتہ کینیا پر اپنا تسلط قایم کر لیا۔ اور جنگ کے بعد ۱۹۲۰ء
میں باقاعدہ طور پر یہ نوآبادی کینیا کے نام سے برطانوی نوآبادیات میں شمار ہونے لگی۔
"مسئلہ کینیا" کا آغاز اُسوقت سے ہوا جب باشندگان ہندوستان کینیا میں آکر آباد ہو گئے۔ یوں تو
۱۸۸۰ء سے کچھ یورپین کینیا میں آباد ہونے لگے تھے لیکن ۱۹۰۲ء سے انکی آبادی میں برابر اضافہ ہوتا
رہا ۱۹۰۹ء میں کینیا کا وہ مرتفع حصہ دریافت کیا گیا جس کو ہائلینڈ کہتے ہیں آب وہوا، زمین کی زرخیزی
اور چراگاہوں کے لحاظ سے یہ حصہ ملک کینیا والوں کے لئے جنت تھا، لارڈ الگن اسوقت وزیر
نوآبادیات تھے، اُنھوں نے ایک خاص قانون کے ذریعہ سے "ہائلینڈ" کو یوروپین کیلئے مخصوص
کر دیا یہ موقع تھا جب مشرق کی مغلوبیت اور مغرب کی قومیت ثابت کرنیکے لئے ہندوستانیونکو
ایک حق سے محروم کیا گیا، چنانچہ اُسی وقت سے ہندوستانیوں اور یورپین باشندوں میں کشمکش
شروع ہوئی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی بانی مینڈس پر حق ادنی تک اُنھوں نے
صدیوں تک اپنی جان پر کھیل کر افریقہ کے دشت وصحرا کا ایک ایک چپہ چھانا اور غیر معلومہ مقامات
کی تلاش کی، وحشیوں کو سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی ابجد سکھائی، کینیا پر برطانیہ کا تسلط
بھی اُنھیں کی مدد سے ہوا جس کا اعتراف سر مان کرک نے جو مشرقی افریقہ میں سب سے پہلے
کونسل جنرل تھے ان الفاظ میں کیا ہے "اگر ہندوستانیوں کی مدد نہ ہوتی تو برطانیہ کا اقتدار
کبھی مشرقی افریقہ میں قائم نہ ہو سکتا تھا سر ہنری جانسن بھی افریقہ میں برطانوی کامیابی کا سہرا
سکھ اور پٹھان سپاہیوں کے سر رکھکر فرماتے ہیں کہ ہندوستانی تاجر جس کوششوں سے یوگنڈا کی
ترقی کی شاہراہ پر لا رہے ہیں وہ تعریف سے باہر ہیں، جن مقامات پر تجارت کا نام ونشان تک نہ تھا
وہاں کاروبار قائم کر رہے ہیں اور سنسان وغیر آباد مقامات پر ہوٹل بنا رہے ہیں،" اس سے

قوی تر شہادت مسٹر چرچل کی ہے جو ہندوستانیوں کے حقوق کی پاسداری میں اپنی کتاب "سفرنامہ افریقہ" میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں :-

"ہندوستانیوں کے کیا کیا حقوق ہیں ؟ پہلا حق بحیثیت انسان کے اور دوسرا برطانوی رعایا کے یہ سکھ سپاہی جنہوں نے مشرقی افریقہ کو فتح کر نمیں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں اور پھر وہاں امن قایم کیا۔ یہ ہندوستانی تاجر تھے جو غیر معلوم مقامات میں بلاخوف گھستے چلے گئے جہاں کوئی سفید رنگ انسان جانیکی ہمت نہ کرسکتا تھا نہ وہاں اپنی روزی کمانے کا کوئی ذریعہ نکال سکتا تھا یہی ہندوستانی تاجر تھے جنہوں نے جنگلی مقامات میں تجارتیں قایم کیں اور آمد و رفت کے لئے راستے نکالے ہندوستانیوں کی محنت و مزدوری کی بدولت ایک ریلوے کی تعمیر ہوئی جس پر آجکل تمام ترقی کا دارو مدار ہے، وہ سرمایہ آج مختلف کاموں میں لگا ہوا ہے اس میں زیادہ حصہ ہندوستانی ساہوکاروں کا ہے اور اس سے یورپین بھی بلا تکلف مستفید ہوتے ہیں (مشرقی افریقہ میں) برطانوی دفاتر کے قیام سے بہت پہلے ہندوستانی وہاں موجود تھے، جنوبی افریقہ کے سفید رنگ کے باشندے مشرقی افریقہ میں اپنی بود و باش کے جتنے سال شمار کر سکتے ہیں ہندوستانیوں کی اتنی نسلیں وہاں گذر چکی ہیں پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی حکومت جو ذرہ برابر بھی ایمانداری کا دعویٰ کرتی ہو وہ ہندوستانی باشندوں کو اُن مقامات سے نکالدینے کی پالیسی اختیار کرے جہاں وہ ایک عرصہ سے آباد بھی ہیں بلکہ جس کی داغ بیل بھی انہی کے ہاتھوں پڑی ہے لیکن اس سے بھی بڑھکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت برطانیہ کیلئے اس پالیسی کا اختیار کرنا ممکن بھی ہے جبکہ وہ ہندوستان کے تیس کرور باشندوں پر کچھ بھی حکومت کرنا چاہتی ہے"

غرض ہندوستانیوں کے صاف اور صریح حقوق کے سامنے یوروپین باشندوں کا

کوئی وعدہ قابل تسلیم نہیں ہوسکتا تھا، لیکن اس کا لحاظ نہ کیا گیا۔ مقامی کمشنر نے بیشک وزیر نوآبادیات
کے فیصلہ سے کسی قدر اختلاف کیا اور بمشکل تمام ایک ترمیم کے بعد یہ قانون منظور کیا گیا کہ "ہائیلینڈز میں
ہندوستانیوں کو جاگیریں نہ دیجائیں" اس قانون کی رو سے ایک راستہ ہندوستانیوں کیلئے
کھلا رہ گیا تھا جس سے ہائیلینڈز کے خطے تک داخل ہوسکتے تھے، یعنی اگر موقع ملے تو یوروپین جاگیرداروں
سے زمین خرید سکتے تھے چنانچہ سنہ ۱۹۱۵ء میں ایک اور قانون مقامی کونسل میں پاس کر دیا گیا کہ
اگر ہندوستانی ہائیلینڈز میں کوئی جاگیر خریدیں تو گورنر کو اس بیع کے منسوخ کر دینے کا پورا حق ہوگا"
اس قانون کے خلاف ہندوستانیوں کی طرف سے حکومت میں گویا "صدائے احتجاج" بلند کی گئی، جس کا جواب
بھی فوراً اسی دہائٹ ہال سے مل گیا کہ ہندوستانیوں کی ناداری اور اطاعت کشی کو پسندیدگی
کی نظر سے دیکھتے ہوئے حکومت برطانیہ ان کو یقین دلاتی ہے کہ جو کچھ کیا گیا وہ امتیاز نسل و رنگ اور
قومیت کی بنا پر نہ تھا۔ (بقول شخصے) "سلطنت برطانیہ میں تمام باشندوں کے مساوی حقوق ہیں"۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں پروفیسر ولیم سمپن صاحب نے ایک رپورٹ شائع کی تھی اور اس میں یہ دکھلایا
کہ طبی اصول پر یہ ضروری ہے کہ مختلف اقوام کے باشندے آپس میں مل کر نہ رہیں ہر قوم کے لئے
علیحدہ علیحدہ حلقے ہوں اور بازاریں بھی علیحدہ ہوں۔ حکومت اس تجویز کو فوراً اختیار کرنا چاہتی
تھی لیکن چونکہ جنگ شروع ہونیوالی تھی اسلئے اس پر فوراً عمل درآمد مناسب نہ سمجھا گیا اور اختتام
جنگ پر سنہ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے اس طرف توجہ کی۔

کینیا کی مقامی کونسل میں پہلے جتنے ممبر ہوتے تھے وہ گورنر مقرر کرتا تھا، لیکن جب
جنگ ختم ہوگئی تو لارڈ ملز نے گیارہ غیر سرکاری اور منتخب شدہ یوروپین نمایندوں کو کونسل میں
جگہیں دیں گو ہندوستانی اور عرب جن کی تعداد یوروپین باشندوں سے دوگنی تھی ان کا حق
نمایندگی بالکل فراموش کر دیا گیا۔

چنانچہ اس کے خلاف ہندوستان میں بھی اور کینیا میں بھی کچھ شورش کی گئی جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ لارڈ ملز نے مجبور ہو کر ہندوستانیوں کو مقامی کونسل میں دو جگہیں دیں اور میونسپل بورڈ

میں کچھ حقوق دلائے یہ مراعات ایسے نہ تھے جو قابل تسلیم ہوتے اور اس کے خلاف شورش بڑھتی جاتی تھی اس لئے مجبوراً حکومت ہند نے ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لارڈ ملز کی خدمت میں ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں کینیا کے معاملات اور سیاسیات کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی حالت پر بھی تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس مراسلہ کا اثر یہ ہوا کہ تمام مسائل پھر ایکبار ۱۹۲۱ء میں ایک کمیٹی کی سامنے غور و بحث کے لئے پیش کئے گئے چنانچہ ارل ونٹرٹن نائب وزیر ہند اور مسٹر وڈ نائب وزیر نوآبادیات نے نہایت کد و کاوش کے بعد حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱- کونسل میں گیارہ منتخب شدہ نمایندے ہوں جسمیں چار ہندوستانی ہوں اور سات یورپین
۲- انتخاب عام ہو جس میں ۲۱ برس کے مرد و عورت دونوں رائے دینے کے مستحق ہونگے
۳- اس کے علاوہ بھی حق رائے دہندگی کے لئے ایسی قیود رکھی جائیں کہ صرف ۱۰ فیصدی باشندے رائے دیسکیں۔
۴- اکزیکٹیو کونسل میں ایک غیر سرکاری ہندوستانی نمایندہ لیا جائے۔
۵- نسل و قومیت کی بنا پر باشندوں کی تفریق اور علٰحدہ علٰحدہ حلقوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مقامی کونسل کو حق ہوگا کہ صحت عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ضرورت قواعد و ضوابط بنائے۔
۶- چونکہ ہندوستانیوں کی تعداد روزافزوں ترقی پر تھی اس لئے یورپین آبادی کا یہ مطالبہ تھا کہ قانون کے ذریعہ سے مزید مہاجرین کا داخلہ کینیا میں روک دیا جائے ورنہ کم تعداد یورپین باشندے مغلوب ہو جائینگے، یہ مطالبہ طرح طرح سے پیش کیا جاتا تھا کبھی اقتصادی اور معاشرتی نقطہ نظر سے کبھی کینا کے دیسی باشندوں کی ہمدردی میں، لیکن وڈ ونٹرٹن کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملہ میں حکومت کا طرز عمل برقرار رہے۔
۷- ہائی لینڈز کے متعلق گذشتہ معاہدوں کو پیش نظر رکھکر اس کمیٹی نے فوراً گورنمنٹ کو

تبدیلی کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن اسکے ساتھ نائب وزیر ہند نے یہ تجویز منسلک کردی کہ وہ اس تجویز کے
خلاف ہیں اور آیندہ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ پھر اس مسئلہ کے متعلق کوئی کارروائی کر سکیں۔
یہ تجاویز اسی زمانہ میں شائع ہوئیں جب امپیریل کانفرنس کے اجلاس منعقد ہو رہے تھے
اور شاستری صاحب نے اپنے نزدیک علاوہ جنوبی افریقہ کے تمام وزرا نوآبادیات سے
ہندوستان کے مساوی حقوق تسلیم کرائے تھے مسٹر چرچل اب وزیر نوآبادیات تھے آپنے یہ
تجاویز حکومت ہند نیز گورنر کینیا (مسٹر نارتھلے) کے پاس بچ کے طور پر محض انکی رائے دریافت کرنے
کیلئے بھیجیں، حکومت ہند نے رضامندی کا وعدہ کیا، لیکن مسٹر نارتھلے جو کینیا کے یورپین
باشندوں کے حامیوں میں تھے کسی طرح اس پر راضی نہوئے۔ ہندوستان میں ترک موالات کا
زور ہو رہا تھا اور حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی جس کا احساس تمام وزراء سلطنت کو تھا
اسلئے مسٹر چرچل نے مسٹر نارتھلے کو موقوف کر دیا اور ان کی بجائے سر رابرٹ کارنڈن کو کینیا کا
گورنر مقرر کر دیا۔ اور انھیں حکم دیا کہ حکومت کی پالیسی کا اب اعلان کر دیں کہ رابرٹ کارنڈن
صاحب نے اعلان سے پہلے ایک مراسلہ مسٹر چرچل کیخدمت میں روانہ کیا اور اس پر یقین دلانے
کی کوشش کی کہ اس پالیسی کے اعلان سے بڑے خطروں کا اندیشہ ہے۔ خطرے کیا تھے؟
یہ بھی آگے چل کر ظاہر ہو جائیگا۔ غرض یہ کہ اس عرصہ میں برطانوی وزارت میں تبدیلیاں
ہوئیں اور مسٹر چرچل کے بجائے ڈیوک آف ڈیونشایر ملاوہ فائز ہوئے آپنے بھی مسٹر چرچل کی پالیسی کو
مناسب خیال کیا اور رابرٹ کارنڈن کو تاکید کی ہے کہ وہ اس پالیسی کا اعلان کریں۔ چنانچہ گورنر
نے مجوزہ پالیسی فریقین کے حوالہ کر دی کیا ہندوستانیوں کے مطالبات کا ایک حصہ بھی اس سے
پورا نہوتا تھا مگر بصد اصرار و مجبوری کچھ عرصہ کے لئے اسکو منظور کرنے پر طیار تھے، لیکن یورپین
آبادی کسی طرح اسپر راضی نہوئی، لارڈ ملز کی پالیسی میں کسی قسم کی ترمیم نہیں چاہتے تھے غرض
ان کی طرف سے انتہائی شورش شروع ہوئی اور انہوں نے اپنی کانگریس میں یہ فیصلہ کیا کہ
اگر وزرا نے ان کے حسب منشا فیصلہ نہ کیا تو کینیا کی حکومت وہ اپنے ہاتھوں میں لے لینگے او

برطانیہ سے کوئی تعلق نہ رہیگا۔ نیز یہ کہ اگر حکومت نے انہیں نظر انداز کرنا چاہا تو وہ تلوار سے بھی مقابلہ کرنیکے لئے تیار ہیں"

یہ خطرہ تہا جس سے لارڈ کارنڈن خائف تھے اور پالیسی کے اعلان سے جھجکتے تھے، کاش یہ بھی کوئی بتلادے کہ جن لوگوں نے یہ اعلان جنگ دیا تہا اور حکومت ہند کی زبان میں جن لوگوں نے علم بغاوت بلند کیا تہا وہ کس سزا کے مستحق سمجھے گئے؟ انکی کانگریس پر یا اُن کے جلسوں پر بھی دفعہ ۱۴۴ کا کبھی نفاذ ہوا! ان کے لئے بھی کبھی جیلوں کے دروازے کہولے گئے؟ لیکن یہ ستم آرائیاں تو صرف غلامان مشرق کے لئے ہیں جو اگر اپنی مظلومیت پر کبھی آہ سرد بھی کھینچتے ہیں تو توپوں کے دہانے کھل جاتے ہیں ہوائی جہاز سے گولے برسائے جاتے ہیں جیلوں میں بند کئے جاتے ہیں غرض دفعات تعزیرات اور مارشل لا کی رو سے ایک ایک خطا پر سینکڑوں جرم عائد کئے جاتے ہیں اور ہر سزا کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

کینیا میں باشندگان یورپ کی باغیانہ شورش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر نوآبادیات نے فریقین کے چار چار نمایندے بہ این غرض تسے مدعو کئے کہ بالمشافہ گفتگو کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے، گورنر کینیا بھی اس کانفرنس میں شریک کئے گئے ہندوستان سے مسٹر شاستری کی زیر سرکردگی ایک وفد اپریل ۱۹۲۳ء میں انگلستان روانہ ہوا تاکہ ہندوستانیوں کے مطالبات ذیل پیش کرے:۔

۱۔ تمام متمدن اقوام کے لئے مساوی حقوق ہوں۔

۲۔ لارڈ چمسفورڈ کے اعلانات ۱۹۲۰ء کی پابندی۔

۳۔ فہرست رائے دہندگان سب باشندگان کے لئے ایک سی ہو اور قیود ایسے عائد کئے جائیں کہ جن لوگوں کے پاس تھوڑی سی جائداد بھی ہے اور کوئی ایسی زبان جانتے ہیں جو سلطنت برطانیہ کے ہائی کورٹ میں رائج ہے وہ بھی رائے دے سکیں۔

۴۔ یورپین نمایندوں کے برابر ہندوستانی نمایندے لیجسلیٹیو کونسل اور اکزیکیٹیو کونسل اور میونسپل کونسل میں لئے جائیں۔

۵۔ ہائی لینڈز میں ہندوستانی جاگیریں خرید سکتے ہیں۔
۶۔ ہندوستان کے جو باشندے کینیا میں جاکر آباد ہونا چاہیں اُن کے لئے کسی قسم کی رکاوٹ نہو۔
۷۔ تمام سرکاری دفاتر میں ملازمت کی راہیں ہندوستانیوں کیلئے بھی کھلی رکھی جائیں۔
۸۔ جو قوانین قومیت اور نسل کی بنا پر نافذ کئے گئے تھے منسوخ کردئے جائیں۔

ان مطالبات پر غور و خوض کرنیکے بعد جو فیصلہ خداوند ان آلاعضی نے صادر فرمایا وہ ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو صحیفہ یعنی ہوائٹ پیپر میں شائع کیا گیا اور اُسکی تفصیل ذیل میں درج ہے:

۱۔ ہندوستانیوں کے پانچ نمایندے لیجسلیٹو کونسل میں لئے جائینگے اور ان نمایندوں کا انتخاب ملی اُصول پر عمل میں آئیگا یوروپین باشندوں کے گیارہ نمایندے برقرار رہینگے۔ سرکاری نمایندوں کی کونسل میں اکثریت رکھی جائیگی۔ عربوں کا ایک ایک منتخب نمایندہ لیجسلیٹو کونسل میں ہوگا اور ایک ممبر ایگزیکٹیو کونسل میں خود حکومت مقرر کریگی۔
۲۔ ایگزیکٹیو کونسل میں کوئی تبدیلی فی الحال نہو گی علاوہ اس کے کہ ایک ممبر کا اور اضافہ کیا جائیگا، لیکن اس جگہہ پر عیسائی مبلغین کی جماعت میں سے کسی شخص کو ترجیح دیجائیگی تاکہ وہ افریقہ کے دیسی باشندوں کی نمایندگی کر سکے۔
۳۔ شہروں میں ایشیائی اور یوروپین باشندوں کو علیحدہ علیحدہ رہنے کے لئے قانون نافذ کیا گیا تھا اب منسوخ کر دیا جائیگا۔
۴۔ ہائی لینڈز میں جاگیروں کا عطایا اور اُس کے بیع کے متعلق جو طریقہ عمل ابتک رہا ہے آیندہ بھی وہی رہیگا، لیکن دوسرے مقامات پر کچھہ آراضیاں ہندوستانیوں کے لئے بھی مخصوص کر دیجائینگی اور صرف اُن لوگوں کو ایک مقررہ زمانہ کیلئے دیجائیں گی جو اُس زمین کو بہتر بنانے کا وعدہ کریں لیکن اگر اس عرصہ میں کوئی شخص اپنی زمین کو پیداوار کے قابل نہ بنا سکا تو حکومت اُس زمین کو واپس لینے کی مجاز ہوگی۔ باقی آ

آفتاب انگورہ

شہید حریت احمد جمال پاشا

ترکانِ انگورہ کو آج استقلال و حریت کے جو حیات افروز لمحات نصیب ہوئے ہیں اور مقام العلیٰ خلافت کے حفظ و استقلال کی جو افتخار اندوز ساعت عالم اسلام کو میسر آئی ہے وہ ہز اکسلنسی امیر البحر مارشل جمال پاشا لفٹنٹ گورنر شام کی بہت زیادہ مرہون منت ہے، ممدوح نہ صرف حکومت انگورہ کے موسسین میں ایک ممتاز مرتبہ لیڈر تھے بلکہ آپکی آخری خدمات نے اناطولیہ و ترکستان سے لے کر تاشقند و افغانستان اور شمالی ہندوستان کو جن بیدار کن طریق پر متاثر کیا اُس سے اسلامی تاریخ کے صفحات ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے ترکی قوم کا یہ جلیل القدر سپاہی انگورہ گورنمنٹ سے وہی تعلق رکھتا تھا جو خود بانیٔ انگورہ گورنمنٹ شوکت پناہ مصطفےٰ کمال پاشا کو حاصل ہے، وہ ابتدائی اسکیم جو آخر ۱۹۱۸ء میں مقام "حلب" انگورہ گورنمنٹ کی تاسیس کے لیے طیار ہوئی تھی احمد جمال پاشا کے قیمتی مشورے سے مزین تھی، اور یہ امر واقع ہے کہ قہرمان ترکی مارشل مصطفےٰ کمال پاشا کو حلب سے اناطولیہ جانے کے لیے احمد جمال پاشا نے جو سہولتیں بہم پہونچائیں یہ انھیں کا نتیجہ تھا کہ کمال ممدوح اناطولیہ میں "تحریک انگورہ" کو فروغ دینے میں کامیاب ہوگئے۔

احمد جمال پاشا کا وطن "مدلہ" اور سال پیدائش ۱۸۷۲ء ہے آپ ترکی، فارسی، عربی، اور روسی، زبانوں کے ماہر اور زبردست قانون داں تھے آپ فوجی تعلیم سے فارغ ہو کر ترکی سپاہ میں داخل ہوئے کچھ عرصہ بعد آپ کو ترکی گورنمنٹ نے "اسکوار" کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا، پھر آپ "ارنہ" کے حاکم مقرر ہوئے پھر "بغداد" کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہو کر تھوڑے عرصہ بعد قسطنطنیہ کے ڈپٹی مقرر ہوئے، اس سلسلہ اعتبار سے کہ ترکی لیڈر جامع کمالات ہوتے ہیں احمد جمال پاشا ڈپٹی کے عہدہ سے پھر فوجی لائن میں

بدل دیئے گئے اور آپ پہلی ترکی اسکواڈرن کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، احمد جمال پاشا مشہور حکمراں ترکی جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے اُن مخصوص بلند مرتبہ ارکان میں تھے جو انجمن کی جان کہے جاتے ہیں ممدوح الصدر انجمن اتحاد و ترقی کے سیکرٹری اور پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے، حضرت جمال پاشا کی یہ اُن خدمات کا نہایت ہی مختصر اجمال ہے جو جنگ یورپ سے پہلے آپ نے انجام دیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان ہے۔

۱۹۱۵ء ترکی قوم کے ابتلا و آزمائش آلام و مصائب کا نہایت صبر آزما سال تھا جبکہ ترکی حکومت جنگ فرنگ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی، روسی محاذ کی حوصلہ شکن مصروفیت کے باوجود ترکی مقبوضات عراق کی حفاظت و صیانت اور ولایت شام و فلسطین کا تحفظ ایک عقل سوز مہم تھی جہاں اندرون ملک جاہل عربوں بدوؤں کردوں اور متفرق قبائل کو ترکی گورنمنٹ کا وفادار رکھنا اور محاذ جنگ پر فوجوں کی ترتیب و ترسیل وغیرہ مہمات مسائل تھے جن کی رُوبراہی ایک فاضل و پختہ کار جنگی و سیاسی لیڈر ہی کر سکتا تھا، چونکہ ترکی گورنمنٹ جمال پاشا ممدوح کی سیاسی و جنگی بلند پائیگی سے اچھی طرح واقف تھی اس لیئے آپ کو شام و فلسطین کی ٹرکی سپاہ کا کمانڈر انچیف بنایا گیا اور جمال پاشا دمشق میں آ گئے، آپ نے نہر سویز عبور کرنے کے لیئے جو جد و جہد فرمائی وہ مہمات جنگ کی ایک لاجواب نظیر ہے، جمال پاشا ممدوح نے باوجود ریلوے لائن اور ریلوے ذرائع کے فقدان کے ترکی سپاہ اور ترکی محاذوں کا جو انتظام فرمایا اُس کی تفصیل جمال پاشا کی جنگی مہارت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، شام و فلسطین اور عراق کے متعلق خود جمال پاشا مرحوم نے "تذکرہ" کے نام سے ایک جامع "تاریخ" لکھی ہے اور جس کا اُردو ترجمہ شاید ہندوستان میں شائع ہو گیا ہے اور جس کے چند حصے مصر کے مشہور عربی رسالہ "الہلال" نے شائع کیئے

ں ان کے دیکھنے سے جمال پاشا کی خداداد فراست اور جنگی تدبر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے جہاں
مدوح نے باوجود گوناگوں مشکلات کے "انتظام و انصرام" اور سیاست و مآل اندیشی کے حکمت
مدوز نمونے پیش کیے ہیں، یہ جمال پاشا ہی کی مقتدر اور سیاست شناس ہستی تھی جس نے
اغی عربوں سے ترکی حکومت کے مفاد کو عرصہ تک محفوظ رکھا' آپ نے "عربی بغاوت" کی
دوک تھام میں جن مساعی اور ذرائع سے کام لیا وہ "مجلۂ الہلال مصری" یا آپ کے خودنوشت
"تذکرہ" ہی کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آپ ہی کا تدبر بیناہ اور حقیقت آگاہ دماغ تھا
جس نے عربی ہیجان کو قبل از وقت محسوس فرما کر ترکی فوجوں کو صحیح سالم رُوسی محاذ پر منتقل کرنے
اور سرکاری قیمتی اشیاء کو قسطنطنیہ پہونچانے کی تدابیر اختیار کیں۔

مذکورہ حالات کے بعد ترکی حکومت کا وہ پُرآشوب دور شروع ہوا جس نے کئی صدی کے
بعد ترکی قومیت کو تباہ کن مصائب کے عمیق گڑھے میں ڈال دیا' ترکی فوجوں کے ہتیار ڈالتے
ہی ملک میں عام ہیجان و برہمی کے مہلک اثرات پھیل گئے، التوائے جنگ کی درخواست پیش ہوتے ہی
ترکی کے ممتاز مرتبہ لیڈروں نے وطن عزیز کو خیرباد کہنا شروع کر دیا، حضور دانش پناہ
احمد جمال پاشا عین اوس دن (۱۰ راگست ۱۹۱۸ء) جبکہ معاہدۂ التوائے جنگ پر دستخط ہوئے
ایک جرمن جہاز پر مع اہل و عیال قسطنطنیہ سے بندرگاہ "سباسٹپول" چلے گئے اور یہاں چند
قیام کے بعد آپ "برلن" جا پہونچے، جب قسطنطنیہ پر اتحادی غلبہ مستحکم ہو گیا تو اتحادیوں نے
قسطنطنیہ کی نام نہاد ترکی گورنمنٹ کی وساطت سے "انجمن اتحاد و ترقی" کے سربرآوردہ ارکان
کو گرفتار کرانا چاہا، اور اس سلسلہ میں احمد رفعت پاشا ترکی سفیر مقیم برلن نے جرمن گورنمنٹ
سے جمال پاشا کی حوالگی کی درخواست کی، چونکہ جرمن گورنمنٹ ارکان اتحاد و ترقی کی طرفدار
تھی' اُس نے فوراً جمال پاشا کو جرمنی حدود چھوڑ دینے کا ایما کیا اور اس طرح جمال پاشا کو
ں کے ہاتھ پڑنے سے بچا لیا، حضور جمال پاشا جرمنی سے [illegible] چلے گئے جہاں

آپ نے قصبہ "کوس ترس" میں مستقل اقامت اختیار فرمائی، قصبۂ کوس ترس میں آپ نے اپنا نام "خالد بے" رکھ لیا اور ایک انجنیر کی حیثیت اختیار فرما کر رہنے لگے، قصبہ کوس ترس واقع سوئٹیزرلینڈ میں آپ کامل آٹھ ماہ مقیم رہے، اور اسی اقامت کے دوران میں آپ نے اپنی یادداشتیں مرتب کیں، یہ وہ معرکۃ الآرا سیاسی یادداشتیں ہیں، جن کا مجموعہ یورپ کی تمام زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، غرض جب جرمنی میں امن و امان قائم ہو گیا تو آپ سوئٹیزرلینڈ سے "فوننگ" میں تشریف لے آئے اور مستقل قیام اختیار فرما لیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اناطولیہ میں سالارِ ملت و دین پناہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک کا آغاز ہوا، جس کی طرف مشرق کی نگاہیں اٹھنے لگیں، اور تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ اناطولی ویرانوں کی یہ ضعیف تحریک ایک دن سارے مشرق کو بیدار کر دے گی لہذا ناممکن تھا کہ جمال پاشا ایسا عظیم الشان مدبر اس وقت خاموش بیٹھا رہتا، آپ فوراً جرمنی سے روس تشریف لے گئے مخالفین تو آج تک یہی کہتے ہیں کہ انور و جمال کو "انگورہ تحریک" سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن جو لوگ ترکوں کی قوم پرست طینت اور "وحدت خیال" سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انور و طلعت، اور خلیل و جمال نے "انگورہ تحریک" کو کامیاب بنانے کے لئے کیسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں؟

مارشل جمال پاشا جب ماسکو پہونچے تو آپ نے کوشش کی کہ کسی طرح انگورہ اور ماسکو گورنمنٹ میں اتحاد عمل پیدا ہو جائے اور مشرق کی یہ دونوں طاقتیں متحد ہو کر دشمنوں کے مقابل آ جائیں، چنانچہ آپ ابھی ماسکو میں سرگرم عمل ہی تھے کہ انگورہ گورنمنٹ کے ذی مرتبہ نمایندہ ڈاکٹر بکر سامی بے ماسکو پہونچے ڈاکٹر بکر سامی اور جمال پاشا کی متفقہ کوششوں سے انگورہ و ماسکو گورنمنٹ میں ایک معاہدہ اتحاد ہو گیا، ڈاکٹر صاحب تو انگورہ واپس آ گئے لیکن جمال پاشا روس ہی میں رہے جہاں آپ نے وسطی ایشیا کو بیدار و آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست لائحہ عمل تیار کیا، یہ وہ وقت ہے جبکہ ماسکو گورنمنٹ انگریزوں کے خلاف اپنے اثرات کی اشاعت چاہتی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ ترکستان سے ہو کر بخارا د

افغانستان تک بالشویک اثرات وسعت پذیر ہو جائیں، تاکہ کسی مناسب موقع پر وہ ہندوستان پر ایک کامیاب ضرب لگانے کے قابل ہو سکے، ادھر ترکی لیڈر بھی چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو انگریزی مفاد کو نقصان پہونچایا جائے لہذا ماسکو میں جمال پاشا کو ان خدمات کا بہترین ذریعہ تصور کیا گیا اور آپ کو ماسکو کے محکمہ خارجہ میں "معاملات شرقیہ" کا چیف ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، خیال تھا کہ جمال پاشا بالشویک گورنمنٹ کی خیر سگالی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے لیکن جمال پاشا کے پیش نظر ایک اور ہی اسکیم تھی اور آپ چاہتے تھے کہ وسط ایشیا میں مسلمانوں کی متعدد و متفرق جماعتوں اور ریاستوں کا ایک زبردست "جامعہ" بنا دیا جائے، جس کا مرکز "تاشقند" ہو، لہذا اس خیال سے آپ نے "تاشقند" میں اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کرکے عملی کام شروع کر دیا، گو بظاہر کچھ عرصہ تک آپ یہاں بالشویک مقاصد کو تقویت پہونچاتے رہے لیکن یہ صرف اس لئے کہ آپ کو بالشویک ذرائع سے اسلامی مصالح کو استوار کرنا تھا، تاشقند، میں جمال پاشا کے ساتھ ترکی جنرلوں اور ترکی لیڈروں کی ایک طاقتور جماعت تھی جس کے ذریعہ انگورہ تحریک کو فروغ دیا جاتا تھا، البتہ ابتداء میں اس تحریک پر بالشویک رنگ چڑھایا گیا تھا، جب جمال پاشا نے انگورہ تحریک کو فروغ دینا شروع کیا تو بالشویک گورنمنٹ جمال پاشا سے بدظن ہو گئی اور آپ کو دوبارہ ماسکو طلب کیا گیا، اس طلبی کے موقع پر آپ کو بالشویک سفیر "ایم سورٹز"، سے ملایا گیا جو اصل میں جمال پاشا کا نگراں تھا، اور اسی موقع پر آپ کے عملہ تبلیغ میں مشہور انقلابی علامہ برکت اللہ بھوپالی کا بھی اضافہ کیا گیا علامہ برکت اللہ بھوپالی کی شرکت سے جمال مشین میں زبردست اضافہ ہو گیا کیونکہ ممدوحین میں "تحریک اتحاد اسلامی" کے خیالات یکساں موجود تھے، اور دونوں پان اسلامزم، کے زبردست مؤید تھے، علامہ برکت اللہ بھوپالی ایک راسخ العقیدہ اور متبحر ہندی عالم ہونے کے ساتھ ہی نہایت معروف انقلابی ہیں، جب سے آپ نے ہندوستان کو خیرباد کہا ہے آپ "تبلیغ اسلام" اور "تحریک پان اسلامزم" کے سرگرم کارکن رہے ہیں، ممالک مغربی خصوصاً،

چین و جاپان میں علامہ برکت اللہ بھوپالی نے اسلام و اسلامیت کی تبلیغ و اشاعت میں
میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ سیاسی نقطۂ نظر سے علامہ جمال الدین افغانی کے تبع
ہیں، وہ ۱۹۰۹ء میں جاپان ٹوکیو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے پروفیسر اور اخبار
"اخوۃ اسلام" کے چیف ایڈیٹر و مالک تھے تو اُنھوں نے افغانی قوم کو اسلامی مرکزیت
میں جذب ہونے کے لیے "سراج الاخبار کابل" کے ذریعہ پرجوش دعوت دی تھی، وہ ۱۹۱۵ء میں
برلن کے محکمہ شرقی میں ہندی قیدیوں کو انقلابی خیالات کی تعلیم دیتے تھے اور پھر ایک طاقتور
جرمن مشن لے کر وہ افغانستان گئے تھے، غرض اب جمال پاشا اور علامہ برکت اللہ بھوپالی
کا اتحاد عمل بخارا کی و افغانی قوم کی بیداری کا ایک مبارک ذریعہ تھا، جمال پاشا نے تاشقند
و بخارا میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا جس کے ذریعہ بالشویک پروپگنڈا کیا جاتا تھا اور اس
تمام پروپگنڈا کے مصارف بالشویک گورنمنٹ برداشت کرتی تھی، یہ وہ وقت ہے جبکہ جمال پاشا
کے متعلق نہایت غلط اور مبالغہ آمیز خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں؛ تھوڑے عرصہ بعد
یعنی اکتوبر ۱۹۲۰ء میں وہ افغانی حدود میں داخل ہوئے چونکہ افغانی قوم اور تاجدار
افغانستان آپ کی بلند مرتبہ شخصیت سے پہلے ہی واقف تھے اس لیے آپ کا نہایت
شاندار استقبال کیا گیا، اس میں شک نہیں کہ آپ افغانستان میں بالشویک ذرائع سے
داخل ہوئے تھے لیکن چند ماہ بعد ہی تاجدار افغانستان نے آپ کی خدمات کو افغان گورنمنٹ
کے لیے حاصل کر لیا، اور آپ کو افغانی کیبنٹ میں "وزیر جنگ" کا عہدہ سپرد کیا گیا، اس وقت
افغانی فوجیں نہ تو جدید قواعد و ضوابط سے واقف تھیں اور نہ اُن کے پاس جدید قسم کے
آلات حرب تھے لیکن جمال پاشا نے اپنی ممتاز جنگی مہارت کے ذریعہ اس کمی کو بہت جلد پورا
کر دیا، اور تمام افغانی فوجوں کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ آراستہ کر دیا، آپ نے اس عرصہ
میں سرحدی قبائل کی اصلاح میں بھی نمایاں اصلاحات فرمائیں اور بعض تجربہ کار ترکی جرنلوں
کو ان کا نگراں مقرر کر کے اُنھیں افغانستان کی مرکزی فوجوں سے متعلق کر دیا، جس وقت

جمال پاشا قبائل کی اصلاح میں سرگرم تھے اُن کے خلاف ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا جارہا تھا اور سرحدی علاقہ میں ہر وقت ایک نئی جنگ کا خطرہ محسوس کیا جاتا تھا حضرت محمد جمال پاشا نے ترکستان و تاشقند، اور افغانستان و شمالی ہند تک جن اسلامی مصالح کو تقویت بہم پہونچائی اُن کی تفصیل سے چونکہ اخبار بین طبقہ اچھی طرح واقف ہے اس لیئے اب صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ آپ سط ۱۹۲۲ء میں افغان گورنمنٹ کے لیئے جدید اسلحہ اور سامان حرب و ضرب خریدنے کے لیئے جرمنی و فرانس تشریف لے گئے، جہاں سے وہ انگورہ اور اپنے وطن عزیز تشریف لے جانے والے تھے، اُس وقت آپ کے اہل و عیال "طفلس" میں تھے، جب آپ جولائی ۱۹۲۲ء میں "طفلس" پہونچے اور ایک دن بازار میں اپنے جنگی ایڈی کانگ "ثریا بے" اور "نصرت بے" کے ساتھ "جو فکروسکی اسٹریٹ" کے گوشے پر پہونچے تو یکایک آپ پر گولی چلائی گئی اور جمال پاشا تین گولیاں کھا کر گر پڑے اسی طرح نصرت بے پر بارہ گولیاں چلائی گئیں اور وہ بھی گر پڑے، ثریا بے یہ دیکھ کر فرار ہونا چاہتے تھے کہ "سولولاک اسٹریٹ" پر پہونچتے ہی اُن پر حملہ کیا گیا اور اس طرح اسلام و اسلامیت اور ملت عثمانیہ کے یہ تابان و درخشندہ تارے طفلس میں ہمیشہ کے لیئے ڈوب گئے۔ انا للہ الخ

حلیہ و خصائص | مارشل جمال پاشا متوسط قامت اور نہایت وجیہ آدمی تھے چہرا ابھرا، آنکھیں بڑی بڑی، اور نہایت خوشنما گھنی داڑھی مونچھیں جرمنی طریق کی اوپر کو چڑھی ہوئیں، یوروپین لباس پر اناطولی ٹوپی زیب سر فرماتے تھے، مزاج کے نہایت حلیم اور بردبار آدمی تھے، گو غصہ بہت کم آتا تھا لیکن چہرہ سے جنگی شہامت و تدبر کے پُرجلال آثار ہویدا تھے۔

ملا توحیدی،

جاپان اور زلزلے

جاپان چینی لفظ نیفن کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ نیفن کے معنی (The Land
of Rising Sun) کے ہیں۔ چونکہ جاپان چین کے مغرب میں ہے اور صبح کو اُسی طرف چینی آفتاب
کو طلوع ہوتے دیکھا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ ان جزائر کو نیفن پکارنے لگے۔
اور خدا کی عجیب قدرت کہ جاپان نے دور جدید میں مغربی اقوام کے ساتھ ساتھ تہذیب و
تمدن میں جو مقابلہ کیا تو اُس کی ترقی کا آفتاب اس طرح طلوع ہوا کہ چینیوں نے جو نام
رکھا تھا وہ صادق آیا۔ جاپان سے مراد وہ تمام حصہ ہے جو ایشیا کے مغربی ساحل پر
شمال میں جزیرہ سگھالین سے لے کر جنوب میں جزیرہ فارموسا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تمام
جزائر شمار میں کم و بیش ایک ہزار ہیں۔ اس میں سب سے بڑا ہانشیو یا ہانڈو کہلاتا ہے
یہ جاپان کا اصل حصہ ہے۔ اسی جزیرہ میں دار السلطنت ہے۔ اہم تعلیمگاہیں مختلف کارخانے
دفاتر سرکاری اور سفارتخانے وغیرہ بھی اسی جزیرے میں ہیں۔ جاپان کا مشہور آتش
فشاں پہاڑ فوجی یامہ بھی اسی حصہ میں ہے۔ اور یہی حصہ ہمیشہ سب سے زیادہ زلزلوں
کی زد میں رہا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل جاپان کا دروازہ غیر اقوام کے لیئے بالکل بند تھا۔ خود
جاپانی کسی دوسرے ملک میں نہیں جایا کرتے تھے۔ البتہ ہندوستان بطور جاترا
کے اکثر آتے تھے اور چند یوم کی سیاحت کے بعد واپس ہو جاتے تھے یہی وجہ تھی
کہ جاپانی تہذیب پر آئینی اثر بالکل نہ پڑا تھا۔ شوگن جماعت جو اُس وقت حکمران تھی
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی حرص آز کو خوب سمجھ گئی تھی۔ یہ جماعت سپاہیوں
ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو حکومت کرتی تھی جس طرح سے فرانس کے
(Mayors of Palace) تھے یہ جماعت بھی اسی طرح بنی تھی اور اپنا نام شوگن قرا

دیا تھا۔ اس نے قدیمی شہنشاہ کو جو مکاڈو کہلاتا ہے معزول کر دیا اس جماعت نے مغربی اقوام کو سوائے ڈچ کے (وہ بھی صرف ایک بندرگاہ سے) جاپان میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور اگر کوئی اس حکم کے خلاف ورزی کرتا تھا تو اُسے موت کی سزا ملتی تھی ۱۸۵۴ء میں ایک امریکن مسمیٰ کموڈور پیری ایک بیڑہ لے کر جس کی تاب جاپان نہ لا سکتا تھا خلیج یڈو میں آپہونچا اور جاپان کو ایک تجارتی صلحنامہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس صلحنامہ کی ماتحت امریکہ کے لیے جاپان کے کئی بندرگاہ کھل گئے اور سلسلۂ تجارت آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس کے بعد یورپ کی بحری اقتدار رکھنے والی سلطنتوں نے بھی ہمت کی اور جاپان نے مثل چین کے بالآخر اپنے تمام بندرگاہ کھول دیئے ان آئینی اقوام خصوصاً یورپین قوموں کے جاپان میں داخل ہونیکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۸ء میں ایک انقلاب ہوا اور شوگن جماعت معزول اور حکومت پھر قدیم شاہی خاندان مکاڈو کو مل گئی۔ غرضیکہ بیسویں صدی کے اوائل سے جاپان نے مغربی تہذیب کو قبول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب اُس کے شہر تقریباً تمام مغربی آسائشوں سے پُر ہیں یورپ کے طرز کی پارکیں، ہوٹل، ریسٹارن، سینما، تھیٹر، ٹریموے، ٹیلیفون، برقی روشنی گیس پائپ، یہ تمام چیزیں اب ہر بڑے جاپانی شہر میں پائی جاتی ہیں۔

باوجودیکہ جاپان زلزلوں اور کوہ آتش فشاں پہاڑ کی تباہیوں کا ہمیشہ آماجگاہ رہا ہے مگر پھر بھی کوئی قوم اپنی حکمراں شاہی خاندان کی قدامت پر اتنا نازاں نہو گی جتنا کہ جاپانی۔ مکاڈو خاندان پورے پچیس صدی سے چلا آرہا ہے گو درمیان میں شوگن جماعت نے اس خاندان کو حکومت سے معزول کر دیا تھا مگر جاپانی قوم ہمیشہ اس خاندان کے ارکان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

جاپان اپنی صناعی، اپنی مخصوص طرز معاشرت کے علاوہ اپنے زلزلوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے جاپان میں جس کثرت اور تسلسل سے زلزلے آئے ہیں اور جس قدر جانی و مالی نقصانات جاپان نے اس ہیبت ناک عذاب سے اُٹھائے شاید بہت سی قوموں نے لڑائیوں

میں بھی نہ اٹھائے ہوں گے۔ جاپان کی تاریخ دیکھنے سے پتہ لگتا ہی کہ ہر زلزلے میں سیکڑوں جانیں تلف ہوئی ہیں اور بڑی بڑی بربادیوں کا جاپان کو سامنا کرنا پڑا ہی۔

یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر بھی جاپان کے لیے عجیب غریب ماتم خیز دوپہر تھی کہ صرف دو منٹ کے اندر ٹوکیو کا خوبصورت شہر اور اس کا وسیع بندرگاہ یاکوہاما نیز شہر شاگامی آوا شمو سہ اور اطراف کے بہت سے مواضعات اپنی تمام چہل پہل کے ساتھ اس طرح زلزلے سے تباہ و برباد ہوگئے کہ اس کی یاد سے انسانی خیال لرزتا ہی۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آئے ہیں خود جاپان کے تمام گزشتہ زلزلوں سے بڑھ کر یہ زلزلہ اپنی تباہ کن اور بربادخیز نوعیت میں یکتا تھا۔ ٹوکیو کا قدیمی نام یدو تھا۔ شوگون حکومت کے انقلاب کے بعد جب مکاڈو خاندان برسر حکومت ہوا تو اس نے دارالسلطنت کا نام بدل دیا اور ٹوکیو رکھا۔ جس کے لفظی معنی "مغربی دارالسلطنت" کے ہیں۔ موجودہ عہد کے تمام شہروں میں یہ عظیم الشان شہر شمار کیا جاتا تھا۔ یہ شہر اپنی وسعت میں یکتا تھا۔ شہر کے اندر کئی نہریں اور بہت سی پارک و باغات تھے۔ اس کا رقبہ ۲۸ مربع میل تھا۔ اس کی آبادی ۲۸۶۰۰۰۰ نفوس کی تھی۔ شہر کی خاص سڑک گنسنزا پر ہر موسم اور یورپ کی وضع کی دکانیں تھیں۔ تین ہزار عبادتگاہیں تھیں۔ اساکوسہ حصہ میں ایک بہت عظیم الشان اور وسیع مندر تھا کہ اس کے احاطہ کے ساتھ کئی تھیٹر گاہیں۔ تیراندازی کے لیے کافی جگہ، چائے خانے ہوٹل وغیرہ وابستہ تھے جن سے عبادتگاہ کے اردگرد شام کو ایک عجیب تماشا لگ جاتا تھا۔ اسی طرح سے یاکوہاما جاپان کا سب سے وسیع بندرگاہ تھا۔ جو بیس میل سمندر پر واقع تھا اس بندرگاہ سے ۲۲۸۲۷۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ جاپان میں آتا تھا اور اسی طرح ۲۰۷۵۶۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ باہر جایا کرتا تھا۔ اس بندرگاہ سے سالانہ ۲۲۶۳۰۰۰ ٹن کا سامان اتارا جاتا تھا۔ ان اعداد سے بندرگاہ کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہی۔ یاکوہامہ میں جاپانی تمدن بہت کم تھا۔ کیونکہ یہاں زیادہ تر یورپ کے باشندے آباد تھے جو مختلف کاروبار کے سلسلے سے یہاں آکر آباد تھے

اُنھیں کے مذاق کے مطابق یہ شہر تعمیر ہوا۔ یاکوہاما کی آبادی ۳۲۶۰۳۵ تھی۔ جاپان کے یہ
دونوں شہر اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ یکایک منہدم نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک خاک کا
تودہ بادل کی طرح اُمنڈ آتا ہے۔ اور جاپان کا مایۂ ناز شہر اور عظیم الشان بندرگاہ اس طرح تباہ
ہوجاتا ہے کہ جو حصے زلزلے کی زد سے بچ جاتے ہیں اُن میں گیس کے نلوں کے پھٹ جانے سے
مہیب آگ لگ جاتی ہے اور لکڑی کا تمام حصہ جل کر خاک سیاہ ہوجاتا ہے۔ ذرا اُس شہر کی حالت
کا خیال کرو جو ابھی چند لمحہ قبل ایک تجارتی منڈی، ایک چلتے پھرتے لوگوں کی بستی اور
انسانوں کی آبادی تھی یکایک خاک کا ڈھیر، راکھ کا انبار اور بیٹھے ہوئے مکانات کے
ڈھانچے میں تبدیل ہوجائے، اور جہاں اب سوائے لاشوں کے اور کوئی زندہ جسم نظر
نہ آئے۔ انسانی جانوں کی بربادی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک معمولی سی [illegible] عمارت میں
آگ لگ جانے سے ستر جانیں فوراً تلف ہوگئیں۔ کوئی گھر ایسا بچا کہ جس میں کوئی نہ کوئی جان
نہ ضائع ہوئی ہو۔

جاپان نے گذشتہ تہائی صدی میں بڑی ترقی کی اور قریب قریب ہر شعبہ میں اپنے مغربی
اقوام کے ہم پلہ ہونے کی کامیابی کے ساتھ کوشش کی تھی۔ جاپان پر گذشتہ کبھی زلزلے
اتنی تباہی و بربادی نہ آئی تھی جتنی کہ اس آخری زلزلے سے۔ انسانی جانوں کی بڑی تباہی
کی وجہ یہ ہوئی کہ ٹوکیو اور یاکوہاما میں لندن کی طرح گیس کے نل بچھے ہوئے تھے جو زلزلے
کے دھکوں سے پھٹ گئے اور جن کی وجہ سے مکانات میں آگ لگ گئی۔ اگر جاپان کے شہر اتنے
مغربی تعیشات سے آراستہ نہ ہوتے تو شاید گذشتہ زلزلوں کی طرح اس قدر جانیں تلف نہ ہوتیں۔
جاپان کی مغرب پرستی کا اس وقت ایشیا کی سادہ زندگی اور سیدھی معاشرت سے مقابلہ کرو تو
دونوں کا فرق نہایت ہی عبرت انگیز نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جاپانی قوم کو قدرت نے زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کی
مصیبتوں کو برداشت کرنے کی کچھ ایسی قوت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اس سے زیادہ اساں نہیں

ہوتے۔ اور تباہی کے بعد فوراً ہی تعمیر میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ زلزلہ کے بعد ہی فوراً ٹوکیو کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے ساتھ اتحاد عمل کے لئے رعایا سے ایک شاہی پیام میں درخواست بھی کی گئی ہے، یہ کمیٹی جلد سے جلد اسکیم اور خاکہ تیار کرنے کے بعد تعمیر کا کام شروع کرے گی۔ جاپانی گورنمنٹ ایسے تباہی کے موقعوں پر اپنی رعایا کے ساتھ جس قدر مراعات اور آسانیاں بہم پہونچا سکتی ہے کبھی دریغ نہیں کرتی چنانچہ گزشتہ زلزلہ کے بعد سے حکومت نے جہاز اور ریل کے سفر کو مفت کر دیا ہے۔ اور تباہ شدہ حصہ سے کوریا فارموسا، یا چین جانے والے کو کچھ نہیں خرچ کرنا پڑتا۔ اسی طرح سے مصیبت زدہ حصوں میں تمام ذرائع باربرداری کا مفت انتظام ہے۔ ڈاک خانہ، تار ٹیلیفون وغیرہ بھی پبلک کے استعمال کے لئے عام کر دئیے گئے ہیں اور کسی قسم کا محصول یا معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ تمام سرکاری ٹیکس اٹھا لئے گئے ہیں۔ گورنمنٹ نے ۹۰ لاکھ ین جو قریب ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے ہوتا ہے امداد کیلئے منظور کئے ہیں۔ شاہی خاندان نے بھی اپنی جیب خاص سے ایک کروڑ ین بدیں غرض عطا کئے ہیں۔ دوسرے ممالک سے بھی برابر امداد پہونچ رہی ہے خصوصاً اس موقعہ پر برطانیہ اور امریکہ اپنی ہمدردی اور فیاضی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ امریکہ نے تو چالیس کروڑ ڈالر کی امداد منظور کی ہے۔ اور برطانیہ کی خاطر غریب ہندوستان سے بھی لارڈ ریڈنگ صاحب بالقابہ جاپان ریلیف فنڈ میں روپیہ وصول کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جاپان پر ہمدردی کا جادو چلانا مقصود ہے۔ اور یہ "سیاسی" ہمدردیاں آیندہ کی کسی تجارتی مراعات کی پیشنگوئی کر رہی ہیں ورنہ برطانیہ اور امریکہ کو تو ایک پیسہ بھی کسی ایسی "قوت" کی امداد کے لئے خرچ کرنا گوارا نہ ہوتا جو کم سے کم ایشیائی تجارت پر اپنا اقتدار چاہتی رہی ہو۔

جاپان میں زلزلے اسی قدامت کے ساتھ سُنے جاتے ہیں جس قدامت پر جاپانی قوم نازاں ہے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ سب سے پہلا زلزلہ جاپان میں ۲۸۶ سنہ قبل مسیح میں آیا تھا اسی زلزلے کے بعد کوہ فوجی یامہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سطح زمین پر نمود

ہوا۔ جھیل بیوا بھی جس کا اس سے قبل کہیں نام و نشان بھی نہ تھا صفحہ زمین پر پائی گئی۔ تاریخ قدیم میں یہ واقعات نہایت ہی اہمیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا زلزلہ غالباً بہت عرصہ کے بعد یعنی سنہ [illegible]ء میں آیا۔ اور اُس کے بعد پندرہ صدی کے عرصہ میں یعنی سنہ [illegible]ء جاپان میں کل ۱۴۹ زلزلے آئے جن میں ۵۳ سنہ ۱۵۰۰ء کے قبل آئے۔ ان زلزلوں کا خاص شکار ہمیشہ شہر کیوٹو رہا ہے جو ہر مرتبہ بالکل مسمار ہو گیا ہے۔ برخلاف اس کے یڈو ٹوکیو، اس عرصہ میں صرف ایک دفعہ زلزلہ محسوس کیا گیا۔ اور ناگاساکی میں دو مرتبہ۔ ناگاساکی کے یہ دونوں زلزلے صرف تین سال کے عرصہ میں یعنی ایک سنہ ۱۷۲۳ء میں اور دوسرا سنہ ۱۷۲۵ء میں آیا۔ اور ہر مرتبہ شہر بالکل برباد ہو گیا اور ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا۔

بارہویں صدی میں صرف ایک مرتبہ سنہ ۱۱۸۵ء میں زلزلہ آیا۔ کیوٹو میں کثیر نقصانات ہوئے اور لاکھوں انسان فنا ہو گئے اور مسطح حصے غاروں میں تبدیل ہو گئے۔

تیرہویں صدی میں کل سترہ زلزلے محسوس کئے گئے۔ جس میں سے سنہ ۱۲۹۳ء میں جو زلزلہ آیا اُس میں اکیس ہزار آدمی ضائع ہوئے۔ چھ سال بعد سنہ ۱۲۹۹ء میں دوسرا زلزلہ پھر آیا اور اُس میں بھی دس ہزار انسانوں کی جانیں گئیں۔ اسی طرح اسی صدی میں ایک معمولی سے زلزلہ میں ایک مندر کے گر جانے سے پچاس پوجاری دب کر مر گئے۔

چودہویں صدی میں آٹھ زلزلے آئے۔ جو قریب قریب اپنی بربادکن نوعیت میں ایک دوسرے سے سبقت لے گئے۔

سمندر کا پانی ان زلزلوں کی وجہ سے چڑھ آتا تھا ساحل پر جو شہر آباد تھے اُن میں ایک عجیب طوفان خیز حالت ہو جاتی تھی۔

پندرہویں صدی میں پندرہ زلزلے آئے۔ اور مثل سابق کے کثیر نقصانات کے باعث ہوئے۔

سولہویں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں کل ۳۶ زلزلے آئے۔ اور یہ سب

نہایت ہی تباہ کن تھے۔ ۳۰ اگست ۱۷۹۲ء کا زلزلہ عجیب و غریب تھا زلزلہ کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی لوگ سنبھلے بھی نہ تھے کہ چار روز بعد پھر یعنی ۴ ستمبر کو دوبارہ زلزلہ آیا۔ جاپانیوں کا خیال ہے کہ یہ زلزلے ہیدے یوشی کی جو اُس وقت حکمراں تھا۔ بد اعمالیوں کے عذاب تھے۔ ہیدے یوشی ایک ٹیلہ پر جا کر پناہ گزیں ہوا اور دنیاوی زندگی چھوڑ کر راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

جب ہم اٹھارہویں صدی کے زلزلوں کو شمار کرتے ہیں تو چودہ زلزلے صرف ۱۸۸۰ء تک آ چکے تھے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریب قریب ہر پانچ سال کے بعد ایک زلزلہ آیا۔ ان میں ۱۸۵۰ء کا زلزلہ سب سے زیادہ مہیب تھا۔ جبکہ زلزلہ کے بعد ہی فوجی یامہ نے آگ اور دھوئیں کی بارش شروع کر دی، جو ۱۶ دسمبر ۱۸۵۰ء سے ۲۲ جنوری ۱۸۵۱ء تک برابر جاری رہی۔ یہ ایک عجیب و ہولناک عذاب الہیٰ تھا۔ جس کی تپش میلوں تک جاتی تھی۔ گرم راکھ جلتے ہوئے کوئلوں اور لاوے کا طوفان کئی میل رقبہ کو محیط کئے ہوئے تھا۔ اس کے بعد ۲۲ دسمبر ۱۸۵۴ء کو پھر ایک زلزلہ آیا جس کی وجہ سے کیوٹو کے کئی بڑے بڑے کارخانے اور بہت سی عمارات کا نقصان ہوا اور ہزارہا آدمی مر گئے۔

اس کے بعد پھر ۱۸۵۵ء میں دوسرا زلزلہ آیا۔ جس کا سب سے زیادہ اثر اس مرتبہ ٹوکیو پر پڑا۔ گو ٹوکیو ایک سال قبل کا تباہ شدہ تھا تاہم سال بھر کے اندر دوبارہ تباہ ہونے کیلئے بہت کچھ تعمیر ہو چکا تھا۔ چنانچہ چودہ ہزار مکانات، چھ سو فائر پروف گودام اور ایک لاکھ چار ہزار نفوس پھر زلزلہ کی زد میں آ گئے۔ اس کے بعد پندرہ سال تک کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ مئی ۱۸۷۰ء میں پھر آیا۔ اُس کے بعد ۱۸۸۰ء تک تین زلزلے اور آئے جس میں سے ۱۲ فروری ۱۸۸۰ء کا سب سے زیادہ سخت تھا۔ جس نے یاکوہاما کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں ایک معمولی سا زلزلہ محسوس ہوا۔ جس سے شہر کوب اور ساحل کے دوسرے شہروں میں نقصانات ہوئے۔ ۲۰ جون ۱۸۹۴ء کا آخری زلزلہ

تھا۔ اس سے بھی یاکوہاما اور ٹوکیو کو سب سے زیادہ برباد کیا۔ ان دونوں شہروں نے اسی زلزلے کے بعد سے نئی مغربی صورت اختیار کرنی شروع کی۔

جاپان کی سر زمین پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے کہ مسلسل زلزلوں کی وجہ سے جاپان نے بڑے بڑے ملکی نقصانات اٹھائے ہیں۔ مسطح زمین پہاڑ بن گئی۔ کہیں جھیلیں پیدا ہو گئیں۔ غرضیکہ اس قسم کی تبدیلیوں کا بہت کچھ سراغ ملتا ہے۔ تاہم جاپان نے ان زلزلوں سے فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ ۱۷۹۶ء میں جب زلزلہ آیا تو اس کے بعد اوسوشما (Oosushima) کا خوبصورت جزیرہ سطح آب پر نمودار ہوا۔ جو آج کل یورپین باشندوں کے لیئے ایک نہایت ہی دلچسپ فرحت افزا تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔ اسی طرح سے جزیرہ ہانگو کو بھی ایک زلزلے کے بعد جاپان کو قدرت نے عطا کیا اور سمندر سے اوپر نکال دیا۔ تواریخوں میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ کسی ٹیلہ پر ایک کسان کی جھونپڑی تھی۔ شب میں زلزلہ آیا۔ ٹیلہ مسطح زمین بن گیا۔ صبح کو کسان اٹھتا ہے تو اپنی جھونپڑی کو بجائے ٹیلہ کے ایک میدان میں پاتا ہے متعجب ہوتا ہے۔ مگر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ شب میں زلزلہ آیا تھا تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کی جھونپڑی اپنی اصلی جگہ پر ہے۔

جاپان کا یہ آخری زلزلہ جو یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر کو ۲۹ برس کے بعد نمودار ہوا اور جس نے یکایک وہ تمام کوششیں ملیامیٹ کر دیں جو جاپان نے اپنے شہروں کو مغربی رنگ میں لانے کے لیئے کی تھیں، تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس غیبی بربادی نے دو منٹ کے اندر ان تمام عشرت گاہوں، عیش و نشاط کے محفل خانوں، تفریحی مقامات، تھیٹروں، بڑے بڑے کارخانوں اور گوداموں کو اس طرح خاک سیاہ کر دیا کہ جہاں ہزارہا انسانوں کی چہل پہل رہتی تھی آج سوائے بیجان لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا! یہ خدا کی کرشمہ سازیاں ہیں، اور اس کے جبروت و ملکوتیت کی بدیہی مثال۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء

محمد جعفری

رفتار تعلیم

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھتیسواں (۳۶) اجلاس آیندہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام علی گڑھ ہوگا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اس کے صدر ہوں گے۔ ہندوستان کے اطراف واکناف سے علم دوست حضرات مدعو کئے گئے ہیں مختلف مضامین پر مشاہیر ہند کے لیکچر بھی ہونگے اسی سلسلہ میں کچھ نمائش کا انتظام بھی کیا گیا ہی جس میں پرانے کتبات، قلمی نسخے، اور شاہی فرامین دکھائے جائیں گے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کیا جائے گا۔ کانفرنس کے گزشتہ کارنامے بیان کئے جائیں گے۔ آیندہ ترقی بھی پیش نظر ہوگی۔ تعلیم نسواں اور تعلیم ابتدائی کے وسائل اور ذرائع بھی زیر بحث ہوں گے۔ مختلف تجاویز و ترمیمات بھی پیش ہونے سے نہ رہیں گی، غرض اس چند روز کے عرصہ میں بہت کچھ ہونے کی امیدیں بندھی ہیں۔ "مسلم قوم" منتظر ہی کہ اس کے مرض کی دوا یہیں سے ملے گی۔ ہر شخص آنکھیں اُٹھائے ہوئے ہی کہ شاید آیندہ کے لئے کوئی سامان پیدا ہو، خود حضرات شرکا بھی سمجھتے ہوں گے کہ آئے ہیں تو کچھ کر ہی جائیں گے۔ فی الحال تو ہم بھی انھیں کے ساتھ اپنی امید وابستہ کرتے ہیں اور نتیجے کے منتظر ہیں۔ دسمبر کے پرچہ میں ہم انشاء اللہ کانفرنس کی کارروائیوں اور ان کے آیندہ نتائج پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر سکیں گے۔

کہا جاتا ہی کہ نپولین اور واشنگٹن کو فوج میں ہزار ہا سپاہیوں کے نام یاد تھے۔ روزولٹ اور لنکن (ہر دو امریکہ کے پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں) کو ہر بات جو انھوں نے کبھی پڑھی یا سنی، زبانی یاد تھی۔ پاسکل مشہور سائنس داں کو پوری انجیل بر زبان تھی شیکسپیر کو ۱۵ ہزار الفاظ اور ملٹن کو ۸ ہزار الفاظ یاد تھے، غرض ہر بڑے شخص کے قوت حافظہ ایک مخصوص عنصر رہا ہی اور جیسا کہ بیکن نے کہا ہی "علم کیا ہی؟ فقط اشیار کی یاد داشت

لیکن اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حافظہ صرف بڑے اشخاص کا حصہ ہے، جو عام آدمی کو میسر نہیں آتا۔ ہزارہا اشخاص عام طور پر ایسے ملیں گے جو اپنی غیر معمولی یادداشت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ غرض اکتسابی طور پر بھی کوئی شخص چاہے تو اپنی قوت حافظہ کو بڑھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ویلیشن نے آٹھ چھوٹے چھوٹے قاعدے بتائے ہیں جن کی مدد سے قوت حافظہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

قاعدے یہ ہیں۔

۱۔ اپنے خیال میں یکسوئی پیدا کرنے کی عادت ڈالو۔

۲۔ کسی چیز کا خیال قائم کرنے کے لئے جتنے حواس کام میں لا سکتے ہو، لاؤ۔

۳۔ جو قوت دماغی کمزور ہو، اُس کو رفتہ رفتہ باقاعدہ مشق سے بڑھاؤ۔

۴۔ کسی چیز کے متعلق جو پہلا خیال قائم ہو، اُسے مستحکم کرو۔

۵۔ اپنے قائم کردہ خیالات کو باربار دُہراتے رہو (ایکٹروں کو جو کھیل وہ کئی بار کھیل چکے ہوں انھیں کچھ کچھ عرصہ کے بعد دہرانا چاہیئے۔

۶۔ اپنی یادداشت پر اعتماد رکھو۔ نوشتہ چیزوں اور دوسروں کی یادداشت پر بھروسہ نہ کرو۔

۷۔ اشیاء کے خیال قائم کرنے میں جو جو صورتیں اور جن جن طریقوں سے ہو سکے، قائم کرو۔ کسی چیز کے یاد رکھنے میں، کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ کہاں، کب، کیسے، اور کیوں آئی؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ اس قسم کے جتنے سوالات ہوں پیش نظر رکھو۔

۸۔ اپنی اس مشق کو عملی اور مفید بناؤ۔

اس کے متعلق خود راقم الحروف کا ایک تجربہ ہے ایک شخص نے انھی اصولوں کی بنا پر دعویٰ کیا کہ "بیس مختلف چیزوں کے نام ایک ساتھ لو اور میں اسی ترتیب کے ساتھ انھیں یکے بعد دیگرے بتا دوں گا۔" چنانچہ بیس نام جنمیں باہم کوئی ربط نہ تھا اور اکثر ان میں سے نامانوس اور مشکل تھے ان میں سے ایک لفظ "عاقرقرحا" بھی تھا لیے گئے اس پر مستزاد یہ کہ

شخص مذکور اس ملک کا باشندہ نہ تھا بلکہ یورپین تھا لیکن دو منٹ تک آنکھیں بند رکھنے کے بعد اس نے اسی ترتیب سے تمام نام یکے بعد دیگرے سنا دیئے۔ بعد میں اس نے اسی راز کو افشا کیا اور کہا کہ میں ہر چیز کی ایک تصویر اپنے ذہن میں قائم کرتا تھا اور دوسری چیز سے اُسے اسی خیالی تصور کی بنا پر جوڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے ذہن میں بیس اشیاء کا ایک قابل تصور سلسلہ بن گیا۔ اور اس دو منٹ میں آنکھ بند کرکے میں نے اس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر ان قائم کردہ ذہنی تصویروں کی بنا پر اس سلسلہ کی مدد سے تمام اشیاء کے نام یکے بعد دیگرے بیان کر گیا"
اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتانا منظور تھا کہ "تعلیم" نہ صرف محسوس طریقہ اور مرئی اشیاء کے ذریعہ ہو سکتی ہے بلکہ غیر محسوس طریقہ سے بھی ممکن ہے اور "رفتار تعلیم" میں بہت کچھ ترقی کی جا سکتی ہے۔

یوں تو ہندوستان میں کم و بیش ساڑھے تین سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں چند ایسی ہیں جن پر علمی زبان کا صحیح معنوں میں اطلاق ہو سکتا ہے۔ انہی میں سے ایک مرہٹی زبان بھی ہے جسے ہندوستان کی تمام دیسی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ علاوہ اس کے زبان مذکور نظم و نثر کے لحاظ سے بھی دوسری زبانوں میں خاص مرتبہ رکھتی ہے اس زبان سے متعلق جتنی انجمنیں اور مجالس کام میں برابر مصروف ہیں ان میں سے ایک مجلس تراجم دکن بھی ہے۔ اس کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ جس زمانہ میں دکن میں پیشوا کی حکومت تھی، اس وقت پنڈتوں اور علمی اشخاص کو حکومت کی طرف سے قریباً ایک لاکھ روپئے بطور وظائف (جنھیں "دکشنا" کہتے تھے) ملا کرتے تھے۔ جب انگریزوں نے مرہٹی علاقہ برطانوی ہند کے ساتھ ملحق کر لیا تو ماؤنٹسٹورٹ الفنسٹن (جو غالباً ہندوستان کی مشہور "الفنسٹن ہسٹری" کے مصنف ہیں) نے وہ رقم مشرقی علوم کی ترقی کے لیے وقف کر دی چنانچہ دکشنا پرائز کمیٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی جو مصنفین و مترجمین کو اس رقم سے معاوضہ دے کر

کام کراتی تھی کچھ عرصہ کے بعد ہماری "انجمن ترقی اُردو" کی طرح یہ کمیٹی بھی بیکار ہوگئی لیکن مرہٹی لٹریچر کی خوش نصیبی سے ۱۸۹۴ء میں مجلس تراجم دکن نے اس کی جگہ لے لی۔ آیندہ خیال یہ ہو کہ اس مجلس کے ساتھ مزید علمی حضرات کا اضافہ کرکے اس کا نام اکاڈیمی آف مرہٹی لٹریچر رکھ دیا جائے تاکہ مرہٹی زبان میں تصنیف وتالیف کا کام مستقل طور پر ہو سکے۔

امید ہو کہ قدر شناساں ریختہ اور حامیان اُردو اس کے پڑھنے کے بعد اپنی زبان کی "رفتار ترقی" پر بھی غور فرمائیں گے۔

کچھ عرصہ قبل ترک منشیات کی جو تحریک امریکہ نے اُٹھائی تھی، اس کے خلاف سب سے بڑا عذر جو پیش کیا گیا، وہ کوئی اخلاقی یا مذہبی نہ تھا بلکہ سراسر دنیوی پہلو لیئے ہوئے تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی آمدنی سے جو معقول رقم آتی ہو وہ تعلیم پر صرف کی جاتی ہو اور اس بنا پر ان کو اندیشہ تھا کہ اس لعنت کے دور ہو جانے سے ایک بڑی برکت ہاتھ سے چلی جائے گی۔

اسی طرح تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جب ترک منشیات کی کوشش کی جا رہی تھی، ہندوستان کے بعض "حامیان تعلیم" نے بھی وہی سبق دُھرایا کہ "محکمہ آبکاری کے بند ہو جانے سے ہندوستان کی تعلیم پر بُرا اثر پڑے گا لیکن شاید وہ یہ دیکھ کر کہ حکومت امریکہ نے قبل از تحریک اور اس کے بعد میں تعلیم پر کس نسبت سے صرف کیئے، کیا جواب دیں گے؟ اس کے لیئے اعداد حسب ذیل ملاحظہ ہوں:۔

اس دوبرس میں	سال	مصارف
اس دوبرس میں شراب کی بکری کم ہوئی	۱۹۱۶ء	۶,۴۰,۷۱,۷۰,۵۳ ڈالر
	۱۹۱۸ء	۷۶,۳۶,۷۸,۰۵۹ ڈالر
اس سال کم تھی	۱۹۲۰ء	۱,۰۳,۶۱,۵۱,۲۰۹ ڈالر

یہ تو ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حال ہو۔ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا اندازہ اعداد

بل سے کیجئے۔

	سال	اخراجات	عطیات
اس دو برس میں شراب کی بکری کم ہوئی تھی	سنہ ۱۹۱۶ء	۱۱۳۸۱۵۰۸۴۸	۱۹۷۷۶۳۶۳ ڈالر
	سنہ ۱۹۱۸ء	۱۳۷۰۵۵۴۱۵	۱۶۷۴۶۱۴۰ ڈالر
اس سال کم نہ تھی	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۸۹۲۳۵۲۴۲	۵۰۹۰۶۷۵۲ ڈالر

سر جے، سی بوس کی شخصیت ہندوستان کے دور حاضر میں، اپنی مثال نہیں رکھتی، نہ صرف یہی بلکہ آپ کا شمار دنیا کے مشہور ترین ماہرین سائنس میں ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب آپ یورپ تشریف لے گئے تو رائل سوسائٹی نے آپ کو اپنا فیلو بنانا فخر سمجھا۔ پیرس میں مشہور سائنس دانوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ وائنا اور برلن میں آپ کے علمی کاموں کو نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ بوس انسٹیٹیوٹ ہے جو چھ سال سے پیشتر آپ نے کلکتہ میں قائم کیا۔ اس میں کوئی ایک درجن اشخاص تحقیق و تفتیش کا کام نہایت محنت و سرگرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ سر مائیکل سیڈلر نے اس انسٹیٹیوٹ کے متعلق ایک بہت اچھا فقرہ کہا ہے "یہ وہ چراغ ہے جس سے ہزاروں اشخاص نشان راہ پائیں گے۔"

ان دونوں کے تعارف کے بعد ہم سر جے۔ سی بوس کی ایک تازہ ترین تحقیق ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آپ نے گزشتہ ہفتہ یونیورسٹی کالج، میں پیش کی ہے۔ آپ نے بسلسلۂ تحقیق نباتیات ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے پودا اپنی خوراک از خود لے سکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جدید آلہ کی اختراع سے آئندہ طب پر جو اثر پڑے گا اس پر علمی رایل سوسائٹی کے کسی خاص اجلاس میں غور کیا جائے گا۔

مطبوعات جدیدہ

افادات مہدی یہ کتاب دورِ جدید کے مشہور انشا پرداز ایم مہدی حسن (جنھوں نے ابھی حال میں وفات پائی ہے) کے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو ان کی بیگم صاحبہ نے مقدمہ، سوانح مصنف اور چند ضمیموں کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ چونکہ خود کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ اس لیئے مضامین کے انتخاب اور ان کی ترتیب و تالیف میں کماحقہ لحاظ نہیں پایا جاتا ہے۔ لیکن "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک"۔ "ادب اردو کے عناصر خمسہ"۔ "فلسفہ حسن و عشق" اور "اُردو لٹریچر کا نفس واپسیں" نیز دیگر مضامین جو اپنی وقتی اور ہنگامی اہمیت کے علاوہ آج بھی ذوق سلیم کے لیئے خاص لطف اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ مضامین ایسے ملیں گے جن کی زبان علمی حیثیت سے نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے۔ مصنفین نے گزشتہ دور اور جدید انگریزی داں طبقہ کے متعلق لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں :۔

> "یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ جو بساط ابھی دیکھتے دیکھتے اُٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی مالک تھے وہ قریب قریب ایسے تھے جنھیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اور جن کو مغربیت کچھ یونہی چھو گئی تھی لیکن ان کی قوت اجتہادی کا منظر وہ معرکۃ الآرا سلسلہ ادب ہے جو ورثہ میں وہ ہمارے لیئے چھوڑ گئے ہیں بہرحال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی بہت ہی لائق افسوس ہے"

اور جو مضامین خالص ادبی ہیں وہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں "فلسفہ حسن و عشق" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

> "آہ عورت! تو فسانہ زندگی ہے۔ تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہے، بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں!"

گنجائش نہیں اس لیے علمی و ادبی رنگ کے یہ اقتباسات بطور مشتے نمونہ از خروارے مختصر آپیش کیے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مصنف ایک دلکش اسٹائل کے موجد تھے جو اپنے ساتھ لائے اور سیتے گئے۔ نئی اصطلاحات مثلاً "قاموس الاسلام" (Encyclopaedia) اور "تنقید عالیہ" (Higher Criticism) اختراعی ترکیبیں جیسے "پنجتن آصفی" (اردو کے عناصر خمسہ کے لیے) "خاتم المصنفین" (مولینا شبلی کے لیے) نیز انگریزی ترکیبیں مثلاً "شائقین ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیے" یا "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" یہ چیزیں مصنف کی خصوصیات میں سے بعض جنھیں وہ اپنے ساتھ لائے اور لیتے گئے۔ بہرحال یہ مجموعہ اب بھی اخلاف کے لیے شمع راہ کا کام دے سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے اسے جلد شائع کرکے اردو زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا، شروع میں مصنف مرحوم کا ایک فوٹو بھی ہے۔ ملنے کا پتہ،

مہدی بیگم، محلہ سنت پورہ گورکھپور

ماہ نو: یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی "ششو" کا اردو ترجمہ ہے جسے حامد اللہ افسر صاحب، بی۔ اے نے کیا ہے۔ اصل کتاب مختصر نظموں کا ایک مجموعہ ہے اور بہ لحاظ مضمون بچوں کے جذبات و حسیات اور ان کے خیالات کا ایک مرقع ہے۔ یوں تو ٹیگور کی نظر میں ع

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن خدا کا جلال اور اس کی معرفت اسے جتنا ایک بچے میں نظر آتی ہے شاید اور کسی چیز میں مشکل سے معلوم ہوتی ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس کے اکثر قصے اور افسانے بچوں کے متعلق اور انھیں کے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں۔ اصل زبان یعنی بنگالی بھی جہاں تک معلوم ہوا ہے، بہت سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ ایسی کتاب کا ترجمہ بلاشبہ اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ خود مترجم نے بھی سلاست زبان اور عام فہمی کی کوشش کی

گو بعض جگہ یہ رشتۂ خیال ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف اگر "پیٹر"، "تالی" (بمعنی کنجی)، "مسکراہٹ"، "جٹا"، "چترائی"۔ اور "کونے" جیسے سادہ الفاظ پائے جاتے ہیں تو دوسری جانب "مضطرب"، "مستعار"، "موسیقیت" "پرداز"، "طلائی مشجر"، "اسرار معنی خیز" اور "بزرگ خورد سال" جیسے الفاظ اور ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مترجم صاحب آیندہ تالیفات میں اس کا لحاظ رکھیں گے کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی قسم کی ہے۔ قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ، منیجر انڈین بک ڈپو۔ اندر کوٹ شہر میرٹھ۔

دخترِ سمرنا | یہ کتاب خالدہ ادیب وزیر تعلیم انگورہ کے ناول "قمیص من نار" کا اردو ترجمہ ہے جسے مولوی غلام ربانی صاحب لودھی (علیگ) نے کیا ہے اور جسے "صوفی پبلشنگ کمپنی" نے شائع کیا ہے۔ سلسلہ عبارت میں کہیں کہیں اس قسم کے فقرے اور ترکیبیں آجاتی ہیں مثلاً "میں گھر کی طرف خط لکھ رہا ہوں"۔ "میری والدہ نے مکان کو یورپین طرز پر سجایا ہوا تھا" "البتہ تمھارے انتظار میں ہوں کہ تم آؤ اور اکٹھے ہجرت کریں" جس سے عام زبان میں ایک اجنبیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہرحال نفس واقعہ ناظرین اردو کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں اور کتاب اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس کو پڑھ کر ناظرین ترکی معاشرت و سیاست سے یک گونہ آشنا ہو جائیں گے۔

لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ صفحے ۱۷۶ قیمت عہ ملنے کا پتہ صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، پنڈی بہاء الدین، پنجاب

سپاہیانہ زندگی | اکبر شاہ خاں صاحب، نجیب آبادی کی یہ تصنیف ہے مصنف نے سپاہیانہ کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو یعنی سادگی لباس وطعام، ایثار نفسی اور ایفاء وعدہ کو اس میں شامل کر لیا ہے اور خود ایک "مورخ" ہونے کی حیثیت سے تاریخ عالم سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل انبیاء کرام

اور دیگر نامور اشخاص اور بعد میں خود آنحضرت صلعم، خلفائے راشدین اور سلاطین کے سوانح سے شجاعت و بہادری کے واقعات پیش کیے ہیں۔ ایک باب میں قرآن سے بھی استدلال کیا ہے۔ آخر کے چند صفحات میں ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں معائب گنائے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مصنف کا مقصد مشہور اشخاص کے حالات زندگی اور واقعات تاریخی پیش کرنا تھے یا ہندوستانی سوسائٹی کے عیوب بیان کرنا۔ بہر حال عنوان کتاب کا لحاظ نہ کیا جائے اور تاریخی واقعات کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کتاب فائدہ سے خالی نہیں۔ طباعت و کتابت معمولی صفحے ۱۴۶، قیمت عہ صوفی پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاء الدین پنجاب نے شائع کیا۔

شرح درد اشتیاق

(از جناب عابد حسین صاحب بی۔ اے۔ از برلن)

میں رخِ امکاں کا رنگِ زرد ہوں　　آفرینش کا دلِ پر درد ہوں
زیست کے آئینۂ دل کا غبار　　مرگ کے نقشِ قدم کی گرد ہوں
تھا عدم کی آنکھ میں اک قطرۂ خوں　　سینۂ ہستی میں آہِ سرد ہوں
مجھ کو لائے ہیں مری مرضی بغیر　　یعنی میں آمد نہیں آورد ہوں

چوں مرا در دارِ دنیا کردہ اند
پس پشیمانند بیجا کردہ اند

اے خوشا روزے کہ میں معدوم تھا　　بے نیازِ ہستیٔ موہوم تھا
نقش میرا سطحِ امکاں پر نہ تھا　　لوحِ قدرت پر مگر مرقوم تھا
ہیں مشیت کے جو معنی دہر میں　　میری ہستی کا وہی مفہوم تھا
رشکِ صد ایجاد تھا میرا عدم　　سب سے پنہاں تھا اُسے معلوم تھا

از شرابِ شوق جامے داشتم
در دلِ ساقی مقامے داشتم

آ کے اس بازیچۂ اسباب میں　　پڑ گیا ہوں سخت پیچ و تاب میں
بحر کی وسعت نظر سے چھپ گئی　　موج کے ہمراہ ہوں گرداب میں
آنکھ کا پردہ ہی خود حسدِ نظر　　مبتدی ہوں معرفت کے باب میں
رکھ لیا محرابِ طاعت اس کا نام　　سجدہ زن ہوں طاعت محراب میں

سوئے موجودات مائل گشتہ ام
از مآلِ کار غافل گشتہ ام

میرا مونس تھا ابد انجام عشق — اصل سے ہٹ کر ہوا بدنام عشق
تھا نوا سنج سکونِ دائمی — دہر میں ہے مورثِ آلام عشق
شورشِ تخئیل کو کہتے ہیں حسن — اضطرابِ قلب کا ہے نام عشق!
چشمِ بینا۔ اور یہ نادار حسن! — قلبِ صافی۔ اور یہ ناکام عشق

دردمندی را کہ سازد چارہ ساز
وائے بر گمراہیِ عشقِ مجاز

باعثِ تسکیں مگر ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
اتحادِ نور و ظلمت تابہ کے — چند لحظہ۔ چند ساعت چند سال
پھر وہی آہنگِ سیرِ لامکاں — پھر وہی سودائے حسنِ لازوال
قید صورت سے ملے گی پھر نجات — شاہدِ معنی سے پھر ہوگا وصال

مرغِ جاں را آشیانے دیگر ست
زیں مکاں را ہم مکانے دیگر ست"

عابد

قیدِ ناگزیر

(از نتائج فکر جناب مولوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

شب کے اخیر حصہ غفلت میں یک بہ یک　　جب ساری کائنات ہو آغوشِ خواب میں
کھلتی کبھی ہو اور جھپکتی کبھی پلک　　اک التہاب ہو دلِ پُر اضطراب میں

جس طرح آبدانِ بر آتش میں جوشِ آب　　خمیازہ ہائے نشتر عناصر لیئے ہوئے
آنکھوں میں مستحیل کچھ آنسو ہیں یا گلاب　　خونِ جگر سے دعوتِ مژگاں کیئے ہوئے

کیوں؟ دل میں یہ کھٹک ہو کسی گل عذار کی　　دل آب آب جس کے ہوا ہو فراق سے؟
یا آگئی ہے یاد کسی جاں نثار کی　　یا آگئے ہیں آنکھوں میں اشک اتفاق سے؟

کچھ بھی نہیں وہ ہائے کہاں ہم کہاں وہ دل　　کیسی کسی کی یاد یہ سب اک خیال ہو
ماضی کی حسرتیں غمِ آیندہ جاں گسل　　اس قیدِ ناگزیر سے چھٹنا محال ہو

آزاد عظیم آبادی

غزل

از تازہ افادات مولانا محمد علی مدظلہٗ

گلہ اے دل! ابھی سے کرتا ہے؟ — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے؟

جان دیتا ہے عیشِ فانی پر — بس اسی زندگی پہ مرتا ہے؟

راحتِ جاوداں کو بھول گیا — کوئی دنیا میں یہ بھی کرتا ہے؟

عشق بن گر جئے تو خاک جئے — زندہ وہ ہے جو اُس پہ مرتا ہے

نام پر اُس کے سب جوڑے بیٹھا — وہی اِک ہے جو نام کرتا ہے

وقفِ مومن ہے آزمائشِ عشق — اس میں پورا وہی اُترتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کیا — وہی ناکام کام کرتا ہے

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان — کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

قولِ مومن ہے اُس کے فعل کی شرح — وہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے

مطمئن رہ، دلا، وہ جانِ جہاں — وعدہ کرکے کہیں مکرتا ہے

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ — یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے!

آج کر لو جو کر سکو، کل تک — کون جیتا ہے، کون مرتا ہے؟

قلزمِ عشق میں گرا سو گرا — اس کا ڈوبا کہیں اُبھرتا ہے؟

اِس قدر احتیاط، اے صیاد! — کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے؟

وہی دن ہے ہماری عید کا دن — جو تری یاد میں گزرتا ہے

مئے اسلام کا بھلا، جوہر!
نشہ چڑھ کر کہیں اُترتا ہے؟

اگست سنہ ۱۹۲۲ء

غزل

(از مولانا حسرت موہانی)

ظر اُس رُخ پہ ہے ادب کے خلاف
ل ہے اس فیصلہ میں سب کے خلاف

کچھ بھی ہم اُن سے کہہ سکے نہ کہیں
ناخوشیہائے بے سبب کے خلاف

ُکرِ غم تابعِ خمار نہیں
ستیٔ بادۂ عنب کے خلاف

آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں
بیرخیٔ وعدہائے شب کے خلاف

حُسنِ جاناں کے عہد میں حسرت
شوق ٹھہرا ہی ماوجب کے خلاف

تواریخ صلح لوزان کانفرنس

(نتائج فکر جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری اڈیٹر اخبار "سعید")

۱

(در صنعت زبر و بنیات غیر منقوط)

صلح کردہ کمال کامل — عادل۔ محمود عصر و ہمدرد
حامد را کرد ملہم الہام — صلح حاصل مراد دل کرد

۱ ۳ ۴ ۱

۲

(در صنعت زبر بقاعدہ معمولی غیر منقوط)

مالکِ ملکِ دو عالم کرد مسلم را عطا — صلحِ کامل، دارو درد دل و آرام دل
مصرع سالِ حصولِ صلح آمد در دلم — سرور و سالار صالح کرد حاصل کام دل

۱ ۳ ۴ ۱

۳

(در صنعت زبر و بنیات بغیر صنعت غیر منقوط)

اے کمال اکملِ عصری لاریب — عادل و شیر دل و دریا دل
ناخنِ زیرکی و ہمتِ تو — حل کند عقدۂ کارِ مشکل
صلح در مجلسِ لوزان کردی — بحقیقت شدہ فتحے کامل
حامد اندر زُبُر و بنیہ گفت — کردۂ فتح بینے حاصل

۱ ۳ ۴ ۱

تاریخ رہائی مولانا محمد علی

(در صنعت زبر و بینات)

آن محمد علی رہبرِ ہند — عزّتِ قوم را علم بردار
کہ بر اسلام و مسلماں کردہ — وقف مال و متاع و جاہ و وقار
ہم سرِ خویشتن بکف دارد — کہ کند بہرِ دینِ خویش نثار
چوں ز قیدِ فرنگ شد آزاد — گشت مسرور قلبِ حامدِ زار
گفت تاریخ بنیات و زبر — باشد آزاد سرورِ سالار

۱۹۲۳

شذرات

'مغربی تہذیب' کہئیے یا 'تمدن جدید' اس کے معائب و نقائص پر گزشتہ ربع صدی کے اندر مشرق میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور اب تک زبان و قلم اس تہذیب کی ہرزہ گوئی سے تھکے بھی نہیں۔ جنھوں نے مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا، ان کی نظر میں مغرب 'بیگانہ از دین مذہب' اور 'مادیت کا مجسمہ' نظر آیا۔ جنھوں نے اخلاقی عینک لگا کر اس تہذیب پر نظر ڈالی انھیں اس کا ہر ہر جزو 'مخرب اخلاق' دکھائی دیا۔ جنھوں نے اس کی معاشی زندگی کا مطالعہ کیا انھیں سرمایہ و مزدور باہم گردست و گریباں نظر آئے اور بعض نے اس کے سیاسی نظام کو دیکھا انھیں یہ تہذیب 'روبہ زوال' اور اندر سے 'کھوکھلی' معلوم ہوئی۔ غرض جس نے جس پہلو سے دیکھا، اُسے یہ تہذیب اور نظام سرتاپا عیب ہی عیب نظر آیا اور مشرق یہ سُن سُن کر خوش ہو رہا تھا اور بعض بہی خواہانِ مشرق تو اس حد تک پہونچ گئے کہ زوال مغرب خود عروج مشرق ہے۔ لیکن شاید مشرق اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اطبائے مغرب ان امراض تہذیب کی تشخیص و علاج سے بھی غافل نہیں۔ ابھی حال میں جرمنی کے ایک فاضل مصنف نے "پان یوروپا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ حسرت کے ساتھ کہتا ہے:۔

> "جہاں بقیہ دنیا دن بدن ترقی کر رہی ہے، یورپ روبہ تنزل ہے، صرف اسی قدر کہہ دینا ایک تفصیل سے کم نہیں"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> "گزشتہ عالمگیر جنگ نے یورپ کے ہر شخص کی سیاسی حالت بدل دی لیکن وہاں کے سیاسی نظام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ آج بھی یورپ میں طوائف الملوکی، جبر و تعدی، بغض و عداوت، معاشی حیثیت سے اختلافات مراتب اور سیاسی

چالوں کا اسی طرح دار و مدار ہے جس طرح قبل از جنگ تھا۔ یورپ کی موجودہ پالیسی آیندہ کی بہ نسبت گزشتہ پالیسی سے زیادہ مشابہ ہے۔ یورپ بجائے مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف کیے ہوئے ہے۔ ہمارے علمی بازار میں بھی تزک سوانح کی زیادہ زور ہے۔ عام مباحثے بھی زیادہ تر گزشتہ جنگ کے اسباب وعلل پر ہوتے ہیں نہ کہ آیندہ جنگ کے انسداد پر۔

"یورپ کا ہمیشہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا ہی اس کے انحطاط اور اختلافات کا اصل باعث ہے۔ یہ اس کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ اسے بدلیں - ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ قدیم یورپ کے باقی ماندہ نشانات پر جدید عمارت کھڑی کر دیں"

فاضل مصنف کے ان ارشادات میں کیا ہندوستان کے لیئے کوئی سبق نہیں؟ ہے اور بہت کچھ ہے بشرطیکہ گوش دل سے سُنیں اور عمل کریں۔

لائق حکیم نے امراض اور ان کی تشخیص ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کا علاج بھی سوچا ہے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ تمام یورپ اپنے اندرونی سیاسی و معاشی اختلافات کو مٹا کر ایک ہو جائے اور ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے لیئے تیار رہے۔ جو راہِ عمل وہ ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں، وہ "پان یوروپا" یعنی "اتحاد یورپ" کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"لوگ یہ سمجھیں گے کہ "پان یوروپا" ایک خیال ہے۔ یہ اعتراض ٹھیک نہیں۔ کوئی قانون قدرت اس کے لیئے مانع نہیں .... ہر بڑے تاریخی کارنامے کی ابتدا 'خیال' ہی سے ہوئی اور خاتمہ حقیقت پر ہوا ..... "پان یوروپا" (اتحاد یورپ) کا مستقبل زیادہ تر ان ابتدائی ہزار اشخاص پر منحصر ہے جو اپنے اعتقاد اور عزم سے لاکھوں کو اس کا قابل بنا دیں اور کل گزشتہ کے 'خیال' کو کل آیندہ کی حقیقت کر دکھائیں۔ میں یورپ کے نوجوانوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فرض کو

انجام دیں"

یہ سب سننے کے بعد ہم تو ان اطبا سے عرض کریں گے کہ آپ یہ دیں چیتے۔ زخم کہنہ ہو کر ناسور کو پہونچ گیا اور اس پر صحت کی امید۔

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

ایم امیل کوئی ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ایک جدید طریقۂ علاج ایجاد کیا ہے اور ہزار ہا مریض ہر روز ان کے شفاخانے پر آتے ہیں اور بے دوا شفا پاکر چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ کرتا ہے کہ مریضوں کو تیس تیس، چالیس چالیس کے گروہ بٹھا کر ان سے کہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر خوب زور سے دبائیں یہاں تک کہ ہاتھ کانپنے لگتا ہے، پھر اس کے بعد ان سے یہ کہتا ہے کہ وہ خیال کریں کہ وہ اپنا ہاتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے اور پھر ان سے کہتا ہے کہ اب چھڑالو لیکن وہ ناکام رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی انھیں یہ سمجھاتا ہے کہ جہاں تم نے یہ سمجھا کہ "میں یہ نہیں کر سکتا" تو اس وقت تمھارے لیے ہاتھوں کا چھڑانا ناممکن ہے۔ اس کے بعد مریض آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور وہ ان سے کہتا ہے کہ اپنے اپنے دلوں میں اطمینان رکھو۔ تمھارے تمام اعضا درست ہو گئے اور تم اب بالکل اچھے ہو گئے اور چلتے وقت ان سے یہ تاکید کر دیتا ہے کہ وہ صبح و شام بیس مرتبہ یہ کہیں کہ "میں ہر ہر نقطۂ نظر سے اچھا ہوتا جاتا ہوں"

بعض وقت جب درد کی شکایت ہوتی ہے تو انھیں یہ نسخہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے یہ کہیں کہ "درد کم ہو رہا ہے، درد کم ہو رہا ہے" اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس علاج کی طرف زیادہ تر امرا کا طبقہ رجوع کرتا ہے اور جو اس شفاخانے میں آتے ہیں، وہ ڈاکٹر اور اس کے طریقۂ علاج کی شہرت و اہمیت سے مرعوب ہو چکتے ہیں۔

یاد ہو گا قدیم ہندوستان میں اور آج بھی بعض قصبات و دیہات میں ہزارہا مریض ایک منتر یا معمولی دعا و تعویذ سے شفایاب ہو جاتے ہیں۔ بہت سے امراض ایسے ہیں جن کے علاج سے اکثر اطبا اور ڈاکٹر عاجز آجاتے ہیں لیکن کسی مقامی یا قریبی دیہات کے ایک معمولی شخص کی 'جھوٹ منتر' اور 'جھاڑ پھونک' سے وہ مریض فوراً اچھے ہو جاتے ہیں۔ مغرب اور مغربی تہذیب کے مشرقی شیدائی اسے "توہم" اور 'جہالت' سے تعبیر کریں گے اور حقارت کے ساتھ معالج اور معالجہ دونوں کو "قرن وسطی" سے منسوب کریں گے۔ لیکن کوئی اور اس کے طریقۂ علاج کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ یہ ناآشنایانِ حقیقت اب تک ان معالجین اور ان کے طریقۂ علاج کے پیچھے پڑے تھے لیکن وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ یہ مرضا کے 'اعتقاد' اور 'یقین' کا نتیجہ تھا جس نے ان کو شفا بخشی۔ یا بعض ماہرین نفسیات کی اصطلاح میں یہ (Sub-Conscious Mind) کا اثر تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۶

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ

(بسلسلہ اشاعت گزشتہ)

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہی۔ خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلّم اکابر نے آپ کے مزار پر چلّے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کیے ہیں چنانچہ دونوں حضرات کے مکانات چلہ کشی ابتک موجود و محفوظ ہیں۔ ملا جامی ان الفاظ میں تصنیف و مصنف کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے ہیں:-

"عالم و عارف بودہ ۔ ۔۔ و بہ صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است۔ صاحب کتاب

کشف المحجوب است، کہ از کتب معتبرہ مشہورہ درین فن است و لطائف و حقائق بسیار در آں کتاب جمع کردہ است[۱]۔

شہزادہ داراشکوہ کے نزدیک فارسی زبان میں تصوف پر کوئی کتاب کشف المحجوب کے ٹکر کی نہیں :۔

"خانوادۂ ایشان خانوادۂ زہد و تقوی بودہ و حضرت پیر علی ہجویری را تصنیف بسیار است۔ اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچکس را برآں سخن نیست و مرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ۔ و خوارق و کرامات زیادہ از حد و نہایت و بارہا بر قدم تجرید و توکل سفر کردہ اند"[۲]

سب سے بڑھ کر قابل استناد و قابل افتخار قول حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کا ہے۔ آپ کا ارشاد تھا، کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔ ایک غیر مطبوع ملفوظ "درر نظامی" میں ہے :۔

"می فرمودند کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری قدس اللہ اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند او را پیدا (؟) شود ... من ایں کتاب را بہ تمام مطالعہ کردہ ام"[۳]

مخدوم موصوف کی اس کرامت کا ذکر متعدد تذکروں میں ہے، کہ لاہور میں آپ نے جو مسجد تعمیر کی تھی، اُس کی محراب میں بہ مقابلہ دوسرے مساجد کے، سمت جنوب میں ذرا کجی تھی۔ علماء وقت اعتراض کیا، کہ سمت قبلہ نہیں رہی۔ آپ نے ایک روز سب کو جمع کر کے خود نماز پڑھائی اُس کے بعد حاضرین سے کہا کہ "خود دیکھ لو کعبہ کدھر ہے" حجابات اُٹھ گئے۔ سب نے دیکھا کہ مسجد کے ٹھیک مقابل ہے۔

---

[۱] نفحات الانس جامی ص۲۸۳ (مطبوعہ کلکتہ) [۲] سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ ص۱۶۴

[۳] درر نظامی، مرتبہ شیخ علی محمود جاندار، نسخہ قلمی

(۲) تصنیف

کشف المحجوب تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں ہے، اور فارسی زبان میں تو اس سے قدیم تر کوئی کتاب تصوف پر دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنی متعدد ابتدائی کتابوں اور اپنی سکونت لاہور کا ذکر کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف آخر عمر میں فرمائی ہے، یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں۔ اسی کتاب کے تقریباً ہمعصر شیخ ابوالقاسم قشیری کا عربی رسالہ قشیریہ ہے۔ موضوع اُس کا بھی تصوف ہی ہے لیکن دونوں کی طرز تصنیف میں فرق یہ ہے۔ کہ امام موصوف نے زیادہ تر متقدمین کے اقوال وحکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے، بہ خلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک محققانہ ومجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات ومجاہدات وغیرہ کو بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، اور مباحث سلوک پر ردوقدح کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ اُن کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعہ حکایات وروایات کی نہیں، بلکہ ایک مستند تصنیف کی ہے۔ صورت تصنیف یہ ہے، کہ کوئی صاحب ابوسعید نامی فرضی یا واقعی سائل ہیں۔ اُنھوں نے حضرت مخدوم کی خدمت میں عرض کی ہے، کہ

"بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوف وکیفیت مقامات ایشان، بیان مذاہب ومقالات آن، واظہار کن مرا رموز واشارات ایشان وچگونگی محبت خدائے عزوجل وکیفیت اظہار آں بر دلہا وسبب حجاب عقول از کنہ ماہیت آں ونفرت نفس از حقیقت آں وآرام روح با صفوت کن وانچہ بدیں تعلق دارد از معاملت آں (ص۶)

ساری کتاب اسی سوال کا جواب، اور انھیں مراتب کی تفصیل ہے۔

مضامینِ تصانیف کے سرقہ میں، معلوم ہوتا ہے، اس وقت کے لوگ بہت جری وبیباک تھے۔ مصنفؒ کو دوبارہ ان لوگوں کے ہاتھوں تلخ تجربات ہو چکے تھے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے مسودہ دیوان مصنف سے مستعار لیا، اور واپس کرنے کے بجائے اپنے نام وتخلص کے ساتھ اس کی اشاعت شروع کر دی۔ دوسری بار یہ اتفاق ہوا کہ ان کی ایک تصنیف فن سلوک

میں منہاج الدین کے نام سے تھی۔ اُسے کوئی شخص اُڑا لے گیا، اُن کا نام کاٹ کر عنوان پر اپنا نام لکھ دیا اور اُس کی تصنیف کو اپنی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا۔ کشف المحجوب کی تصنیف ان تصنیفات کے بعد کی ہے۔ اِس کے آغاز میں اسم مصنف کی تصریح ضروری تھی۔ ان حالات کا ذکر ابتدای سخن میں خود ہی فرمایا ہے:۔

"آنچہ اندر ابتدائے کتاب نام خود ثبت کردم مراد اندر آں دو چیز بود، یکے نصیب خاص و دیگر نصیب عام۔ و آنچہ نصیب عام بود آن ست کہ چوں جہلا این علم کتابے بینند نو کہ مصنف آں بہ چند جاے ثبت نہ باشد نسبت آں کتاب بہ خود کنند، و مقصود مصنف از آں بر نیاید، کہ مراد از جمع و تالیف و تصنیف کردن بجز آں نہ باشد کہ نام مصنف بداں کتاب زندہ باشد، و خوانندگاں و متعلمان وے را دعاے نیکو کنند، کہ مرا ازیں حادثہ افتاد بدو بار۔ یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بخواست و باز گرفت و اصل نسخہ جز آں نبود۔ آں جملہ را بہ گردانید و نام من از سر آں بیفگند و رنج من ضائع گردانید تاب اللہ علیہ۔ و دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف عمرہ اللہ نام آں منہاج الدین۔ یکے از مدعیاں رکیک کہ گراں گفتار نام او نکنند، نام من در سر آں پاک کرد، و نیز دیک عوام چناں نمود کہ آں وے کردہ است، ہر چند خواص بر آں قول وے خندیدندے تا خداوند تعالیٰ بے برکتی آں بدو رسانید، نامش از دیوان طلاب درگاہ خود پاک گردانید" (ص ۲-۱)

اِس سرقہ سے اتنا خائف تھے کہ اسی ایک تصریح پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ درمیان کتاب میں بار بار اپنے پورے نام کی تصریح فرماتے گئے ہیں۔

لاہور کا جو مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، اُس کا ہر صفحہ اغلاط طبع و کتابت سے لبریز ہے بعض مقامات پر عبارت بے معنی ہو گئی ہے۔ بعض مقامات پر حضرت مصنف کے بالکل خلاف منشا معنی نکلتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے، کہ اکثر مقامات پر اسمار اشخاص مواضع بالکل مسخ ہو گئے ہیں۔ دوسرا تکلیف دہ امر پیش نظر نسخہ میں یہ ہے کہ کسی قسم کی فہرست مضامین وغیرہ درج نہیں۔ کتاب

وابواب فصول میں منقسم ہے۔ ہر باب و فصل کے الگ الگ پیراگراف (بند) ہیں۔ لیکن کاتب صاحب
بائی بسم اللہ سے لے کر تائے تمت تک ۳۲۸ صفحہ کی کتاب کا یکساں قلم رکھا ہے۔ نہ کہیں
پیراگراف (بند) توڑا ہے، نہ ایک باب و فصل کے اختتام اور دوسرے کے آغاز کو کوئی
ں امتیاز دیا ہے۔ راقم مضمون نے بطور خود ایک فہرست مضامین اور بعض دوسری فہرستیں
ب کی ہیں۔ جن سے ناظرین کو مطالعہ کتاب میں شاید کچھ سہولتیں حاصل ہو سکیں۔

شروع کے چھ صفحہ (ص۲-۸) بہ طور مقدمہ یا تمہید کے ہیں۔ جس میں سبب تالیف، موضوع
ن، وغیرہ کی تصریح ہے۔ اس کے بعد ترتیب مضامین حسب ذیل ہے:-

(۱) باب الاول فی اثبات العلم (ص۸-۱۴) اس میں علم کی ماہیت، اُس کے فضائل اور
س کے اقسام کا بیان ہے۔ مشہور صوفی حاتم اصم کا قول نقل کیا ہے کہ تمام علوم میں سے

حاتم الاصم گفت رضی اللہ عنہ کہ چار علم اختیار کردم، و از ہمہ علمائے عالم برستم ... یکے آنکہ بدانستم کہ مرا رزقی ست مقسوم کہ زیادت و کم نہ شود، از طلب زیادت برآسودم و دیگر آنکہ بدانستم کہ خدای را بر من حقے ست کہ جز من کسے دیگر نہ تواند گزارد، بہ ادای آں مشغول گشتم۔ سہ دیگر آنکہ دانستم کہ مرا طالبے ست یعنی مرگ کہ از و نتوانم گریخت آں را بشناختم (؟) چہارم آنکہ دانستم مرا خداوندے ست مطلع بر من از وے شرم داشتم و از ناکردنی دست باز داشتم (ص۱۰)

چار چیزوں کا علم میں نے اختیار کر لیا ہے، اور باقی کی حاجت نہیں رہی ... اول یہ کہ رزق کی ایک مقدار مقسوم ہے، جس میں کمی و بیشی نہیں ہو سکتی اس لیے اس میں اضافہ کی فکر سے نجات پا گیا ہوں دوسرے یہ کہ خدا کی جانب سے میرے اوپر جو حقوق عاید ہیں اُن کی بجا آوری میرے ہی ذمہ فرض ہے، اس لیے اُن کی ادائی میں مصروف رہتا ہوں تیسرے یہ کہ میرے تعاقب میں موت لگی ہوئی ہے جس سے کسی طرح گریز ممکن نہیں، اس لیے اُس سے ملنے کی طیاری کرتا رہتا ہوں۔ چوتھے یہ علم ہے، کہ خدا میرے حال کو دیکھتا رہتا ہے اس سے شرم کرتا ہوں۔ اور ممنوعات سے بچتا رہتا ہوں۔

علم صحیح کے لیے علم ظاہر (شریعت) و علم باطن (حقیقت) کی جامعیت ضروری ہے صرف

ایک کا وجود طالب کے لیئے مضر ہوگا۔

ظاہر ورزش معاملت و باطنش تصحیح نیت۔ و قیام ہر ایک ازیں بے دیگرے محال باشد ظاہر بے حقیقت باطن نفاق بود و باطن بے ظاہر زندقہ۔ و ظاہر شریعت بے باطن نقص بود و باطن بے ظاہر ہوس۔ پس علم حقیقت را سہ رکن است یکے علم بذات خداوند تعالےٰ و وحدانیت وے و نفی تشبیہ از وے، و دیگر علوم بہ صفات خداوند تعالیٰ و احکام آں، و سہ دیگر علم بہ افعال و حکمت وے و علم شریعت را نیز سہ رکن است یکے کتاب۔ دیگر سنت و سہ دیگر اجماع امت (ص۱)

.. .. .. ظاہر بغیر امتزاج باطن کے نفاق ہے اور باطن بغیر امتزاج ظاہر کے زندقہ۔ شریعت بلا حقیقت نقص ہے اور حقیقت بلا شریعت ہوس علم حقیقت کے تین ارکان ہیں۔ علم ذات وتوحید و نفی تشبیہ خداوندی۔ علم صفات خداوندی، و علم افعال و حکمت افعال خداوندی۔ اسی طرح شریعت کے بھی یہ تین رکن ہیں۔ قرآن۔ سنت و اجماع امت

علم ذات خداوندی کی تعلیم اس قسم کی آیات قرآنی میں بہ کثرت ملتی ہے:۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىكُمْ۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ

نیز اس قسم کی احادیث نبوی میں کہ مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى رَبُّهٗ وَاَنِّیْ نَبِيُّهٗ حَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَحْمَهٗ وَدَمَهٗ عَلَى النَّارِ۔

علم صفات خداوندی کی جانب رہبری اس قسم کی آیات قرآنی کرتی ہیں۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ فَعَّالٌ

[illegible] وقس علی ذا۔

علم افعال خداوندی کی بابتہ اس قسم کی آیات قرآنی میں اشارہ ہے۔ واللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْن۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ و وقس علیٰ ہذا۔

علم شریعت کے رکن اول "کتاب اللہ سے اعتصام" کی دلیل پر ارشاد حق تعالیٰ ہے۔ مِنْہُ آیاتٌ مُحْکَمَاتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتَاب۔ رکن دوم سنت نبویؐ کی شاہد عدل یہ فرمان ربانی ہے۔ وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ رکن سوم اجماع امت کی دستاویز استنادیہ ارشاد حضرت رسالتؐ ہے۔ لَا یَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَم۔

علم بہ شمول علم شریعت کی اہمیت پر جتنا زور دیا ہے، اُس کا مزید اندازہ اقتباس ذیل سے بھی ہوگا:-

محمد بن فضل البلخی گوید رحمۃ اللہ علیہ۔ اَلْعُلُوْمُ ثَلٰثَۃٌ عِلْمٌ مِنَ اللّٰہِ۔ وَعِلْمٌ مَعَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ بِاللّٰہِ علم باللہ علم معرفت بود کہ ہمہ انبیاء اولیاء اورا بدو دانستہ اند وتا تعریف وتعرف وے نبود ایشان ویرا ندانستند .. .. وعلم من اللہ علم شریعت بود کہ آں از وے بما فرمان وتکلیف است وعلم مع اللہ علم مقامات و طریق حق وبیان درجات اولیاست۔ پس معرفت بے پذیرفت شریعت درست نیاید وورزش شریعت بے اظہار مقامات راست نیاید ہرکرا علم معرفت نیست دلش بجہل مردہ است و ہرکرا علم شریعت نیست دلش بہ نادانی بیمار است (ص ۱۲)

محمد بن فضل بلخیؒ کہتے ہیں، کہ علم کی تین قسمیں ہیں علم من اللہ۔ علم مع اللہ اور علم باللہ۔ علم باللہ علم معرفت ہے، کہ انبیاء و اولیاء نے اُسی ذریعہ سے معرفت باری حاصل کی ہے اور بغیر اس کے انھیں معرفت باری حاصل نہ ہوسکی (یہ علم اکتساب سے نہیں آتا) علم من اللہ علم شریعت ہے، یعنی احکام الٰہی و فرائض عبدیت کا علم۔ علم مع اللہ علم مقامات طریقت، و درجات اولیاء کا نام ہے۔ معرفت بغیر علم شریعت کے قبول کیے درست نہیں ہوسکتی اور شریعت پر عمل بغیر مقامات کے ممکن نہیں۔ جس کو علم معرفت نہیں اُس کے قلب پر جہل کی موت طاری ہے، اور جسے علم شریعت نہیں اُس کا قلب مرض نادانی میں گرفتار ہے۔

اسی تعلیم کی تائید میں بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "میں نے تیس سال تک مجاہدات کیے لیکن کسی مجاہدہ کو علم و تحصیل علم سے صعب تر نہیں پایا" (عَمِلت فی المجاہدۃ ثلثین سَنَۃ فما وجدتُ شیئاً اَشَدَّ عَلیّ مِنَ العلم وَمتابعتہٖ)

اور خود مرشد ہجویریؒ کا بیان ہے کہ طبع انسانی کے لیے آگ پر چلنا راہ علم پر چلنے سے آسان تر ہے، اور ایک جاہل کے لیے پل صراط پر ہزار بار گزرنا اس سے آسان ہے کہ علم کا ایک مسئلہ حل کرے" (ص۱۴)

(۲) باب الثانی فی الفقر (ص۱۴-۲۲) اس باب میں فضائل فقر و مسکنت کا بیان ہے فضائل فقر میں متعدد آیات قرآنی وارد ہیں، مثلاً لِلفُقَرَاءِ الَّذِینَ اُحصِرُوا فِی سَبِیلِ اللہِ لَا یَستَطِیعُونَ ضَربًا فِی الاَرضِ یَحسَبُہُمُ الجَاہِلُ اَغنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (البقرۃ) یا یہ مثلاً تَتَجَافٰی جُنُوبُہُم عَنِ المَضَاجِعِ یَدعُونَ رَبَّہُم خَوفًا وَّطَمَعًا۔ (سورہ سجدہ)

احادیث نبوی میں بھی بہ کثرت فضائل فقر بیان ہوئے ہیں۔ سرور کائناتؐ خود اپنے متعلق دعا میں یہ آرزو کرتے ہیں کہ "اے پروردگار مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکین بنا کر وفات دے اور حشر میں زمرۂ مساکین میں اٹھا" اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز ارشاد باری تعالیٰ ہوگا کہ میرے دوستوں کو حاضر کرو۔ فرشتے عرض کریں گے، کہ "تیرے دوست کون ہیں"؟ جواب ملے گا کہ "فقرا و مساکین" (اُدْنُوا مِنِّی احبائی فیقولُ الملٰئکۃُ مَن احبائکَ فیقولُ اللہُ فُقراء وَالمساکین) عہد رسالت میں فقرا و مہاجرین تھے جو مسجد نبویؐ میں تمام اسباب دنیوی سے قطع نظر کرکے محض عبادت الٰہی کے لیے بیٹھ جاتے تھے، اور اپنی روزی کے لیے محض مسبب الاسباب پر تکیہ و توکل رکھتے تھے

اُن کی خبر گیری اور اُن کی رفاقت کے لیے خود رسول اللہ صلعم کو بارگاہ رب العزت سے تاکید ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا تَطرُدِ الَّذِینَ یَدعُونَ رَبَّہُم بِالغَدٰوۃِ وَالعَشِیِّ یُرِیدُونَ وَجہَہٗ۔ اور ایک دوسرے مقام پر فرمان ملتا ہے۔ وَلَا تَعدُ عَینٰکَ

عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا - اِن تاکیدی احکام نے اُن فقرا و مہاجرین کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا تھا کہ سرورِ کونین جہاں کہیں اُنھیں دیکھ لیتے، تو ارشاد فرماتے "میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، کہ خدا نے تمھارے حق میں مجھ پر عتاب کیا" (ص ۱۴-۱۵)

صفحات مابعد میں فقر کی حقیقت و آداب پر بحث کی ہے، اور غنا کے مقابلہ میں اس کی افضلیت بہ دلیل ثابت کی ہے۔

۳- **الباب الثالث فی التصوف** (ص ۲۲-۳۱) تیسرا باب ماہیت تصوف پر ہے۔

حضرت مصنف، حسب عادت، اس باب کا بھی آغاز قول خدا اور قول رسول سے کرتے ہیں۔ چنانچہ کلام الٰہی میں اُنھیں یہ آیت ملتی ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا - اور احادیث میں سے اس کو پیش کرتے ہیں۔ مَنْ سَمِعَ صوتَ اهلِ التصوفِ فلا يومن على دعائهم كُتِبَ عند الله من الغافلين

اس کے آگے مصنف کتاب اللمع کی طرح، اُنھوں نے بھی تفصیلی بحث لفظ "صوفی" اور اُس کے اشتقاق پر کی ہے۔ لفظ 'صوفی' کی تحقیق میں مختلف مذاہب ہیں۔ ایک گروہ

مردمان اندر تحقیق ایں اسم بسیار سخن گفتہ اند و کتب ساختہ۔ و گروہے از اں گفتہ اند کہ صوفی را برای آں صوفی خوانندہ اند کہ جامہ صوف دارد۔ و گروہے گفتہ اند کہ صوفی را از برائے آں صوفی خوانند کہ از صف اول باشد و گروہے گفتہ اند کہ بداں صوفی گویند کہ تولی بہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کردہ اند۔ و گروہے گفتہ اند کہ ایں اسم از صفا مشتق است و ہر کسے را اندریں معنی اندر تحقیق ایں طریقت	کے نزدیک، چونکہ یہ لوگ جامہ صوف میں ملبوس رہتے تھے، اس لیے صوفی کہلائے۔ بعض کا خیال ہے، کہ لفظ صوفی کا ماخذ 'صف اول' ہے یہ حضرات چونکہ صف اول میں رہتے تھے۔ اس لیے صوفی کے لقب سے موسوم ہوئے۔ ایک گروہ کا مسلک ہے کہ صوفی، اصحاب صفہ سے مشتق ہے۔ اور ایک جماعت، اس لفظ کا اشتقاق لفظ 'صفا' سے بتاتی ہے۔ اور ہر گروہ اپنی تائید میں دلائل و شواہد لاتا ہے، لیکن لغت سے کسی قول کی بھی

لطایف بسیار است۔ اما بہ مقتضائے لغت | تائید نہیں ہوتی۔
ازیں معانی بعید می باشد (ص۲۲)

شیخؒ کے نزدیک "صوفی" وہ ہے، جس کا قلب "صفا" سے لبریز ہے۔ اور "کدر" (گندگی) سے خالی۔ اور اس مرتبہ تک کاملان ولایت ہی پہونچ سکتے ہیں:۔

"صفا ضد کدر بود، و کدر صفت بشر بود، و بہ حقیقت صوفی بود آنکہ او را از کدر گزر بود" (ص۲۳) "صوفی نامے ست کہ مر کاملاں ولایت را و محققاں اولیا را بدیں نام خوانند و خواندہ اند" (ص۲۵)

چنانچہ متقدمین مشائخ طریقت میں سے ایک بزرگ کا قول ہے کہ

مَنْ صَفَاہُ الْحُبُّ فَھُوَ صَافٍ وَمَنْ صَفَاہُ الْحَبِیْبُ فَھُوَ صُوْفِیٌّ (ص۲۵) | جس کو محبت صاف کر دے اُسی پر "صاف" کا اطلاق ہوگا، اور جسے محبوب اپنے لیے صاف کرلے اُسے صوفی سے موسوم کریں گے۔

اہل تصوف کے تین درجے ہیں۔ صوفی^۱، متصوف^۲، اور مستصوف^۳۔ تینوں کی تعریف شیخ ہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے:۔

"صوفی آں بود کہ از خود فانی بود و بحق باقی و از قبضہ طبایع رستہ و بہ حقیقت پیوستہ و متصوف آنکہ بہ مجاہدہ ایں درجہ را ہمی طلبد و اندر طلب خود را بر معاملت ایشاں درست ہمی کند۔ و مستصوف آنکہ از برائے مال و منال و جاہ و حفظ دنیا خود را مانند ایشاں کردہ و ازیں ہر دو چیز ہیچ خبر ندارد، تا حدے کہ گفتہ اند اَلْمُسْتَصْوِفُ عِنْدَ الصُّوفِیَۃِ کَالذُّبَابِ و عند غیرہم کالذیاب۔ مستصوف بہ نزدیک صوفی از حقیری چوں مگس بود و آنچہ کند نزدیک وے ہوس بود و نزدیک دیگراں چوں گرگ بے افسار بود کہ ہمہ ہمتش لختے مردار بود" (ص۲۵)

صوفی صاحب وصول ہوتا ہے، کہ اُسے وصل مقصود حاصل ہو چکا ہے۔ متصوف صاحب اصول

ہوتا ہی، کہ اصل پر قائم رہ کر احوالِ طریقت میں مشغول رہتا ہی۔ مستصوف صاحبِ فضول ہوتا ہی، جس کی قسمت میں حقیقت سے محجوبی اور معانی سے محرومی ہی (ص ۲۵-۲۶)

بعض صوفیہ متقدمین نے 'صوفی'، 'تصوف' کی جو تعریفات بیان کی ہیں، شیخ نے اُنھیں بھی سنداً پیش کیا ہی (ص ۲۶-۲۹) مثلاً

(۱) الصُّوفی اِذا نَطَقَ بانَ نُطْقُہٗ عَنِ الحَقایق وان سَکَتَ نطقت عنہ الجوارح بقَطْعِ العَلَایق (ذو النون مصری)

حضرت ذو النون مصریؒ کہتے ہیں، کہ صوفی وہ ہی کہ جب گفتار میں آتا ہی تو اُس کی زبان اُس کے حقیقتِ حال کی ترجمانی ہوتی ہی۔ اور جب خاموش ہوتا ہی تو اُس کے اعضا شہادت دیتے ہیں کہ وہ علایق کو قطع کر چکا ہی۔

(۲) التصوف نعت اُقیم العبد فیہ قیل نعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقۃً ونعت العبد رسماً (جنید بغدادیؒ)

حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہی، کہ تصوف نام اس صفت کا ہی جس میں بندے کی اقامت ہو۔ لوگوں نے پوچھا، یہ صفت بندے کی ہی یا حق کی؟ جواب دیا کہ حقیقۃً وہ صفت حق کی ہی، بہ ظاہر بندہ کی ہی۔

(۳) التَّصَوّف ترک کُلِّ حَظٍّ للنَّفس (ابو الحسن نوری)

حضرت ابو الحسن نوری کا قول ہی، کہ تصوف تمام حظوظِ نفسانی کے ترک کا نام ہی۔

(۴) الصُّوفیۃ ہم الَّذِیْنَ صفت ارواحہم فصاروا فی الصَّفِّ الاوَّل بین یدی الحق (ایضاً)

انھیں بزرگ کا یہ قول بھی ہی، کہ صوفی وہ لوگ ہیں جن کی ارواح آلایشوں سے پاک ہو چکی ہیں اور وہ بارگاہِ عزت کے حضور میں صفِ اول میں حاضر ہیں۔

(۵) الصُّوفی الذی لا یُملِک و لا یُملَک۔ (ایضاً)

انھیں بزرگ سے یہ بھی منقول ہے کہ صوفی

وہ ہے، جو نہ خود کسی کا مالک ہو اور نہ کوئی اس کا مالک ہو۔

(۶) التصوف رویۃ الکون بعین النقص بل غضّ الطرف عن الکون
(ابو عمرو دمشقی)

ابو عمرو دمشقیؒ ارشاد کرتے ہیں کہ تصوف نام ہے کائنات کی جانب نگاہِ عیب جوئی سے دیکھنے کا، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا۔

(۷) التَّصَوُّفُ شِرکٌ لِاَنَّہٗ صیانۃ القلب عن رُویۃ الغیرِ و لا غیر
(ابوبکر شبلی)

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لئے کہ یہ نام ہے قلب کو غیر سے محفوظ رکھنے کا، درآنحالیکہ "غیر" کا سرے سے وجود نہیں۔

(۸) التَّصَوُّف صَفَاءُ السّرِّ من کدورۃ المخالفۃ
(حصری)

شیخ حصریؒ کا مقولہ ہے کہ تصوف نام ہے قلب کو مخالفتِ حق کی کدورت سے پاک رکھنے کا۔

(۹) الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ
(شبلی)

شبلیؒ سے یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ صوفی دونوں جہان میں بجز خدا کے کسی کو نہیں دیکھتا۔

(۱۰) التصوف اسقاط الرویۃ للحق ظاہراً و باطناً
(علی بن نیشاپوری)

شیخ علی بن نیشاپوریؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف یہ ہے کہ صوفی کو اپنا ظاہر و باطن نظر نہ آئے۔ سب حق ہی حق نظر آئے۔

اسی باب میں اہلِ تصوف کے مزید خصوصیات۔ اُن کے معاملات اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی کو بیان کیا ہے۔

دولت گپتا

دولت گپتا | ۱۔ تیسری صدی عیسوی کے تاریک اور نامعلوم دور کے بعد شمالی ہند پھر ایک زبردست حکومت کے زیر سایہ متحد اور متفق نظر آتا ہے۔ جس کا دارالامارۃ ہندی رودم یعنی پتالی پتر میں تھا۔ یہ حکومت تاریخ میں دولت گپتا کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی ادب۔ حکمت اور فنون لطیفہ کے ساتھ سلطنت گپتا کا نام ابدالاباد تک زندہ رہے گا۔ شاہان گپتا کا دور تاریخ ہند کا بہترین زمانہ تھا۔ اس دور کو ست جگ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا۔

مگدہ کا دوبارہ عروج | ۲۔ والی (ریاست) مگدہ چندر گپت کا عقد لیکاوی قبیلہ میں ہوا تھا۔ چندر گپت کے نسب کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہے۔ بجز اس کے ہم کچھ نہیں جانتے کہ چندر گپت گھالوٹ کلہا کا لڑکا تھا۔ گھالوٹ کے باپ کا نام گپتا تھا۔ لیکاوی قبیلہ کی قرابت نے اس غیر معروف والی ریاست کو ہندوستان کی سیاسی دنیا میں زبردست بادشاہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ چندر گپت معمولی آدمی نہ تھا۔ موقع پاتے ہی ایک معمولی ریاست کو سلطنت کے درجہ پر پہونچا دیا۔ اسی کے ایسے بلند دماغ راجہ کا کام تھا۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ لیکاوی قبیلہ کی قرابت نے اس کی قوت کو عالمگیر بنا دیا ہے۔ اس لیئے اس کے سکوں پر لیکاوی شاہزادے کا نام اس کے نام کے ساتھ نظر آتا ہے۔ سکوں پر راجہ اور رانی کا نام ایک ساتھ دیکھ کر عہد گپتا میں طبقہ نسواں کی منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سنہ ۳۲۱ء میں چندر گپت نے مہاراج دیسراج کا لقب اختیار کیا۔ اس مبارک تقریب کی یادگار میں گپتا سنہ تاریخ کی ابتدا کی گئی۔ یہ سنہ عرصہ دراز تک ہندوستان میں رائج رہا۔ چندر گپت کی سلطنت کے حدود صحت کے ساتھ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن گمان غالب ہے کہ شمالی ہند کا بیشتر حصہ اس کے تحت میں آچکا تھا۔

سمندر گپت | ۳۔ چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا سمندر گپت تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔

اسے ایک متبحر مورخ نے جو صفات کے صحیح استعمال سے اتنا نہیں معلوم ہوتا ہندی نپولین کا لقب دیا ہے۔ بادشاہ ہونے میں سمندر گپت نے شہنشاہی پر کمر باندھی۔ اس منصوبہ کی انجام دہی کے لئے پہلے شمالی ہند اور پھر جنوبی ہند کی تسخیر ضروری تھی۔ سمندر گپت کا سوانح نگار ہری سین اُن ریاستوں کے نام گناتا ہے جو اس اولوالعزم بادشاہ کے ہاتھ پر فتح ہوئی تھیں۔ شمالی ہند سے فارغ ہو کر سمندر گپت نے جنوب کی طرف رخ کیا۔ اور ایسا عجیب و غریب دھاوا مارا کہ بہت کم عرصہ میں جنوبی جزیرہ نما کی انتہائی حد پر پہنچ گیا۔ غالباً کالیداس کے دماغ میں جب اس نے "راگھو کے گھر میں" تصنیف کیا ہے سمندر گپت کے کارنامے ضرور ہوں گے۔ کالیداس کا سمندر گپت کے عہد میں ہونا تقریباً یقینی ہے۔ دکن پر فوج کشی کرنے سے سمندر گپت کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ جنوبی ریاستوں کو مٹا کر قلمرو مگدھ میں شامل کر لے۔ وہ صرف اپنی عظمت و جلالت کا سکہ پورے ملک میں جمانا چاہتا تھا۔ سمندر گپت کا عجیب و غریب دھاوا جو پتالی پتر سے دکن کے مشہور شہر کانچی پورم پر اور کانچی پورم سے مہاراشٹرا پر کچھ ہی دنوں میں انجام دیا گیا تھا۔ دنیا کے قابل ذکر کارناموں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ اس فوجی نقل و حرکت کی تمثیل ہنبل اور نپولین اعظم کے ہاں مل سکتی ہے لیکن ان میں اور سمندر گپت میں اتنا فرق ہے کہ سمندر گپت ان دونوں سے زیادہ کامیاب رہا۔

سمندر گپت کی حکومت کے حدود اربعہ

۴۔ سمندر گپت کی سلطنت کے حدود اربع حسب ذیل قرار دیئے جا سکتے ہیں شمال میں کوہ ہمالیہ جنوب میں کوہ وندھیا، مشرق میں دریائے برہمپتر اور مغرب میں دریائے سندھ اُس کی سلطنت میں گجرات۔ مالوہ اور دوآب کے علاقے شامل تھے شمالی ہند پورا اس کے قبضہ میں تھا اور جنوبی ہند کے راجہ اُسے شہنشاہ تسلیم کرتے تھے اُس کی عظمت ایران کے بادشاہوں کے ہم پایہ ہو چکی تھی۔ شاہانِ پیشین کی تقلید میں اس نے اسومیدھا (گھوڑے کی قربانی) کی رسم ادا کی تھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہندوستان میں اُس کی برابر کوئی دوسرا راجہ نہیں ہے اس تقریب کی شہادتیں اُس کے شاعر سوانح نگار کی تصنیفات میں۔ سکوں میں اور ایک سنگی گھوڑے کی شکل میں جس پر حسب موقع عبارت کندہ

موجود ہیں یہ گھوڑا لکھنؤ کے عجائب خانہ میں تماشہ گاہ خلائق ہے۔

لک غیر سے سمندرگپت
تعلقات

۵۔ آس پاس کی ہمعصر سلطنتوں سے جو ہندوستان کی جغرافوی حد سے باہر تھیں سمندرگپت کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ لنکا کے راجہ لھا ورمدنے اُس کے پاس سفیر بھیجکر لنکا کے بدھ جاتریوں کے لیئے خانقاہ بنوانے کی اجازت ب کی تھی پہلے اس خانقاہ کی عمارت نہایت شاندار تھی اور جب چینی سیاح یو دان چوانگ ندوستان دیکھنے کی غرض سے آیا ہے یہ خانقاہ موجود تھی۔ کابل اور وسط ایشیا کے دشاہوں سے بھی سمندرگپت کے سیاسی تعلقات دوستانہ تھے۔

مندرگپت رزم و بزم
دنوں کا مرد میدان تھا

۶۔ سمندرگپت رزم و بزم دونوں کا مرد میدان تھا وہ خود شاعر تھا موسیقی میں اُسے خاص مہارت تھی اور اہل علم کا سرپرست تھا بعض لیاب سکون میں وہ تخت پر بیٹھا ہوا بین بجاتا دکھایا گیا ہے ایسے سکے اُس کی فن موسیقی کی مہارت زندہ رکھنے کے لیئے نکالے گئے ہوں گے۔ دوسرے گپتا بادشاہوں کی طرح سمندرگپت بھی مذہباً ہندو تھا اس کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ اُسے وید پر عبور حاصل تھا افسوس ہے کہ اُس کے شاعرانہ تصنیفات میں سے ایک بھی باقی نہیں رہی۔

سمندرگپت کا
سوانح نگار

۷۔ سمندرگپت کا سوانح نگار اور ملک الشعرا ہری شین علوم متداولہ میں ماہر تھا ہری شین پراساشک طرز کا موجد ہے۔ باناس ہارشی چرتیا اس کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب متاخر سنسکرت تصنیفات کی طرح کچھ نظم میں ہے اور کچھ نثر میں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ سنسکرت زبان کی پہلی خالص تاریخی تصنیف ہے۔ لیکن باوجود ان تاریخی شہادتوں کے سمندرگپت کا نام فلیٹ کے کتاب گپتا نے دوبارہ زندہ کیا۔ ورنہ زمانہ اسے کب کا بھول چکا تھا۔

چندرگپت ثانی

۸۔ سمندرگپت نے ۳۷۵ء میں وفات پائی اور چندرگپت ثانی اس کا جانشین قرار پایا۔ چندرگپت کے عہد حکومت میں ہندو مذہب کا عروج شروع ہوا۔ اس بادشاہ نے وکرماجیت

کا لقب اختیار کیا تھا وکرماجیت کو رجا تاسا ترو کی طرح عزیز ترین ہندو شاہی نام ہونے کا فخر حاصل ہے۔ چندر گپت ثانی کی فتوحات میں مغربی صوبہ گجرات کی فتح بہت نمایاں ہے۔ ۳۹۵ء میں گجرات کا آخری (ستربپ یا کھترا پا) صوبیدار اور سنہا اس کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔ گجرات زمانہ قدیم سے بحری تجارت کی منڈی بنا ہوا تھا۔ اس کی فتح سے بیشمار دولت چندر گپت ثانی کے خزانہ میں آئی ہوگی۔

دار الامارۃ کی تبدیلی ۹۔ حدود سلطنت کی توسیع سے دار الامارۃ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر گپت کے عہد میں شاہان موریہ کا دار السلطنت چھوٹ چکا تھا۔ اور اس کی بجائے اجودھیا صدر مقام قرار پایا تھا۔ چندر گپت ثانی نے بھی اجودھیا ہی میں بود و باش اختیار کی۔ دار السلطنت منتقل ہوجانے سے پتالی پتر کی رونق ضرور گھٹ گئی ہوگی مگر پھر بھی تذکروں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت متمول اور آباد شہر تھا۔ پتالی پتر کے بعد قدیم ہند کے قرون وسطی میں صوبہ مالوہ کا صدر مقام اُجین بہت بڑا شہر تھا۔ کیونکہ کالیداس نے جو چندر گپت ثانی کا ہمعصر تھا اُجین کی شان و شوکت کا ذکر کیا ہے۔

چندر گپت ثانی کا مذہب چندر گپت ثانی اپنے آبا و اجداد کی طرح مذہباً ہندو تھا۔ لیکن اس میں مطلق تعصب نہ تھا۔ اس کی بے تعصبی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے عہد میں بدھ مذہب پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کی گئی۔ بلکہ برہمنوں کی طرح بدھ مذہب کے نام لیوا بھی شاہی عطیوں سے سرفراز ہوتے رہے۔ چندر گپت کے عہد میں مشہور چینی مسافر فاہیان سیاحت ہند کی غرض سے آیا تھا۔ سنسکرت کی کتابوں میں اس شاندار عہد کی سیاسی و اجتماعی ترقی کا جو تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی مزید تصدیق فاہیان کے سفر نامہ سے ہوتی ہے۔ فاہیان ہندوستان میں ۴۰۵ء سے ۴۱۱ء تک رہا۔ اس عرصہ میں اس نے سنسکرت سیکھی۔ اور بدھ مذہب کی مقدس کتابیں قصے اور روایات جمع کیے۔

کمارگپت اول | ۱۱۔ ۴۱۳ء میں چندرگپت ثانی رہگزائے عالم فانی ہوا اور کمارگپت اول نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس بادشاہ کے عہد کا صرف ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اس نے بھی اسوامیدھا (گھوڑے کی قربانی) کی تقریباً ادا کی تھی۔ جس سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ گپت فرمانروائی کشمیر سے راس کمورن تک مسلم ہوچکی تھی۔ کمارگپت کے اخیر عہد میں قبیلہ رشامتر نے جو غالباً وادی نربدا میں آباد تھا بغاوت کی۔ اسکندگپت کمارگپت کے بیٹے نے جو ولیعہد سلطنت بھی تھا اس بغاوت کو بڑی زحمتوں کے ساتھ فرو کیا۔ ۴۵۵ء میں کمارگپت بیکنڈباشی ہوا اور اس کا بیٹا اسکندگپت تخت پر بیٹھا۔

اسکندگپت | ۱۲۔ بادشاہ ہوتے ہی اسکندگپت کو ہن (تاتاری یا مغول) حملوں کی مدافعت کرنا پڑی۔ تاتاریوں نے (جنھیں مغربی مورخین قوم ہن کے نام سے موسوم کرتے ہیں) ایشیا اور یورپ میں ایک ہی وقت میں خروج کیا تھا۔ جس ملک میں ان کا گزر ہوا خاک اڑنے لگی تباہی اور بربادی ان کے جلوس میں چلتی تھی۔ ان کی ایک شاخ نے سلطنت روما کی دھجیاں اڑادی تھیں۔ ہندوستان میں خاندان گپتا کا اقتدار قیاصرہ سے کم نہ تھا۔ اسکندگپت نے پہلے تاتاری سیلاب کو شکست دے کر کچھ دنوں کے لیے امن وامان کا سامان فراہم کرلیا۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر اسکندگپت کا ستون بھتری ضلع غازی پور میں موجود ہے۔ اس ستون پر کچھ اشعار کندہ ہیں جن میں اسکندگپت کی فتوحات کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ ۴۷۰ء میں تاتاریوں کا دوسرا حملہ ہوا۔ اب کی مرتبہ اسکندگپت کافی مدافعت نہ کرسکا۔ کیونکہ تاتاریوں کے سفاک گروہ اس کے آخر عہد تک بلاخوف وخطر گپتا حدود سلطنت میں گھوما کئے۔ اسکندگپت نے ۴۸۰ء میں وفات پائی۔ اس کے ساتھ خاندان گپتا کا عروج بھی دنیا سے اٹھ گیا۔

اسکندگپت کے اخلاف کی حکومت | ۱۳۔ اسکندگپت کے اخلاف کی حکومت سلطنت کے مشرقی حصہ تک محدود تھی۔ اس کے اخلاف میں بالادتیا کا نام جامع نلندا میں ایک مدرسہ

قائم کرنے کی وجہ سے مدتوں زندہ رہا۔ سلطنت گپتا کے مغربی ممالک تاتاریوں کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اور انھوں نے وسط ہند میں ایک زبردست حکومت قائم کرلی تھی۔ ان کے بادشاہ کا نام تورامانا تھا۔ تورامانا کا جانشین مہیراگولا ہوا یہ نہایت درجہ بیرحم خونریز اور سفاک تھا۔ اس کی دراز دستیوں سے عاجز آکر راجگان ہند بالا دتیا کے جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ راجگان ہند کی اس متحدہ قوت نے ۵۲۸ء میں ہندی تاتاری حکومت کا قلع قمع کردیا۔ بالا دتیا کے بعد کمار گپت ثانی اورنگ نشین ہوا۔ لیکن اس کے متعلق کوئی قابل ذکر بات ہمیں معلوم نہیں۔

سلطنت گپتا کا زوال ۱۴۔ کمار گپت ثانی کے ساتھ دولت گپتا بھی صفحہ ہستی سے ناپید ہوگئی۔ اگرچہ کچھ دنوں تک گپتا خاندان مگدھ میں برسر حکومت رہا۔ لیکن پھر اس خاندان کو شہنشاہی کا دعویٰ کرنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ باقی رسوخ بھی جاتا رہا۔ اور یہ نامور خاندان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ جن کی حیثیت محض مقامی تھی۔ ان ریاستوں کے والی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ان کے حریفوں میں قبیلہ مکاسر کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ قبیلہ اس عہد کے مشہور قبائل میں سے ہے۔ اور گو اس قبیلہ کو بادشاہت نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا تعلق شمالی ہند کے حکمران خاندانوں سے ہمیشہ رہا اس طرح گپتا خاندان ۷۰۰ء تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حاکم رہا لیکن ان خاندانوں کی مقامی تاریخ ملکی اہمیت سے خالی ہے۔

عہد گپتا کے علوم وفنون

عہد گپتا ست جگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۱۔ شاہان گپتا ۳۲۰ء سے ۵۳۵ء تک ہندوستان میں کوس لمن الملک بجاتے رہے۔ ان کا عہد ہندو تہذیب کے معراج کمال کا زمانہ تھا۔ یہی ست جگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شاہان گپتا کی سرپرستی میں علم وحکمت نے ایسی ترقی کی کہ تاریخ ہند میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے چندر گپت ثانی راجہ وکرم کے دربار کی رونق۔ اس

نورتن - اس کی علم دوستی اس اولوالعزم راجہ کی وسیع تر سلطنت اور عظیم الشان شہنشاہی سے
بیں زیادہ مشہور تھی - انہیں باتوں نے اس کا نام صدیوں تک ملک کے گوشہ گوشہ میں زندہ
رکھا - زمانہ سمندرگپت کی فتوحات بھول گیا - لیکن راجہ وکرم کے محبوب نام کا وظیفہ سولہ سو
برس بعد بھی عوام و خواص کی زبان پر ہے

علم وحکمت کی غیر معمولی ترقی

۲ - عہد گپتا میں علم و حکمت نے جو غیر معمولی ترقی حاصل کی تھی - اس میں سے اب
کسی کو شبہ نہیں رہا یہ متفق علیہ امر ہے کہ کالیداس چندرگپت ثانی کے عہد میں
تھا - کالیداس ہندی شاعری کا ملک الشعراء - تغزل اور ناٹک میں لاثانی تھا - اس شاعر کی زندگی
کے حالات بہت کم معلوم ہوسکے ہیں - کالیداس کے کلام میں الحاقی اشعار کثرت سے شامل ہوگئے
- لیکن جس نے کالیداس کا کلام غور سے پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ خس و خاشاک پہلی ہی نظر
نمایاں ہونے لگتے ہیں - کالیداس کی تصنیفات میں سے تین ناٹک شکنتلا - ملاویکا اگنی متر -
م واسیم دو افسانے راگھواشرم - رکمار اسمبھا وام اور دو عشقیہ غزلوں کے مجموعہ
یادتا - اور رتیو سام ہارا موجود ہیں - آخر الذکر نظم غالباً الحاقی ہے اور کالیداس کی تصنیف
ں معلوم ہوتی - کالیداس کی تمام تصنیفات میں شکنتلا کا پایہ بہت بلند ہے - یہی اس کا بہترین
ل سمجھا جاتا ہے - شکنتلا کی خوبیوں کا اعتراف مشہور جرمن شاعر گیٹے نے نہایت موثر اشعار
کیا ہے - میگھا دتیا عاشقانہ رنگ میں مشہور نظم ہے - اس نظم میں ایک عاشق جو بادشاہ کی
خوشنودی سے جلاوطن کر دیا گیا تھا - اپنی محبوبہ کو پیغام بھیجتا ہوا اور تصور میں گفتگو کرتا
دکھایا گیا ہے میگھا دتا سنسکرت کی بہترین عشقیہ مثنوی ہے - غالباً دوسری زبانوں میں
ی ایسی مثنویاں کم ہوں گی - ملاویکا اگنی متر اور وکرم واسیم شکنتلا سے کم رتبہ ہیں - پھر
ی ان سے کالیداس کی قادر الکلامی معلوم ہوتی ہے - اور اس زمانہ کی کوئی دوسری نظم
ن کی برابری نہیں کر سکتی - کالیداس ایک نئی طرز کا موجد ہے - اس کے بعد مدتوں تک اہل علم
س طرز کا تتبع کرتے رہے - اسی کی طرز پر میگھا نے سیو پا لا وادھا اور ہارستا نے

نامی شاستر لکھا ہے۔ لیکن ان میں کالیداس کے رگھوونشم کی نزاکت خیال۔ انداز بیان او
لطافت نام کو نہیں ہے۔ اور کالیداس کی نظموں سے انہیں کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

راجہ وکرم کا دربار

۳۔ پروفیسر سلوین لیوی کے تخیل نے راجہ وکرم کے دربار کا نقشہ ہمارے
لیے مہیا کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکنتلا پہلے پہل دربار میں پیش کیا گیا۔ علم دوست راجہ
فرط خوشی سے بیخود ہو گیا۔ حاضرین مصرعہ مصرعہ پر واہ واہ احسنت و مرحبا کی صدائیں بلند کر
لگے۔ حریف نکتہ چیں۔ متحیر۔ انگشت بدنداں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کالیداس کامیابی
کے آغوش میں انتہائی مسرت کے مزے اٹھاتا ہے کہ حاضرین یکزبان ہو کر کہتے ہیں کہ شعر
میں کالیداس کا ہمسر کوئی نہیں اور کالیداس کے کلام میں شکنتلا سے بہتر نظم نہیں۔ ایسی
کامیابی کسی ناٹک لکھنے والے کو کیوں کبھی نصیب ہوئی ہوگی" یہی رائے زمانہ کی جبلاً بعد جبلاً
و نسلاً بعد نسل رہی۔ ہمیں شکنتلا کے اوصاف سے زیادہ تعجب اس امر پر ہے کہ پانچویں صدی
میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے شکنتلا کی قدر کی۔ اس سے کم از کم طبقہ اعلیٰ کے تمدن و
تہذیب کا حال معلوم ہوتا ہے کالیداس کا کلام شمال و جنوب میں ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا تھا
چھٹی صدی عیسوی تک عام مقبولیت کی بکثرت شہادتیں موجود ہیں۔ جس سے ہم یہ نتیجہ نکال
سکتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ایک ہی تمدن جاری و ساری تھا۔ میگھادوتا کا مصنف
جنوبی ہند کے اکثر مقامات سے بخوبی آشنا نظر آتا ہے۔ اس کی واقفیت آریہ ورت سے
تہذیبی اتحاد پر دلالت کرتی ہے۔

کالیداس کے علاوہ دوسرے ارباب علم

۴۔ کالیداس کی عظمت نے اس عہد کے بہت سے قابل شعرا اور ناٹک نویسوں
کو پردہ خفا میں ڈال دیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک مشہور شاعر بھاشا تھا جو
کالیداس سے کچھ پہلے غالباً ۳۰۰ء میں یا اس سے بھی کچھ قبل گزرا ہے امانی سبھ
جس کی لغت نصاب سنسکرت میں ابھی تک رائج ہے۔ اس زمانہ کا مشہور عالم تھا۔ علاوہ از
مہابھارت کی آخری اصلاح شاہان گپتا کے عہد میں ہوئی تھی۔ اور بعض پر ان کے نسخہ

اسی زمانہ کی تصنیف کئے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔

شاہان گپتا فنون لطیفہ کے قدرداں تھے

۵۔ شاہان گپتا کو فن موسیقی سے خاص شغف تھا شاہ سمندر گپت تو اس فن کا ساحر ہی تھا۔ دربار میں گانے اور دوسرے فنون لطیفہ کی قدر ہوتی تھی۔ شاہان گپتا کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے اس عہد کی شاہی عمارتیں بچ نہ سکیں۔ غارہائے ایجنٹا کی دیواروں پر اعلیٰ ترین مصوری کے نمونے اس عہد کی یادگار ہیں۔ غارہائے الورا کے بعض حصے شاہان گپتا ہی کے عہد میں تیار ہوئے تھے۔ دنیا اس غاروں کی مصوری کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ فن مصوری کا انتہائی کمال بھی ہو سکتا ہے جو ان میں موجود ہے۔ عہد گپتا میں محلات شاہی ہندو مندر اور بدھ خانقاہیں سب ایسی ہی سنگی اور قلمی تصویروں سے مزین ہوں گی۔ چینی مسافر یوان چوانگ لکھتا ہے کہ جامع ملندا کی عمارتیں اس قدر عالیشان تھیں کہ عام لوگ انہیں دیوؤں کی طرف منسوب کرتے تھے جملہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد گپتا میں سنگ تراشی۔ مصوری۔ موسیقی وغیرہ دیگر فنون لطیفہ حد کمال کو پہونچ چکے تھے۔

اس عہد کے اجتماعی حالات

۶۔ خوش قسمتی سے اس عہد کے اجتماعی حالات پر ایک چینی نکتہ شناس کی شہادت موجود ہے۔ جس کا نام فاہیان تھا۔ فاہیان ہندوستان میں بدھ تیرتھوں کی زیارت کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ وہ ان مقدس مقامات میں رہ کر مذہبی معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا منشا اس دور دراز سفر سے یہی تھا کہ مذہبی قصے اور روایات جمع کر سکے اور بدھ کتابوں کے نسخے فراہم کر سکے یہ چینی جاتری ہندوستان میں چھ برس رہا (از ۴۰۵ء تا ۴۱۱ء) اس کے سفرنامہ سے اس زمانہ کی حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ فاہیان کو ہندوستان میں بکثرت شفاخانہ اور سرائیں دیکھ کر جو محض رفاہ عام کے خیال سے بنوائی گئی تھیں سخت حیرت ہوئی اس نے ہر چیز مذہبی عقیدت کی نظر سے دیکھی ہے۔ اس لئے ہندوستان کا ذرہ ذرہ اسے دھرم کے اثر سے متاثر

نظر آیا۔ گو واقعتاً ہندوستان کی یہ حالت نہ تھی۔ بدھ مذہب خانقاہوں اور مدرسوں میں ضرور فروغ پر تھا بدھ خیالات عام طور سے پسند بھی کیے جاتے تھے۔ ارباب علم زیادہ تر گوتم بدھ ہی کے پیرو تھے۔ لیکن عوام زیادہ تر ہندو مذہب پر تھے۔ گو بدھ مذہب کے حسب نخواہ اُصول عام پسندیدگی کے خیال سے ہندو مذہب میں داخل کر نے لگے تھے۔

فاہیان کے سفرنامہ میں ہندوستان کے تمدن کا ذکر

۷۔ سڑکیں اور شاہراہیں چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ و مامون تھیں۔ کیونکہ چھ برس تک فاہیان ہندوستان میں چکر لگایا کیا اور اسے کبھی نقصان اُٹھانا نہیں پڑا۔ فاہیان کا بیان ہے کہ ہندوستان سرسبز اور متمول ملک تھا۔ یہاں کے باشندے عام طور سے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ امن و امان اور اندرونی تحفظ کی وجہ سے جو عام طور سے موجود تھا۔ تجارت۔ صنعتیں اور حرفتیں ترقی پر تھیں۔ حکومت ہند کے چین۔ فارس اور کسی حد تک زوال آمادہ سلطنت روما سے تجارتی تعلقات تھے۔ غرضکہ شاہان گپتا کے عہد میں ہندوستان کی سیاسی وقعت پرانی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

جمہور اور تصویت

(۱) مرضی عام لازوال ہوتی ہے۔

جب تک افراد کی ایک معتدبہ تعداد باہم مجتمع ہو کر اپنے آپ کو ایک واحد جماعت سمجھتی ہے اسکی مرضی بھی واحد ہو گی اس کی مشترک بقا و تحفظ، فلاح و رفاہ عام سے متعلق ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ریاست کے تمام قوائے زبردست اور سادہ اور اس کے اصول صاف اور روشن ہوتے ہیں۔ اس کے اغراض و مفاد میں کوئی بربھی اور تناقض و تصادم نہیں ہوتا۔ ہر طرف نفع عام صاف نمایاں ہوتا ہے جس کے محسوس کرنے کے لئے صرف عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ صلح و امن، اتحاد، مساوات سیاسی عیاریوں کی دشمن ہیں۔ سیدھے سادھے نیک دل لوگ اپنی سادگی کے سبب سے بمشکل دھوکا کھاتے ہیں۔ ترغیب و تملق اور حیلہ و وعدہ کے سبز باغ سے وہ متاثر نہیں ہوتے۔ ان میں اتنی چالاکی بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی چالاکی کا شکار بن سکیں۔ جب دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب قوموں میں ہم دہقانیوں کی ٹولیوں کو ایک شاہ بلوط کے نیچے بیٹھ کر معاملات ریاست کو سربراہ کرتے اور ان کو نہایت دانائی کے ساتھ نبھاتے دیکھتے ہیں تو کیا ہم دوسری اقوام کی تہذیب و شائستگی کی تحقیر کئے بغیر رہ سکتے ہیں جن کی تدابیر اور طلسم و کرشمہ ان کو مصیبت و فلاکت میں ممتاز بنا رہے ہیں۔

جو ریاست اس طرح چلائی جائے اُسے بہت کم قوانین درکار ہوتے ہیں اور اگر کبھی کسی نئے قانون کے نفاذ کی ضرورت ہوتی بھی ہے تو یہ ضرورت عام طور پر ملک میں محسوس اور تسلیم ہو چکتی ہے۔ پہلا شخص جو کسی نئے قانون کی تجویز پیش کرتا ہے صرف اُس رائے کی ترجمانی کرتا ہے جو سب لوگ پہلے سے قائم کر چکتے ہیں اور جس بات کا فیصلہ ہر شخص کر چکتا ہے اس کو قانون کی صورت میں پاس کرنے کے لئے کسی سازش یا زبان آوری و سخن بافی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اطمینان رہے کہ دوسرے بھی اسی کی طرح اس قانون

پر عامل ہوں گے۔

ہمارے مدبرین جس بات سے دھوکا کھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ صرف اُن ریاستوں کو دیکھ کر جن کی بنا شروع ہی سے خراب ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی حکمت عملی ان کے حق میں ناممکن العمل سمجھ لیتے ہیں۔ ایک عیار سخن فروش، ایک کائیاں مقرر اہل پیرس اور اہل لندن کو جن بیہودگیوں پر آمادہ کرسکتا ہے ان کا خیال کرکے یہ حقارت سے ہنستے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ اہل برن کراموبل سے زنداں کی کڑیاں اٹھواتے اور اہل جینوا ڈیوک آف بیوفورٹ سے چکی پسواتے۔

لیکن جب اجتماعی رشتہ ڈھیلا پڑنے لگتا ہے اور ریاست میں ضعف آجاتا ہے، جب شخصی اغراض ومفاد کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ریاست چھوٹے چھوٹے فرقوں یا گروہوں سے متاثر ہونے لگتی ہے تو عام قوم کے اغراض ومفاد کو ضرر پہنچنے لگتا ہے اور ان کی مخالفت ہونے لگتی ہے، مجالس میں اتفاق آرا و اتحاد خیالات باقی نہیں رہتا، مرضی عام عام خلق کی مرضی نہیں رہتی، اختلافات و نزاعات شروع ہوجاتے ہیں اور بہترین تجویز بھی بلا بحث وحجت منظور نہیں ہوتی۔

جب ریاست آخر کار تباہی کے گڑھے کے کنارے پہنچ کر محض نمایشی صورت کے سوا حقیقۃً کوئی چیز نہیں رہ جاتی، دلوں کا اجتماعی رشتہ اتحاد ٹوٹ جاتا ہے، ذلیل سے ذلیل مقصد بے باکانہ قومی بہبود کے مقدس نام میں ملبوس و مشتہر کیا جاتا ہے تو مرضی عام بے زبان ہوجاتی ہے۔ لوگ اپنے خفیہ اغراض کی رہبری میں اپنے خیالات مشہری کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ گویا ریاست کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اور وضع قانون کے نام سے وہ فریب سے نامنصفانہ احکامات صادر کرتے ہیں جن کی علت غائی شخصی مفاد ہوتے ہیں۔

کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مرضی عام فنا یا خراب ہوسکتی ہے؟ نہیں۔ مرضی عام ہمیشہ ثابت اور قائم، غیر متغیر اور خالص رہتی ہے، البتہ یہ اور مرضیوں کے تابع ہوتی ہے،

اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ ہر شخص اپنے اغراض کو قوم کی اغراض سے جدا کرنے کے بعد بھی صاف مشاہدہ کر لیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قوم سے کلیۃً جدا نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ ریاست کو نقصان پہنچانے میں انسان جو حصہ لیتا ہے وہ اس نفع کے مقابلہ میں جو وہ اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے اُسے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ اس ذاتی نفع سے قطع نظر کر کے وہ اپنے اور دوسروں دونوں کے اغراض کے لحاظ سے عام بہبود و فلاح ہی کا طالب ہوتا ہے۔ اگر اپنی رائے (ووٹ) روپیہ لے کر بیچتا بھی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ مرضیِ عام کو وہ دل سے بھلا دیتا ہے بلکہ دانستہ اس سے اغماض کرتا ہے۔ وہ قصور یہ کرتا ہے کہ مسئلہ کی صورت کو بدل لیتا ہے اور سوال کچھ ہوتا ہے وہ جواب کچھ دیتا ہے۔ چنانچہ اظہارِ رائے (ووٹ) کے ذریعہ سے جہاں اسے یہ کہنا چاہیئے کہ "یہ امر ریاست کے حق میں مفید ہے" وہ یوں کہتا ہے کہ "فلاں تجویز کی منظوری فلاں شخص یا فلاں گروہ کے حق میں مفید ہے"۔ غرض قومی مجالس کو جس اصول پر کاربند ہونا چاہیئے وہ چنداں مرضیِ عام کا ثبات و قیام نہیں بلکہ زیادہ تر اس بات کا اطمینان و ایقان ہے کہ ان سے ہمیشہ مشورہ طلب ہوتا رہے گا اور وہ جواب دیتی رہیں گی۔

میں اس موقع پر استقلالیہ کے ہر فعل کے متعلق محض حق الرائے پر بہت کچھ خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ (یہ وہ حق ہے جس سے کوئی چیز شہریوں کو محروم نہیں کر سکتی) اور تقریر، تجویز، تقسیم، بحث کے حق پر بھی جسے حکومت ہمیشہ نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اراکین مجلس کے لئے مخصوص و محدود رکھتی ہے اپنے خیالات ظاہر کرتا مگر یہ اہم بحث ایک علٰحدہ رسالہ چاہتی ہے اور اس ایک رسالہ میں اتنی ساری باتیں قلمبند کر دینا ناممکن ہے۔

۲۔ تصویت[له]

پچھلے باب سے ظاہر ہے کہ جس اسلوب سے معاملاتِ عمومی کا انصرام ہوتا ہے وہ ملت کی حالت اور قوت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے بالکل کافی ہے۔ قومی مجالس میں جس قدر زیادہ ہم آہنگی ہوگی، یا دوسرے لفظوں میں تصویت میں جس قدر زیادہ اتحاد آرا ہوگا، مرضیِ عام

له ووٹ دینا

لو اُتنا ہی زیادہ غلبہ ہوگا۔ لیکن طویل مباحثے، اختلافات اور شور وغل شخصی اغراض کے غلبہ
ور ریاست کے ضعف و انحطاط پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ایسی حالت میں چنداں نمایاں نہیں ہوتی جب کہ ریاست کے نظام اساسی میں
دو یا زیادہ عنصر داخل ہو جائیں جیسے رومہ میں امرا اور عوام، جن کی باہمی آویزشوں نے
اکثر مجلس نظامیہ کو بہترین عہد جمہوریہ میں بھی پریشان رکھا ہے۔ لیکن یہ استثنا محض ظاہری
ہے واقعی نہیں۔ کیونکہ اُس زمانہ میں ملت کے ایک مجہول عیب کی بنا پر گویا دو ریاستیں ایک
میں مدغم تھیں اور جو بات دونوں ریاستوں کے لئے ملا کر جائز نہیں وہ دونوں کے لئے علیحدہ
علیحدہ درست ہے۔ فی الواقع پرآشوب سے پرآشوب زمانوں میں بھی طبقۂ عوام کو اگر مجلس الشیوخ
چھیڑتی نہ تھی تو وہ ہمیشہ صلح و آشتی کا برتاؤ رکھتا تھا اور کثرت آرا اس کی طرف ہوتی تھی
تمام شہریوں کے اغراض ایک تھے اس لئے تمام قوم کی مرضی ایک تھی۔

[illegible]ط الدائرہ کے مقابل نقطہ پر اتفاق و اتحاد دوبارہ عود کرتا ہے، یعنی اُس وقت جب شہری
غلامی میں مبتلا ہو کر حریت اور مرضی دونوں کھو چکتے ہیں۔ اس حالت میں خوف اور خوشامد سے
ان کی رائے (ووٹ) نعرۂ تحسین و آفریں کی صورت میں بدل جاتی ہے۔ لوگ غور و فکر ترک
کر دیتے ہیں اور صرف پوجنے یا کوسنے پر اُتر آتے ہیں۔ شہنشاہوں کے ماتحت مجلس الشیوخ
میں متبذل طرز تقریر جاری تھا بعض اوقات یہ عجیب قسم کی بیہودہ احتیاط کے ساتھ عمل میں آتا تھا
ٹیسٹس کا بیان ہے کہ اوتھو کے ماتحت ارکان مجلس الشیوخ جہاں ویٹیلیس پر لعنت و
نفریں کی بوچھار نازل کر رہے تھے وہاں نہایت وحشت خیز شور و غوغا کرتے تھے جس سے
کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر وہ اتفاق سے ان کا حاکم ہو گیا تو
اُسے یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کس نے کہا تھا۔

ان مختلف ملحوظات سے وہ اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں جس کے مطابق اصوات (ووٹ)
کے شمار اور رایوں کے مقابلہ کا طریقہ مقرر ہو سکتا ہے، اُسی نسبت سے جس سے مرضی عام کی

دریافت دشوار یا سہل ہو اور ریاست زیادہ یا کم زوال پذیر ہو۔

صرف ایک ہی قانون ایسا ہے جو بالطبع متفقہ رضامندی کا محتاج ہوتا ہے اور وہ معاہدۂ اجتماعی ہے کیونکہ اجتماع مدنی دنیا میں سب سے زیادہ ارادی فعل ہے۔ قدرۃً ہر شخص آزاد اور آپ اپنا مالک و مختار پیدا ہوا ہے لہذا کوئی شخص کسی عذر یا بہانہ سے اس کی مرضی کے بغیر اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ یہ قرار دینا کہ ایک غلام کی اولاد غلام ہوتی ہے گویا یہ قرار دینا کہ وہ آدمی کی اولاد نہیں۔

اجتماعی معاہدہ کے وقت اگر کچھ لوگ اس کے مخالف بھی ہوں تو ان کے اختلاف سے یہ معاہدہ باطل نہیں ہوتا بلکہ اس کے سبب سے صرف وہ چند نفوس اس میں شریک ہونے سے رہ جاتے ہیں وہ شہریوں میں اجانب ہوتے ہیں۔ جب ریاست قائم ہوتی ہے تو اس میں مجرد سکونت رضامندی کی دلیل ہوتی ہے۔ اس کی قلمرو میں رہنا اس کے استقلالیہ کو تسلیم کرنا ہے[۵]

اس اولین معاہدہ کو مستثنیٰ کر کے جمہور آرا کی پابندی باقی تمام قوم پر لازم ہے اور یہ خود معاہدۂ کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص آزاد بھی ہو اور غیر کی مرضی کی پیروی پر مجبور ہو۔ ایک مخالف جماعت کے افراد کس طرح آزاد ہو سکتے ہیں جب کہ وہ ایسے قانون کے ماننے پر مجبور رہوں جن پر وہ دل سے راضی نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سوال ہی غلط وارد کیا گیا ہے۔ شہری تو تمام قوانین پر راضی ہوتا ہے یہاں تک کہ ان قوانین پر بھی جو اس کی مرضی کے خلاف وضع ہوں، بلکہ اُن پر بھی جو کسی

---

[۵] یہ صرف آزاد ریاستوں کے متعلق سمجھنا چاہیئے جہاں سے لوگوں کو اپنی مرضی سے اپنا مال و دولت لے کر رخصت ہو جانے کی آزادی حاصل ہو۔ کیونکہ دوسری ریاستوں میں اعزا و اقربا، مال و دولت، بے پناہی، احتیاج، ظلم و تعدی کسی باشندہ کو اُس کی مرضی کے خلاف کسی ملک میں محصور رکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایسی حالت میں اس کی مجرد سکونت نہ معاہدہ پر اس کی رضامندی پر دال ہوتی ہے نہ اس کی خلاف ورزی پر۔ (مصنف)

قانون کی خلاف ورزی پر اسے سزا دلوائیں۔ ریاست کے ممبروں کی غیر متغیر و مستقل مرضی ہی کا نام مرضیِ عام ہے۔ اسی مرضی کی بدولت وہ شہری اور آزاد ہیں[۱]۔ جب مجلس عوام میں کوئی قانون پیش ہوتا ہے تو قوم سے سوال یہ نہیں ہوتا کہ آپ اسے منظور کرتے ہیں یا نامنظور بلکہ یہ ہوتا ہے آیا مرضیِ عام کے جو عین اُن کی مرضی ہے مطابق ہے یا نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے دے کر اس مسئلہ کے متعلق اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے اور رایوں کے شمار سے مرضی عام دریافت ہو جاتی ہے اس لیے اگر میری رائے کے خلاف کوئی رائے مسلّم قرار پا جائے تو اس سے صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ میں برسر غلط تھا اور جس رائے کو میں نے مرضیِ عام سمجھ رکھا تھا وہ مرضی عام نہ تھی۔ اگر میری شخصی رائے مان لی جاتی تو یہ گویا خود میری مرضی کے خلاف ہوتا کیونکہ ایک شہری کی حیثیت سے میری مرضی وہی ہے جو مرضیِ عام۔ تو اس صورت میں میں آزاد نہ ہوتا۔

بے شک اس استدلال میں یہ مفروضہ مان لینا پڑے گا کہ مرضیِ عام کی تمام علامات کثرت آرا میں مضمر ہوتی ہیں۔ جب کبھی یہ نہیں ہوتا تو جو طریق بھی اختیار کیا جائے حریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ قومی مجالس کے مباحثہ و مذاکرہ میں خاص افراد اور خاص خاص جماعات کی مرضی کس طرح مرضیِ عام کی جگہ لے لیتی ہے اس ضمن میں میں اس بے عنوانی کے دفعیہ کی عملی تدبیریں بھی واضح طور پر بیان کر چکا ہوں۔ اور میں آگے چل کر اس مسئلہ پر پھر بحث کروں گا۔ مرضیِ عام کے اعلان کے لیے جس نسبت سے تعداد

---

[۱] جینوا میں ہم زندانوں کے اوپر اور جفاکش غلاموں کی زنجیروں پر لفظ حریت لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس تحریر کا یہ استعمال نہایت موزوں ہے، کیونکہ در اصل کل ریاستوں میں جرائم پیشہ لوگ باشندوں کی حریت کو غارت کرتے ہیں۔ واقعی جس ملک میں ایسے تمام لوگوں سے سخت مشقتیں اُٹھوائی جائیں وہاں کامل ترین حریت نصیب ہوگی۔ (منہ)

درکار ہی میں نے اس کے اصول بھی قائم کیئے ہیں۔ ایک صورت کا فرق بھی اتحاد و ہم آہنگی کے توڑ دینے کو کافی ہی لیکن اتحاد اور مساوات کے درمیان بہت سی غیر مساوی تقسیمیں ہیں جنمیں سے ہر ایک کے ساتھ ملت کی حالت اور ضروریات کے مطابق یہ تعداد متعین ہو سکتی ہی۔

اس نسبت کا ضبط و تعدیل دو عام اصولوں کے ماتحت ہو سکتا ہی۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ اہم و دقیع ہو اُسی قدر زیادہ کثرت آرا کی ضرورت ہی۔ دوسرا یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ عجلت کا محتاج ہو اُسی قدر کم کثرتِ آرا کی تلاش ہونا چاہیئے۔ جس موقع پر فوری فیصلہ کی ضرورت ہو ایک رائے کی زیادتی کافی سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلے اصول قوانین کے لیئے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہی اور دوسرا معاملات کے لیئے۔ خواہ کچھ بھی ہو ان کی مناسبت ترکیب سے ضروری اکثریت کی دریافت کے لیے بہترین معلوم ہو جاتی ہی

قانون کی خلاف ورزی پر اسے سزا دلوائیں۔ ریاست کے ممبروں کی غیر متغیر و مستقل مرضی ہی کا نام مرضیِ عام ہے۔ اسی مرضی کی بدولت وہ شہری اور آزاد ہیں[1] جب مجلس عوام میں کوئی قانون پیش ہوتا ہے تو قوم سے سوال یہ نہیں ہوتا کہ آپ اسے منظور کرتے ہیں یا نامنظور بلکہ یہ ہوتا ہے آیا مرضیِ عام کے جو عین اُن کی مرضی ہے مطابق ہے یا نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے دے کر اس مسئلہ کے متعلق اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے اور رایوں کے شمار سے مرضی عام دریافت ہو جاتی ہے اس لیے اگر میری رائے کے خلاف کوئی رائے مسلّم قرار پا جائے تو اس سے صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ میں برسر غلط تھا اور جس رائے کو میں نے مرضیِ عام سمجھ رکھا تھا وہ مرضیِ عام نہ تھی۔ اگر میری شخصی رائے مان لی جاتی تو یہ گویا خود میری مرضی کے خلاف ہوتا کیونکہ ایک شہری کی حیثیت سے میری مرضی وہی ہے جو مرضیِ عام۔ تو اس صورت میں میں آزاد نہ ہوتا۔

بے شک اس استدلال میں یہ مفروضہ مان لینا پڑے گا کہ مرضیِ عام کی تمام علامات کثرت آرا میں مضمر ہوتی ہیں۔ جب کبھی یہ نہیں ہوتا تو جو طریق بھی اختیار کیا جائے حریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ قومی مجالس کے مباحثہ و مذاکرہ میں خاص افراد اور خاص خاص جماعات کی مرضی کس طرح مرضیِ عام کی جگہ لے لیتی ہے اس ضمن میں میں اس بے عنوانی کے دفیعہ کی عملی تدبیریں بھی واضح طور پر بیان کر چکا ہوں۔ اور میں آگے چل کر اس مسئلہ پر پھر بحث کروں گا۔ مرضیِ عام کے اعلان کے لیئے جس نسبت سے تعدادِ آرا

---

[1] جینوا میں ہم زندانوں کے اوپر اور جفاکش غلاموں کی زنجیروں پر لفظ حریت لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس تحریر کا یہ استعمال نہایت موزوں ہے، کیونکہ دراصل کل ریاستوں میں جرائم پیشہ لوگ ہی باشندوں کی حریت کو غارت کرتے ہیں۔ واقعی جس ملک میں ایسے تمام لوگوں سے سخت سخت مشقتیں اُٹھوائی جائیں وہاں کامل ترین حریت نصیب ہوگی۔ (منہ)

درکاری میں نے اس کے اُصول بھی قائم کیے ہیں۔ ایک صورت کا فرق بھی اتحاد و ہم آہنگی کے توڑ دینے کو کافی ہے لیکن اتحاد اور مساوات کے درمیان بہت سی غیر مساوی تقسیمیں ہیں جنمیں سے ہر ایک کے ساتھ ملت کی حالت اور ضروریات کے مطابق یہ تعداد متعین ہو سکتی ہے۔

اس نسبت کا ضبط و تعدیل دو عام اُصولوں کے ماتحت ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ اہم و وقیع ہو اُسی قدر زیادہ کثرت آرا کی ضرورت ہے۔ دوسرا یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ عجلت کا محتاج ہو اُسی قدر کم کثرت آرا کی تلاش ہونا چاہیئے۔ جس موقع پر فوری فیصلہ کی ضرورت ہو ایک رائے کی زیادتی کافی سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلے اُصول قوانین کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے اور دوسرا معاملات کے لئے۔ خواہ کچھ بھی ہو ان کی مناسبت ترکیب سے ضروری اکثریت کی دریافت کے لیے بہترین معلوم ہو جاتی ہے

امید اور جاہ طلبی

إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ

وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ

قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ میں ایک بردست راز کا اظہار ہے، وہ راز جس کو خدا نے صرف انسان کے ساتھ مخصوص کیا ہے، وہ راز جس کی وجہ سے تمام عالم کون پر اس کو فضیلت دی ہے، وہ راز جس کے پانے کے بعد انسان بڑے بڑے مراتب اور کمال انسانی کے وہ اعلیٰ مدارج حاصل کرتا ہے جن کو عنایت الٰہی نے صرف اسی کے لئے مخصوص کئے ہیں، تم اپنے ضمیر سے مخاطب ہو، اور اس آواز کی طرف کان لگاؤ جو تمہارے اندر سے آرہی ہے، تم اپنے وجدان میں اس وقت ایک قوی میلان اور ایک زبردست جذبہ خواہش کا پاؤ گے جو تمہیں اپنے ابنائے جنس کے قلوب میں طلب عزت اور علو منزلت کے لئے آمادہ کرے گا، اس کے بعد تم قوم کی مجموعی شکل پر نظر ڈالو، وہاں بھی افراد کی طرح تم کو یہ جذبہ ملے گا کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابل سب سے بلند مرتبہ کی مشتاق ہے، دلدادۂ عزت کے لئے اگرچہ اس مقصد کی کامیابی سہل نہیں، لیکن باایں ہمہ وہ اس کی راہ میں تمام مشکلات کا خوشی سے استقبال کرتا ہے، اس کے سامنے ایسی دشوار گزار گھاٹیاں بھی آتی ہیں، جو اسے بڑھنے نہیں دیتیں، لیکن پھر بھی اس کی خواہش میں کوئی ضعف اور اس کے میلان میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی، وہ برابر ان گھاٹیوں کو طے کرتا ہوا، دشواریوں کو برداشت کرتا ہوا منزل عزت کی سمت بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ عزت کی سب سے بلند چوٹی کو پالیتا ہے، جب اس کی راہ میں کوئی زبردست مانع پیش آتا ہے، جو اسے ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہے، تو وہ اس طرح بیتاب و بے قرار ہوتا ہے، جیسے کوئی گرم چٹان پر لوٹتا ہو۔

اگر کوئی عاقل اور واقف کار حکیم انسانی اعمال کی تحقیق پر آمادہ ہو، اور اس کے

ہر فعل کی علت غائی معلوم کرنا چاہے، تو وہ اس نتیجہ پر ضرور پہونچے گا کہ اکثر اعمال انسانی کی غرض و غایت صرف حصول عزت و جاہ ہی، یہ وہ خصوصیت ہی جو ہر قوم کے تمام افراد میں باوجود اختلاف طبقات کے ادنی سے لیکر اعلیٰ تک پائی جاتی ہی، ہر طبقہ میں لوگوں کی یہ باہمی کشمکش عزت کے لیے ہمیشہ جاری رہتی ہی، ہر ایک بلندی کے لیئے جدوجہد کرتا ہی، اور اس بات کی حرص کرتا ہی کہ سب کے دلوں میں وہ اپنی عظمت کا سکہ بٹھاوے، جب وہ اس منزل پر لوگوں کے معیار کے مطابق پہونچ جاتا ہی، تو اس پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے طبقہ کی طرف جست کرتا ہی، اور وہاں بھی سب سے مقابلہ کرتا ہی، یہاں تک۔ کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہی، یہ اس لیئے کہ کمال انسانی کی کوئی مقرر حد نہیں، جہاں پہونچ کر انسان کا نفس قانع ہو جائے، اور یہ اعتقاد کرے، کہ یہ آخری سرحد ہی، اب اس کے آگے کوئی نہایت نہیں، سبحان اللہ، اس جذبہ نے انسان کے دل پر کیا جادو کر دیا ہی، کہ وہ اسی کو اپنا ثمرۂ حیات اور اسی کو اپنے وجود کی غایت شمار کرتا ہی، وہ اپنی زندگی کو بیکار سمجھتا ہی، جب اس عزت کے فقدان اور اس کی پامالی کا خطرہ بھی اس کے دل میں گزرتا ہی، کیا تم نے اس گدڑی پوش فقیر کو نہیں دیکھا؟ جس پر کسی نے ظلم کیا ہی، اور اس کی عزت و آبرو کو خاک میں ملانا چاہتا ہی، وہی فقیر جو اب تک عاجز بے بس نظر آتا تھا، غضبناک ہو کر مرنے اور مارنے کے لیئے طیار ہو جاتا ہی، حالانکہ اس تذلیل نے نہ اس کے کھانے میں کوئی کمی کی، نہ اس کے آرام میں کوئی خلل ڈالا۔ ایک نہیں بلکہ ہر زمانہ میں ہزارہا افراد نے اس عزت کی حمایت میں اپنے کو خطرات میں ڈالا، اور عزیز جانوں سے ہاتھ دھویا، خدا کی عجیب شان ہی، کہ انسان کا کھانا پینا حرام ہو جاتا ہی، نرم اور گدگدا بستر خار دار معلوم ہوتا ہی، جب تک اُس کو یہ یقین نہ ہو، کہ جو کچھ اسے مل رہا ہی، وہ دوسروں سے بڑھ کر ہی، اور یہ کہ لوگ اس کی بلندی کا دل سے اعتراف کرتے ہیں، گویا کھانے پینے کی لذت بھی صرف فخر و مباہات کا وسیلہ ہی پھر اور لذتوں کا

یا شمار کتنی ہیں وہ جسمانی مشقتیں جو انسان نے برداشت کیں؟ کتنی ہیں وہ سفر کی صعوبتیں جو خوشی سے اس نے منظور کیں؟ اور کتنے ہیں وہ جنگ و جدال کے مواقع جہاں وہ سر کو ہتیلی پر رکھ کر لے گیا؟ اور کتنے ہیں وہ حسرتناک مناظر جب انسان کو لذائذ دنیوی سے باوجود قدرت کے کنارا کرنا پڑا ہی؟ یہ سب کس لیئے؟ صرف اس لیے کہ وہ عزت و شہرت کا طالب ہی۔ انسان پر خدا کی کس قدر مہربانی ہی، کہ وہ صرف ناموس و عزت کے لیئے زندہ ہی، اس کی عزت تمام عالم کی عزت ہی، دنیا کی تمام لذتیں صرف عزت ہی کے لیئے بنی ہیں، بلکہ یہ زندگی بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہی، کہ انسان اس کو شاہراہ عزت بنائے، انسان جب اپنی زندگی کو الوداع کہتا ہی، تو اس کی آنکھیں ان چیزوں سے ٹھنڈی ہوتی ہیں، جن کو اس نے کر لیا، اور اس کا دل رنجیدہ ہوتا ہی اُن چیزوں سے جن کے انجام سے وہ قاصر رہا۔

وہ عزت کیا ہی، جس کے لیئے انسان اس قدر دیوانہ وار کوشش کرتا ہی، بڑے بڑے خطرات میں اپنے کو خوشی سے ڈال دیتا ہی، اگر موقع پڑ جاتا ہی تو اپنی عزیز جان کو بھی اس عزت کی دیوی پر قربان کر دیتا ہی؟ یہ عزت وہ انمول گوہر ہی، کہ جس کے نصیب میں یہ آتا ہی، لوگ اس کی سیادت اور حقیقی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے ہاتھوں میں اپنی عنان حکومت سپرد کر دیتے ہیں، یہ قدر و منزلت نہ صرف اس صاحب عزت کو حاصل ہوتی ہی، بلکہ ہر وہ ذات جو اس شخصیت سے متعلق ہی، اُس کے عزیز، اس کا خاندان اور اس کی تمام قوم، یہ درحقیقت ایک بہت بڑا اجر ہی، جو رب العزۃ کی طرف سے کسی انسان کو گوناگوں مصائب کے عوض ملتا ہی، عزت کا طالب جن باتوں میں اپنے لیئے نفع دیکھتا ہی، اُن کے لیے مدبر کائنات کا شکر گزار ہوتا ہی، جس کا خوشگوار نتیجہ اسکی ساری قوم کو ملتا ہی خدا کی یہ کتنی بڑی حکمت ہی، کہ اگر قوم کا ایک فرد بھی حقیقی عزت و حرمت حاصل کرتا ہی، تو ساری قوم کو سیادت کا فخر حاصل ہوتا ہی، اس میں شبہ نہیں

کہ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے، وہ تنہا اپنی کوششوں سے نہیں، بلکہ تمام افراد قوم کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے، (ذالک تقدیر العزیز العلیم) ایک اکیلا محنت کرنے والا کیا کر سکتا ہے، اور اپنی سعی و کوشش کو کیونکر بارآور بنا سکتا ہے، تا وقتیکہ اس کے خاندان و قبیلہ کے لوگ اس کے لیئے دست و بازو نہوں۔ لہذا جو عزت و شرف کے اعلیٰ درجات تک پہونچنا چاہتا ہے، اُس کو ازبس ضروری ہے، کہ وہ خود مع اپنے ساتھیوں کے ہر کمال و فضیلت کے حاصل کرنے کے لیئے بڑھے۔

انسان کے اس فطری میلان اور الہام الٰہی کی خدمت گزاری کس قدر دشوار ہے، کس قدر زبردست ہیں وہ مشکلات جو انسان اپنے بعض مقاصد کی خاطر اُٹھاتا ہے، اور کس قدر عظیم ہے وہ شے جو انسان کو کسی بلند مقصد کے حصول کے لیئے گوناگوں مصائب اٹھانے پر آمادہ کرتی ہے، آخر وہ کونسی شے ہے، جو لوگوں پر ہر مشکل کو آسان، ہر دور کو نزدیک، ہر بڑے کو چھوٹا، اور ہر سخت کو ملائم کر دیتی ہے، مصائب کا خیال لوگوں کے دل سے یکقلم نکال دیتی ہے، اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیئے جانی ہو یا مالی راضی کر دیتی ہے، یہ زبردست محرک، اور نفس کو ہر عمل پر برانگیختہ کر دینے والی برقی قوت امید ہے۔

امید مصائب کی تاریکیوں میں ایک روشنی مشعل ہے، ہجوم مشکلات میں ایک حاذق رہنما ہے، ارادوں میں سستی کے وقت ایک قاہر حاکم ہے اور ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو دوبارا تقویت دینے کے لیئے ایک فرشتہ غیب ہے، امید اُن آرزؤں اور بوالہوسیوں کا نام نہیں جو ذہن میں پے درپے داخل ہوتی رہتی ہیں، اور انسان ان کو ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کاش میرے لیئے سلطنت ہوتی، میرے لیئے جاہ و منزلت ہوتی، حالانکہ وہ عیش و عشرت سے باز نہیں آتا، ملائم بستروں سے ایک گھڑی علحدہ ہونا نہیں چاہتا، اُن ملاہی و ملاعب کو ترک نہیں کرتا، جو ہر آن مقصد سے اس کو دور کر رہے ہیں، گویا یہ شخص چاہتا ہے کہ خدا انسانی اعمال و حرکات میں اس کی خاطر اپنی سنت کو بدل دے، اور اس کی دلی آرزو

محنت و مشقت کے پوری کر دے نہیں، بلکہ امید اس سچی اور حقیقی خواہش کا نام ہے جس کے ساتھ ساتھ عمل ہو، اور انسان کو اس کی راہ مقصود میں آنے والی دشواریوں اور نازل ہونے والی مصیبتوں کے جھیلنے پر خوشی سے آمادہ کر دے، وہ امید جو انسانی قلب میں اس خیال کو راسخ کر دے، کہ بغیر مقصود کے جینا بیکار ہے، وہ سر جو اس بادۂ امید سے سرشار ہے اسکی قربانی کا پہلا قدم نقد جان ہے، دولت و زر کو تو وہ صرف حوادثات عالم سے زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیئے ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

جس طرح بڑھنے کا میلان ایک فطری بات ہے۔ اسی طرح امید اور نفس پر یہ اعتماد کرنا، کہ اس کی کوششیں مقصد تک پہونچانے والی ہیں، قدرت کی ودیعتوں میں سے ہے، اگرچہ دونوں کا وجود عام فطرت انسانی میں مزاحمات و موانع سے خالی نہیں، تاہم ہر ایک اس ودیعت الٰہی کے مطابق ضرور عزت و مجد کی تلاش کرتا ہے، اور دوسروں کے دل میں اپنی جگہ کرنا چاہتا ہے گویا ہر ایک طالب و مطلوب دونوں ہے، عقل انسانی کی مساعی ابھی اس پایئے تک نہیں پہونچی ہیں، کہ وہ ہر فرد کے اس عمل کی تائید کریں، جو وہ دوسروں کے نزدیک ہر دلعزیز ہونے کے لیئے کر رہا ہے، اور اس طرح سے سب کے سب معزز و محترم ہو جائیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ امید و خواہش کی طرح اعمال میں بھی متصادم ہوتے ہیں، اور اس طرح سے ہر ایک کی راہیں بیشمار مشکلات سے پُر ہیں، مگر نوع انسانی کی اس کشمکش میں بھی خدا کی ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے (لیعلم الذین جاھدوا ولیعلم الصابرین) جب کسی فرد یا قوم پر پیہم مشکلات طاری ہوتی ہیں، تو اُس کی ہمت پست ہو جاتی ہے، ارادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے اور انحطاط کا بادل چاروں طرف سے اس پر محیط ہو جاتا ہے، اُس وقت کیا ہوتا ہے؟ اسوقت یہ ہوتا ہے کہ طبیعت انسانی کی اِن دونوں شریف خصلتوں (امید و طلب عزت) میں فساد واقع ہو جاتا ہے، جس طرح اور عمدہ اخلاق و مکارم میں، اور انکی جگہ یاس و حرماں نصیبی لے لیتی ہے۔ نعوذ باللہ منہا۔

ان مایوس اور حسرت زدہ انسانوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ جن کے رشتہائے امید
ایک ایک کرکے سب منقطع ہوگئے ہوں وہ اپنی ذلت کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ ہر بلندی سے محرومیت
اور عاجزی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی دنائت اور ذلت باقی نہیں رہتی
جس کو وہ اختیار نہ کرتے ہوں، اہانت و تحقیر کی ہر ادا انھیں محبوب ہونے لگتی ہے، ان کے تمام
وہ احساسات و جذبات انسانی جو انسان کو انعام سے ممتاز کرتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں
وہ ہر اس شئی سے خوش ہوتے ہیں، جو حیوانات کو خوش کرتی ہے، ان کا سرمایہ حیات بجز چند
کھانے پینے کی احتیاجات کے اور کچھ نہیں، کاش وہ جانور ہی ہوتے، ادھر ادھر چراگاہوں
میں پھرتے، اور سرسبز نباتات سے اپنا پیٹ پالتے، لیکن افسوس ایسا نہیں ہے، وہ اگر اپنے
لیئے کام نہیں کرتے، تو خدا ان پر بطور سزا کے ایسے لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے، جو اپنے آرام
کے لیئے ان کو استعمال کرتے ہیں، بالکل اس جانور کی طرح جو اگرچہ اپنی پیٹھ پر ہزاروں
من کا بوجھ اٹھاتا ہے، لیکن اپنے لیئے نہیں بلکہ دوسروں کے آرام و راحت کے لیئے، کسان
چلچلاتی دھوپ میں دن بھر کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں، مزدور کارخانوں میں ہر وقت لگے
رہتے ہیں اور اس کے علاوہ سیکڑوں محنت و مشقت کے کام لوگ کرتے ہیں، اور اتنی تکلیفیں
اٹھاتے ہیں کہ کوئی اپنے لیئے بھی نہیں اٹھا سکتا، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ آیا ان کو بھی اپنے
پسینہ بہانے کا کوئی عوض ملتا ہے؟ نہیں بلکہ ان کی گاڑھی کمائی کا سارا فائدہ صرف انکی
نذر ہو جاتا ہے، جو اپنی اولوالعزمیوں کی بدولت ان پر حکمراں ہیں، کاش جس قدر ایک ذلیل اپنی
ذلت کے لیئے اعمال شاقہ کی مصیبت گوارا کرتا ہے، اس کا کوئی حصہ بھی وہ عزت و شرف کے
چاہنے میں گوارا کرتا تو یقیناً اسے خاطر خواہ ثمرہ ملتا، حقیقت یہ ہے کہ ان حرماں نصیبوں کا درجہ
حکومت کرنے والوں کے نزدیک حیوانات سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے، اس لیئے کہ وہ بداہتاً
اس کو سمجھتے ہیں، کہ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے خود اپنے کو مقتضائے فطرت انسانی کے مرتبہ
سے گرا دیا ہے، اور اس چیز پر راضی ہوگئے ہیں، جو ان کے حق سے کہیں کم ہے، بلکہ ایسی چیز جو

کبھی اُن کی شایان شان نہیں، اُنھوں نے انسانی شکل میں پیدا ہو کر خدا کی نعمتوں اور ودیعتوں کا جو ہر فرد بشر میں اس نے ودیعت کی ہیں، صاف وصریح کفر کیا ہے، لہٰذا حکمراں ان کے ساتھ وہ وہ روا رکھتے ہیں، جو جانوروں سے ان کے قاصر ہونے کے سبب روا نہیں رکھتے، اس کا مشاہدہ ہم آج ان قوموں سے کر سکتے ہیں جن کو مایوسی نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور غیروں کی غلامی کا جوا ان کے کندھوں پر رکھا ہوا ہے۔

اب تک ہمارا گمان ہی تھا، کہ پہلے ایسی قومیں تھیں جن کے حکمراں انکو طرح طرح سے ستاتے تھے، مگر اب ہم اپنی آنکھوں سے ایسی قومیں دیکھتے ہیں، جن کے حکمراں ان کے ساتھ جانوروں سے بھی زیادہ بُرا سلوک کرتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت ہے، کہ طبیعت کے احکام کیونکر بدل جاتے ہیں، فطرت کے اثرات کیونکر محو ہو جاتے ہیں، کیونکر ایک نفس اس طرح ذلت پر قانع ہو جاتا ہے کہ اُبھرنے کی آرزو نہیں کرتا، اور کیونکر اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ کوئی امید باقی نہیں رہتی، حالانکہ امید اور عزت کی محبت انسان کی طبیعت میں داخل ہیں، غور و تامل کے بعد اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان نے یہ سمجھ لیا ہے، کہ اس کے تمام اعمال و افعال مستقل حیثیت سے صرف اسی کے قوت و ارادے سے صادر ہوتے ہیں، اس کی قوت ہی صرف اس کے تمام اعمال کی حاکم ہے، اس کے اوپر کوئی ایسی قوت نہیں جو اس کی مدد کرے، یا اس کو مجبور رکھے۔ لہٰذا جب بار بار کسی عمل کے لیے اس کے سامنے مواقع پیش آتے ہیں، اور مقصود تک پہونچنے کے لیے بیشمار مشکلات سدراہ ہوتی ہیں، تو وہ اپنی قدرت کی طرف لوٹتا ہے، مگر اس کو مردہ پاتا ہے، قوت کی طرف پھر کر دیکھتا ہے، تو وہ بھی جواب دے رہی ہے، اس وقت وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے بے بس ہو جاتا ہے، اور مایوس و نا امید ہو کر بیٹھ جاتا ہے، یہی ہے وہ منحوس مقام جہاں سے انسان کی ذلت و رسوائی کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے کہ اس وقت وہ اپنے دل میں اس امر کا اعتقاد کر لیتا ہے کہ بس ان

موانع کے لیئے کوئی روک نہیں، جب مانع کی قوت اس کی قوت سے بڑھ گئی، تو اب عمل کے راستے مسدود ہو گئے، لہٰذا اس کی تمام امیدیں یک لخت منقطع ہو جاتی ہیں، اور وہ بدبختی کے جال میں پھنس جاتا ہے، لیکن کہیں اگر اسے یہ یقین ہو کہ کائنات کے پس پردہ ایک اور بھی زبردست مدبر ہے، جس کی عظمت و جبروت کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سر جھکائے ہوئے ہے، زمین کے نامور سلاطین اس کے خراج گزار ہیں، اور وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ تمام کائنات عالم اس کے (کن فیکون) کا ادنیٰ مظہر ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ اس یقین کے ساتھ مایوسی اس پر قبضہ کر سکے، یا نا امیدی اس کی امیدوں کا خاتمہ کر دے، اس لیے کہ ایک یقین کرنے والا جس وقت بھی اپنی کمزوری کا احساس کرے گا۔ یا اپنے ہاتھوں کو کسی عمل کے لیئے شل پائے گا۔ تو خدا کی اس قوت کو کبھی نہ بھولے گا، جو تمام قوتوں سے بالاتر ہے، ایسے ہی وقتوں میں وہ اپنے عمل کو جاری رکھنے کے لیئے، اس قوت کی طرف متوجہ ہوگا، اور مایوسی کو اپنے پاس نہ آنے دے گا، جب جب اس پر سختیوں کا ہجوم ہوگا، وہ اور جوش کے ساتھ اس کی مدافعت کو بڑھے گا، اس لیے کہ اسے اس ہستی کی قوت کا اعتقاد ہے، جس کا کوئی آسمان و زمین میں مزاحم نہیں، ایک دروازہ اگر اس پر بند ہوگا، تو سدہا دروازے خدا کی عنایت و مہربانی سے اس پر کھل جائیں گے، لہٰذا نہ کبھی وہ ملول ہوگا، اور نہ کبھی پست ہوگا، اور نہ کبھی کسی ناکامیابی کا خطرہ اس کے دل میں گزرے گا، وہ سمجھتا ہے کہ مدبر عالم اس پر یقیناً قادر ہے کہ پہاڑوں کو متزلزل کر دے، دریاؤں کو شق کر دے، شہنشاہوں کو گدا بنا دے، اور ایک گدائے بینوا کو تخت شاہی پر سرفراز کر دے، اور بارہا خدا کی قدرت نے اس طرح جلوہ کیا ہے، لہٰذا ہمیں کا ارادہ اور مضبوط ہو جاتا ہے، اور کمال کے حاصل کرنے کے لیئے ہمہ تن مستعد ہو جاتا ہے جس کو کوشش کے بعد خدا نے مرحمت کرنیکا وعدہ کیا ہے، جو شخص خدا اس کی قدرت، اس کی عزت، اور اس کی جبروت پر یقین کامل رکھتا ہے، وہ کبھی مایوس نہ ہوگا، اس لیئے خدا نے اصل حقیقت سے اس کو خبردار کر دیا ہے جسمیں مطلق شک و شبہ نہیں، وہ اصدق القائلین ہے، (انہ لا ییأس من روح اللہ

إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ) اپنے پیغمبر ابراہیم کی زبان سے اسی تعلیم کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتا ہے
(ومن یقنط من رحمۃ ربہ الا الضالون) پس بلاشبہ خدا نے یاس اور ناامیدی کو گمراہی
کی دلیل قرار دی ہے اور اس دل میں کہاں سے یاس داخل ہو گی جو دل خدا اور اس کی
قدرت کاملہ کے ایمان سے بندھا ہے۔ لہذا ہم بانگ دہل یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا کے
ساتھ یقین، اور جو کچھ نبی صلعم لائے اس کی تصدیق کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی گزشتہ
عزت وعظمت کے لوٹانے میں باوجود کثرت تعداد کے رحمت الٰہی سے مایوس ہوں، ان کا ایمان کبھی
یہ نہیں بتاتا کہ وہ توہین کو قبول کریں، اور اپنی ذلت و رسوائی سے خوش ہوں، بلندی و رفعت
کے حاصل کرنے کے بجائے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں، رب العزت کا شکر ہے کہ مسلمان اب تک
اس ابتلاء و آزمائش سے محفوظ ہیں، جو اکثر قوموں کے ساتھ کی گئی، ان کے پاس ابھی سلطنت
بھی باقی ہے، اور ان شاء اللہ ہمیشہ ایک بڑی سلطنت اس زمین پر مسلمانوں کی رہے گی، حق تو یہ ہے
کہ ان پر رحمت الٰہی کے دروازے اب بھی کھلے ہیں، ان کا کام صرف ان میں داخل ہو جانا ہے،
خدا کا ابر کرم ان پر گلاب پاش کر رہا ہے، اس کی خوشبوؤں سے معطر ہونے کے لیے صرف
ایک سونگھنے والی ناک درکار ہے، فرمتیں ہمیشہ ان کو بیدار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہیں،
غافلوں کی تنبیہ کرتی ہیں، سونے والوں کو ہشیار کرتی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کھوئی
ہوئی عظمت کے حاصل کرنے کے لیے بجز اس بات کے اور کوئی بات ضروری نہیں کہ وہ متحد ہو جائیں،
اعزاز ملت کے لیے باہم ایک دوسرے کی اعانت کریں، اور اس کامیابی کا حقیقی راز اسی دینی
اتحاد ہی میں پوشیدہ ہے، پھر کونسی چیز اب یاس کا باعث ہے، اور کونسی چیز ناامیدی کی طرف
بلانے والی ہے، جبکہ ان کے سامنے صاف صاف خدا کی کتاب یہ کہہ رہی ہے، کہ مایوس ہونا
گمراہوں کی صفت ہے، کیا ہدایت وضلالت میں کوئی یگانگت ممکن ہے، اور کیا حق کے بعد صرف
گمراہی باقی نہیں رہ جاتی ہے؟ کیا مسلمان سلاطین دنیا میں حکومت و سیادت کی عزت حاصل
کرکے آج اغیار کی غلامی میں آنے کے لیے خوش ہیں؟ وہ زندگی سے کس بات کی تو

لگائے ہیں، اگر وہ ظالم دشمنوں کے قبضہ میں اس طرح ذلت واعانت، فقر و فاقہ اور بدبختی کی
زندگی پر قانع ہیں؟ وہ مطمئن ہیں، حالانکہ اغیار ان کے دائیں بائیں سرکوبی کے لیئے
موجود ہیں، وہ اغیار جو جفا کار ہیں، ذلیل و رسوا کرنے والے ہیں، اور جنھوں نے اپنے غلاموں
کے متعلق یہ قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ وہ اقوام کی صف میں جگہ نہیں پا سکتے، کیا اس سے
بڑھ کر انسانیت کی کوئی اور رسوائی ممکن ہے؟ اور کیا انسان جب تک اس کی انسانیت سلب
نہ ہو، ایک لمحہ کے لیئے بھی اس ذلت اور بدبختی کی زندگی کو پسند کرے گا، مسلمان کیا وہ زمانہ
بھول گئے، جبکہ دنیا ان کو اپنی آنکھوں میں بٹھاتی تھی، حالانکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا،
گزرا، صفحات تاریخ کی روشنائی ہنوز تازہ ہے، دنیا کے پاس ان کی عظمت کے آثار باقی
ہیں۔ اس وقت بھی زمین پر ان کا شوکت و اقتدار بالکل معدوم نہیں ہوا ہے، بلکہ اب تو
خدا کی مہربانی سے امید کی نئی کونپلیں تمام دنیائے اسلام میں پھوٹ رہی ہیں،

عوام اگر اس قانون الٰہی سے بے خبر ہیں، تو خیر مگر علماء کے لیئے کیا عذر ہے؟ وہ علماء
جو شریعت اسلامیہ کے محافظ ہیں، وہ علماء جو راسخون فی العلم کہلانے کے مستحق ہیں، کیوں وہ
متفرق مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ کیوں وہ ان کے بکھرے ہوئے شیرازے
کو ایک لڑی میں نہیں پروتے؟ کیوں وہ ان خرابیوں کی اصلاح نہیں کرتے، جو انمیں پیدا ہو گئی ہیں کیوں
وہ اپنے امکان بھر مسلمانوں کو تقویت پہونچانے، اور رب العزت والجلال کے ان وعدوں کی
بشارت دینے میں پہلوتہی کرتے ہیں، جو اطاعت شعاری اور ایمان بالجزم کے عوض ان سے کیئے گئے
ہیں؟ یقیناً اب ایک جماعت خدا نے ایسی پیدا کر دی ہے، جن کے سینوں کو ایمان کے لیئے اس نے
کشادہ کر دیا ہے، اور وہ اس عالمگیر مقصد کی تکمیل کے لیئے زمین کے چپہ چپہ میں پھیل گئے ہیں،
ان کا باہمی اتفاق ایک دن ضرور ان کو مرکز واحد پر کھڑا کر دے گا، باقی مسلمانوں سے ہمیں
صرف اس قدر توقع ہے، کہ وہ ان سے اتفاق کرکے ان کی اعانت کریں تاکہ سب کو خدا کی
فتح عظیم حاصل ہو (ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم) مترجمہ سعدالانصاری بنگلہ ملتہ

جشن نوروز اور ایک محفل عروسی

ترجمہ از دستا الفیتکی

""دستا الفیتکی کے نام سے ہمارے ملک میں بہت کم لوگ واقف ہیں اور اس پر کیا موقوف ہے کسی روسی انشاپرداز تک ہماری پہونچ ابھی نہیں ہوئی ہے۔ دستا الفیتکی صرف روس ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بہ حیثیت باکمال افسانہ نویس سحر نگار انشاپرداز اور نفس انسانی کے حقائق و اسرار کے ترجمان کے شہرت رکھتا ہے۔ اس چھوٹے سے افسانے سے اُس کے کمالات کا قرار واقعی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آگے چل کر انشاء اللہ اس قصہ کے مترجم محمد مجیب صاحب بی۔ اے جو روسی ادب سے خاص مذاق رکھتے ہیں اور روسی زبان سیکھ رہے ہیں اس مصنف اور دوسرے روسی ادیبوں کی معرکۃ الآرا کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کریں گے۔""

کچھ دن ہوئے میں ایک شادی میں شریک تھا۔ مگر نہیں میں پہلے ایک نوروز کے جشن کا قصہ سناؤں گا۔ شادی بہت دلچسپ تھی اور مجھے بہت پسند آئی مگر اُس پہلے واقعہ کا ذکر پہلے کرنا چاہیئے۔ عجب بات ہے کہ اس شادی میں شریک ہو کر مجھے وہ نوروز کا جشن یاد آگیا۔ اسکی وجہ یہ تھی۔

پورے پانچ برس ہوئے میں نوروز کے موقعہ پر ایک بچوں کے ناچ میں مدعو تھا۔ صاحب خانہ جنھوں نے مجھے دعوت دی تھی تاجروں کے طبقہ میں بہت ممتاز تھے اُن کے تعلقات بااثر لوگوں سے تھے اور اُن کی ملاقات کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ اکثر طرح طرح کی صحبتیں منعقد کیا کرتے تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بچوں کا ناچ محض ایک بہانہ ہے جس کی آڑ میں انھوں نے ایک معمول سے بڑی جماعت اکٹھا کی ہے تاکہ ہر طرح کی بے ضرر اور دلچسپ گفتگو سے دل بہلائیں۔

میں اس حلقے میں اجنبی تھا اور مجھے اس گفتگو سے بالکل رغبت نہ تھی۔ اس لئے اُس رات کو

کئی بار ایسا ہوا کہ میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ وہاں ایک صاحب اور تھے جو معلوم ہوتا تھا کہ میری طرح یہاں کی صحبتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور محض اتفاقاً بلائے گئے تھے۔ ایک لانبے دُبلے آدمی تھے سنجیدہ طبیعت کے معلوم ہوتے تھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل بہلانے یا خاندان کی خوشی میں حصہ لینے نہیں آئے ہیں۔ جب کبھی وہ کونے میں ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو فوراً ہنسنا موقوف کر دیتے تھے اور اُن کی تیوری پر بل پڑ جاتا تھا۔ صاحب خانہ کے علاوہ وہ اس مجمع میں کسی سے واقف نہ تھے ظاہر ہے کہ اُن کی طبیعت اُکتا گئی تھی مگر اُنھوں نے اس کا ارادہ کر لیا تھا کہ آخر تک ایک شادان و فرحاں مہمان کے انداز کو نباہیں گے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک صاحب تھے جو مفصلات سے ایک نہایت اہم معاملہ کے طے کرنے کے لیئے آئے ہوئے تھے اور ہمارے میزبان کے پاس ایک سفارش کا خط لائے تھے جس کی وجہ سے موصوف نے اُنھیں اپنی حمایت میں لے لیا تھا، اگرچہ خالص محبت کے انداز سے نہیں اور از راہ مہمان نوازی اُن کو اپنے بچوں کے ناچ میں بھی بلا لیا تھا۔ تاش کوئی کھیل نہیں رہا تھا سگار ان کو دیئے نہیں گئے اُن سے باتیں کسی نے چھیڑی نہیں (شاید اس وجہ سے کہ لوگوں نے دور سے پر دیکھتے ہی ایک ویسی مثل کی طرف اشارہ ہی چڑیا کو پہچان لیا تھا اور بیچارے کیا کرتے مجبوراً اپنے ہاتھوں کو کسی طرح مشغول رکھنے کے لیئے ساری شام اپنے گلچھوں پر ہاتھ پھیرتے رہے اُن کے گلچھے دراصل بہت خوبصورت تھے مگر وہ ان پر اس قدر رجوع قلب کے ساتھ ہاتھ پھیر رہے تھے کہ دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا تھا کہ دنیا میں اُن کے گلچھے پہلے آئے تھے اور یہ حضرت بعد میں اُن پر ہاتھ پھیرنے کے لیئے پیدا ہوئے تھے۔ ان صاحب کے علاوہ میری نظر ایک اور صاحب پر پڑی مگر یہ بالکل ہی دوسری قسم کے آدمی تھے۔ وہ نہایت اہم شخصیت رکھتے تھے اور اُن کا نام دمیتری پیٹرووچ نارکن تھا۔ پہلی ہی نظر میں یہ معلوم ہوتا تھا وہ بڑے آدمی ہیں اور ہمارے میزبان سے اُسی قدر برتر ہیں جتنے ہمارے میزبان

گلچھوں والے صاحب سے ہمارے میزبان اور اُن کی بیوی دونوں ہر طرح کی میٹھی میٹھی باتیں
کر رہے تھے۔ بہت ادب سے پیش آتے تھے۔ بار بار شراب کے جام پینے پر مجبور کرتے تھے۔
غرض ہر طرح اُن کی درباداری کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں کو لا کر اُن کے سامنے پیش کرتے
تھے اور اُن کو کسی کے سامنے نہیں۔ میں نے یہاں تک محسوس کیا کہ ایک موقعہ پر جب جناب
نارکن نے فرمایا کہ اُنھوں نے اپنا وقت اتنی اچھی طرح نہیں گذارا تھا جتنا کہ اس بچوں کے ناچ
میں تو ہمارے میزبان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس قدر عظیم الشان آدمی کے قریب رہنے سے
مجھ پر خوف طاری ہوا تھا اس لیے جب میں بچوں کو اچھی طرح دیکھ چکا تو ایک چھوٹے سے کمرے
میں چلا گیا جہاں کوئی نہ تھا اور وہاں ایک پھول دار درختوں کے کنج میں جو آدھے کمرے کو
گھیرے ہوئے تھا بیٹھ گیا۔

بچے غیر معمولی طور پر پیارے تھے۔ اور باوجود میاں اور اُستانی کی تاکید کے وہ اس پر
راضی نہیں ہوتے تھے کہ ہر بات کو اپنے بزرگوں کی مرضی کے مطابق کریں۔ ان کے لیئے جو مٹھائی
بڑے دن کے درخت پر رکھی گئی تھی وہ اُنھوں نے ساری کی ساری لوٹ لی تھی۔ اور
یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ کونسا کھلونا کس کا ہے اُنھوں نے آدھے کھلونے توڑ ڈالے تھے۔
خاص طور سے پیارا ایک کالی آنکھوں اور گھونگھر والے بالوں کا لڑکا تھا جو مجھ کو اپنی لکڑی کی
بندوق سے داغ دینا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی لوگوں کی توجہ اُس کی بہن کی طرف زیادہ تھی۔
وہ تقریباً گیارہ برس کی دلفریب خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ
زردی مائل تھا اور اُس کی آنکھیں بڑی اور کشادہ تھیں جن پر غور و فکر کے آثار پائے جاتے
تھے۔ دوسرے بچوں نے اُس کو کسی طرح سے خفا کر دیا تھا اس لیئے وہ اُن کے پاس سے
بھاگ کر اُسی کمرے میں چلی آئی جہاں میں بیٹھا تھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی گڑیا سے
کھیلنے لگی۔

یہاں میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں جو میں نے پہلے مشاہدہ کی تھیں۔ تمام مہمان ایک دوسرے

کو بار بار ایک دولتمند شراب کے ٹھیکہ دار کی طرف متوجہ کر رہے تھے جو اس لڑکی کا باپ تھا کسی نے چپکے سے کہا کہ اُس نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے تین لاکھ روبل (یعنی کوئی ۸ لاکھ روپے) علیحدہ رکھ دیئے ہیں۔ میں اُس طرف مڑا کہ اُن لوگوں کو دیکھوں جنھیں اس معاملے سے دلچسپی ہے اور میری نظر نارگن صاحب پر پڑی۔ وہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اور سر کو ذرا سا ایک طرف جھکائے ہوئے نہایت توجہ سے اِن لوگوں کی بے مزہ گفتگو کو سُن رہے تھے۔

علاوہ اس کے بچوں کو کھلونے تقسیم کرنے میں۔ اپنے میزبان کی دانشمندی کی میں بغیر تعریف کیے نہیں رہ سکتا۔ اُس چھوٹی لڑکی کو جس کا جہیز ابھی سے ۳ لاکھ روبل مقرر ہو چکا تھا سب سے خوبصورت گڑیا ملی۔ اس کے بعد اور بچوں کو اُن کے ماں باپ کی حیثیت کے مطابق کھلونے دیئے گئے۔ جو بچہ سب سے آخر میں آیا کوئی دس برس کی عمر کا لڑکا تھا۔ وہ دُبلا اور پستہ قد تھا اُس کے بال سُرخی مائل تھے اور چہرہ داغ دار تھا۔ اُس کو صرف ایک کتاب ملی جس میں قصے تھے مگر صرف ایسے جن میں قدرت کی شان و شوکت اور متاثر دل کے آنسوؤں وغیرہ وغیرہ کا ذکر تھا اُس کتاب میں تصویروں کا نام بھی نہ تھا اور پھول پتیاں بھی نہیں تھیں یہ ہمارے میزبان کے بچوں کی اُستانی کا لڑکا تھا۔ وہ ایک غریب بیوہ تھی اور یہ ایک شرمیلا سہما ہوا بچہ تھا جو کوٹ سستے نین سکھ کا تھا۔ اپنی کتاب لے کر وہ بہت دیر تک اور کھلونوں کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ اُس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اور بچوں کے ساتھ کھیلے مگر اُس میں اتنی ہمت نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی حیثیت کو محسوس کرتا تھا۔ مجھے بچوں کو غور سے دیکھنے میں بہت خوشی ہوتی ہے۔ اُن کا درجہ بدرجہ سمجھ دار ہونا بہت دلچسپ ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سُرخ بالوں والا لڑکا اور لڑکوں کے کھلونوں سے اور خصوصاً ایک مصنوعی تھیٹر، جس میں وہ خود ایک پارٹ کرنا چاہتا تھا کھیلنے کی اس قدر ہوس رکھتا تھا کہ وہ ایک خوشامد انہ حرکت پر بھی آمادہ ہو گیا۔ اُس نے اور بچوں کو دیکھ کر مسکرانا شروع کیا اُس نے دل لگی کرنے کی کوشش کی اور اپنا سیب ایک چھوٹے فربہ اندام بچے کو دے دیا جس کی عمر

سے ایک مٹھائیوں کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ اور لڑکوں کو اپنی پیٹھ پر سواری دینا شروع کیا تاکہ وہ اُس کو اُسس تھیٹر کے پاس سے نہ بھگا دیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑا کو بچہ نے بلے وجہ اُس کو خوب ٹھوکا۔ بیچارے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ روئے اس پر اُس کی ماں پہونچی اور اُس سے بہت سختی سے کہا اُس کو اور لڑکوں کو کھیلنے میں ق نہ کرنا چاہیے اب یہ بچہ بھی اُسی چھوٹے کمرے میں پہونچا جہاں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کو اس کی صحبت سے کوئی شکایت نہ تھی اور دونوں گڑیا کو کپڑے پہنانے میں مشغول ہوگئے۔

میں اپنے کنج میں آدھے گھنٹہ بیٹھا رہا اور اُس سُرخ بالوں والے لڑکے اور اُس ۴ لاکھ روپے کے جہیز والی لڑکی کی باتیں سُنتے سُنتے اونگھ گیا تھا کہ ایکبارگی مارکن صاحب کمرہ میں وارد ہوئے۔ اُن کی چال بہت تیز تھی اور بچوں کے مجمع میں اس وجہ سے اختیار کی گئی تھی کہ بڑے کمرے سے گزرنے میں انھیں کوئی دیکھ نہ لے۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس سے کچھ دیر پہلے وہ اُس ہونے والی دُلہن کے باپ سے جن سے اُن کی ملاقات اُسی وقت ہوئی تھی دونوں کے ایک دوسرے پر ترجیح رکھنے پر گرما گرمی سے سخت بحث کر رہے تھے۔ یہاں پہونچکر وہ کسی خیال میں محو ہو کر کھڑے ہوگئے اور اپنی انگلیوں پر کچھ حساب کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"۴ لاکھ... ۴ لاکھ" اُنھوں نے چپکے سے کہا۔ "گیارہ... بارہ... تیرہ... سولہ۔ یعنی پانچ سال فرض کیجئے پانچ فی صدی کی شرح سے یہ بارہ ہزار ہوئے، بارہ پنجے ساٹھ۔ اچھا اور اُن ساٹھ ہزار سے اوپر اور... اچھا فرض کیجئے پانچ سال میں چار لاکھ ہو جائیں گے۔ ہاں، مگر یہ بے ایمان اپنا روپیہ چار فی صدی کے حساب سے نہیں لگائے گا آٹھ یا دس فی صدی لے گا۔ اچھا تو سمجھئے پانچ لاکھ کم از کم پانچ لاکھ ہوئے۔ یہ تو یقینی ہے۔ اچھا اور پھر پاندان کا خرچ! ہونہہ

اپنے سلسلۂ خیال کو ختم کر کے اُنھوں نے ناک صاف کی اور کمرے سے باہر جانا چاہتے

تھے کہ ایکبارگی اُن کی نظر اُس لڑکی پر پڑی اور وہ کھڑے ہوگئے میں کنج کے اندر اُنھیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یا تو یہ اُس حساب کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی مگر وہ ہاتھ مل رہے تھے اور کسی ایک جگہ بے حس و حرکت نہیں کھڑے رہ سکتے تھے۔ یہ گھبراہٹ انتہا پر پہونچی جب اُنھوں نے اُس ہونے والی دلہن پر ایک دوسری مصمم نظر ڈالی۔ اُنھوں نے اُس کے پاس جانے کا ارادہ کیا مگر اُس سے پہلے اپنے آپ کو ہر طرف سے جھاڑ پونچھ لیا، اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے گویا کہ اُنھیں کسی جرم کے ارتکاب کا احساس ہو رہا تھا اُس کی طرف بڑھے، مسکراتے ہوئے اُس کے پاس پہونچے اور جھک کر اُس کے سر پر بوسہ دیا وہ بیچاری ایسے کسی حادثے کے لئے تیار نہ تھی اور گھبرا کر چلا اُٹھی۔

"کیوں پیاری تم یہاں کیا کر رہی ہو" اُنھوں نے چپکے سے پوچھا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر اُس کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ "کھیل رہے ہیں"

"اچھا؟ اس چھوکرے کے ساتھ؟" یہ کہہ کر نارکن صاحب نے اُس لڑکے کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور فرمانے لگے۔

"پیارے لڑکے تو بڑے کمرے میں کیوں نہیں جاتا؟" وہ لڑکا کچھ نہیں بولا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کو دیکھنے لگا۔ نارکن صاحب پھر چاروں طرف دیکھ کر بچی کی طرف جھکے۔ "اور تمھارے پاس ہے کیا میری پیاری بچی؟ گڑیا ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے کچھ شرما کر جواب دیا اور اُس کے چھوٹے سے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہوئے۔

"گڑیا ہے۔ مگر تم کو معلوم بھی ہے کہ تمھاری گڑیا کس چیز سے بنی ہے؟"

"جی نہیں" بچی نے چپکے سے کہا اور اپنا سر نیچے جھکا لیا۔

"چھوٹے چیتھڑوں سے میری جان۔ لڑکے تجھ کو اپنے ساتھیوں کے پاس بڑے کمرے میں جانا چاہیے،" نارکن صاحب نے لڑکے کی طرف گھور کر کہا۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کو بہت

غصہ آیا اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا ایک دوسرے سے علٰحدہ ہونے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔

"اور تم کو معلوم ہی کہ تم کو یہ گڑیا کیوں دی گئی ہی؟" نارکن صاحب نے اور آہستگی سے پوچھا۔ "جی نہیں"

"اسی وجہ سے کہ تم تمام ہفتہ ایک بہت پیاری لڑکی رہی ہو"

یہاں پر نارکن صاحب نے جو کہ اب سخت اضطراب کی حالت میں تھے پھر چاروں طرف دیکھا اور اس قدر آہستگی سے کہ اُن کی آواز مشکل سے سُنائی دیتی تھی گھبراہٹ اور بے صبری کے انداز سے پھر سوال کیا۔

"لیکن پیاری بچی جب میں اگلی مرتبہ تمھارے والدین سے ملنے آؤں گا تو تم مجھ سے خوشی سے ملو گی؟" یہ کہہ کر نارکن صاحب چاہتے تھے کہ اُس چھوٹی پیاری بچی کو ایک مرتبہ اور پیار کریں۔ لیکن جب اُس سرخ بالوں والے بچے نے دیکھا کہ وہ بالکل رونے والی ہی تو اُس نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور ہمدردی کے جوش میں خود زور سے رو دیا۔ اب نارکن صاحب درحقیقت خفا ہو گئے۔

"نکل جا یہاں سے" اُنھوں نے لڑکے سے ڈانٹ کر کہا: "ہال میں اپنے دوستوں کے پاس جا کر بیٹھ، نکلتا ہی کہ نہیں؟"

"نہیں یہ نہیں جائے گا۔ آپ خود کیوں نہیں چلے جاتے ہیں" لڑکی بول اُٹھی: "اس کو یہاں بیٹھا رہنے دیجئے۔ اس کو یہاں بیٹھا رہنے دیجئے" اور یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

اس موقعہ پر شور اور لوگوں کی آوازیں دروازے سے سُنائی دینے لگیں اور نارکن صاحب نے گھبرا کر اپنے موٹے بدن کو سیدھا کیا۔ مگر وہ سرخ بالوں والا بچہ نارکن صاحب سے بھی زیادہ ڈر گیا تھا۔ اُس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور چپکے چپکے دیوار سے لگا ہوا اُس کمرے سے نکل کر کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس خیال سے کہ اُن پر کسی طرح بدگمانی نہ ہو نارکن صاحب بھی اُسی کمرے

میں چلے گئے۔ وہ ایک کیکڑے کی طرح سرخ اور سخت پریشانی کی حالت میں تھے۔ شاید اپنے جوش اور بے صبری کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے خفا ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اُنگلیوں پر جو حساب لگایا تھا اُس کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں گھبراہٹ لالچ اور بے صبری نے ایک ساتھ زور کیا ہوگا۔ اور اسی وجہ سے اُنھوں نے باوجود اپنی سنجیدگی اور عظمت کے بچوں کی طرح ایک دلہن کے گرفتار کرنے کے لئے حملہ کیا تھا۔ اور ایسی چھوٹی سی لڑکی پر جو پانچ سال سے قبل شادی نہیں کرسکتی تھی ..... میں بھی اُنھیں کی طرح کمرے میں پہونچا اور ایک بہت پر لطف نظارہ دیکھا۔ معزز نارکن صاحب غصہ سے لال اُسی سرخ بالوں والے لڑکے کی طرف لپک رہے تھے اور وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور آخر کار اس کو کسی طرف بھاگنے کا موقعہ نہ ملا۔ "دور ہو یہاں سے" وہ حضرت چلائے "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ نکل بدمعاش نکل! تو یہاں پھل چرا رہا ہے کیوں بے؟ پھل چرا رہا ہے۔ نکل بدمعاش! نکل ..... ! جا اپنے ساتھیوں کے پاس جا!"

بیچارہ سہما ہوا لڑکا جان بچانے کے لئے میز کے نیچے گھس گیا۔ نارکن صاحب نے جھلا کر اپنا کمر کہ کا رومال نکالا اور اُس سے مار مار کر بیچارے خوف زدہ لڑکے کو میز کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ نارکن صاحب کسی قدر فربہ اندام واقع ہوئے تھے۔ وہ تندرست سرخ گالوں والے اور مضبوط آدمی تھے۔ اُن کے ایک چھوٹا سا توندبھی نکلا ہوا تھا اور موٹی موٹی رانیں تھیں اُن کے بدن کا ہر ایک حصہ اخروٹ کی طرح گول تھا۔ اس وقت ان کے پسینہ بہ رہا تھا۔ ہانپ رہے تھے اور بے حد لال ہو گئے تھے۔ آخر کار ان کا غصہ (اور عجب نہیں کہ اُن کا حسد) اس قدر بڑھ گیا کہ وہ دیوانے سے ہو گئے۔ میں نے بڑے زور سے ٹھٹھا لگایا۔ نارکن صاحب نے مڑ کر مجھے دیکھا اور باوجود اس کے کہ وہ اتنے بڑے رتبے کے آدمی تھے بہت گھبرا گئے۔ اسی لمحہ میں ہمارے میزبان صاحب سامنے کے دروازے سے اندر آ گئے۔ وہ لڑکا میز کے نیچے سے نکل آیا اور اپنے گھٹنے اور بازو جھاڑنے لگا۔ نارکن صاحب جلدی سے

اپنے رومال سے ناک صاف کرنے لگے۔

ہمارے میزبان نے ہم تینوں کو کسی قدر تعجب سے دیکھا مگر ایک آزمودہ کار شخص کی
اُنھوں نے اس وقت کو اپنے مہمان کے ساتھ اکیلے میں بات کرنے کا موقع بنا لیا۔ لڑکے کی
اشارہ کرکے کہنے لگے۔

"یہ لڑکا وہی ہے جس کے لیے میں نے آپ سے کچھ عرض کیا تھا۔

"اچھا۔۔ ہاں" نارکن صاحب نے جواب دیا۔ اُن کو ابھی تک اپنی طبیعت پر قابو
"یہ ہمارے بچوں کی اُستانی کا لڑکا ہے" ہمارے میزبان نے التجا کے لہجے میں کہا۔
"وہ ایک غریب عورت ایک شریف عہدہ دار کی بیوہ ہے۔ اور اسی لیے۔۔ اگر ممکن
تو۔۔۔۔ پیتری پیٹرووچ۔۔۔۔"

"نہیں نہیں،" نارکن صاحب نے جلدی سے کہا "فیلپ الیکسیئووچ صاحب
بُرا نہ مانیے گا مگر یہ کسی طرح سے ممکن نہیں ہے۔ میں نے پوری طرح سے دریافت کر لیا ہے کہ
کی کوئی جگہ خالی نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو اُس کے لئے پہلے ہی سے دس آدمی موج
جن کا حق اُس پر اس لڑکے سے زیادہ ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے

"افسوس صد افسوس،" ہمارے میزبان نے کہا "یہ تو اس قدر حلیم اور صلح پسند بچہ ہے"
"ہرگز نہیں،" بلکہ ایک دخل در معقولات کرنے والا مربی ہے، جیسا کہ میں نے دیکھا"
نارکن صاحب نے جواب دیا اور بے اختیار اپنے ہونٹ چبانے لگے۔ اُنھوں نے لڑکے کی
مُڑ کر کہا "نکل یہاں سے چھوکرے، تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ اپنے ساتھیوں کے پاس جا
جیسا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اُس وقت میری طرف بھی کنکھیوں سے دیکھنے سے باز نہ
مجھے بھی اپنے اوپر قابو نہ تھا اور ان کے سامنے ہنس دیا۔ نارکن صاحب نے فوراً
طرف مُنہ پھیر لیا اور میں صاف سُن سکتا تھا کہ اُنھوں نے میزبان سے پوچھا کہ
غریب جوان کون ہے؟ اور تب میں نے یہ دیکھا کہ نارکن صاحب میری طرف سے با

کرنے کے لیئے سر ہلانے لگے۔

جب میں جی بھر کر ہنس چکا تو میں ہال میں واپس آگیا۔ وہاں میں نے لال دولتمند صاحب (یعنی نارکن) کو ماؤں اور باپوں سے جن میں ہمارے میزبان اور اُن کی بیوی بھی شامل تھے گھرا ہوا پایا۔ نارکن صاحب ایک خاتون سے جن سے ان کی ملاقات اُسی وقت ہوئی تھی بہت گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاتون اُسی چھوٹی بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑی تھیں جس سے اور نارکن صاحب سے اُس چھوٹے کمرے میں مختصر سی گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اُس کی خوبصورتی حلم لیاقت اور تہذیب کی تعریف کے دریا بہا رہے تھے۔ اُس کی ماں کی رضاجوئی کے لیئے صاف صاف خوشامد کر رہے تھے اُن کی باتیں سُنتے سے ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگے۔ باپ کے منہ پر سرور کی مُسکراہٹ تھی۔ ان تین معزز شخصوں کی کیفیت دیکھ کر مالک مکان کو بھی خوشی ہوئی۔ باقی مہمانوں پر بھی اسی قسم کا اثر ہوا۔ لوگوں نے بچوں تک کو مجبور کیا کہ وہ اپنا کھیل تھوڑی دیر کے لیئے بند کر دیں، تاکہ اس گفتگو میں خلل نہ پڑے۔ ہر ایک میں ایک قسم کا جوش بھرا ہوا تھا۔ تب میں نے اُس دلچسپ بچی کی متاثر ماں کو نارکن صاحب سے بہت چیدہ الفاظ میں کہتے سنا کہ وہ اُس کے یہاں قدم رنجہ فرما کر اُس کو سرفرازی اور عزت بخشیں۔ اور اُس کے بعد میں نے سُنا کہ نارکن صاحب نے کیسی بیساختہ خوشی سے یہ دعوت قبول کی۔ اور اس پر تمام مہمانوں نے پہلے کی طرح پر اپنی گفتگو میں اُس شراب کے سوداگر اور اُس کی بیوی اور نارکن صاحب کے نام لے لے کر جوش و خروش سے تعریف کرنا شروع کی۔

”کیا ان نارکن صاحب کی شادی ہو چکی ہے؟“ میں نے کچھ زور سے ایک صاحب سے پوچھا جن سے مجھے واقفیت تھی اور جو اُن کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

نارکن صاحب نے مجھ پر ایک جگر دوز غصہ کی نگاہ ڈالی۔

”نہیں“ اُن صاحب نے جواب دیا جن سے میں نے پوچھا اور جو میری بے شعوری پر

کچھ کم خفا نہیں تھے۔ مگر میں نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔

کچھ دن ہوئے میں . . . گرجا کے پاس سے جا رہا تھا۔ وہاں پر آدمیوں اور گاڑیوں کا مجمع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ چاروں طرف ایک شادی کی باتیں ہو رہی تھیں جو یہاں ہونیوالی تھی۔ اس وقت پالا پڑا تھا اور موسم بہت بے رونق تھا۔ میں مجمع میں گھستا ہوا گرجا کے اندر پہونچا اور وہاں دولہا کو دیکھا وہ ایک پستہ قد موٹا سا گول آدمی تھا جس کے تھوڑا سا توند بھی نکلا ہوا تھا اور جو حد سے زیادہ چہرے پر غازہ لگائے ہوئے تھا وہ بہت مشغولیت کے انداز سے ادھر اُدھر دوڑتا اور انتظام کرتا پھرتا تھا۔ آخر کار شور ہوا کہ دُلہن آتی ہے۔ میں مجمع کو چیر کر آگے بڑھا اور میں نے ایک نہایت خوبصورت لڑکی دیکھی جس کے باغ جوانی میں تازہ بہار آئی تھی لیکن یہ حسین لڑکی زرد اور غمگین تھی۔ وہ کھوئی ہوئی سی نظر آتی تھی بلکہ مجھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھیں ذرا دیر پہلے رو چکنے کی وجہ سے سرخ تھیں اُس کے خط و خال کی کل شکل متانت سے اُس کے حسن میں ایک طرح کی عظمت اور وقار آگیا تھا۔ لیکن اس وقار و تمکنت اور اس رنج و ملال میں اب تک بچپن کی معصومیت کی جھلک نظر آتی تھی۔ اُس کے چہرے سے ایسا بھولا پن۔ بے بسی اور ہراس ظاہر ہوتا تھا جو الفاظ میں نہیں ظاہر ہو سکتا۔

میں نے مجمع میں لوگوں کو کہتے سُنا کہ وہ ابھی پوری سولہ برس کی بھی نہیں ہے۔ میں نے دولہا کو ذرا غور سے جو دیکھا تو پہچان لیا کہ وہ دمتری۔ پیٹرو وچ نارکن ہے جسے میں نے پچھلے سال نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دلہن کو غور سے دیکھا۔ یا اللہ۔ میں نے مجمع کو چیرنا شروع کیا تا کہ جس قدر جلد ممکن ہو گرجا سے باہر نکل جاؤں۔ لوگوں میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ دلہن بہت امیر ہے اُس نے پانچ لاکھ روپیہ جہیز میں پایا ہے، اور پاندان کا خرچ اس کے علاوہ۔

بہر اور وقت سڑک پر پہونچکر میں نے اپنے دل میں کہا" تو وہ حساب پورا اُترا "

مجلس اقوام

متیاز رنگ و قوم اپنے دامن میں دنیا کے لیے تباہی و ہلاکت کا جو سامان پوشیدہ رکھتا
ا ثبوت بیسویں صدی کی جنگ عظیم سے تمام اہل عالم کو مل چکا ہی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ
غدنہ کو تجارت، فارغ البالی اور بین الاقوامی تعلقات کبھی اُس اتحاد باہمی کو صدمہ
نے کی بھی اجازت دیں گے جس کی شکست امن عالم کے لیے پیام موت تھی۔ مگر اس عارضی سکون
یر تک نہ جم سکا، اور آخر کار ہیجان عظیم پیدا ہو گیا۔ کاغذ کے وہ چند پُرزے، جن پر اتحاد کا
ان قصر تعمیر کیا گیا تھا، خود غرضی کے ہاتھوں سے مسل کر پھینک دیے گئے، اور عمارت منہدم
س کے کھنڈروں کے نیچے امن کی اُمیدیں اور ترقی کے خواب، دنیا کی بیوفائی، اور
ثباتی کی داستان زبان خاموشی سے دُہراتے ہوئے مدفون ہو گئے۔ دنیا طلبی کے
فتنہ انگیز جذبات اندر ہی اندر فضا کو مسموم کر رہے تھے اُن کا یہ انجام ناگزیر تھا۔
مگر خون ناحق سے زمین لالہ رنگ کرنے کے بعد، زندگی کی خاموش فضا میں ہنگامہ
نے کے بعد، دنیا کے سمندر میں طوفان تلاطم پیدا کرنے کے بعد، تمدن جدید کے نونہالوں
ں کیا کہ حقیقی راحت امن میں ہی نہ کہ جنگ میں۔ جس چیز کو وہ احیا ملت کے لیے چشمۂ حیات
ہے تھے وہ سراب فانی تھا۔ کشمکش حیات کی روز افزوں ہلاکت آفرینی سے تنگ،
وال قوت سے مجبور، اور آئے دن کے مصائب سے خستہ و پریشان ہو کر امن کے لیے
چلا اُٹھے۔ ہاں، بدترین گنہگار بھی اپنے عصیاں پر پشیمان ہوتا ہی، مگر اُس وقت جب
ارتکاب گناہ کی سکت باقی نہیں رہتی، اور دنیا ہی میں اپنے اعمال بد کے عبرتناک
کا مشاہدہ کرنے لگتا ہی۔ کاش لوگوں کی آنکھیں کھُلتیں، اور وہ دیکھتے کہ جنھیں بڑی سے
دنیاوی طاقت نصیب ہی، جن کے ہاتھ دنیا کی تقدیر بظاہر عناں گیر ہیں، وہ بھی
ل بد کے معمولی سے معمولی انجام کے بدلنے میں کتنے مجبور و بے بس ہیں۔

دنیا میں اگر شر نہ ہو، تو خیر کی برکتیں قابل قدر نہ سمجھی جائیں۔ قدرت کے اسی اُصول مسلمہ نے آہستہ آہستہ خلفشار میں سکون پیدا کر کے حالات میں ردعمل کی صلاحیت بخشی، اور لوگ کسی ایسی راہ کے متلاشی ہوئے جس پر گامزن ہو کے امن کی منزل مقصود تک رسائی یقینی ہو۔ تاکہ ایک بار پھر پُرسکون اور مطمئن زندگی نصیب ہو سکے۔ اس اہم ترین موقع پر ہماری نگاہیں کسی ایسی شے کی جستجو میں بیتابانہ اُٹھتی ہیں، جو ان مساعی کی کامیابی کا ثبوت بن کر اہل عالم کی اُن توقعات کے پورا ہونے کا یقین دلا سکے جن کے ساتھ اُن کا مستقبل وابستہ ہے مگر ہر گوشہ سے مایوس و ناکام واپس آتی ہیں۔ کیونکہ حالات میں حقیقی تغیر ہنوز نہیں ہو سکا۔ ارادوں میں وہی کمزوریاں ہیں، نیتوں میں وہی فتور ہے، ہوس ملک گیری کے شعلوں میں وہی لپٹ ہے، جس کی جہاں سوزی کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ کشاکش و بے چینی زبان حال سے اس امن وصلح کے زمانہ سے بھی اُتنی ہی بیزاری کا اظہار کر رہی ہے، جتنی دنیا زمانہ جنگ سے نالاں تھی۔ جو قومیں اس عالمگیر مصیبت کی ذمہ دار ہیں اُنھیں اپنے ذاتی اغراض کے مقابلہ میں بنی نوع انسان کی فلاح کی کچھ پرواہ نہیں۔ اُن کی دنیاوی طاقت، اُن کے مدبرین کے دماغ، اُن کے ملک کے تمام وسائل ہزاروں لاکھوں ہمجنسوں کو جائز حقوق سے محروم کر کے اپنی قوم کے چند افراد کے دامن حرص کو پُر کرنے کے لیئے وقف ہیں۔ اُن کے تمام مساعی صرف اس مقصد کے لیئے صرف ہوتے ہیں۔ اُن کی تلواریں اسی سمت جھکتی ہیں، اُن کے ترکش کا ہر تیر کسی کمزور قوم کو اپنا نشانہ بناتا ہے کاش انھیں احساس ہوتا کہ تمام بنی نوع انسان کے حقوق خود ساختہ حدود کے اندر رہنے والی جماعت سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور اُن کی توجہ مصیبت زدہ دنیا کو مشکلات سے نجات دلانے کی طرف منعطف ہو جاتی!

اگرچہ صلح و آشتی کے اس اخلاقی پہلو کو بین الاقوامی تعلقات کے خوشگوار بنانے میں شمع راہ نہیں بنایا گیا، تاہم، جنگ عظیم کے بعد اقوام متحاربہ کے ہاتھ شل ہو چکے

تھے، اور وہ اپنے ملک کے جانی ومالی نقصان کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، چنانچہ جنگ کو کسی حد تک روکنے کے لیے مجلس اقوام معرض وجود میں آئی۔ اس کا قیام ایک معاہدہ کی رو سے عمل میں آیا، جو اتحادی اور اُن کی رفیق کار طاقتوں کے درمیان ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۱۹ء کو بمقام پیرس، ایک کانفرنس میں باہم طے پایا تھا۔ قبل ازیں کہ اس کے اغراض ومقاصد اور اُن کی کامیابی یا ناکامی پر بحث کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جائے۔

لیگ اقوام میں ایک اسمبلی ہے جس کے ممبر اُن ممالک کے نمایندے ہیں جنھیں لیگ کی رکنیت حاصل ہے۔ اور ایک کاونسل ہے جس کے اراکین بڑی بڑی اتحادی طاقتوں اور اُن کے رفقائے کار کے نمایندے ہیں۔ مزید براں اس میں چار اور اراکین ہوں گے جنھیں اسمبلی، ممبران لیگ کے درمیان سے وقتاً فوقتاً انتخاب کرے گی۔ اس کے علاوہ ایک صیغہ نظامت ہے، جو کاونسل مذکورہ کے غالب عنصر کی رضامندی سے مقرر شدہ ناظم اور ضروری اسٹاف پر مشتمل ہے۔ ایک عدالت کا قیام بھی عمل میں آیا ہے "جو ان بین الاقوامی نزاعات کی سماعت اور فیصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو، جو فریقین کی جانب سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جائیں۔" اس عدالت کے نظام کی ترتیب کا اختیار کاونسل کو حاصل ہے۔ لیگ کا صدر مقام جینوا ہے۔

اس کا مقصد، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، یہ ہے کہ آیندہ بڑی بڑی قوموں کو جنگ سے باز رکھنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔ اس کی دفعات اس امر پر بہت زور دیتی ہیں کہ قیام امن کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ فوج اور اسلحہ میں جہاں تک مصالح ملکی بین الاقوامی اجازت دیں، تخفیف کی جائے۔ انسداد جنگ کے مساعی صرف اراکین مجلس اقوام کی باہمی نزاعات ہی تک محدود نہ رہیں گے، بلکہ اُن ملکوں کو بھی اس کے قوانین کی پابندی پر مجبور کیا جائے گا جو کسی رکن مجلس سے برسر پیکار ہوں، خواہ انھیں

اس کی ممرکیت نہ بھی حاصل ہو۔

اہل عالم کی بہبودی کے لیئے اس سے زیادہ امید افزا اور قابل مسرت اور کیا امر ہوسکتا ہے، کہ ذمہ دار مدبرین اپنے حقیقی فرائض کو محسوس کرکے کسی ایسے نظام کو ترتیب دیں، جو کسی قوم کے جائز حقوق اور مفاد کو صدمہ پہونچائے بغیر قیام امن کے لیئے کامیاب کوشش کر سکے۔ اور بنی نوع انسان کو، جو محض خود ساختہ اُصولوں، اور بیجا تعصب کے باعث ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے ہیں تصادم سے باز رکھے، تاکہ وہ اُس مقصد عظیم کے حصول میں سرگرم سعی ہوسکیں جو آفرینش انسان کا تنہا سبب ہے۔ انسان کی فطرت بہت بلند ہے، اور اس میں ترقی کی لامحدود اہلیت موجود ہے۔ اگر کامیابی کی انتہا بہت سی جانوں کو تلف، بہت سے حقوق کو پامال، اور بہت سے دلوں کو شکستہ کرکے زمین کے چند قطعات کی ملکیت ہی نہ تصور کر لی جائے، بلکہ اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ انسان دنیا میں اعلیٰ ترین مقاصد اور اہم ترین فرائض کے ساتھ آیا ہے، تو ایسے اسباب کے بہت جلد پیدا ہو جانے کا امکان ہے، جو زمانہ کی حالت میں نہایت ہی مفید تغیر پیدا کردیں، اور زندگی کا جام تہی بادۂ امن و سکون سے لبریز ہو جائے۔

کاش مجلس اقوام کی تعمیر ایسے دست و بازو سے ہوئی ہوتی، جن کے صدق و خلوص پر اعتماد کیا جا سکتا، تو یقیناً ہر گوشہ سے صدائے لبیک اُٹھتی۔ لیکن اس کے چند سالہ کارنامے کسی روشن مستقبل کی اُمید نہیں دلا سکتے، کیونکہ خود وہی اراکین جن کی کوششوں سے یہ عالم وجود میں آئی، اور اب تک قائم ہے، اپنے طرز عمل سے، اس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک قومی مفاد کے مقابلہ میں فلاح عام کی کوئی وقعت نہیں۔ اس سے زیادہ حوصلہ شکن اور تاریکی مستقبل کو نمایاں کر دینے والا اور کیا امر ہو سکتا ہے کہ خود امریکہ اس کی تائید نہ کر سکا، اور اس سے کنارہ کش ہونے لگا، حالانکہ یہ مجلس پریسیڈنٹ ولسن ہی کی

تخلیق ہے، اور اپنے نشو و نما میں اُنھیں کی دماغ سوزی و مساعی کی رہین منت۔ پھر بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہی حالت رہے تو کسی خوشگوار نتیجہ تک پہونچنے اور اپنے کسی ایک مقصد میں بھی کامیاب ہونے سے قبل اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجلس اقوام چند طاقتور سلطنتوں کا کھلونا بن کر رہ گئی اور یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا، کہ وہ فتحمند قومیں، جن کو اُس کے سیاہ و سفید پر کامل قدرت حاصل ہے، صرف اس لئے اس کے قیام کے موافق و مؤید ہیں، کہ بیرونی خطرات، اور آیندہ کسی امکانی جنگ سے محفوظ ہو کر اقوام مغلوبہ کو اطمینان کے ساتھ اپنی حرص و آز کا شکار بنا سکیں۔ بلا شبہ اس "مجلس امن و انصاف" کے اراکین اپنے ہی منظور کردہ قوانین کو شکست اور اپنے ہی مقرر کردہ اُصولوں کو پامال کر کے پُر فریب چالوں سے اس مقصد میں بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ فرانس اور جرمنی کی باہمی کشمکش، اور اول الذکر کی سخت گیر پالیسی اس کی بین شہادت ہے۔ کیا فرانس کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے جابرانہ رویہ کو اس اطمینان و استقلال کے ساتھ برقرار رکھتا، اگر اُس کو حریف و حلیف قوتوں کے توازن سے اپنے پوزیشن کی مضبوطی کا یقین نہ ہو جاتا، اور کسی بیرونی حملہ کا خوف دامنگیر ہوتا؟ کیا فرانس اپنی حکمت عملیوں میں کامیاب ہو جاتا اگر روس اور جرمنی کو مجلس اقوام سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر بین الاقوامی معاہدۂ حریت و مساوات کی حد شمولیت سے باہر نہ کر دیا جاتا؟ اگر مجلس اقوام دنیا کو پیام امن دیتی ہے، تو اقوام مغلوبہ کے لئے اُس کا دامن کیوں تنگ ہے؟ کیا قومیت کی تفریق مٹانے کے لئے یہی بہترین طرز عمل ہے؟ اس سے انکار نہیں، کہ برطانیہ فرانس کے اس رویہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی، لیکن جرمنی سے ہمدردی کا حقیقی محرک وہ اخلاقی جذبہ نہیں ہے جس کا اعادہ بار بار ہوتا رہتا ہے، بلکہ ذاتی اغراض ہیں، کیونکہ جرمنی کی موجودہ حالت برطانوی تجارت کے لئے سخت مضرت رساں ہے۔

اٹلی اور یونان کے تصادم میں مجلس کا قوت سے مرعوب ہو کر اطالوی مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دینا، اور کمزور یونان کی حمایت سے پہلو تہی کرنا حقیقت پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ ان واقعات میں دول حلفاء کے درمیان بھی نا اتفاقی کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ فرانس اور اٹلی ذاتی منافع کے لئے مجلس اقوام کے اصول اور اپنے معاہدہ برطانیہ کے مفاد کو نظر انداز کرنے میں چنداں تامل نہیں کرتے، اور اپنے اخرو اقتدار کی بدولت کسی الزام کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ تنازعات کے بُرے نتائج سے بچنے اور جائز حقوق کی حفاظت کے لئے اب بھی فوجی طاقت کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی مجلس کے قیام سے پہلے تھی۔ مساوات کے زبردست دعاوی کے بعد بھی اس میں تنگ قومی کی اسپرٹ ہنوز زائل نہیں ہوئی۔ پھر اس مجلس سے آزاد انصاف کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے، جو قوت سے مرعوب ہو جائے، اور جماعتی تفریق کا مرکز بن گئی ہو۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلس اقوام برکات امن کے احساس کا ثمر اولین ہے۔ اگرچہ موجودہ فضا اس کی نشو و نما کے لئے کچھ موزوں نہیں، لیکن دنیا کی عنان سیاست زیادہ ایمان دار اور دانشمند مدبرین کے ہاتھوں میں ہو، اُس وقت عالمگیر جمہوریت کا خیال شاید درس اخوت دینے میں کامیاب ثابت ہو۔ دنیا اسلامی جمہوریت و اخوت سے آشنا ہو جاتی، تو اپنے مقصد کی تکمیل میں کسی آنے والے زمانہ کا منتظر نہ ہونا پڑتا۔ کاش مسلمان اپنے فرض تبلیغ کو محسوس کریں کامیابی ان مصائب کا تنہا علاج ہے۔ اسلام کی صداقت کے اظہار کا بہترین موقع ہے جب زمانہ خود پیام امن سننے کے لئے گوش بر آواز ہے، اور موجودہ حالت سے بیزار ہو کر دوسری جانب پلٹا کھانے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔ ع

ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

عبدالقادر

مطبوعات جدیدہ

پیام امن - از مولوی عبدالماجد، بی۔اے۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، قیمت عہر

جناب عبدالماجد صاحب کی مستقل تصنیفات میں "پیام امن" ایک جدید اضافہ ہے۔ جو اگرچہ مشہور فرانسیسی اہل قلم موسیو پال رچرڈ کے ترجمہ ہونے کی حیثیت سے اس مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا تھا لیکن جناب مترجم نے جو محنت اُس کے حواشی کی ترتیب، مقدمہ کے اضافہ، اور ضمیمہ جات کے ذریعہ سے کی ہے وہ بلاشبہ اس کتاب کو محض ترجمہ کہلائے جانے کے بجائے اک تالیف کہلانے کی مستحق قرار دیتی ہے۔

پیام امن ایسے وقت شائع ہو رہا ہے جب کہ تمام عالم لذت امن کو فراموش کر چکا ہے، خصومات باہمی اور جنگ و جدال کا دور دورہ ہے، امن و سلامتی کی روحانی تعلیم تو بعض حلقوں میں ہذیان سرائی کے مرادف قرار دی جاتی ہے، اور یورپ کی جدید سیاسی تگ و دو انسانی جذبات، مذہبی معتقدات اور اخلاقی تعلیمات کو اس سنگدلی سے پامال کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے کہ فی الواقع "امن و سلامتی" کا راگ بے وقت کی شہنائی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنی حیرت انگیز اخلاقی قوت سے دفعۃً روک دیا اسی طرح یورپ کے بعض حلقوں میں بھی بے چینی کے آثار نظر آتے ہیں گو اس وقت تک کوئی زبردست آواز اس تعلیم کی حق و حمایت میں نہیں اُٹھی جس کو مسیح نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے (متی - ۵)" اور سچ یہ ہے کہ اس کی توقع بھی عبث تھی اس لیے کہ مسیح کا دوسرا قول فیصل بھی موجود ہے۔

"یہ امت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے۔ لیکن ان کا دل سمجھ سے دور ہے، اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں" (مرقس باب ۷)

ترجمہ کی خوبی کے لئے خود عبدالماجد صاحب کا نام کافی ضمانت ہے کہ وہ زبان کی خوبی و دلکشی کے ساتھ اس فن میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ کتاب ۱۸۱ صفحہ پر ختم ہوئی ہے اور اچھے سفید کاغذ پر صحت و صفائی کے ساتھ چھپی ہے۔

جدید دنیائے اسلام ۔ مترجمہ محمد جمیل الدین صاحب بی۔ اے علیگ ڈپٹی کلکٹر مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں۔ قیمت عہ

ڈاکٹر اسٹاڈرڈ کی شہرۂ آفاق تصنیف "دی نیو ورلڈ آف اسلام" کا یہ ترجمہ ہے، جس کو جناب مترجم نے باوجود اپنے مشاغل ملازمت مکمل کر کے شائع فرما دیا۔ ہم ان کی اس خدمت کی دل سے قدر کرتے ہیں اس لئے اور بھی کہ اُن کی جماعت میں بہت کم ہیں جو ملک و قوم کی اس ممکن امداد کی سعی فرماتے ہوں جو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انجام دے سکتے ہیں۔ موجودہ سیاسیات اسلامی کو سمجھنے کے لیئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ کتاب کی اشاعت نے مصنف کو فوراً ممتاز ماہرین سیاست کی صف اول میں شامل کر دیا۔

مصنف نے ممالک اسلامی کے گزشتہ صدی کی زوال پذیر حالت کو وضاحت و خوبی سے بیان کرنے کے بعد جس قدر جدید تحریکات احیار ملت کے لیئے ہوئی ہیں اور اکابر مصلحین مثلاً عبدالوہاب نجدی، شیخ جمال الدین افغانی، شیخ سنوسی، سید احمد خاں اور دوسرے بزرگوں کی جد و جہد کے تفصیلی حالات پیش کر کے موجودہ سیاسیات اسلامی پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ اور آج جو عام تحریک انگورہ، ترکی، فلسطین، سوڈان، مصر اور دوسرے عربی ممالک اور ایران میں نظر آ رہی ہے اس کے اسباب اور اس کی قوت کا نہایت صحیح اندازہ کیا ہے اور بالآخر پان اسلامزم یا عالم اسلامی کی ہیئت عظیمہ کے متعلق خوشگوار پیشینگوئی ان الفاظ میں بطور "نتیجہ" پیش کی ہے "مشرق ادنے و وسطے پر ہمارا تبصرہ ختم ہو گیا۔ اس تبصرہ کی نمایاں صورت کیا ہے؟ انقلاب! بالآخر غیر متحرک مشرق اور کامل طور پر متحرک ہو گیا۔ آج مشرق کامل انقلاب، سیلان اور ہیجان کی حالت

میں ہے اور یہ انقلاب، سیلان، اور ہیجان جس قدر فوری اور عمیق ہے اس قدر پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دنیائے اسلام ایک ہزار سال تک جمود اور سکون کی حالت میں رہ کر اب پھر ایک مرتبہ سرگرم تگاپو نظر آتی ہے" کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان بنظر غور مطالعہ کرے۔ اور ہم کو نہایت مسرت ہے کہ مولوی جمیل الدین صاحب کی عنایت سے وہ اردو خواں طبقہ تک پہونچ گئی ترجمہ نہایت صاف، صحیح اور برجستہ ہے۔ اور اسی وجہ سے اصل کتاب سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ کاغذ معمولی سفید طباعت معمولی اور حجم ۲۲۴ صفحہ ہے۔

موریشس اور اسلام ۔ مؤلفہ مولانا قاری حکیم عبدالرشید صاحب نواب رشد کی امام پورٹ لوئس۔ موریشس قیمت ۱۰ر

یہ تین جزو کی مختصر کتاب ہے جس میں اک جدت بھی نظر آتی ہے یعنی فہرست مضامین ختم کتاب کے بعد دی گئی ہے۔ صفحہ اول پر ماریشس کا نقشہ ہے اور انتساب و تعارف و بعض نظموں کے علاوہ جزیرہ ماریشس کے متعلق مفصل معلومات و تاریخی حالات کے علاوہ وہاں کی مسلمان آبادی کی موجودہ کیفیت اور ان میں تبلیغ اسلام کی اہم ضرورت پر توجہ دلائی گئی ہے۔ حکیم عبدالرشید صاحب کی کوششوں سے وہاں ایک تبلیغی انجمن۔ اور مدرسہ قائم ہے ہم کو مؤلف صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مسلمانان ماریشس کے لیئے اگر عمدہ تعلیم کا انتظام ہوسکے تو ان کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہے۔

یادِ وطن ۔ (مہینہ میں دو بار) باتصویر اخبار، مقام اشاعت نیویارک (امریکہ) رئیس تحریر سید حسین چندہ سالانہ ۵ر پتہ پوسٹ بکس ۳، اٹامز اسکوئر اسٹیشن

جذبہ وطن پرستی کی تازہ مثال ہندیان مقیم امریکہ کی وہ کوشش ہے جو انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خاطر امریکہ میں اردو اخبار جاری کرنے سے کی ہے "یاد وطن" جدید ہندوستان کی مساعی جمیلہ کا اک پرتو ہے اور اس عہد میں ہمارے نوجوانوں کے قابل فخر کارناموں میں شمار کیئے جانے کے قابل ہے۔ اس کے اڈیٹر کا نام ہندوستان

کے لئے جس طرح مانوس ہے اسی طرح امریکہ میں بھی ہندوستان کے ہمدردوں سے پوشیدہ نہیں۔ مسٹر سید حسین نے اپنے قیام امریکہ میں خدمت ہند کا جو موقع نکالا ہے وہ ان کی جدت پسندی و ذہانت کی دلیل ہے۔ ہم صحیح انداز نہیں کر سکتے کہ امریکہ میں اُردو خواں ہندوستانیوں کی کیا تعداد ہے، لیکن محض ہندوستان کی عظیم الشان آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے اگر اس اخبار کے کامیابی کی توقع کی جائے تو بیجا نہیں۔

"یاد وطن" عام اخباری تقطیع پر آٹھ صفحے کے مضامین اور متعدد تصاویر دیتا ہے مضامین زیادہ تر ہندوستانی قومی تحریکات اور سیاسی جد و جہد سے متعلق ہوتے ہیں جو زبان کی خوبی، مطالب و بیان کی عمدگی کے لحاظ سے یورپ امریکہ کے دوسرے اخبارات سے جو مشرقی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں کسی حیثیت میں کم نہیں بلکہ اکثر سے بہتر ہوتے ہیں۔ کاغذ و طباعت کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے "یاد وطن" اپنے نام کے ساتھ ہی یہ شعر لکھ کر ہندوستانی اخوت پر اس انداز سے ناز کرتا ہے کہ مذاق سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔

به آں گروه که از ساغر وفا مستند   ز ما سلام رساند هر کجا هستند

"یاد وطن" نے ہندیان مقیم امریکہ کے متعلق دو طویل مضامین شائع کیے ہیں اور ہندوستان و نیز امریکہ میں اک نظام تحفظ حقوق کے قیام پر زور دیا ہے۔ ہم کو اس حقیقت سے انکار نہیں اور نہ اس کی اہمیت کو گھٹایا جا سکتا ہے۔ امریکہ کے رہنے والے ہندوستانیوں کے متعلق زیادہ تفصیلی حالات اگر اس اخبار میں شائع ہوا کریں تو وہ اہل ہند کے لیے بہت زیادہ دلچسپ ہو جائے۔

حسن و عشق ۔ اڈیٹر ابو محمد مصلح ابو العلائی۔ ڈہری ضلع شاہ آباد (بہار) چندہ سالانہ ۃ
یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے مضامین جیسا کہ نام سے ظا ہر ہے اسی عنوان کے ہیں ادب لطیف کی خدمت کے خیال سے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے

علاوہ اور مضامین کے اک پورا مشاعرہ بھی نقل ہے

حور - مرتبہ بیگم صدیق انصاری - سماگر دت لین کلکتہ چندہ سالانہ سے ر

یہ "زنانہ لٹریچر کا ماہوار صحیفہ" کلکتہ کی اک خاتون کی زیر ادارت تین ماہ سے نکل رہا ہے
اور طباعت و تہذیب نیز تنوع مضامین کے لحاظ سے قابل تعریف ہے اس وقت تک جس قدر
زنانہ پرچے شائع ہوئے ہیں ان میں "حور" غالباً زیادہ سلیقہ و محنت سے ترتیب دیا جاتا ہے
علاوہ مردوں کے متعدد خواتین بھی مضمون نگاروں کے صف میں نظر آتی ہیں۔

الرفیق - مدیر سید عبدالوہاب استہانوی - مانک تلہ روڈ ڈاکخانہ شملہ - کلکتہ

کلکتہ سے یہ رسالہ بھی نیا جاری ہوا ہے۔ اگست و ستمبر کا مشترکہ نمبر ہمارے پیش نظر ہے
جس میں مولوی کیفی چریاکوٹی اور حکیم رکن الدین صاحب دانا کے مضامین بھی ہیں۔
مضامین میں تصوف و حکمت علم و ادب سب ہی کچھ ہے۔ طباعت و کاغذ معمولی ہے۔ اگر دو
چار نمبر اور شائع ہوں تو کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

"ناقد"

برق بے جولاں

از جناب آزادؔ عظیم آبادی

نمودِ برقِ بے جولاں کی ہستی کیا عدم کیا ہے
سمندر مشربی بازیچۂ طفلاں سے کم کیا ہے

مشیت کا بھلا ہو کیسی آسان ہو گئی مشکل
خوشی جینے کی جس کو کچھ نہیں مرنے کا غم کیا ہے

نہ کھانا مغلطہ صاف اعترافِ ضعفِ باطن ہے
جہاں ہے عزمِ راسخ حاجتِ قول و قسم کیا ہے

صدا ہے ناتوانوں کے شکستِ شیشۂ دل کی
کوئی سوچے تو یہ آوازۂ طبل و علم کیا ہے

یہ ہستی کیا ہے؟ خود اک خوابِ آشفتہ کی انگڑائی
جھپک ہے دیدۂ بے خواب کی خواب عدم کیا ہے

فلک کی دشمنی ہے اپنی ہستی پر قوی حجت
جہاں ہو زہر ہی امرت وہاں پر وائے سم کیا ہے

ہزاروں سر بکف ہو کر نہ پہونچے تیری غایت کو
رموزِ زندگی! اللہ! تیرا پیچ و خم کیا ہے

فریبِ سادہ لوحاں اک نمائش ہے سرابِ آسا
نمود و نام کیا ہے شہرۂ جاہ و حشم کیا ہے

ہم اس باطل پرستی کی فسوں کاری سے حیراں ہیں
اگرچہ نقشِ باطل دلنشیں نقشِ دِرم کیا ہے

شرر سے کم نہیں ہر قطرۂ اشک اے حرم والو
شرر کو پھونک دینے کے لئے دیر و حرم کیا ہے

کہاں مرتے پھریں طولِ حیاتِ خضر کے غم میں
کہ مرمٹنے کو تھوڑی سی بھی قیدِ عمر کم کیا ہے

فراغِ طبع آخر مقصدِ سعیِ دو عالم ہے
اسی خرمن کا خوشہ ہے گلستانِ ارم کیا ہے

مصائب کی رفاقت میں بھی پہلو ہیں مصیبت کے
دو نیم اپنا جو دل ہے سینہ شق اپنا قلم کیا ہے

غضب ہے ایسے بیماروں کو ہے زعمِ مسیحائی
جو اس سے بے خبر ہیں فربہی کیا ہے ورم کیا ہے

کرم بھی ہے تو بے روئی ریا کم ہے درم دم ہے
تہی مغزی کے پہلو میں کفِ اہلِ کرم کیا ہے

دل افسردہ جو ارزشت آہ آزاد کی میری
بس اک زندہ دلی اس کے سوا حضرت میں دم کیا ہے

———

حیات

خموشی آشنا گو ہی زبانِ نکتہ داں اس کی ‌‌ پہنچتی ہی دلوں تک داستانِ خونچکاں اس کی

بسا دیتے ہیں اُجڑے گھر کو اس کے رعد کے کڑکے ‌‌ ہرا کرتی ہیں بانغ دل کو گر کر بجلیاں اس کی

تبسم ہائے پنہاں اس کے ہوتے ہیں امید افزا ‌‌ عزیمت خیز ہوتی ہیں دلوں میں چٹکیاں اس کی

بپا کرتی ہیں ہر ساعت، نیا ہنگامہ عالم میں ‌‌ دکھاتی ہیں بہار تازہ ہر دم شوخیاں اس کی

ضعیفوں کے دلوں میں پھونکتی ہیں روحِ رستم کی ‌‌ جوانوں کو جھنکاتی ہیں گوئیں اٹھکیلیاں اس کی

سبق دیتی ہی یہ افراد کو جب سرفروشی کا ‌‌ تو ہوتی ہی بقائے نوع آکر ہمزباں اس کی

علو کے راز جب یہ منکشف کرتی ہی کانوں میں ‌‌ بصد آہنگ ہوتی ہی شجاعت نغمہ خواں اس کی

تمناؤں کا دریا موجزن ہوتا ہی سینہ میں ‌‌ غضب کی روح پرور ہی نوائے جانستاں اس کی

جسے سر کی نہیں پروا ہی کچھ، وہ اس کا ہمدم ہی ‌‌ حمیت ہی دل دردآشنا کی پاسباں اس کی

منافی موت کی تکلیف سعی دمبدم اس کی ‌‌ مبشر زندگی کی، دعوت تسلیم جاں اس کی

جو اس عالم میں رہنا ہی تو وقف جستجو رہنا ‌‌ یہ آے دن ہوا کرتی ہی، تلقین نہاں اس کی

مزہ سر چڑھ کے مرنے میں ہی کیسا تجربہ کر لو ‌‌ سبق دیتی ہیں دل والوں کو یہ سرگرمیاں اس کی

"صدائے خاموش"

رقص بسمل

ہمارے مکرم دوست محمد مسلم صاحب ایم اے عظیم آبادی کو حال میں اک جگر دوز حادثہ پیش آیا ہے کہ اُن کے صاحبزادہ ہاشم نے اُن کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دیا۔ یہ چند اشعار اسی کیفیت قلبی کا اظہار ہے جو اس وقت نہ صرف مسلم صاحب بلکہ ان تمام احباب کی ہے جن کو ہاشم کی صورت اس کی خداداد ذہانت اور غیر معمولی متانت کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ہم اس موقع پر اگر تعزیت کا کافی حق ادا نہ کر سکیں تو اس کی وجہ وہی ہے جس کو اکبر مرحوم نے اسی موقع پر خود اپنے لئے لکھا تھا۔ مرنے والا اُس وقت بھی ہاشم ہی تھا۔

بہت نہ رونے پہ یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوش سرشک دل میں
یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایت ظرف آستیں ہے!

مدیر

"سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں"

غالب

کل صبح صحن گلشن میں اک گلاب دیکھا — رنگ اُس کا باغ عالم میں لاجواب دیکھا
اور مست بو میں اُس کی کیف شراب دیکھا — گل کی بہار دیکھی! یا میں نے خواب دیکھا؟

تھا کیا وہ میرا پیارا؟ ہاں ہاں وہی تھا ہاشم

کل دوپہر کو دیکھی وادی میں اک تتلی — نازک پروں پہ ساتوں رنگوں کی بیل بوٹی
کالی ہری سنہری لال اودی زرد اُجلی — ہو لمس کا تحمل، ایسی کہاں تھی نرمی

وہ تھی مری دل آرا یعنی وہی تھا ہاشم

کل سہ پہر کو دیکھا، گردوں پہ اک دھنک تھی — جو رونق زمیں تھی جو زینت فلک
حسن میں نظارہ آنکھوں سے روح تک تھی — کس نے کہا دھنک تھی، اک وہم تھا نظر

آنکھوں کا تھا وہ تارا یعنی وہی تھا ہاشم

ل شام تک چمن میں اک طائر خوش الحاں — تھا شاخ گل پہ رقصاں اور جوش میں غزل خواں
شیرینیِ ترنم سے شاد کام تھی جاں — خاموش ہو گیا لو وہ مطرب گلستاں

ہاشم نہ ہو ہمارا بے شک وہی تھا ہاشم

شب ظلمت فضا میں تھا ایک کرمکِ نور — ایک اختر جہندہ، ایک اخگر سر طور
مسکیں کا ایک دینار، اک شمع بختِ دیجور — پو پھٹتے ہی ہوا وہ آنکھوں کا نور کافور

وہ مضطرب شرارہ! اُف اُف وہی تھا ہاشم

مستور

کلام فانی

دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر
عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

اور بندے ہیں جن کو دعوٰی خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں
زندگی نئی پائی آپ سے جدا ہو کر

کارگاہ حسرت کا حشر کیا ہوا یارب
داغ دل پہ کیا گزری نقش مدعا ہو کر

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں
سانس بن گیا ایک ایک نالہ نارسا ہو کر

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

عشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی
خاک میں ملادو گے دیر آشنا ہو کر

اب ہوئی زمانہ میں شیوۂ وفا کی قدر
عالم آشنا ہے وہ دشمن وفا ہو کر

زندگی سے ہو بیزار فانیؔ اس سے کیا حاصل
موت کو منالو گے جان سے خفا ہو کر

غزل

جناب اعزاز الدین صاحب ایم اے

روزے بمن دل شدہ۔ ناکام بیا شام
وز وقت سحر تا بسرِ شام بیا شام

تا چند ہمیں نامہ و پیغام، بیا، شام
وز بادۂ گلرنگ دو سہ جام بیا شام

گر جامِ صبوحی بزدی خیرہ بہ اغیار
با دلشدۂ خویش بیا شام بیا شام

از دستِ حنا بستۂ خود پرکن و در دہ
وز ناز نگاہے کہ "بیا شام! بیا شام؟

ق

چوں مست شوم از سرِ الطاف دو یک جام
از دست منِ رعشہ بر اندام بیا شام

اے پیر مغاں بادۂ سرجوش نخواہم
با بندہ بگو دردِ تہِ جام بیا شام

دی واعظ بدمست چہ خوش گفت بہ مومنؔ
"خواہی کہ نہ بینی غمِ ایام" بیا شام

شذرات

رسالہ جامعہ نے اس ایک سال میں جو خدمت کی ہے اس کا صحیح اندازہ ممکن ہے کہ ناظرین علم دوست حضرات کر سکیں، لیکن جن لوگوں کے ذمہ ادارت کا بار ہے وہ اس کے اہل نہیں۔ اِک نمایاں خصوصیت اس رسالہ کی یہ رہی ہے کہ ابتدا ہی سے وہ اِک خاص مقصد کے ساتھ نکالا گیا، ترتیب و تہذیب، مضامین کی نوعیت، حجم اور ظاہری شکل و صورت میں وہ ہمیشہ یکساں رہا اور بڑی حد تک وقت کی پابندی کو بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ان کوششوں میں جس قدر کامیابی حاصل ہوئی اس کی بڑی وجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلق ہے جو ملک میں بہ اعتبار اپنے مقاصد تعلیمی کے اک خاص حیثیت رکھتی ہے۔

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ اس عرصہ میں بعض ناگوار و ناگزیر اسباب کی بنا پر رسالہ وقت پر شائع نہ ہو سکا اور غالباً ابھی اِک دو مہینہ اس قصور کی سزا اور بھی ملے گی۔ جن اصحاب نے ازراہ قدر دانی رسالہ کے انتظار میں شوق و محبت اور گلہ و شکوہ سے کام لیا ہے ان کا شکریہ الفاظ سے نہیں ادا ہو سکتا۔ اگر رسالہ اُن کے تقاضے کے ساتھ ہی اُن تک پہنچ جاتا تو ہم سمجھتے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، لیکن اب بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

رسالہ جامعہ کی اک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جامعہ ملیہ کی علمی و تعلیمی زندگی کے متعلق بہت کم لکھتا ہے۔ خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو، لیکن جامعہ کی اس ادا نے یہ ضرور ثابت کر دیا ہے کہ اس کے صفحات نہ روزنامے کے کالم ہیں، اور نہ وہ کسی چیز کو محض اپنی ہونے کی خاطر پبلک میں پیش کرتا ہے۔ لیکن آج جبکہ مدعیان علم و ماہرین تعلیم اس فن شریف کے لیے یورپ کے

بعض نہایت پس پا افتادہ تجربوں پر اپنی جدید تعلیمی ترقی کی بنیاد رکھنی چاہتے ہیں، اور جن کی کوششیں صرف تقلید کے اک خفیف و ناکام کوشش تک محدود ہیں ان کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فضا اور تعلیمی آب و ہوا بالیقین اک درس عبرت ہے۔ جامعہ کا نصاب تعلیم اور قدیم روش میں جو خاص تبدیلیاں موجودہ نظام کرنا چاہتا ہے بارہا پبلک میں آچکی ہیں۔ ممکن ہے کہ کاغذ پر اور بھی بہت سی تجاویز و دستور العمل ہوں جو ہمارے بعض رہبران تعلیم کے میزوں کے کسی گوشہ میں پڑے ہوں لیکن جامعہ نے ان تجاویز کو جس جرأت کے ساتھ عملی جامہ پہنایا ہے اُس کا صحیح اندازہ صرف علی گڑھ ہی میں ہو سکتا ہے۔ سیڈلر کمیشن نے کلکتہ یونیورسٹی کے اصلاح کے سلسلہ میں جو اصول تعلیمی ہندوستان کے لیے قرار دئے تھے وہ عام طور پر پسند کئے گئے اور توقع تھی کہ جدید یونیورسٹیاں اسی نظام کے ماتحت عمل میں آئیں گی، مسلمان بھی اپنی یونیورسٹی کو اس ترقی یافتہ شکل میں دیکھنا چاہتے تھے مگر

قریب دیر خضر آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جدید وائس چانسلر جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب اُن بزرگان قوم میں سے ہیں جنھوں نے سیاسیات کو ہمیشہ اس لیے ناقابل التفات سمجھا کہ اُن کا رجحان طبیعت تعلیمی مسائل کی طرف تھا، نیز سیاسی حالت کی جس بلند سطح تک اُن کی دوربیں نگاہ پہنچتی تھی اس کا اقتضا بھی یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو بجائے سیاسیات کے تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ ممکن ہے کہ اُن کو اپنے خیال میں اس مقصد میں کامیابی ہوئی ہو، لیکن ملک کی موجودہ بے چینی اور مسلمانوں کا اس میں جو حصہ ہے وہ تو ہوا کا رُخ کسی دوسری ہی جانب بتا رہا ہے۔ بہرحال، باوجود ان موانعات کے وہ اپنی رائے پر قائم ہیں۔

اور اُمید ہے کہ یونیورسٹی بھی اُن کے مشوروں سے فائدہ اُٹھائے گی جس کے آثار نظر نہیں آتے اس لیے کہ صاحبزادہ صاحب نے اپنے جدید عہدہ کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد جس عنوان سے ذمہ داراراکین یونیورسٹی کو خطاب فرمایا ہے وہ تو اک نوحۂ درد ہے جس کا آخری بند یہ ہے کہ جس یونیورسٹی کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ گورنمنٹ کی عنایت کرنے سے بھی حاصل نہ ہوا۔

اس خواب کی تعبیر اگر کہیں نظر آتی ہے۔ تو وہ جامعہ ملیہ ہے جہاں درختوں کے نیچے کھلی زمین پر طلبہ اور اساتذہ فلسفہ و حکمت، تفسیر و حدیث سے ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ اور ان دلدادگان علم کے کارناموں کے دُھندلے نشان ان کوششوں میں دکھائی دیتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے کبھی کبھی کتابوں کے صورت میں نظر پڑتے ہیں لیکن جن کا بڑا حصہ ہنوز مسودات کے ہی نام سے یاد کیے جانے کے لایق ہے۔

جامعہ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک تعلیمی اور دوسرا اصلاحی، دارالاقامہ کی زندگی اصلاح معاشرت کے لیے اور جامعہ کی درسیات ترقی تعلیم کی خاطر۔ جامعہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ لائق اساتذہ و پرجوش کارکن اس کو ابتدا ہی سے مل گئے تھے۔ اور اُنھوں نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے طلبہ کے لیے ہر قسم کی مفید تربیت کا انتظام کیا۔ حال میں اک کواپریٹو اسٹور یا مشترکہ سرمایہ کی دُکان خود طلبہ ہی کے سرمایہ اور انتظام سے قائم کی گئی ہے۔ جس کے حصوں کی فروخت اور فراہمی سرمایہ کے بعد اسباب تجارت کی خرید و فروخت سب طلبہ کے ہاتھ میں ہے۔ حسابات خود طلبہ ہی رکھتے ہیں اور طلبہ ہی ان کی جانچ کرتے ہیں۔ یہ تمام کام باقاعدگی اور پابندی کے علاوہ اس طرح انجام پاتا ہے کہ دارالاقامہ کے اکثر طلبہ کو اس میں تھوڑی مدت کے لیے شرکت کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ کاروبار کا عملی تجربہ ان میں سے ہر فرد کو حاصل ہو سکے۔ اس دُ

میں جو سامان برائے فروخت رکھا گیا ہے اُس میں تعیشات و تکلفات کی تمام چیزوں کو علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ طلبائے دارالاقامہ کے ضروریات روزمرہ کی تقریباً تمام چیزیں خود طلبہ ہی کی دوکان فراہم کرے۔

عرضِ جوہر

از

محمدؐ علی جوہر

مولانا محمدؐ علی مدظلہٗ کا تازہ ترین کلام جس میں زمانہ اسیری بیجاپور کی تمام غزلیں درج ہیں اور جو اس وقت ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

سے مل سکتا ہے

فتح الحمید

مولانا فتح محمد خاں جالندھری کا یہ ترجمہ کلام مجید اردو زبان کے بہترین تراجم میں شامل ہونے کے لائق ہے علاوہ سلاست وصحت زبان کے طباعت وتقطیع نہایت دلفریب اور جلد بڑے اہتمام سے طیار کی گئی ہے۔ قیمت ٦ے

مطبع کاویانی برلن

سے فارسی جدید کی مقبول ومشہور کتابیں آگئی ہیں خریداری میں عجلت فرمائے

فہرست ملاحظہ ہو۔

۱۔ تیاتر (ڈراما) مصنفہ مرزا ملکم خاں ناظم الدولہ — ۶؏

۲۔ موش وگربہ۔ باتصویر عبید زاکانی کی مشہور نظم — ۵۰/

۳۔ تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) مصنفہ حمزہ اصفہانی — ۶؏

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

سے طلب فرمائیے

مبادی معاشیات | علم المعیشت میں قابل قدر اور گراں مایہ اضافہ ہے جو اصول معاشیہ پر تازہ ترین مباحث پر حاوی ہے از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب قیمت عہ مجلد عہ

خطبہ صدارت شیخ الہند مرحوم | بہ تقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ قیمت ۲

خطبہ صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مدظلہ | بہ تقریب جلسہ اول تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۲ر

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم | ڈاکٹر سر پی۔ سی رائے کا وہ مشہور و معروف خطبہ صدارت جو ممدوح نے بہ تقریب جلسہ دوم تقسیم اسناد جامعہ بزبان انگریزی پڑھا۔ جس میں مسلمانوں کی گذشتہ علمی خدمات کی تاریخ کا قابل دید مرقع ہے مترجمہ مولوی محمد مسلم ایم۔ اے قیمت ۴ر انگریزی ایڈیشن قیمت ۸ر

ترکوں کی کہانیاں | محبت اسلامی و غیرت قومی کو جوش دلانے والی چند ترک بہادروں کی جانبازیوں کے نہایت سچے اور بصیرت افروز تاریخی واقعات زبان سلیس و عام فہم اور آسان۔ قیمت ۴ر

حقائق اسلام | فلسفۂ اسلام پر عقلی دلائل و براہین از مفتی انوار الحق صاحب ایم اے نئی روشنی کے حضرات کے واسطے قابل قدر تحفہ ہے قیمت ۱۲ر

المدنیۃ والاسلام | فرید وجدی علامۂ مصر کی عربی کتاب کا بہترین و دلکش ترجمہ کہ اصل کتاب اور ترجمہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اسلامی اصول پر محققانہ اور دلچسپ مباحث۔ از مولینا رشید احمد انصاری مرحوم استاذ جامعہ و سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم قیمت ۱۲ر

مکاتیب | نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر۔ دلچسپ۔ پُراز معلومات بہترین مجموعہ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ بھوپال قیمت عہ

فہرست مضامین

جلد سوم	ماہ شعبان سنہ ۱۳۴۲ ہجری مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۴	نمبر ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد سوم | ماہ شعبان سنہ ۱۳۴۲ ہجری مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء | نمبر ۳

مسئلہ خلافت

مسلمانوں کے اوپر ملی اور قومی مصائب میں یوں ہی کچھ کمی نہ تھی کہ اس خبر نے اُن میں اور بھی اضافہ کردیا
کہ ترکوں نے خلافت کے منصب کو توڑ دیا۔

اگرچہ یہ خبر ابھی تک مبہم ہے اور اس کی اصل حقیقت اچھی طرح واضح نہیں ہوئی کہ کن وجوہات اور خیالات
کی بنیاد پر ایسا کیا گیا۔ لیکن جو بھی اسباب ہوں یہ واقعہ نہایت افسوس ناک ہے۔ اس سے اسلامی اقوام وملل
کی مرکزیت مٹتی ہے۔ اور تاریخ اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

ترکوں نے جب اپنی جمہوریہ قایم کر لی تھی تو ہر ایک مسلمان کو یہ توقع ہوگئی تھی کہ اب وہ مسئلہ خلافت
کا صحیح حل نکالیں گے اور اس کو بہترین شکل میں قایم کریں گے۔ خود ان کے اعلانوں سے بھی یہ امر ظاہر
ہوتا تھا۔ کہ وہ صرف ترکوں کا خلیفہ نہیں بنانا چاہتے بلکہ تمام امت اسلامیہ کے انتخاب سے ایک
جمہوری خلافت کا انتظام کر رہے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے سال گذشتہ میں ان کا خود اپنے
اپنے انتخاب سے عبدالمجید کو خلیفہ بنا دینا۔ اور اس سال ان کو یکایک نکال دینا۔ اور اس کے ساتھ
منصب جلیلۂ خلافت کو بھی توڑ دینا ایک ایسا لاینحل سیاسی معما ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر ایک غلطی دوسری غلطی کی ممد ہوسکتی ہے تو یقیناً ان کی دوسری غلطی پہلی غلطی کا نتیجہ ہے کیونکہ جب ملک میں جمہوری حکومت قایم ہوچکی تھی۔ اور مجلس ملیہ کا صدر بھی منتخب ہوچکا تھا تو پھر کسی دوسرے شخص کا انتخاب خواہ خلیفہ ہی کے نام سے کیوں نہ ہو سراسر اصول سیاست کے خلاف تھا۔ ایک ہی ملک میں صدر جمہوریہ اور خلیفہ کی دو جداگانہ حکومتیں کیوں کر قایم رہ سکتی ہیں۔ دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں سازشیں اور جماعت بندیاں ہوئی ہونگی جن کی پاداش میں خلیفہ اور اس کا سارا خاندان نکالدیا گیا۔

ہم نہ خاندان پرست ہیں نہ کسی خاص خاندان کا حق خلافت تسلیم کرتے ہیں اس لئے عبدالمجید کے نکالنے پر نہ ہم کو حیرت ہے نہ ملال کیوں کہ ان معاملات میں ترک اپنے مصالح بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن نفس خلافت کو اس انتشار اور گھبراہٹ میں توڑ دینے کا مقصد ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس کا ترکوں کو کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ خلافت کچھ ان کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس منصب کو امت اسلامیہ نے اس دن قایم کیا ہے جس دن سرور پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رحلت فرمائی ہے۔ کیونکہ امت کے لئے ایک ایسی ذات ناگزیر ہے جس کو بجائے نبی کے وہ اپنا مرکز بنائے۔ اسی وجہ سے اس منصب پر قایم ہونے والے کا لقب خلیفۃ الرسول یعنی نبی کا جانشین رکھا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ۳۰ سال تک خلافت جمہوری اصول پر رہی۔ اس کے بعد بنی امیہ تغلب سے اس پر قابض ہوگئے۔ انہوں نے اگرچہ جمہوریت کو مٹا کر اس کو خاندانی سلطنت بنادیا لیکن بھی مرکزیت کو قایم رکھا۔ خلافت کے فرایض ادا کرتے رہے اپنے تقریباً صد سالہ عہد حکومت میں امت کے شیرازہ کو بکھرنے نہیں دیا۔ اور سب کو ایک علم کے نیچے رکھا۔ ان کے زمانہ میں تمام عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک بجز خلافت کے کسی دوسری حکومت کا نام ونشان نہ تھا۔

۱۳۲ھ میں جب سے بنی عباس تخت خلافت پر آئے امت میں افتراق اور انشقاق شروع ہوا۔ اور مرکز خلافت کو چھوڑ کر جداگانہ اسلامی حکومتیں قایم ہونے لگیں۔ تقریباً

سال تک خلافت عباسی نے اپنی قوت اور شوکت کی بدولت دوسری اسلامی حکومتوں پر اپنی قوت کو قایم رکھا۔ اور ایک قسم کی مرکزی حیثیت اس کو حاصل رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے بعد اس قدر کمزور ہوگئی کہ دوسری اسلامی حکومتوں مثلاً آل بویہ۔ اور آل سلجوق نے اس کو اپنے سایہ میں لے لیا آخر ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد بقایائے بنی عباس کی خلافت پھر مصر میں قائم ہوگئی۔ مگر وہاں حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ محض رسماً یہ منصب باقی رکھا گیا تھا۔

۹۲۳ھ میں جب سلطان سلیم عثمانی نے غوری کو شکست دی تو مصر کی سلطنت کے ساتھ منصب خلافت بھی اس کو ملگیا۔ اور امت کی مرکزیت آل عثمان کو نصیب ہوگئی۔ اس پر وہ اس قدر خوش ہوا کہ جب خطیب نے خطبہ میں اس کے نام کے ساتھ خادم الحرمین الشریفین کہا تو وہ فوراً سربسجود ہوا۔ میں اپنا جبہ جس کی قیمت پچاس ہزار غرش تھی اتار کر اس کو بخشدیا۔ اس کے بعد اہل شام وعرب نے بلاجنگ محض خلافت کے نام سے اطاعت قبول کر لی اسوقت سے یہ منصب ترکوں کے ہاتھ میں چلا آتا ہے۔

عثمانی خلافت بھی خاندانی سلطنت تھی۔ شخصی حکومتوں کے جو لازمی نقائص ہیں وہ سب اس میں موجود تھے اور خلفاء عثمانیہ نے خلافت کے بہت سے فرایض نہیں ادا کئے۔ لیکن پھر بھی اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انہوں نے انجام دیں وہ کسی طرح فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں سلطان سلیم ثانی اس وقت بھی میدان جہاد میں جانے سے نہیں رُک سکا جبکہ اس کے مرض سرطان میں اس قدر حدت تھی کہ مرغی رکھی جاتی تھی اور گل جاتی تھی۔

اس خاندان کی عظمت وشوکت کو خلافت نے بہت بڑھا دیا۔ اور تمام عالم اسلامی میں ان کو وہ وقعت نصیب ہوئی جو بلاخلافت کے کبھی نہیں ہوسکتی تھی۔

آج جبکہ ترکوں نے اسلامی اصول کے مطابق جمہوری سلطنت قایم کر لی تھی تو وہ سب سے زیادہ خلافت کے مستحق ہوگئے تھے۔ اگر سیاسی وجوہ یا رکاوٹ نہ ہوتی تو تمام ملت کے انتخاب سے

خلافت نہیں قایم کر سکتے تھے تو کم سے کم اپنے صدر ہی کو خلیفہ بنا دیتے۔ جو تمام دنیائے اسلام کا نہ سہی لیکن ترکوں کا تو صحیح خلیفہ ہو جاتا۔ پھر عالم اسلامی بھی اسی کو تسلیم کر لیتا۔ لیکن تعجب ہے کہ جس وقت وہ دستار خلافت کے صحیح طور پر اہل ہوئے۔ جس سے ان کی عظمت کو عروج ہوتا اس وقت اونہوں نے اس کو سر پر سے اُوتار کر پھینکدیا۔ اور ملت کے اس قدیم منصب اور امت کی مرکزیت کو فنا کر دیا۔

لیکن ابھی کوئی قطعی رائے قایم کرنا قبل از وقت ہے۔ ترک سیاسیات میں اس قدر بودے نہیں ہیں کہ حیات ملی چھوڑ کر انفرادی زندگی اختیار کریں۔ علاوہ بریں اس مرکزیت سے بجز نفع کے ان کا کوئی نقصان نہیں تھا جس کی وجہ سے اس سے دست بردار ہوں۔ گو ترکی جمہوریہ کا صدر اس وقت خلافت کا اہل ہے لیکن اس کی مرکزی حیثیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیگر اسلامی جمہوریات ضروری حمایت اور امداد کے لئے تیار ہوں۔ اس لئے ممکن ہے کہ ترکوں کا مقصد یہ ہو کہ دنیائے اسلام اگر ہم سے خلافت کی خواہاں ہو تو ہم ان شرائط پر راضی ہو سکتے ہیں کہ دیگر ممالک کے مسلمان بھی اس کے فرائض کا جس قدر حصہ ان کے ذمہ عائد ہوتا ہو پورا کرنے کا عہد کریں۔ لہذا اصل حقیقت کے ظاہر ہونے کے لئے ابھی آیندہ حالات اور واقعات کا انتظار کرنا چاہیئے۔

محمد اسلم جیراجپوری

فلسطین

برطانوی سیادت میں

فلسطین کی مقدس سرزمین، ایشیا کے منتہائے مغرب میں، صحرائے شام اور سواحل بحر ابیض کے درمیان واقع ہے اس کا رقبہ ۰۱ ہزار کیلومیٹر مربع ہے۔ جس کے اکثر حصے نہایت سرسبز اور زرخیز ہیں باشندوں کی تعداد ۸ لاکھ تک پہنچی ہے جن میں ۸۱ ہزار یہودی، ۸۰ ہزار عیسائی اور باقی سب مسلمان ہیں۔ یہ سرزمین دنیا کے تین بڑے بڑے مذاہب کی گہری عقیدتوں کا مرکز ہے، اور یہودی، عیسائی اور مسلمان، تینوں ایک دوسرے کے دشمن اور حریف ہونے کے باوجود اگر کسی چیز کے تقدس کو متحدہ طور پر تسلیم کرتے ہیں، تو وہ یہی ارض مقدسہ ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے ابتدائی ایام تک دوسرے عربی ممالک کی طرح یہاں ترکی حکومت تھی۔ اس حکومت کے نظام اور عربوں کے ساتھ اس کے برتاؤ پر کوئی تفصیلی بحث کرنا، اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے؛ البتہ مختصراً صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ترکی حکومت میں عربوں کو ان مصائب و شدائد کا ایک سواں حصہ بھی کبھی برداشت نہیں کرنا پڑا جو ہمیشہ ایک قوم کو دوسری قوم کی حکومت میں برداشت کرنے پڑتے ہیں، اور اس حیثیت سے یہ دعویٰ کرنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ اعراب فلسطین کے لئے ایک قومی حکومت کے بعد اگر کوئی نظام حکومت مشفقانہ و مربیانہ ہوسکتا تھا۔ تو وہ ترکی حکومت ہی کا نظام تھا۔ اس کی وجہ محض یہی نہیں کہ ترکوں اور عربوں کے درمیان اسلام کے مذہبی رشتہ نے اخوت اور بھائی چارہ قائم کردیا تھا، بلکہ ترکی قوم کی تاریخ اس امر کی زبردست شہادتیں دیتی ہے کہ اس نے تمام غیر قوموں پر بلا امتیاز مذہب و ملت، ایسی شفقت و رواداری سے حکومت کی ہے، جس کی مثال اس بیسویں صدی کی مہذب ترین حکومتوں میں بھی ڈھونڈے نہیں ملسکتی۔ مگر عربوں نے ترکوں کی اس اچھی حکومت کو بھی اپنے اوپر ہمیشہ گراں سمجھا۔ اور وہ اپنی اس حریت پسندی کے باعث جو فطرت نے بہت مبالغہ کے ساتھ ان کی جبلت میں ودیعت کی ہے

ایک غیر قوم کی حکومت سے کبھی خوش نہیں رہے۔ پھر چونکہ عرب و ترک دونوں بہادر اور اپنی بہادری و شجاعت پر فخر و غرور کرنے والی قومیں ہیں، اس لئے فطرتاً عربوں پر ترکوں کا غلبہ و تسلط بہرحال عربی شجاعت کے لئے ایک چیلنج تھا۔ تاہم مذہبی رابطہ اور منصب خلافت کا اثر و اقتدار قومی جذبات سے بہت زیادہ قوی تھا اور عربی قوم کو کئی صدیوں تک خلیفۃ المعظم کا نہ صرف مطیع و فرمانبردار بلکہ وفادار و جاں نثار بنائے رکھا تھا انیسویں صدی کے اواخر میں، جبکہ استعمار و استعباد کے لئے یورپین قوموں کی حریصانہ کوششیں اپنے پورے عروج پر تھیں، اور خصوصاً اسلامی ممالک کو غلام بنانے اور اسلام کی دنیوی طاقت کو توڑ دینے کی متفقہ سعی کی جارہی تھی، مدبرین یورپ نے نام نہاد "عربیت" کی تحریک ایجاد کی۔ ان دقیقہ رس مدبرین کی باریک نظروں نے اس خفیف سے شگاف کو دیکھ لیا جو خلافت کے مضبوط بند میں موجود تھا، اور اس چوہے کی طرح جس نے عرم الکی تاریخی بند کو کھودا تھا رفتہ رفتہ اس شگاف کو فراخ کرنے لگے۔ انہوں نے عربوں کی رقابت کو جو محض بالقوی موجود تھی، اُبھار کر عملی صورت میں لانا شروع کردیا، اور ان کے اندر حریت و خود مختاری کا جذبہ پیدا کرنے کے بعد اس خیال کی پرورش شروع کردی کہ خلافت در اصل ان کا حصہ ہے جسے ترکوں نے غصب کر رکھا ہے۔ نوجوان اور بیوقوف عرب جن میں مغربیت کی نئی نئی ہوا لگی تھی اور جو مغربیت کی محض چمکدار اصطلاحوں پر مرتے تھے، ان عنایتوں کی اصل غایت تک نہ پہنچ سکے اور اپنے یورپین ہادیوں کو اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھکر ان کے اشاروں پر حرکت کرنے لگے۔ آخرکار بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں عربی خلافت کی تحریک اپنے شباب کو پہنچ گئی۔ نوجوان عربوں میں ترکوں کے خلاف بغض و عناد پوری طرح مستحکم ہوگیا، عربوں نے اپنے یورپین رہنماؤں کی نگرانی میں تمام ممالک عربیہ سے ترکوں کو نکال دینے کے لئے خفیہ سازشیں شروع کردیں، اور اس شگاف نے جو برسوں سے خلافت عثمانی کے بند میں پھیلایا جارہا تھا، آخرکار رسنا شروع کردیا۔ فلسطین مسیحیت کے خداوند مصلوب کا مولد ہونے کی حیثیت سے، ان تمام کوششوں کا ایک حد تک مرکز مقصود تھا۔

۱۹۱۴ء میں جب اتحاد و ترقی کی حکومت نے تلوار سے موت و حیات کا آخری فیصلہ چاہنے کے لئے سنٹرل یورپ کا ساتھ دیکر جنگ میں شرکت کی تو اتحادیوں نے اپنے پرانے عزائم کی تکمیل کیا

اس وقت کو مناسب ترین وقت خیال کیا۔ تمام عربی قوم کو امیدیں دلائی گئیں کہ اگر انہوں نے اتحادی قوتوں کا ساتھ دیکر ترکی حکومت سے بغاوت کردی تو یہ امر ان کی نجات کا بہترین ذریعہ ہوگا، ان سے وعدے کئے گئے کہ فتح کے بعد ایک متحدہ عربی سلطنت قائم کی جائیگی، اور عربی قوم کے بچہ بچہ کو ان اعلانات کے ساتھ اپنی حق پرستی کا یقین دلایا گیا کہ اتحادی طاقتیں محض غلام قوموں کو آزاد کرانے اور استبداد کو نیست ونابود کرکے حق انتخاب حکومت کا زریں اصول دنیا میں رائج کرنے کے لئے جنگ کررہی ہیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۵ء کے معاہدہ کی رو سے عربی حکومت قائم کرنے اور عربوں کو پوری طرح آزاد کرادینے کی ضمانت لے لی گئی۔

یورپین سیاست سے ناواقف اور ڈپلومیٹک چالوں سے نابلد عرب سمجھ بیٹھے کہ بس اب آزادی کی ضمانت مل گئی اور بجائے تو مطمئن ہوگئے کہ عربی خودمختاری کا خمیر ترکی خون سے تیار ہوجائے گا۔ مکہ میں شریف نے بغاوت کی، فلسطین کی حزب الوطنی نے لارڈ (اس وقت جنرل) ایلنبی سے ساز باز کیا اور شام وعراق کے عربوں نے اس مثال کی تقلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء کا خاتمہ گویا ممالک عربی سے ترکی حکومت کا خاتمہ تھا۔

اس حد تک ان اسباب سے بحث کرنے کے بعد جن کی بدولت عربوں کا رشتہ ترکوں سے ٹوٹ کر انگریزوں سے جڑا تھا، اب سلسلۂ کلام کو جوڑنے کے لئے فتح فلسطین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ ترکی قوت اس محاذ پر نہایت مستحکم اور ناقابل تسخیر تھی۔ لارڈ ایلنبی کی تمام ابتدائی کوششیں اس کو توڑنے کے لئے بیکار ثابت ہوئیں۔ مگر اہل فلسطین نے برطانی وعدوں پر اعتماد کرکے ترکوں کے خلاف سازش کی اور ایسے نازک موقع پر جبکہ ان کے خلاف ایک زبردست دشمن بر و بحر سے حملہ آور تھا، دفعۃً اٹھ کھڑے ہوئے۔ جمال پاشا مرحوم نے بڑے تدبر اور ہوشیاری کیساتھ مدافعت کا سامان باندھا اور مشکل تھا کہ انگریزی فوجیں صحرائے سینا سے آگے بڑھ سکیں مگر اس اندرونی بغاوت نے ان کو بالکل بے بس کردیا اور آخرکار ارض مقدس کا ایک ایک انچ انہیں خالی کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۷ء کو دنیائے مسیحیت کی وہ آخری آرزو بھی پوری ہوگئی جس کے لئے اسلام کی گذشتہ ۱۳ صدیوں میں ہزاروں

مرتبہ خونریز کوششیں کی گئی تھیں، اور یروشیلم کی تسخیر اسلام پر مسیحیت کی آخری فتح کی صورت میں مکمل ہوگئی۔ یہ سب اعراب فلسطین کی اعانت کا نتیجہ تھا۔

بیت المقدس میں داخل ہوتے ہی لارڈ ایلنبی کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ انھوں نے عربوں کے اعتماد کو زیادہ استوار کرنے کی کوشش کی، اور ان ابلہ فریب اعلانات کی زیادہ پرزور لہجہ میں تجدید کی جن کی بدولت انہیں اس قدر عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک اجتماع عظیم کے سامنے جو انگریزی، ہندوستانی اور عربی فوجوں اور اہل بیت المقدس سے مرکب تھا انہوں نے منارۂ داؤد کے نیچے کھڑے ہوکر ایک تقریر کی جس کے صاف اور صریح الفاظ یہ تھے کہ:

"یہ جنگ اسلام پر حملے کی غرض سے نہیں بلکہ فلسطین کے باشندوں کو عثمانیوں کے استبداد سے آزاد کرانے اور انہیں خودمختاری دلانے کے لئے کی گئی ہے۔"

پھر تکمیل فتح کے بعد دوبارہ ایک اعلان کیا گیا اور فلسطین کی چھوٹی سے چھوٹی بستی تک یہ الفاظ پہنچائے گئے کہ:-

"ہم خالص ملکی حکومت قائم کرنے میں تمہاری اعانت اور ہمت افزائی کریں گے۔ ہم نے اس ملک کو اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے نہیں لیا بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنی مرضی کے مطابق آپ حکومت کرو۔"

اعراب فلسطین بجائے خود مطمئن تھے کہ بس اب عنقریب آزادی کا سورج طلوع ہونے والا ہے اور جنگ ختم ہوتے ہی ہماری غلامی کا خاتمہ بھی یقینی ہے، مگر عہدنامۂ التوائے جنگ پر دستخط ہونے کے بعد عین اس وقت جبکہ ہر دل توقعات سے معمور تھا، دفعۃً ۲۔ نومبر ۱۹۱۸ء کو رائٹ آنریبل مسٹر (اب لارڈ) بالفر نے فلسطین پر برطانی سیادت کا اعلان کردیا، اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ یہ بھی اعلان کیا کہ فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن قائم کیا جائے گا اور تمام اطراف عالم سے بنی اسرائیل کو سمیٹ کر ارض مقدس میں بسایا جائے گا۔ یہ ایک بجلی تھی جس نے ایک آن واحد میں اعراب فلسطین کی چہارسالہ امیدوں کو پھونک کر رکھدیا۔

بہت جھنجلائے، مگر وقت ہاتھ سے کھو چکے تھے اس لئے بہت جلدی ہی ان کا غصہ مایوسی سے بدل گیا
برطانی سیادت کے ظاہری الفاظ پر اگر غور کیا جائے۔ تو ایک ناواقف شخص یقین کرے گا
کہ ان میں اہالی کی اندرونی آزادی اور اُن پر محض برطانی نگرانی و ہدایت کے معنی پوشیدہ ہیں۔ اس
کے ساتھ اگر قبل جنگ اور دوران جنگ کے وعدوں اور تصریحات بالفور کے الفاظ کو پیش نظر رکھا جائے
تو یہ یقین وثوق کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ مگر امر واقعہ اور نفس حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں اس
استبداد سے بھی کچھ زیادہ شدید استبداد حکمراں نظر آتا ہے جو ترکوں کے زمانہ میں تھا۔ اور جس
سے عربوں کو "آزاد" کرانے کے لئے جنگ کی گئی تھی۔ ترکی حکومت گو اصطلاحاً ایک استبدادی حکومت
تھی، مگر اس میں عربوں کو ایک بڑی حد تک خود مختاری حاصل تھی۔ والی اور چند بڑے افسروں کے
سوا حکومت کی مشین اول سے آخر تک عربی پرزوں سے مرکب تھی۔ بلکہ بڑے افسروں میں
بھی چند افسر عربی ضرور ہوتے تھے۔ ترکی میں پارلیمنٹ قائم ہونے کے بعد عربوں کو بھی پورے نیابتی
حقوق حاصل ہو گئے تھے اور قسطنطنیہ کے دار المبعوثین میں فلسطین کے جائز طور پر منتخب کئے ہوئے نمایندے
پوری آزادی کے ساتھ اپنے ملک کی نیابت کر رہے تھے علاوہ رعایا کی دادرسی خود سلطان المعظم
فرماتے تھے اور عربوں پر ان کی شفقت و محبت تمام دوسری محکوم اقوام سے زیادہ تھی۔ مگر برطانی تسلط
کے بعد نقشہ بالکل بدل گیا۔ دوران جنگ کا ذکر نہیں، عہد امن قائم ہونے کے بعد جو نظام حکومت فلسطین
پر نافذ کیا گیا وہ ایک مکمل استبدادی نظام تھا۔ ہائی کمشنر تمام اہالی فلسطین کا مالک الرقاب تھا، اس
کو مشورہ اور رائے عامہ کے استرضا کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اور اس کی زبان و قلم اپنی ایک ادنیٰ
جنبش سے اہل ملک کی قسمتوں کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ اس دور میں سر ہربرٹ سیموئیل کی گرفت جمال پاشا
مرحوم کے فوجی پنجہ کی گرفت سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ پھر جب مجلس اقوام نے "باقاعدگی" کے
ساتھ فلسطین کو برطانی سیادت میں دیدیا تو یہ نظام ذرا بدلا گیا۔ اب اس مطلق العنان کو آئینیت
اور شورائیت کا لباس پہنانے کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ دنیا کی ظاہر بیں نگاہیں خوبصورت
کپڑوں کو دیکھ کر بدصورت جسم کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ ہز ایکسیلنسی سر ہربرٹ سیموئیل

نے اعلان کیا کہ :-

"اب فلسطین میں ایسی حکومت قائم کی جائیگی جو رائے عامہ کی مرضی کے مطابق حکمرانی کرے گی۔ میں ایک مجلس شوریٰ قائم کرتا ہوں جس میں ۱۱ نمائندے سرکاری ہوں گے اور ۱۰ نمائندوں کو میں خود ہر قوم میں سے نامزد کروں گا۔ یہ کونسل مختلف اوقات میں میرے زیر صدارت اجلاس کرے گی اور تمام اہم مسائل اس کے مشورہ سے طے ہوں گے۔"

یہ کونسل قائم کرکے گویا مدبرین سلطنت نے اہل فلسطین کو وہ حق انتخاب حکومت عطا کر دیا جس کے وہ ترکی حکومت میں سخت محتاج تھے اور جسے ان کو دلانے کے لئے ایک عظیم الشان جنگ کی گئی تھی مگر سب سے بڑی مصیبت جو اعلان بالفر کی بدولت اہل فلسطین پر نازل ہوئی وہ یہودیوں کے قومی وطن کی مصیبت تھی اس وطن قومی کی تحریک نے ملک کے تمام اصلی باشندوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا ہے اور وہ مالی، اخلاقی، جسمانی اور ہر حیثیت سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

بالفر کے اعلان کی بنیاد یہ خیال ہے کہ فلسطین دراصل یہودیوں کا قدیم گہوارہ اور بنی اسرائیل کی پرانی بستی ہے اس لئے اب یہاں انہی کو آباد کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس دعوے کی حقیقت کو ٹٹولا جائے تو نہ کسی طریقہ سے یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ فلسطین یہودیوں کا حق ہے اور نہ یہ حرکت کبھی حق بجانب ہوسکتی ہے کہ ملک کے موجودہ باشندوں کو نکال کر جو صدیوں سے یہاں رہتے ہیں، ان کے گھروں میں یہودیوں کو بسایا جائے جو صدیوں پہلے رہتے تھے۔ اگر تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آج اس سے دو ہزار سال پہلے اس سرزمین پر یہودیوں کے قبائل آباد تھے۔ ۴ سو برس سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری ہوگی کہ رومیوں کا سیلاب آگیا اور رقبائے اصلیہ کے قانون نے اسرائیل کی اولاد کو نکال کر رومی فاتحوں کے لئے جگہ خالی کرالی۔ آخر ساتویں صدی عیسوی میں عربی قوت ریگستان حجاز سے اٹھی اور مملکت فارس سے مصر تک پھیل گئی۔ اس زمانہ میں فلسطین فتح ہوا اور ساتویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ تمام اہل ملک نے اسلام قبول کرلیا۔ پس تاریخ ۴۰۰ برس کے یہودی قیام کے مقابلہ میں ۱۳۰۰ برس کی اسلامی آباد

کو پیش کرتی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اول الذکر کی وطنیت پر آخر الذکر کی وطنیت کا کتنا ترجیحی حق ثابت ہوتا ہے۔ نسلی حیثیت سے اگر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے قبل یہاں عمالقہ آباد تھے جو عربی الاصل تھے پھر اسماعیلیوں نے یہاں اپنے خیمے لگائے اور ان کے بعد بنی اسرائیل آباد ہوئے بس بنی اسرائیل سے پہلے یہاں عرب کی سکونت ثابت ہوتی ہے۔ اگر آثار کو دیکھیں تو ہمیں فلسطین میں اسرائیلی آثار اتنے بھی نظر نہیں آئے کہ ان کی بنا پر ملک کے کسی ایک ٹکڑے کو بھی خالص اسرائیلی کہا جا سکے۔ برخلاف اس کے مسلمان ہیں کہ اس سرزمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جو اسلامی تمدن و عمرانیت کے آثار سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک سیاح کسی چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں بھی داخل ہوتا ہے تو عہد قدیم کے اسلامی آثار اور عہد حاضر کے اعلام مقدسہ کو نمایاں دیکھتا ہے اور اسے اپنے گرد ایک ایسا ماحول نظر آتا ہے جس میں اسلامی تمدن، اسلامی روایات، اسلامی آثار اور اسلامی تہذیب کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اگر ان تمام تاریخی و اثری شواہد سے قطع نظر کر کے ہم تسلیم بھی کر لیں کہ ان تمام حیثیات سے فلسطین ایک اسرائیلی ملک ہے تب بھی انصاف نہیں چاہتا کہ اس ملک سے ۱۳ سو برس کی عربی اکثریت کو نکال کر ان اسرائیلیوں کو تمام اقطاع ارضی سے لا لا کر بسا یا جائے جو آج سے دو ہزار سال پہلے یہاں بستے تھے اور آج مذہبی روایات کے سوا فلسطین میں ان کے لئے اور کوئی جاذبیت ایسی نہیں جو انہیں اس کی طرف کھینچ جانے پر مجبور کر سکے۔ مسلمان یہاں ۱۳ صدیوں سے رہتے ہیں، آبادی میں ۹۰ فیصدی ان کا حصہ ہے، جائدادیں ۹۵ فیصدی ان سے تعلق رکھتی ہیں ملکی تجارت اور کاروبار میں ان کا سرمایہ اربوں تک پہنچتا ہے جو ثروت ملکی کا کم از کم ۹۲ فیصدی ہے، اسلامی اوقاف اس کثرت سے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں کہ صرف قدس شریف میں ان کے خرچ پر ۱۰ ہزار طالب علم دینی تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر ان تمام مادی و اقتصادی اعتبارات کے مقابلہ میں محض تاریخی و اثری اعتبارات کو وزن دیا جا سکتا ہے، اور اگر صرف انہیں دلائل کی بنا پر عربوں کو ان کے گھروں سے محروم کر کے باہر کے یہودیوں کو ان کی جگہ آباد کیا جا سکتا ہے تو یقیناً ایسے ہی قوی دلائل پیش کر کے امریکہ کے موجودہ ساہوکاروں کو حبشیوں کے لئے جگہ

خالی کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے کینیڈا، اسٹریلیا اور نیوزیلینڈ وغیرہ برطانی مستعمرات کے آبادکاروں کو قدیم وحشی باشندوں کے لئے اپنی تجارتی کوٹھیاں چھوڑ دینے کا مشورہ دیا جاسکتا ہے، اور ہندوستان کی پوری سامی اور آرین آبادی کو بھیلوں اور گونڈوں کے حق میں اپنے اس نظام تمدن سے دست بردار ہوجانے کی رائے دی جاسکتی ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر آج یہی اصول دنیا میں رائج کر دیا جائے تو اس معمورۂ ارضی کی تمام جدید نسلوں کو پرانی نسلوں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے گی اور کچھ عجب نہیں کہ موجودہ نسلوں کو یہ کرۂ زمین چھوڑ کر کسی اور ویران کرہ میں اپنے لئے جائے قرار ڈھونڈنی پڑے۔

پس ہر ہوشمند انسان یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اعلان بالفر کی تائید میں تاریخی وأثری دلائل پیش کرنا محض ایک بہانہ ہے جس کی تہ میں اس مقصد کے سوا کچھ اور پوشیدہ نہیں ہوسکتا کہ یہودیوں کو اپنا رہین منت بنا کر انہیں خطرناک مسلمانوں کے بجائے سویز کے مضافات میں آباد کیا جائے۔ اگر اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو بحث ضرورت سے زیادہ طویل ہوجائیگی اس لئے اختصار کے ساتھ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جب سے مصریوں کے وطنی جذبات برطانی حمایت (Protection) کے لئے اندیشہ ناک ہوگئے ہیں، اس وقت سے مدبرین برطانیہ کو ہندوستان کے راستہ پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے مستقر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو وادی نیل سے زیادہ مستحکم ہو اور اگر کسی وقت سرزمین فراعنہ پر انگریزی سیاست کے لئے عرصہ تنگ ہوجائے تو ایسا نہ ہو کہ آبنائے سویز بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ ظاہر ہے کہ مصر کے بعد اگر سویز کی حفاظت کے لئے کوئی اور علاقہ موزوں ہوسکتا ہے۔ تو وہ فلسطین ہی ہے جو لیوانٹ کا نچلا حصہ ہے اور آبنائے کی سرزمین سے متصل واقع ہے چنانچہ اسی کو انہوں نے منتخب کیا ہے اور اب چاہتے ہیں کہ یہ پورا علاقہ ایک ایسی قوم سے آباد ہو جو ہمیشہ برطانیہ کی دوست اور خیر خواہ رہے اور کسی وقت مصر کی طرح خطرناک ثابت نہ ہو۔ یہی راز ہے جو یہودیوں کے وطن قومی کی تحریک میں پوشیدہ ہے اور اسی خواہش نے انہیں اس صریح ظلم پر آمادہ کیا ہے۔ اس داغ کو چھپانے کے لئے وہ تاریخ وآثار کے خوشنما لباس استعمال کر رہے ہیں، مگر انہیں پتہ نہیں کہ یہ کپڑے جالی دار ہیں جن میں سے

ان کا عیب بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔

فلسطین کے مسلمانوں نے بارہا اس امر کی درخواست کی کہ رائیٹ آنریبل مسٹر بالفور یا ڈاؤننگ اسٹریٹ کے دوسرے ارباب حل وعقد نومبر ۱۹۱۷ء کے اعلان کی تشریح کر دیں اور کھلے لفظوں میں بتلا دیں کہ وطن قومی کا مقصد کیا ہے؛ اس کو قائم کرنے کے لئے کیا ذرایع اختیار کئے جائیں گے اور موجودہ غیر یہودی اکثریت کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوگا۔ مگرجدید فن سیاست کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ حکومت کی پالیسی اور اس کے احکامات کبھی استدلال وتشریح اور توضیح وتفصیل سے آلودہ نہ کئے جائیں۔ کیونکہ الہام نہ صرف دغا کا ایک خوبصورت آلہ ہے، بلکہ اس کی بدولت عمل کا میدان وسیع رہتا ہے۔ اور سلطنت کے قوائے عملی کے لئے کوئی روک اور بندش نہیں رہتی۔ لارڈ بالفور اور برطانی سیاست خارجہ کے دوسرے ارباب حل وعقد ان لوگوں میں ہیں جو موجودہ فن سیاست کے ائمہ کاملین شمار کئے جاتے ہیں، پھر کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے اعلان کی کوئی تشریح کرتے۔

مگر ہمارے پاس صہیونی لیڈروں کی تصریحات موجود ہیں جو پورے اعلان کے ساتھ کی گئی ہیں اور کم ازکم ان وعدوں پر مبنی ہیں جو وطن قومی کی تعمیر اور اس کی نوعیت کے متعلق ان سے کئے گئے ہیں؛ ان کی تقریریں اور تحریریں پڑھکر ہمیں پوری طرح ان مقاصد کا علم حاصل ہوجاتا ہے جو وطن قومی کے موسسین کے پیش نظر ہیں۔ مثال کے طور پر کارلسباڈ[۲] کانفرنس کی تقریریں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں ہر یہودی مقرر نے کھلے الفاظ میں اس مفہوم کو دہرایا تھا کہ "اب فلسطین یہودیوں کا ہے اور غیر یہودی کے لئے وہاں ایک انچ زمین بھی نہیں مل سکتی"؛ ورسیلز کانفرنس میں صہیونی کانگریس کے صدر، ڈاکٹر وائزمین نے علی رؤس الاشہاد یہ الفاظ کہے تھے کہ:-

"بالفور کے اعلان کا مقصود حقیقی یہودیوں کے لئے فلسطین کے دروازے کھول دینا ہے تاکہ کم سے کم مدت میں وہ اسی طرح ان کا وطن بنجائے جس طرح انگلستان انگریزوں کیلئے اور امریکہ امریکنوں کیلئے ہے"

---

[۱] یہودیوں کی ایک جماعت ہے جسے انگریزی میں (Zionists) کہتے ہیں۔ یہ دوسرے معنی میں قوم پرست یہودی ہیں اور وطن قومی کی تحریک کے روح رواں ہیں۔ [۲] یہ کانفرنس اواخر ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔

صہیونی کانگریس کے وکیل ڈاکٹر ایدر نے اضطرابات یافا کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے نہایت زور
سے کہا تھا کہ:۔

"فلسطین میں ایک قوم کے سوا کسی اور کا وطن بننے کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں۔ وہ یہودیوں
کا ہوچکا ہے" "اور اب یہ بات قطعاً ناممکن ہو کہ مسلمانوں کو برابر کے حقوق دئے جائیں"

ایک اور صہیونی لیڈر مسٹر زنگویل جو صہیونی کانگریس کا نہایت ممتاز رکن ہو اپنے مضمون میں لکھتا ہے

"مسلمانوں کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ارض مقدس سے بوریا بستر اٹھا کر
کسی اور جگہ اپنا گھر بنائیں"

سر الفرڈ مونڈ ایک اور سربرآوردہ لیڈر بڑے پُرزور لہجہ میں کہتا ہے کہ:۔

"میں اپنی زندگی کے آخری ایام مسجد اقصیٰ کی جگہ ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرانے میں
صرف کروں گا"

ان صاف اور صریح بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم پرست فلسطین میں ایک خالص یہو
حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اس مقصد میں کامیابی کا پورا پورا یقین ہے صرف ا
پر بس نہیں بلکہ صہیونی تحریک کی تاریخ اور اس کے مقاصد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہو
کے عزائم فلسطین کے حدود سے گذر کر عراق و شام اور اطراف جزیرہ تک پھیل رہے ہیں اور ا
لالچی فطرت تمام مشرق ادنیٰ کو گھیر لینا چاہتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب تمام معمورۂ ار
کے کونہ کونہ سے یہودیوں کو جمع کرکے ایک مرکز پر اکٹھا کیا جائے گا تو فلسطین ان کے آبا
دسویں حصہ کو بھی مشکل سے جگہ دے سکیگا۔ کیونکہ اس میں حد سے حد ۱۰ لاکھ آدمیوں کی گنجا
ہے اور یہودیوں کی مجموعی آبادی ایک کرور ۴۰ لاکھ سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی لئے یہودی لی
نے اپنے پاؤں ابھی سے پھیلانے شروع کر دئے ہیں اور فلسطین کے حدود کھینچ کھینچ کر
ادنیٰ پر محیط کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک لیڈر ڈاکٹر اوسیکشن نے جو صہیونی کانگریس کا
فلسطین کا صدر ہے، ایک موقع پر حکومت انگلستان کو سخت ملامت کی تھی کہ وہ مادر

اردن کو فلسطین کا ایک ٹکڑا کیوں نہیں تسلیم کرتی! اسی طرح ان کے چند لیڈروں نے متعدد طور پر دعویٰ کیا ہے کہ توراۃ کی رو سے اصلی فلسطین کے حدود موجودہ جغرافی فلسطین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع ہیں اور ان میں حوران اور عراق و شام کے بعض حصے داخل ہیں، ان کے اس دعوے کو تو شاید کوئی تسلیم نہ کرے مگر یہ حقیقت بالکل ناقابل انکار ہے کہ ان کی حرص و آز کے حدود اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہیں۔

(باقی آئندہ)

"ابوالاعلیٰ مودودی"

یورپ کی موجودہ حالت

یورپ آج اضطراب اور پریشانی کی حالت میں ہے، اور اس کے قدم ایک غار کی طرف اُٹھتے جا رہے ہیں، محاربۂ عظیم جس میں تہذیب وشائستگی کا مقابلہ بربریت اور مطلق العنان فوجی قوتوں سے ہوا تھا عرصہ ہوا کہ ختم ہوگیا اور اس خونیں انقلاب کے ساتھ تاریخ بنی نوع انسان کی سب سے بڑی جنگ کا بھی خاتمہ ہوا۔ اب وہ تمام ناانصافیاں جو مدت مدید سے انسانیت کا خون کر رہی تھیں آج اُن سے نجات پانے کے لئے ہر طرف سے صدائیں آ رہی ہیں اور دُنیا کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں کہ ایک زمانہ کے پردردہ مظالم اور ناانصافیوں کی کیوں کر اصلاح کی جاتی ہے۔ جس آرام وسکون کے لئے ہر انسان اس قدر بےچینی سے انتظار کر رہا تھا آج بھی کہیں نظر نہیں آتا اور نہ ایک عرصہ تک کوئی امید ہے۔ جنگ کو فتح کرنا دشوار تھا لیکن امن وصلح کو قائم کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہوگیا۔

اس مضمون سے میرا مقصد یہ ہے کہ دُنیا کی معاشی حالت پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ صحیح طور پر دُنیا کے تمام علائل سمجھ میں آجائیں اور یہہ بھی ظاہر ہو جائے کہ ان کا ازالہ دائمی اور موثر طریقہ پر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ دُنیا کی معاشی صورت حال یقیناً اصل راہ سے دور جا پڑی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے، چنانچہ اگر جلد سے جلد اس حالت کی اصلاح نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ بڑے سے بڑے نتائج ظہور پذیر ہوں گے اور دُنیا تباہ ہو کر رہے گی۔ یہ الفاظ یقیناً سخت ہیں لیکن اگر صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تو واقعات خود ان الفاظ کی تصدیق کریں گے۔

لارڈ مارلے نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "کہ معاشی معاملات میں قوانین غلط طریقہ پر برتے جاتے ہیں جس کا اثر جماعت کی زندگی اور اس کے رگ وریشہ تک میں سرایت کر جاتا ہے۔ معاشی قوانین میں کبھی کوئی فریب نہیں ہوتا۔ دُنیا کے ہر ملک کی اقتصادی حالت نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے

ہر اُس چیز کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جس کو انسان عزیز رکھتا ہے اور جس کے لئے وہ گراں سے
گراں معاوضہ دینے کو تیار ہے۔ اس لئے ان مسائل کا جو آج درپیش ہیں فوراً حل کرنا ضروری بلکہ ناگزیر
ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ تدبر اور تدبر سے زیادہ نیک نیتی آج دنیا سے بالکل مفقود نہیں ہے
انشاء اللہ اسی کی وجہ سے دُنیا میں حقیقی صُلح اور امن قائم ہو جائے گا۔ تمام دنیا میں ہر طرف سے
اسی کی پکار ہے۔ خدا ان آرزوں کو جلد پورا کرے!

معاملات کو سمجھنے کے لئے ہم پہلے دُنیا کی موجودہ معاشی حالت پر ایک نظر ڈالیں گے۔ اور
اس کے خصوصی پہلو جو غور طلب ہیں اُن کی تقسیم حسب ذیل سُرخیوں پر ہو سکتی ہے:-

(الف)۔ مالی حالت | جنگ عظیم محض ایک مالی جنگ تھی اور شروع ہی میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی
کہ جس کے پاس زیادہ سے زیادہ خزانہ ہوگا اُسی کی آخر فتح ہوگی۔ مُحاربین کا مجموعی خرچہ جنگ یومیہ چالیس لاکھ
پونڈ تھا اس کے معنی یہ ہوئے کہ جنگ کو ساڑھے چار سال تک جاری رکھنے کیلئے اتنا بڑا قارونی خزانہ
موجود ہو جس کا جمع کرنا دُنیا کی دولتمند سے دولتمند ممالک کی قوت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باوجود
اس کے جنگ کو جاری رکھنا تھا اور ہر ملک یہ سمجھتا تھا کہ اس کے لئے صرف دو ہی راہیں کھلی ہیں
یا موت کی یا فتح کی، اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ ایسی نازک حالت میں جب حیات
وممات کا سوال پیش تھا کوئی قربانی اس کے لئے زیادہ نہ تھی اور کوئی بھی طریقہ کار جائز ہو یا ناجائز
اسوقت اختیار کیا جا سکتا تھا، جنگ کے لئے بہرحال روپیہ کی ضرورت تھی، اگر جائز طریقوں سے
ناکامی ہوئی تو جنگ کو فتح کرنے کے لئے حکومتوں کو دوسرے ذرائع لا مُحالہ اختیار کرنے پڑے، غرض
اس طرح قریب قریب ہر ملک میں نہایت ہی غیر مُحتاط نظام مالیات کی ابتدا ہوئی، مزید زر پیدا
کرنے کے لئے مطبع کام میں لائے گئے اور لاتعداد کاغذی زر جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے
تیار کیا جانے لگا۔ مزید براں تمام حکومتوں نے زیادہ اپنے خزانہ سونے اور چاندی سے ہر وقت
پُر رکھنے کے لئے غیر ممالک سے بڑے بڑے قرضہ لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک میں مصنوعی زر ضرورت
سے زیادہ ہو گیا، اور اُس کے مقابلہ میں دولت اور کاروبار زر میں جس پر اُس کی قدر مبادلہ

انحصار ہے بجائے زیادتی کے کمی ہوتی گئی۔اس قسم کے مصنوعی اور ضرورت سے زیادہ زر کے اجرار سے کبھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا، ممکن ہے کہ عارضی طور پر کسی ایک طبقہ کو اس سے کچھ نفع پہونچ جائے لیکن بالآخر ملک کی مجموعی اور اصلی قوت خرید میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کا نتیجہ یہ ہی ہوتا ہے، کہ زر کی ہر اکائی کی قوت خرید کم ہوجاتی ہے۔ یہ ناجایز قرضہ غیرمتبدل کاغذی زر دیگر زبردستی وصول کیاجاتا ہے، اور شاید تمام جبری قرضوں میں بدترین قسم کا قرضہ بھی ہے۔ زر کی تعداد بڑہانے کی ذمہ داری تمام محارب ممالک پر عائد ہوتی ہے اور باوجود مسٹر لائیڈ جارج کے اعلانات کے جب انھوں نے دارالعوام میں یہ یقین دلانا چاہا تھا کہ "انگلستان نے ازدیاد زر کے اس سراب کی جانب ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جس میں پڑکر یورپ اب تباہ ہوئے والا ہے" کافی ثبوت اور دلائل موجود ہیں کہ انگلستان بھی ازدیاد زر میں گرفتار رہے حالانکہ یہ بھی ساتھ ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگلستان نے اپنے یہاں نظام زر کو فوراً ہی درست بھی کرلیا۔

اس تمام قمار بازی کا نتیجہ ضروری تھا کہ جلد ظاہر ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ حقیقی نظام زر کو ان اصولوں پر چلایا جاتا۔ ہر ملک میں نظام زر درہم برہم ہوچکا تھا، زر کی قیمت گرتی جاتی تھی اور اس کی قوت خریداری میں ایک عام کمی واقع ہوگئی تھی۔ قدر زر کا مسلسل گرتے رہنا زر کی قیمت ہی سے یکقلم انکار کرنے کے برابر ہے۔ زر طلائی جس کی وجہ سے مختلف ممالک کے نظام زر میں معاشی رشتہ نہایت ہی موزنیت سے قائم تھا ایک ایک کرکے چھوڑ دیا گیا اور اس کی بجائے کاغذی زر کا ایک غیرمعین نظام قایم کیا گیا جو نہ تو ایک طرف زر طلائی سے کوئی مناسبت رکھتا تھا نہ دوسرے ممالک کے زر کاغذی سے جدید کاغذی زر کے معیار بالکل جدا گانہ تھے اور ایک دوسرے سے بالکل غیرمتعلق اس لئے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حشر ہوا، نظام مبادلات خارجہ کو اس سے بہت بڑا نقصان پہونچا۔ چنانچہ جرمن مارک کی تباہی صرف جرمن ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کی معاشی زندگی کا سنگین ترین حادثہ ہے تجارتی اور صنعتی کاروبار کی جائز ترقی

قدرِ مبادلہ کہ تنزل کی حالت میں غیر ممکن تھی، چنانچہ اس کے بجائے تخمینی اور قمار بازی شروع ہوگئی بعض لوگوں نے بیٹھے بیٹھے لاکھوں روپیہ تخمین بازی سے پیدا کرلئے، لیکن اصل تجارت کو حد سے زیادہ نقصان پہونچا موجودہ صورتِ حال ایک سرکاری مراسلہ میں اجمالاً یوں بیان کی گئی ہے۔

"۱۔ بحساب جنس زر کی قیمت ہر ملک میں گر گئی ہے۔ ۲۔ اکثر ممالک میں زر کی قیمت بحساب طلائی زر بھی گھٹ گئی ہے۔ ۳۔ زر طلائی کی قیمت بھی بحساب جنس گھٹ گئی ہے۔ ۴۔ بعض ممالک مثلاً جرمنی میں زر کی ملکی اور بیرونی قیمت میں بحساب جنس بہت تفاوت ہے۔ ۵۔ ہر جگہ نظام زر کی درہمی برہمی تجارت کے سر نو تعمیر میں حارج اور سدراہ ہورہی ہے۔ بعض ممالک میں جن اسباب کی وجہ سے نظام اشتراکی اور معاشی کی یہ حالت ہے ان میں سب سے جزیہی ہے"

غرض تمام دنیا کے نظام زر کی یہ نازک حالت ہے، اب ہم اس صورت حال کے دوسرے جزو پر توجہ کرتے ہیں۔

(ب) محدود پیدائش ازدیاد زر کے ساتھ ساتھ جنس کی رسد میں بیحد تخفیف واقع ہوتی ہے اور اس کے اسباب بالکل صاف اور ظاہر ہیں، اس لئے کہ یورپ آج بھی ایک مسلح چھاؤنی کی مانند ہے۔ جنگ عظیم ختم ہوگئی لیکن اس کی بجائے یورپ اور ایشیا کے مختلف حصص میں چھوٹی چھوٹی مقامی جنگیں چھڑ گئیں۔ اور ایک عرصہ تک ایشیاء کوچک، بلقان، روس اور ایشیائی روس محاذ جنگ بنے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ مال اور محنت کے ضائع ہونے کے ان ممالک میں ایسی منتشر اور غیر منظم حالت پیدا ہوگئی جس سے پیدائش دولت کے لئے صنعت اور تجارت پر کوئی توجہ نہ ہوسکتی تھی مزدور جو کاروبار میں لگے ہوئے تھے فوجوں میں بھرتی کئے گئے اور جنگ پر بھیجدئے گئے، اگر جنگ نہ ہوتی تو یہی لوگ پیدائش دولت کے ذرائع وسیع کرنے میں مصروف رہتے عمل پیدائش کے لحاظ سے روس عرصہ سے ازکار رفتہ ہوگیا ہے عام فوجی بھرتی صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے، مہارت یافتہ مزدوروں کی محنت بیکار صرف ہوتی ہے۔ اہم ترین ضروریات زندگی کی پیدائش کے لئے محنت اور سرمایہ کی مانگ ہے لیکن

اس سے سامان جنگ تیار کیا جاتا ہے، اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ ہر ملک میں ایک عام بےچینی پھیلی ہوئی ہے جو اس جنگ عظیم کی وراثت ہے۔ یہ اور بھی عمل پیدائش میں حارج ہے، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ جو ان دونوں کے لئے نیز تمام دنیا کے لئے فال بد ہے، ہڑتالیں اور مزدوروں کی بیکاری روز کی بات ہو گئی ہے جس کے نتائج عموماً ہنگاموں اور بلووں کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جم لدرکن کی صدائیں آج پھر ہمارے کانوں میں گونج رہی ہیں بن ٹلٹ نے عوام میں شہرت حاصل کی اور سورما بن گیا؛ مزدور آج شاہ بنے ہیں اور اپنی قوت کو محسوس کرتے ہوئے نظام سرمایہ داری کے خلاف تمام دنیا میں جدوجہد کر رہے ہیں ایک معمولی مزدور بھی ملک میں اپنی قوت رکھتا ہے، بن ٹلٹ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ یہ لوگ باوجود اپنی ہیچمقداری کے اگر چاہیں تو تمام دنیا کا کاروبار بند کر دیں، یہی لوگ جہازی بیڑہ کو کوڑہ کرکٹ کے برابر بنا سکتے ہیں، یہی لوگ جدید سے جدید کارخانوں کو بند کر سکتے ہیں نیز رفتار انجنوں کو ملکہ تہذیب و تمدن کی چلتی ہوئی گاڑی کو بھی روک سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں پیدائش محدود کرنے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں، مسئلہ تاوان جنگ کو حل کرنے میں اتنی تاخیر پھر مارک، کرونے، نیز دوسرے مبادلات زر کی شکستہ حالی، فرانس کا جرمن علاقوں پر قبضہ، بالشویک اصول کی تمام دنیا میں ترویج و اشاعت، کسانوں کا ہر ملک میں سرمایہ داروں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا۔ یہ نیز دوسرے اسباب کا ملکر مجموعی اثر یہ ہوا کہ نصف دنیا آج جتنا صرف کرتی ہے اس سے کم پیدا کرتی ہے پھر یہ کونسی تعجب کی بات ہوگی اگر دنیا بھر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

<u>قیمتوں میں اضافہ</u> جنگ سے قبل دنیا میں اجناس کی جتنی مجموعی تعداد تھی اسی کے لحاظ سے سد زر بھی ہوتی تھی اس طرح مبادلہ میں توازن قایم رہتا تھا اور قیمتوں میں بھی ایک حد تک قرار رہتا تھا لیکن جب جنگ شروع ہوتی، تو تمام ممالک نے نقد اور زر حد سے زیادہ

بڑھادی جس کے اسباب ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں، اگر اجناس کی پیداوار اُتنی ہی رہتی جتنی جنگ سے پہلے تھی پھر بھی رسدِ زر میں غیر معمولی اضافہ مجموعی پیداوار کی نسبت سے بہت زیادہ تھا اور لامحالہ قدرِ زر کا گھٹنا اور قیمتوں کا بڑھنا ضروری تھا، لیکن اس پر مستزاد یہہ ہوا کہ زر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ پیداوار اجناس میں تخفیف ہوتی گئی، غرض جب رسدِ زر اُس سے کہیں زیادہ بڑھ گئی جتنا کہ کاروبار کے لئے درکار تھی اور اجناس کی رسد میں کمی ہوگئی تو قیمتوں میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ازدیادِ زر ہی ایک بہت بڑی غلطی تھی لیکن اُس کے ضرر رساں نتائج کا ازالہ پیداوار میں برابر کا اضافہ کرنے سے ہو سکتا تھا کیونکہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے زائد زر کو کام میں لگایا جا سکتا تھا، لیکن زمانہ کی تنگ نظری نے یہہ فراموش کر دیا کہ حقیقی دولت اور خوشحالی ازدیادِ زر سے نہیں بلکہ پیداوار سے ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب قیمتوں کے بڑھ جانے کے ہیں مثلاً جنگی کارروائیوں کی وجہ سے تجارتی جہازات میں کمی جس کی وجہ سے باربرداری کے اخراجات میں اضافہ ہوگیا۔ درآمد پر نیز آزاد تجارت پر ہر ملک میں بندشیں لگائی گئیں اور طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی مانگ اور اجرت بھی یکبارگی بڑھ گئی لیکن یہ تمام اسباب اُن دونوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

قیمتوں کے بڑھ جانے کے تمامتر نتائج ظاہر ہیں، یہ ایک قسم کا پوشیدہ ٹکس ہے، غریب لوگ بھوکوں مر رہے ہیں متوسط درجہ کے لوگوں کے لئے گذر بسر کرنا بھی دشوار ہوگیا ہے، سب سے زیادہ افسوسناک حالت آسٹریا اور جرمنی کی ہے۔ جہاں بحیثیت افلاس اور غربت کی دردناک حالت آنکھوں سے دیکھی نہیں جاتی شیرخوار بچہ دودھ کے ایک ایک گھونٹ کے لئے بلکتے ہیں، اور سن رسیدہ شدت گرسنگی سے گھل گھل کر مر رہے ہیں روس اور آسٹریا میں خدا کے لاکھوں بندہ ایک ایسے ہولناک قحط میں مبتلا رہے ہیں جس سے صرف موت ہی نجات دلا سکتی تھی۔ آسٹریا کی حالت تو اس قدر نازک اور ابتر تھی کہ شریف عورتیں اور نوجوان لڑکیاں خود اور اپنے بچوں کو مسلسل فاقہ کشی سے بچانے کے لئے عین پریشانی کی حالت میں خدا جانے کیا کیا کرتی ہیں

نہیں مجبور نہ ہوئیں؟ جرمنی بھی اس راستہ پر پھسلتا جارہا ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھکر اگر کسی بات پر یقین کیا جاسکتا ہے تو صرف یورپ کے تاریک مشکل مستقبل پر۔ اور خدانخواستہ اگر موجودہ صورت حال میں کوئی کایا پلٹ نہ ہوئی تو پھر نتیجہ ظاہر ہے۔

قومی بار گذشتہ چند سالوں کے اندر ہی اندر قومی گراں باری بھی بہت بڑھ گئی ہے اور ممالک یورپ کے کل بیرونی قرضہ اگر روپیہ کے حساب سے شمار کئے جائیں تو حسب ذیل ہوں گے۔

سنہ ۱۹۱۳ء	۱۵،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ روپیہ
سنہ ۱۹۲۰ء	۴۶۵،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ "

آغاز جنگ کے بعد سے قرض عامہ کا اضافہ کل آبادی پر بحساب فی کس حسب ذیل ہوتا ہے۔

۱۔ ریاستہائے امریکہ	۸۴۲ روپیہ
۲۔ انگلستان	۲۳۶۲ "
۳۔ اٹلی	۱۰۹۵ "
۴۔ فرانس	۱۷۱۸ "

بین الاتحادی اور تاوانی قرضہ بین الاتحادی اور تاوانی قرضہ کا مسئلہ دوسرے تمام مسائل سے زیادہ اہم اور مشکل ہے اس مسئلہ کے دو حصہ کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ جنگ کے لئے فرانس بلجیم اٹلی نیز دوسرے ممالک نے پہلے تو انگلستان سے، امریکہ سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیں۔ لیکن امریکہ نے بعض حالات میں بغیر انگلستان کی ضمانت کے اتحادیوں کو قرضہ دینے سے انکار کیا، چنانچہ انگلستان پر امریکہ کا زیادہ تر قرضہ اس صورت کا ہے جو فرانس، اٹلی اور بلجیم کی طرف سے لیا گیا تھا۔ انگلستان کے خاص خاص قرضہ دوسرے ممالک پر جولائی سنہ ۱۹۲۱ء میں حسب ذیل تھے۔

فرانس	۵۵۷،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ
روس	۵۶۱،۰۰۰،۰۰۰ "

اٹلی	۴۷۶,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ	
بلجیم	۱۰۳,۰۰۰,۰۰۰ ″	ان دونوں سے کوئی سود نہیں لیا جاتا ہے
سرویا	۲۲,۰۰۰,۰۰۰ ″	

انگلستان کا مجموعی قرضہ جنگ اسی وقت ۱,۸۰۶,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ تک پہونچگیا تھا۔

اب دوسری طرف امریکہ کا جنگی قرضہ دوسرے ممالک پر حسب ذیل تھا۔

۱۔ بلجیم	۴۰۹,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر
۲۔ فرانس	۳,۶۳۴,۰۰۰,۰۰۰ ″
۳۔ برطانیہ	۴,۵۷۳,۰۰۰,۰۰۰ ″
۴۔ اٹلی	۱,۸۰۹,۰۰۰,۰۰۰ ″
۵۔ پولینڈ	۱۳۵,۰۰۰,۰۰۰ ″
۶۔ روس	۲۱۱,۰۰۰,۰۰۰ ″

ان تمام قرضوں کی کل میزان ۱۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر ہوتی ہے۔

(۲) اتحادیوں نے جنگ فتح کی تھی اس لئے انھوں نے جرمن اور اس کے متعلقات سے اپنی ہی شرائط پر صلح کی جس میں تاوان جنگ کے نام سے بڑی بڑی رقمیں اُس سے طلب کیں۔ معاہدہ ورسائی پر ۲۸۔ جون ۱۹۱۹ء کو دستخط ہوئے تھے۔ اس صلحنامہ کی دفعہ ۲۳۲ کی رو سے جرمنی نے تمام نقصانات کا معاوضہ یا تاوان دینے کا عہد کیا تھا۔ اسی دفعہ کی رو سے ایک تاوانی کمیشن نقصانات کا اندازہ کرکے تاوانی رقم معین کرنے کے لئے نیز اُس رقم کی جس کے اندر اندر ادائیگی کی صورتیں اور ذرائع تجویز کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس صلحنامہ کی دفعہ ۲۳۵ میں ۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ کی رقم کا ابتدائی مطالبہ بھی کیا گیا تھا جس کی ادائیگی یکم مئی ۱۹۲۱ء تک جرمنی کو کردینا چاہئے تھا۔

جرمنی سے وصول ہونے والی جملہ تاوانی رقم کے مختلف اندازہ کئے گئے ہیں۔ انگلستان نے اتحادیوں کے مطالبات کی بنا پر اس کا اندازہ ۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ کیا ہے۔ برخلاف اس کے

موسیو کلاٹزنے ۔۔ ،۔۔۔، ۔۔۔۔ ۱۵ پونڈ اندازہ کیا ہے۔ بہرحال مجموعی رقم کے متعلق بالآخر جو فیصلہ ہوا یہ ظاہر
ہے کہ اتحادیوں نے نہایت بیدردی سے زیادہ سے زیادہ مطالبات کا بوجھ جرمنی پر ڈالدیا۔ مسٹر
لائیڈ جارج نے فرمایا تھا کہ جرمنی زیادہ سے زیادہ جتنا برداشت کرسکتی ہے اُتنا تاوان جنگ اُس
سے لیا جائیگا، لیکن مسٹر ایرک گڈیز اس معاملہ میں سب سے بڑھ گئے جب اُنھوں نے گلڈہال کیمبرج
میں تقریر کرتے ہوے فرمایا کہ "ہم جرمنی کو اتنا دبوچینگے کہ تم لوگ اُس کی چیخ پکار سنوگے۔ ......
اُس کو صفحہ ہستی سے اسی طرح مٹائیں گے جیسے اُس نے بلجیم کو مٹانا چاہا تھا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ انگلستان نے اپنا معاندانہ طریق عمل چھوڑ دیا اور ذمہ دار اصحاب
کے ویوں میں بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اب قبل اس کے کہ ہم اصل مسئلہ پر توجہ کریں، ایک معا
کو فوراً واضح کردینا ضروری ہے۔ وہ یہہ کہ امریکہ نے یکبارگی انگلستان سے اپنے تمام قرضہ کا مطا
کردیا۔ اس واقعہ نے انگلستان کو مجبور کیا کہ وہ بھی اتحادیوں سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کرے۔ ا
میں شک نہیں کہ امریکہ اپنے ایک جائز حق کا استعمال کر رہی ہے۔ لیکن یہ کہاں تک درست ہے
ایک حصہ دار تو اپنا پورا قرض وصول کرے اور دوسرے کو جتنا قرض لیا تھا وہ تو دینا پڑے او
دیا تھا اس میں سے ایک پائی وصول نہ ہو۔ اور خاصکر ایسی حالت میں جب برطانیہ کے ذمہ امریکہ
قرضہ کا زیادہ تر بار وہی ہے، جو فرانس اٹلی اور بلجیم کی طرف سے لیا گیا تھا۔

غرض اس معاملہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد سلسلہ کی تمام کڑیاں ترتیب پاگئیں۔ چونکہ امر
انگلستان سے ادائیگی کا مطالبہ کر رہا ہے اس لئے انگلستان فرانس سے مطالبہ کرتا ہے
فرانس جرمنی سے تاوان جنگ کی ایک ایک پائی تک وصول کرنے پر اڑا ہوا ہے۔ اور نتیجہ
کہ جرمنی کا تمام نظام معاشیات غیر معمولی اور انتہائی گرانباری کی وجہ سے تباہی کے مُنھہ میں
مسٹر کینزنے فرانس کی حالت کا بہترین خاکہ کھینچا ہے، اُن کے نزدیک فرانس جا
کہ گذشتہ جنگ میں معاشی قوت کا ایک طریقہ پر امتحان تھا۔ محض امریکہ اور انگلستان
سے وہ کامیاب ہوسکتا تھا، لیکن یہہ آخری جنگ نہ تھی اور اس کے بعد اور بھی جنگیں یقینی طور

ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ بھی اس کو انگلستان اور امریکہ کی مدد ملیگی۔ جرمنی کی آبادی بڑھتی جاتی ہے اور فرانس کی آبادی دوسری طرف گھٹتی جا رہی ہے۔ جرمنی اپنے ساز وسامان، کی بنا پر بہت ممکن ہے کہ جلد ہی اُٹھ کھڑا ہو اور فرانس کے خلاف تیغ انتقام بے نیام کرے۔ چنانچہ فرانس کو اسی کا خطرہ ہے اور اُس سے محفوظ رہنے کے لئے سامان کرنا چاہتا ہے۔ اسی غرض سے ایک طرف وہ جرمنی کی تجارت اور صنعت و حرفت کو بالکل تباہ کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف معاشی ذرائع کو توڑنا چاہتا ہے، اور پھر تاوان جنگ کی ایک ایک پائی مار کر وصول کرنا چاہتا ہے۔

لیکن ایک لمحہ کے لئے ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیئے، کہ جرمنی اتنی بڑی تاوانی رقم ان حالات میں کیوں کر ادا کر سکتا ہے۔؟ تین ہی ذرائع اس کی ادائیگی کے ہوسکتے ہیں خدمات سے یا طلائی زر سے یا سامان سے۔ ان کے علاوہ کوئی اور چوتھا ذریعہ نہیں نکل سکتا۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ نظر ڈالیں گے۔

(۱) جہاں تک خدمات کا تعلق ہے، انگلستان تو اُس سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور فرانس کو اس حالت میں دو اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اوّل یہ کہ اس کی وجہ سے بیکاری فرانس میں اور بڑھ جائیگی دوسرے یہ کہ اگر جرمن مزدوروں کو فرانس میں کام پر زبردستی مجبور کیا گیا تو ایک طرح پر ہم لوگ ایسے نظام کا دوبارہ آغاز کریں گے جو غلامی کی محنت سے بہت مشابہ ہے، اور اُس میں یہ خطرہ بھی ہے، کہ یہ مزدور ہمیشہ اپنے مخالفانہ طرز عمل سے ہڑتالیں اور دوسری اشتعال انگیز حرکتیں کرتے رہیں گے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ فرانس کو ایک اور فوج ان مزدوروں سے کام لینے کے لئے مقرر کرنا پڑے گی۔

(۲) اس وقت جرمنی میں زر طلائی کی مقدار کاغذی زر کے صرف ایک فیصدی کے قریب ہے تو اُس سے مارک کی رہی سہی قیمت بھی ختم ہو جائے گی جس سے تمام یورپ (جس میں فرانس بھی شامل ہے) کے معاشی نظام پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔

(۳) تیسرا ذریعہ سامان یعنی ملکی مصنوعات اور دیگر اجناس کی برآمد سے ادائیگی کا ہوسکتا

سے ہے۔ لیکن اس میں اور بھی اہم دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً اگر جرمنی اپنا تمام قرضہ فاضل سامان
برآمد سے ادا کرنا چاہے تو اُس کے پاس اتنا سامان کہاں موجود ہے؟ چار سال تک سخت جنگ میں
مبتلا رہ جس کے دوران میں اُس پر طرح طرح کی معاشی مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے اب حالت یہ ہے، کہ اگر
بالفرض درآمد بالکل بند کر دی جاے اور اتحادی اُس کی تمام برآمد پر بھی قابض ہو جائیں پھر اُس سے
تاوانی قرضہ کی ادائیگی ناممکن ہے۔

لیکن اگر بغرض استدلال تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ جرمنی مزدور زیادہ سامان
تیار کرنے پر مجبور کئے جا سکتے ہیں جس سے برآمد بڑھ جائیگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی اپنے سامان
انگلستان اور فرانس کے مقابلہ میں کم قیمت پر تیار کرے گا اور تمام دُنیا کے بازاروں میں انگلستان
اور فرانس کے مقابلہ میں کم قیمت پر فروخت کرے گا۔ اس طرح اُن کی بیرونی تجارت معرض
خطر میں آجاے گی، اب اگر اتحادی جرمنی کو آخری الذکر طریقہ پر قرضہ ادا کرنے کے لئے مجبور
کرتے تو تجارتی نقصان اُنھیں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی سے انگریزی مالکین معدنیات نے
کوئلہ کی درآمد کے خلاف احتجاج اور شورش برپا کر دی ہے اور جب ٹائمز نے یہ تجویز پیش کی
تاوان کی مد میں انگلستان میں تعمیرات کا کام جرمنی کے ذمہ کر دیا جاے تو انجنیروں کی انجمن نے
اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پیرس کے ایوان تجارت نے بھی یہی طرز عمل حکومت کے خلاف
کیا اور معاہدہ وسبا ڈن سے گو کہ ایک حد تک مالی مفاد کی امید تھی لیکن اس سے فرانس کی
اور جرمنی کی قابلیت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ غرض ماحصل
ہے کہ جرمنی کو تاوان ضرور ادا کرنا پڑیگا لیکن اُس کو اُس ذریعہ سے ادا کرنے نہ دیا جا سکےگا جس
سے وہ صرف ادا کر سکتا ہے۔

اس کے بعد پھر وہ مشکلات ہیں جو محصولات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قریب قریب
ممالک نے غیر ملکی مال پر محصولات لگا دئے ہیں، اس میں امریکہ، انگلستان اور فرانس سب
طریق عمل ہے اس کے وجوہات بھی ظاہر ہیں، اول دیسی تجارت کی حفاظت دوسرے

کی وجہ سے حکومتوں کے اخراجات میں حد سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اُن لئے مالیات میں توازن قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے، کہ ہر ممکن ذریعہ سے روپیہ فراہم کیا جائے۔ انگلستان صنعتوں کی حفاظت کا ایک قانون پاس کیا ہے، اس کا مقصد سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ جرمنی کا سامان انگلستان میں نہ آنے پائے

اب ظاہر ہے کہ اتحادیوں کے طریق عمل میں کس قدر بے ربطگی پائی جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے اُن کو اپنی صحیح حالت کا خود اندازہ نہیں ہے ایک طرف تو جرمنی سے قرضہ کی ادائگی کا مطالبہ کرتے ہیں جرمنی صرف سامان سے ادا کر سکتا ہے، لیکن جرمنی مال پر بڑے بڑے محصولات لگائے جاتے ہیں اور برآمد بند کی جاتی ہے۔ غرض اتحادیوں کی یہ مشکلات ہیں جس سے کوئی مفر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ تاوان اور زیادہ سے زیادہ محصولات کی حکمتیں دونوں غیر محکم ہیں جس کا نتیجہ صرف تباہی ہے۔ کیونکہ جب تک تجارت آزاد نہ کروگے تاوان وصول نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تجارت آزاد کروگے تو جرمنی تم سے مقابلہ کر کے تمہاری تجارت کو تباہ کر دے گا۔

غرض ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟

آخر میں جرمنی کی قوت ادائگی کا سوال آتا ہے، بہت سی رائیں اس پر متفق ہیں کہ جرمنی میں ادائگی کی سکت باقی نہیں رہی امریکہ اور انگلستان میں اسی طرف رائیں پلٹتی جا رہی ہیں مسٹر کینز کا خیال ہے کہ برطانیہ بھی جو دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ہے ۱۹۲۰ء میں یعنی اپنے عروج کے زمانہ میں بھی ان مطالبات کا صرف ایک تہائی ادا کر سکتا تھا جو آج جرمنی سے مانگا جاتا ہے۔ غیر ممالک میں جرمنی املاک کے قبضہ یا تاوانی دستاویزوں سے بھی ادائگی کی کوئی امید نہیں پھر جرمنی کیونکر اتنی بڑی رقم اتحادیوں کو نقصان پہو نچائے ہوئے ادا کر سکتی ہے؟

ممکن علاج یہاں تک ہم نے دنیا کی موجودہ صورت حال کے خصوص واقعات کو مفصل طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم چند تدابیر بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جن پر عمل کرنے سے اس صورت حال کو بدلا جا سکتا ہے اور دنیا کی معاشی اور اشتراکی زندگی بحال ہو سکتی۔

(۱) پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ آج دنیا جس چیز کی محتاج ہے وہ تحقیقی اور عالمگیر امن ہے

چھوٹی چھوٹی مقامی جنگوں کا خاتمہ ہونا چاہئے - اور یہاں کے اس بار جو کبھی کبھی تلواروں کی جھنکار اٹھتی ہے وہ بھی بند ہونا چاہئے۔ صلح اور امن سے فوجی اخراجات گھٹ جائیں گے میزانیات میں توازن قایم ہوجائے گا، ٹیکس میں تخفیف ہوجائے گی صنعت و حرفت میں کام کرنے والے مزدوروں کی بڑی تعداد کو فوجی خدمت سے آزادی ملیگی اور وہ مشاغل پیدائش میں لگ کر دنیا کی مجموعی پیداوار کو افزوں کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتیں گھٹ جائیں گی اور اس سے لاکھوں بلکہ کروڑوں غریبوں کا فائدہ ہوگا۔

انجمن بین الاقوامی، واشنگٹن کانفرنس اور دوسری بین الاقوامی مجلسوں کو ایک قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔ تاکہ دنیا کو موجودہ قومی اقتدار پسندی کے جنون سے نجات دلائیں۔

(۲) تکثیر زر کو فوراً روکنا چاہئے۔ کیونکہ بغیر اس کے تمام کوششیں بے سود ہوں گی قوانین اور قواعد کی رو سے مقرر کردہ قیمتیں وقتاً قائم نہیں رہ سکتیں اس لئے اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ ترویج زر میں استحکام پیدا کیا جائے۔ تکثیر زر کی وجہ سے تمام حکومتیں آج دیوالیہ بن رہی ہیں، اس کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں پھر مزید ضروریات کے مطابق مزید مصنوعی زر بنایا جاتا ہے، اور اس طرح یہ سلسلہ قایم رہتا ہے چنانچہ آج اسی کی بدولت تمام دنیا میں قماربازی کا دور دورہ ہے،

تعداد زر گھٹانے کی اشد ضرورت ہے، لیکن یہ ایکبارگی ناممکن ہے۔ کیونکہ اس سے اور بھی برے نتایج کا اندیشہ ہے؛ لیکن چند تجویزات جو اکثر مصنفیں نے اس کے متعلق کی ہیں وہ اس موقعہ پر قابل ذکر ہیں:-

۱- بھاری ٹکس۔ جس سے سلطنت کو ضرورت سے زیادہ آمدنی ہوجائے گی اور پھر سلطنت فاضل رقم کو ضائع کرسکتی ہے اور اس طرح زر کی تعداد کم ہوجائے گی۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ بھاری ٹکس والے میزانیہ کسی جمہوری حکومت میں مشکل سے منظور کئے جائیں گے، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے میزانیہ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں کاغذی زر نقد -

۳۴ کروڑ روپیہ کو خارج یا ضائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(ب) بنک کی شرحیں بڑھا دی جائیں اور بنک کے قرضوں پر اور بھی بہت سی قیدیں لگا دی جائیں۔ گو اس سے قیمتیں گھٹ جائیں گی، لیکن اس سے تجارت اور صنعت کو بھی نقصان پہونچیگا (ج) کاغذی زر کو اگر پہلے کی نسبت سونے کی کم مقدار سے تبدیل کرنے کا قانون بنا کر تمام زر کی قدر گھٹا دی جائے۔

(د) ڈاکٹر کینن کی یہ تجویز ہے کہ کاغذی پونڈ اور دس شلنگ والے نوٹ جو خزانے نے اپنے فائدہ کے لئے تمام ممالک میں بھر دیے ہیں وہ سب جلا دیے جائیں، یہی تجویز مسٹر ہاس اور ہلس کی بھی ہے جو اس کو بھی پسند کرتے ہیں کہ تمام کاغذی زر چھکڑوں میں بھر کر جلا کر خاک کر دئے جائیں۔

(ر) حکومتیں اپنے مصارف کم کریں تاکہ میزانیات میں کمی واقع نہ ہو۔ اور آمد و خرچ میں جو فرق ہے اس کو پورا کرنے کے لئے مزید زر نہ بنایا جائے۔

(س) اجناس کی پیدائش میں اضافہ ہو تاکہ کثیر زر کے استعمال کے لئے کام نکلے۔

(ش) معیار طلائی جلد سے جلد اختیار کر لیا جائے، اس میں کچھ دشواری ضرور ہوگی اور کچھ عرصہ بھی لگے گا لیکن یہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کوشش بیکار ہے کہ موجودہ کاغذی زر کا تناسب سونے کی قدر سے قائم کیا جائے۔

۳۔ مالیات میں توازن قایم کرنے کی پھر کوشش کرنا چاہئے۔ تاکہ قرضہ پر گزارہ نہ کرنا پڑے اور یہ حسب ذیل طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

ا۔ کمی مصارف۔ یہہ از خود ایک بہت بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ قومی مصارف فوراً کم کر دینا چاہئے۔ حکومتوں کو اس صورت حال سے نجات پانے کے لئے محض تجربہ کی خاطر

ایک حصّہ بھی اب نہ خرچ کرنا چاہئے۔ اس سے مشکلات بجائے کم ہونے کے بڑھجاتی ہیں۔
معمولی مصارف کے لئے جس میں قرضہ کی ادائیگی بھی شامل ہے معمولی آمدنی پر قناعت کرنا چاہئے
(ب) حکومتوں کو اس طریق عمل کو چھوڑنا چاہئے جو عموماً اصل معاش حالت کو عوام الناس کی
سے پوشیدہ رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً مصنوعی طور پر سامان خوردونوش
اور کوئلہ وغیرہ کی ارزانی جو محض دکھلانے کے لئے اصل قیمت سے کم پر فروخت کیا جاتا ہے
یا بیکاروں کے لئے گذارہ مقرر کرنا جس سے صنعت وحرفت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور ریل
کا کرایہ کم کرنا یا ڈاکخانہ کی شرحیں گھٹا دینا جس سے اصل قیمت بھی وصول نہیں ہوتی۔
(ج) مزید ٹکس سے آمدنی بڑھانا چاہئے اور اسی سلسلہ میں اس دولت پر جو جنگ
کی وجہ حاصل کی گئی ہے اس پر ایک خاص ٹکس لگانے کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔

۴۔ آزاد تجارت کے اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ چونکہ بغیر اس کے قیمتوں
میں تخفیف کی کوئی صورت نہیں، یہ طریق عمل نہایت خطرناک ہے کہ شکستہ خوردہ دشمنوں کو دنیا کی تجارت
میں کوئی حصہ نہ لینے دیا جائے، جرمنی اپنی جغرافی حدود سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اور دنیا اس
کو کسی حالت میں فراموش نہیں کرسکتی ہے۔

۵۔ آخر میں سب سے زیادہ اہم تجویز یہ ہے کہ تمام بین الاقوامی قرضہ منسوخ سمجھے جائیں
اور تاوانی قرضہ پر نظرثانی کی جائے، غیر طے شدہ مسائل کبھی اقوام کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے، اور یہ
مسئلہ اس لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر اس کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو قومی مشکلات کا ایک نیا باب
کھولا جا رہا ہے جس کا خمیازہ ایک دوسری اور سخت ترین جنگ کی صورت میں دنیا کو بھگتنا پڑے گا جرمنی
جو آج بالکل دیوالیہ ہے اپنے بار کو ناقابل برداشت سمجھ کر اور ادائیگی کی کوئی صورت نہ نکلنے کی حالت
میں کہیں تیغ آزمائی پر نہ مجبور ہو جائے وہ خود تو ڈوب رہا ہے۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں اپنے

ساتھ تمام دنیا کو نہ لے ڈوبے۔ وہ روس سے ملکر اگر بالشویک ہوجائے تو اپنے تمام قرضوں سے یکقلم انکار کردے گا۔ جنیوا کانفرنس واقعتاً خدا کی طرف سے اتحادیوں کو ایک تنبیہہ ہے۔ فرانس جو روس کا آج جانی دشمن ہے اس کی تعمیر بھی انقلاب پر ہوئی ہے؛ اور یورپ کو آج بھی وہ شعلہ یاد ہونگے جو انقلاب فرانس نے تمام دنیا میں مشتعل کردئے تھے۔ فرانسیسی حکومت نے ۲۲۔ دسمبر ۱۷۹۲ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ جمہوری حکومت اُن معاہدوں پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں ہے، جو ظالم اور جبّاروں سے کئے گئے تھے۔ پھر کیا ہوگا۔ اگر جرمنی اور آسٹریا روس سے ملجائیں اور اسی جمہوری اصول کی تقلید کریں؟ اُس وقت اتحادیوں کے لئے صرف ایک راہ کھلی رہ جائیگی کہ وہ غنیم کے علاقوں پر ایک غیر معین وقت تک قبضہ کئے رہیں۔ لیکن کیا اتحادی اس قابل ہیں کہ ایسا کرنے پر تیار ہوجائیں۔ تاریخ اس کا صرف ایک جواب دسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے یورپ کا خاتمہ جلد تر ہوجائے گا۔ قومی قرضوں سے انکار کی یہ پہلی مثال نہ ہوگی۔ اتحادیوں نے اس پر پہلے عمل کیا ہے۔ فرانس نے انقلاب کے زمانہ میں اُس کے بعد امریکہ کی بہت سی ریاستوں نے بھی گذشتہ صدی میں یہی کیا۔ چنانچہ روسی مراسلہ جو اتحادیوں کے سامنے جنیوا میں پیش کیا گیا تھا اُس میں اس طرف بھی نہایت پرزور الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ "کہ فرانسیس کنونشن منعقدہ ۱۷۹۲ء کے مطابق فرانس نے ان تمام عہدناموں کو صرف چاک ہی نہیں کیا جو شاہان فرانس نے دوسرے ممالک سے کئے تھے۔ بلکہ قومی قرضوں سے بھی صاف انکار کیا تھا۔"

غرض یورپ کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ ہر ملک میں بےچینی پھیلی ہے۔ تاریخ بنی نوع انسان کے اس نازک ترین وقت میں کونسی تدبیر اصلاح کی کیجاسکتی ہے؟ یورپ کی تمام قوموں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیا یہ توقع بیکار ہے کہ امریکہ اس حالت میں یورپ کی نہ ہولے گا۔ بین الاقوامی قرضوں کو منسوخ کردینا گویا کہ اخراجات جنگ کی دوبارہ تقسیم ہے

اس سے ان اقوام کا بار بڑھ جائے گا جنہوں نے سب سے زیادہ قرض دئے تھے، یہ ایک طرح کا
زائد ٹکس ہوگا۔ اور چونکہ انگلستان اور امریکہ نے سب سے زیادہ قرض دیا تھا۔ اس لئے اُس کا
مطلب یہ ہوگا کہ ان ممالک نے جنگ کے سب سے زیادہ اخراجات برداشت کئے۔ لیکن تاریخ عالم میں
یہ واقعہ بے نظیر نہ ہوگا۔ اس سے پہلے خود انگلستان نے جنگ نپولین کے بعد اپنے تمام اتحادی
قرضہ کو منسوخ کر دیا تھا۔ اب یہ امریکہ کی باری ہے، کہ وہ یورپ کو ہولناک موت سے بچا سکے
آج یورپ امریکہ کی کفالت کا محتاج ہے۔ تاکہ دوبارہ امن قایم ہو۔ امریکہ کی دولت وثروت
آج دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اس دنیا کو گرداب مصیبت سے نکال بھی سکتا ہے۔ روس سے
تہذیب تمدن کا خمیازہ نکل چکا، جرمنی کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ آسٹریا کی حالت اس سے بھی بدتر
پھر کیا امریکہ کی جمہوری حکومت "ایک پونڈ گوشت" کے لئے دنیا کو اس خطرہ میں پڑا رہنے دیگی سمجھوتا
کرنا زندگی کا اصول ہوگیا ہے۔ اور دُنیا جانتی ہے کہ فرانس اور امریکہ کیا کریں گے اون کی ذمہ داریاں
خدا اور بندہ دونوں کے سامنے اہم ہیں تو کیا یہ روس۔ جرمنی اور آسٹریا کو اُنکی قسمت
پر چھوڑ دیں گے، یا اون کی مدد کریں گے کہ وہ پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔
اتحادیوں نے جنگ تو فتح کر لی لیکن اب صلح اور امن کون قایم کرے گا؟

(ترجمہ)

شفیق الرحمن قدوائی
متعلم جامعہ

یورپ کس طرف جا رہا ہے

صلح ہوئے پانچ چھ برس ہونے کو آئے، لیکن دنیا اس کی برکتوں سے اب تک محروم ہے۔ پہلے دنیا کو ایک خطرہ تھا۔ مگر اب ایک نہیں، دس خطرے ہیں۔ حق اور آزادی۔ جن کے لئے جنگ کی آگ بھڑکائی گئی تھی، وہ اب بھی اسی طرح روندے جا رہے ہیں، اور ان پاؤں سے روندے جا رہے ہیں، جنہوں نے ان کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جنگ سے پہلے دنیا جس لعنت میں مبتلا تھی، جنگ کے بعد، ہزاروں لاکھوں کا خون بہا کر بھی ان ہی لعنتوں میں مبتلا ہے۔ اور کوئی صورت نہیں کہ یہ ابتلا کم ہو۔ کمزور قومیں غلامی کے اندیشہ سے رعشہ براندام ہیں، اور قومی جماعتیں ملک گیری کے جنون سے توازن کا مسئلہ حقوق فطری کی نگہداشت کی ضرورت ہے ایسے خوشنما جال ہیں جو اب بھی بچھائے جائیں گے، اور حق و آزادی کا نام لیکر شیاطین دولت دنیا کو اپنی حرص و آز کے جہنم میں ڈھکیلینگے۔ کرہ ہوائی جنگ کی آتشناکیوں سے اب تک شعلہ بدامن ہے، زمین کا دل فوج کے لاؤلشکر، اور توپوں کے دھماکوں سے اب بھی کانپ رہا ہے، اور انسانی روحیں امن و اطمینان کے لئے مضطرب و بیقرار ہیں۔ لیکن عمالی کے دجال کی بھوک تیز سے تیز تر ہو رہی ہے، دولت کا شیطان حق و آزادی، امن و انصاف کا دشمن ہے، اس کو چین کی نیند سونا پسند نہیں، جنگ کے دہکتے انگاروں پر لوٹنا پسند ہے۔ وہ روحوں کی پکار نہیں سن سکتا، رانڈوں کا آہ و نالہ اس کے لئے نغمۂ راحت ہے، اور یتیموں کا گریۂ ماتم ساز ترنم، ہوائیں کہہ رہی ہیں کہ عنقریب وہی مصیبتیں پھر ٹوٹنے والی ہیں، جن کا ایک چھوٹا سا نمونہ ۱۴ء سے ۱۸ء تک دنیا میں ٹوٹا تھا، اور چشم فلک ایکبار اس ہلاکت کا تماشا دیکھنے والی ہے، جو ایک عرصہ کے لئے روئے زمین سے نسل انسانی کا خاتمہ کر دے گی۔ موت کا فرشتہ سب کو خون آلودہ نیند میں سلا دے گا۔

دوستو! یہ محض الفاظ کا زور ہی زور نہیں ہے، بلکہ واقعات و حقائق کا بیان ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیاں، جنگی تیاریاں حربی اختراعیں، اور ملک گیریوں کا جوش اس بیان کا بنیادی مسالہ ہیں۔ یورپ سے لیکر امریکہ تک سب کے قوائے دماغی یہی کام کر رہے ہیں حکومتوں کو شہپر گولہ بارود کے سوا کوئی کام نہیں۔ مزدوروں کو ملوں کی سرمایہ داروں کو تجارتی میدان کی فکریں ہیں، اور وزارتیں رات دن یہ خواب دیکھتی ہیں کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ انسانی جماعتوں پر حکومت کریں۔

اس صحبت میں ان خوابوں کی تعبیروں کا صرف ایک حصہ پیش کرتا ہے۔ یہ حصہ اختراعات حربی کا ہے، اہمیت کے لحاظ سے یہی سب سے بھاری ہے۔ باقی حصے کسی آیندہ صحبت میں پیش کئے جائیں گے۔

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا، ایک حکومت کے رائل کمیشن نے حربی آلات کی ایجادوں پر ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ کے انعامات تقسیم کئے ہیں۔ ان میں چالیس ہزار پونڈ صرف دو قسم کے بموں کا انعام ہے جن کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ایک ایک بم ایک پوری بستی کیلئے کافی ہوگا چند خاص ایجادوں کے انعاموں کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

ایرپلین پر	۴۸۰۰۰ پونڈ
زیپلین پر	۳۰۰۰۰ "
شب پرواز پر	۵۰۰۰ "
لایم برگی نٹ پر	۱۲۵۰۰ "
آبدوز پر	۲۶۰۰۰ "

جس آبدوز پر انعام دیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ دنیا میں یہ سب سے بڑی اور سب سے اچھی قسم کی آبدوز ہے۔ اس کی رفتار بہت تیز ہے، اس پر سے ۱۲۔ انچ دہانہ کی توپ فیر کی جائے گی بم کے گولے بھی پھینکے جائیں گے، اور پانی میں غایب ہو کر اتنی گہری چلی جائے گی کہ آبی دوربینیں بھی نہیں دیکھ سکیں گی۔

ہی حکومت نے ایک ٹینک بھی بنوایا ہے۔ اور اس کے بنانے والے کو کئی ہزار پونڈ انعام دیا
۔ یا گیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ خشکی اور تری دونوں میں یکساں کام دیگا۔ اس کا طول ۱۵ اور
ض ۶ فٹ ہے۔ اس میں ۵، ۷ ملی میٹر کی توپ لگائی جائے گی۔

اب تک ہوائی جہازوں میں یہ نقص تھا کہ وہ فضا میں قایم نہیں رہ سکتے تھے، جس سے
ان سے مستقل کام نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اب کئی کئی منٹ ٹھیر سکتے ہیں۔ ایک طیارچی نے ایک ایسا
آلہ بنایا ہے، جس سے جہاز قابو میں رہے گا، اور ٹھیرانے سے زمین پر گریگا نہیں حکومت نے اس ایجاد
پر ۲۴۵۰۰۰، اور مختلف کمپنیوں نے ۱۰۷۵۰۰ پونڈ صلہ دیا ہے۔ اب تک ہوائی جہازوں کی زیادہ سے
زیادہ قوت ۱۰۰۰ گھوڑوں کی تھی، لیکن اب ایسے ہوائی جہاز بنائے جا رہے ہیں، جن کی قوت ۳۰ ہزار فٹ
بلندی پر ۴۰۰۰ گھوڑوں کی ہوگی، ان کی رفتار کا اندازہ ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کیا گیا ہے، پچاس آدمی معہ سامان
کے بیٹھ سکیں گے، ۴۴ ملی میٹر کی توپیں بار کی جائیں گی، اور فضا میں جہاز کو قایم کرکے بآسانی
باری کی جا سکے گی۔ جہازوں کو غیر مرئی بنانے کے لئے ایک شفاف دھات کے غلاف بھی طیار کئے
گئے ہیں، جس کی وجہ سے دیکھنے والے جہازوں کو نہیں دیکھ سکیں گے اور وہ بیٹھے بٹھائے، خاص
خاص بانوں میں سے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

پرانے قصوں میں جو "از غیبی گولہ" سنا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں ہے؟

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ہوائی قوت فرانس
کی ہے۔ اور حکومتیں اس بارے میں اس سے بہت کمزور ہیں، اور اس کے مقابلہ کی طیاریوں میں
مصروف سرگرم۔ لیکن سطور بالا میں جس ہوائی قوت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ فرانس کی نہیں ہے، اس
۔۔ کی ہے۔

شکست خوردہ جرمنی کو اس کے مربضوں نے ہوائی جہاز بنانے سے روک دیا تھا لیکن اس نے
۔ کلیں بنائی ہیں، جن کی مدد سے انسان پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ سکتا ہے یا بالکل آزاد
ہے ہیں، اور دیکھنے سے یہ اڑنے والے انسان غیر پرند نہیں معلوم ہوتے۔ اس نے ایک اور

مشین بھی بنائی ہے، جو ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ جوڑ جوڑ علیحدہ ہے، ۱۵ منٹ میں ٹوٹ کر تہہ ہو جاتی ہے اور اتنی مختصر ہے کہ سارا سامان پانچ چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں سما جاتا ہے۔

امیر البحر سر پرسی اسکاٹ نے "پیرسن میگزین" میں اختراعات حربی پر یہ خیالات ظاہر کئے ہیں کہ دنیا میں اب میدانی جنگیں نہیں ہوں گی ان میں ہاتھ پیر سے زیادہ دماغوں کا اور سپاہیوں سے زیادہ کیمیاگروں کا حصہ ہوگا۔ فریقین کو مقابلہ میں آنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ آیندہ حملوں میں بڑے بڑے ڈریڈ ناٹ کام نہیں دیں گے، جو کچھ کام ہوگا آب دوز اور تحت البحر کشتیوں سے ہوگا۔ لیکن جیت اسی کی ہوگی جس کے پاس سب سے زیادہ ہوائی قوت ہوگی حکومتوں کو اپنی بقا کے لئے سب سے زیادہ اس قوت کو بڑھانا چاہئے۔

ہوائی جہازوں کی طرح روز نئی نئی قسم کی توپیں بھی ڈھالی جاتی ہیں۔ ہوائی اور پہاڑی حملوں کے لئے ایلومینیم کی توپیں بنائی گئی ہیں جو بجد ہلکی پھلکی، مضبوط اور کام دینے میں نہایت عمدہ ہیں۔ ایسی توپیں بھی بکثرت ڈھالی جا رہی ہیں، جن کا توڑ ایک سو پچیس میل کا ہے ان کی نال گولوں سے بھر دی جاتی ہے، اور ایک گولہ سر ہونے کے بعد دوسرے گولے یکے بعد دیگرے از خود سر ہوتے رہتے ہیں کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کی مار کی حد کو اور بڑھایا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ان توپوں میں زہریلے گولے بھر کر سر کئے جائیں، تو سیکڑوں میل کے فاصلہ سے دشمن کے ملک کو تباہ و تاراج کیا جاسکیگا۔ جرمنوں نے ایک نئی وضع کی توپ ڈھالی ہے؛ یہ توپ ۱ کیلومیٹر کے نوٹ کی ہے، چلنے میں مطلق کوئی آواز نہیں دیتی، اور اتنی تیزی سے چلتی ہے کہ گولے بارش کی بوندوں کی طرح گرتے ہیں۔ ایک اور کارخانے میں برقی توپیں تیار کی جا رہی ہیں، یہ گولوں کی جگہ برقی شرارے برساتی ہیں۔ ان کی زد بھی اچھی خاصی ہے، کسی قسم کا شور نہیں ہوتا؛ اور چپ چاپ پلٹنیں کی پلٹنیں منٹوں میں تودۂ خاکستر ہو جاتی ہیں۔

تمدن جدید کا ایک اور آلہ ہلاکت بم کے گولے ہیں۔ ہندوستان میں ان کی آمد

کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یورپ والے جانتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے، اور کتنی خطرناک ہے۔

امریکہ میں ایک شل بنایا گیا ہے، جس سے زیادہ قوی آج تک نہیں بنایا گیا ہے، اس کا وزن ۴۰۰۰ پونڈ ہے، اور اتنے مہلک اور قوی اجزا سے مرکب ہے۔ کہ بڑے سے بڑے آہن پوش جنگی جہاز ایک گولہ کی ضرب سے سنبھل نہیں سکیں گے لیکن اس سے زیادہ زبردست قسم کے بم فرانس میں طیار کئے گئے ہیں، جو خشکی کے علیحدہ ہیں اور تری کے علیحدہ خشکی کے بم ایسے ہیں کہ صرف بارہ گھنٹہ میں برلن کو نیست و نابود کر سکتے ہیں، اور تری کے ایسے ہیں کہ ایک ایک بم جس جگہ پڑ جائے گا، سو سو فٹ بڑے بڑے جہازوں کو غرق کر دے گا، اور پچاس فٹ تک گہراؤ میں اثر کریگا۔

ان کے علاوہ اور بھی نئے طرح کے بم بنائے جا رہے ہیں، جو اگر تیار ہو گئے تو قوت و ہلاکت میں بے نظیر ہوں گے

سب سے آخری اور بے بنیاد چیز، جو ایک حد تک صرف اسی دور کی پیداوار کہا جا سکتا ہے جنگ میں زہریلی گیسوں کا استعمال ہے گذشتہ جنگ میں جرمنوں نے اس سے خاص طور پر بہت کام لیا ہے، آخر آخر میں اتحادی بھی اسی حربہ پر اتر آئے تھے۔ لیکن آئندہ جنگوں میں توپ گولوں سے زیادہ یہی چیز کام آئے گی۔

امریکہ میں پروفیسر لوئیس نے ایک زہر طیار کیا ہے، جس سے حیوانات ہی نہیں نباتات بھی نہیں بچ سکیں گے اس زہر کا نام موجد کے نام کی مناسبت سے "لوئی سائٹ" رکھا گیا ہے اور ہزاروں من کی تعداد میں ہر وقت جمع رہتا ہے۔ اسی قسم کی ایک خطرناک گیس منجمد کی گئی ہے لیکن ہوا لگنے سے سیال ہو جاتی ہے، یہ ڈبیوں میں بند سپاہیوں کو دیدی جائے گی، اور وہ بوقت ضرورت ڈبیاں کھول کر چپ چپاتے یہی کام کریں گے۔ جو تیغ و تفنگ کی جھنکاروں میں کیا جاتا ہے امریکہ میں "بالٹی مور" نام ایک کارخانہ ہے جہاں صرف اسی قسم کی چیزیں تیار کی جاتی ہیں عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ وہاں دو لاکھ سیر کی مقدار میں، مختلف قسموں کے زہر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

ایک فرنچ سائنسٹ نے آتش باری کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے، جو بہت ہی [illegible]

ان کا اظہار انقلاب پسندوں کی طبائع کرتی ہیں لیکن اس قسم کے جذبات بجائے خود عوام کی
کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کو مخصوص طرز بیان سے اور بھی زیادہ مشتعل کن اور کارگر کر دیا جاتا ہے۔
یہ جذبہ انقلاب پسند مقرر یا مضمون نگار کے زور قلم سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو صرف اتنا کرتے ہیں
بے اطمینانیوں کو بلیغ اور موثر پیرایہ سے ادا کر دیں اور دنیا کے روشن مستقبل کا منظر لوگوں کے
پیش کر دیں جس کو اگرچہ عوام دیکھتے ہیں لیکن دھندلی شکل میں۔

لیکن اگر انقلاب کی بنیاد کا دار و مدار عوام پر ہے تو یہ کیا ہے کہ ایک معمولی آدمی ا
کے ہیبت ناک منظر سے خائف ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف نصب العی
کے تصادم کو شخصی تصادم خیال کیا جاتا ہے۔ اور پھر فریق مقابل سے ہر طرح کی خطرناک ام
قایم کی جاتی ہیں۔ انسانی جماعتیں جلد مشتعل ہونے والی اور ڈرپوک ہوتی ہیں اور ان میں
تر ایسے ہوتے ہیں جو خوف کے بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اس لئے دونوں قسم کی جماعتی
انقلاب سے توقعات قایم کرتی ہیں یا انقلاب کو نفرت کی نظر سے دیکھتی اور ان ڈرا
ہوؤں کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں جن کا خود ان کو احساس ہوتا ہے۔ ان میں سے
قابل وثوق نہیں ہوتے۔ انقلابات شورش پسندوں یا سرمایہ داروں کی وجہ سے وقوع پذ
ہوتے۔ اس لئے مورخ کو چاہیئے کہ اس قسم کے ڈرانے ہوؤں کو صحیفہ نگاروں، مدیروں،
اور ضعیف عورتوں کے لئے چھوڑ دے۔ یہ بھی آسان ہے کہ "ہوّے" پر عوام کو حملہ کرنے
آمادہ کر دیا جائے۔ پیشتر اس ہوّے کی شکل لمبے بالوں والے وحشت مآب، دبلے ا
کپڑے پہنے ہوئے نوجوان کی سی ہوتی تھی۔ اور اس کا نام انارکسٹ یا سوشلسٹ
اب اس کے لئے ایک اور ہیبت دلانے والا نام بالشوک تجویز کیا گیا ہے۔ یہ ہوّا
زیادہ ذلیل طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے یعنی اول درجہ کا نقاش یا کاریگر، ڈرائنگ روم
موجود رہنے والا ملازم یا کوئی نوجوان جس کے جذبات امتیاز سے مطلقاً معرا ہیں اور
جو دوسروں کے سر پر سوار ہو کر لکھنے یا تصویر کھینچتا ہے۔ شاید عمومی صحیفہ نگار ا

ں نے اس شخص کو دیکھا ہوگا۔ انہوں نے یہ خبر بھی افواہ سنی ہوگی کہ بالشوک نزدیک آرہے ہیں
سے زیادہ اور کیا قدرتی بات ہوسکتی ہے کہ یہ شخص بالشوک ہو۔ آدمیوں کے ہجوم میں ایسے
اص کو نہایت خوشی سے مار ڈالا جاسکتا ہے۔

ہوّوں کے متعلق صرف ان رجعت پسندوں کا ہی ٹھیکہ نہیں۔ ایک ہوّوے کو موٹے آدمی
طرح لباس پہنا کر جیب میں لا بنی گھڑی کی زنجیر اور سر پر بہت بڑی ٹوپی رکھی جاتی ہے اور انقلا
ند جماعت اس کو سرمایہ دار کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ حالانکہ اکثر سرمایہ داروں کو فتور ہضم
کایت ہوتی ہے اور وہ نہایت محنتی ہوتے ہیں۔ شاید یہ ہوّا حزب العمال کے لیڈر کی شکل سے قیاس کیا گیا
جس کو (او۔ بی۔ ای) کی تمنا ہے۔ غرضکہ اسی طرح انقلاب پسندوں کو اپنی آگ مشتعل کرنے کے لئے کافی
لجاتا ہے۔ اس طرح عوام کو صبح امید کی توقع دلائی جاتی ہے جس سے ان کی بلاغت میں مزید اضافہ
جاتا ہے۔ ان باتوں کا لابدی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ معمولی آدمی سہم کر رہ جائے۔

لفظ انقلاب کے متعدد معنی ہوسکتے ہیں اور بحث کی خاطر یہ لفظ متضاد معنی میں بھی استعمال کیا
سکتا ہے۔ انقلاب کے حریف اس سے صرف یہ مراد لیتے ہیں کہ انسانوں کی گردنوں پر چھریاں پھیری
یں اور نظام جماعت کو چند متعصب عالی دماغ والوں کے قبضہ اقتدار میں دیدیا جائے۔ لیکن ایک
انقلاب پسند اس مسئلہ کی پیچیدگیوں میں یہ کہہ کر مزید اضافہ کرسکتا ہے کہ زمانہ انقلاب میں
م سرمایہ داروں کے گولی ماردینی چاہئے اور ساتھ ہی اسکی محبت و رفاقت کی تعلیم بھی جاری ہے زبان کے استعمال
جو ابہام واقع ہوجاتا ہے اس امر میں مانع نہ ہونا چاہئے کہ ہم لفظ انقلاب کے محدود مخصوص معنی مراد لیں۔

روسّو، مارکس اور دیگر انقلاب پسندوں نے (اگر ہم اس باب میں ان سے رہنمائی طلب
) اس لفظ سے نظام جماعت میں ایک مخصوص تبدیلی مراد لی ہے۔ انہوں نے انقلاب کے معنی
نہ ہیئت اجتماعی میں اچانک اور بنیادی تغیر خیال کئے۔ اول تو انہوں نے ان گذشتہ واقعات کا حوالہ
جن کو عام طور پر انقلاب کہا جاتا ہے اور زیادہ اس لفظ کے استعمال کے متعلق توضیح کردی ہے
رے یہ کہ انہوں نے موجودہ طرز زندگی کے نصب العین پر تنقید کے ذریعہ اس لفظ کے متعلق

پورا ابہام رفع کر دیا ہے۔

لیکن تمام گذشتہ اہم واقعات کے لئے اس لفظ انقلاب کو بجز استعارہ کے اچانک اور بنیادی تغیر کے معنی میں نہیں استعمال کر سکتے۔ قیام مسیحیت یا نشاۃ الثانیہ کے لئے یہ لفظ نہیں استعمال کر سکتے بلاشبہ یہ اصولی تبدیلیاں تھیں یہ اچانک نہیں واقع ہوگئیں۔ برخلاف اس کے اگست ۱۹۱۴ء (جب جنگ عظیم کا آغاز ہوا) میں بھی کوئی یکایک تبدیلی نہیں رونما ہوئی کیونکہ اتبک قوموں کی زندگی کا انحصار جنگ پر ہی رہا ہے۔ اگرچہ اس کے بعض ناگزیر نتائج کا کسی کو علم نہ تھا۔ بلاشبہ یورپین ممالک کے افراد کے حرکات و سکنات میں اک گونہ تبدیلی واقع ہوئی لیکن ان کا طرز عمل اور جماعتی نظام کی بنیادیں بدستور قائم رہیں۔

یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آخر کتنا زبردست تغیر واقع ہو جس کو بنیادی تبدیلی کہہ سکیں۔ مثلاً انقلاب انگلستان ۱۶۸۸ء اس معنی کر بنیادی تغیر نہ تھا اور لفظ انقلاب اس پر عاید نہیں ہوتا۔ جنوبی امریکہ کے انقلابات اچانک وقوع پذیر ہوئے لیکن ہیئت اجتماعی میں کوئی نمایاں تبدیلی ظہور پذیر نہیں ہوئی برخلاف اس کے انگریز جس کو انقلاب امریکہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور امریکہ والے جس کو جنگ آزادی کہتے ہیں فی الحقیقت اسی حد تک بنیادی تغیر کہا جاسکتا ہے۔ جہانتک کہ اس سے اس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کو انقلابی کہا جاسکتا ہے۔

صنعتی انقلاب کے لئے اس لفظ کا جائز استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس کے ذریعہ طرز زندگی میں ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جن میں دوسرے انقلابات کی عارضی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ مورخوں کے نزدیک انقلاب اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوتا جبتک کہ کھڑکیوں کے شیشے نہ ٹوٹیں اور خونچکاں سروں کا منظر لوگ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ مورخین یہ نہ سمجھ سکے کہ جدید صنعت میں اس اعتبار سے کتنے انقلابات کے جراثیم پوشیدہ ہیں اس انقلاب کے ستم کش غربا اور ننھے ننھے بچے ہیں۔ اور خونریزی بھی اس قدر ہو چکی جو کسی دہشت انگیز انقلاب میں ہوئی ہو لیکن اس میں نہایت آہستگی اور تڑپا تڑپا کر قتل کیا گیا۔ اس میں شک نہیں شرفاء کو زیادہ زحمت نہ اٹھانا پڑی اور چونکہ ہمارے تمام

مورخین کا تعلق اسی شرفا کے گروہ سے تھا اس لئے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے، بہر حال انقلاب کے لئے بہت سی جانوں کا ضائع ہونا بھی ضروری نہیں اس کے لئے محض یکا یک اور بنیادی تبدیلی کا ہے جو اس سے لازمی طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے

انقلابات میں سب سے زیادہ محیر العقول انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء اور انقلاب روس ۱۹۱۷ء ہیں اور اس لئے عموماً لفظ انقلاب ان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید تاریخی عہد کے یہ مخصوص انقلابات ہیں۔ یہ اچانک واقع ہوئے اور جو تبدیلیاں ان سے رونما ہوئیں ان کو بنیادی تغیرات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کے اثرات ان ممالک سے باہر جہاں وہ وقوع پذیر ہوئے خارجی ممالک لک پہونچ گئے۔ بہر حال یہ ضروری نہیں کہ ان کے مشترکہ خصوصیات سے بحث کی جائے کیونکہ وہ مسلمہ طور پر ہئیت اجتماعی میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے والے خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ زیادتیاں اور ستم رانیاں جو عوام کو برداشت کرنا پڑیں انقلاب کا لازمی نتیجہ نہ تھیں بلکہ اس قسم کے مصائب نے جماعتی نظام کو آئے دن دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لڑائیوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کو انقلاب کے نتائج نہیں کہا جا سکتا۔ مذکورہ بالا محققین تاریخ کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان نے اجتماعی طور پر ابھی اس قدر ترقی نہیں کی ہے کہ غیر ضروری تصادم کے بدون اجتماعی تغیرات عمل میں آسکیں لیکن اس حقیقت سے انقلاب اور بے جا مظالم ایک ہی علت کے نتائج نہیں قرار پا سکتے۔

بہر حال ہماری دلچسپی کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ انقلابات ایک بڑی حد تک اجتماعی تخیلات پر مبنی ہیں اور چونکہ انقلاب کے ذریعہ جدید نظام جماعت کا تصور سب کا مقصود ہوتا ہے اس لئے ہم کو اس لفظ کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری تھا۔ یہ ایک قدیم اور صحیح خیال ہے کہ انقلاب فرانس روشو کی تعلیمات کا نتیجہ تھا اور بالشویک کرل مارکس کے ابھارے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ محدود تاریخی حقیقت ہمارے دلائل کے لئے بنیادی نہیں قرار دیجا سکتی یہاں ہمارا مقصد مستقبل سے بحث کرنا ہے۔ ان مردہ انقلاب پسندوں کے نصب العین ہم زندوں کے لئے اس واسطے زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان میں ہمارے اور موجودہ زمانہ کے لوگوں کے دماغوں

ہوں اوران پراب تک عمل شروع بھی نہ کیا ہو۔ ہر فرد کا ادراک وفہم اور متخیلہ محدود ہیں نہ وہ سلسلہ وار سوچ سکتا ہے نہ اس کا تخیل ہر نئی چیز پر آزادی کے ساتھ حاوی ہے۔

لیکن انقلاب پسندوں کے نزدیک یہ معمولی کمزوریاں نظام جماعتی اور عادات مروجہ کی خرابیوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ یہاں ہم جانور ہیں لیکن جانوروں کی صحیح فطرت سے محروم۔ اس لئے یہ وحشی جانوروں کی تحقیر و ذلت ہوگی اگر ان کا مقابلہ ہماری مسلح قوموں یا ان انسانی جماعتوں سے کیا جائے جو دوسروں کی بے بسی سے خود فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان عادات سے جو اتفاقی طور پر قایم ہوئیں اور جن کے مجموعہ کو ہم نظام جماعت کہتے ہیں افلاس اور جنگ وجود میں آئے اور یہ دونوں سب سے بڑی برائیاں ہیں جن کا ابتک کسی ہیئت اجتماعی کو تجربہ ہوا۔ ان کی بدولت صرف افراد کو مصایب ہی میں ہی گرفتار رہنا نہیں پڑتا بلکہ آسودگی بالکل مفقود ہوگئی اور قوت فکری وطبعی بے کار ضائع کی گئی۔ ضروریات زندگی کو خوشحال بنانے والی اشیاء کے بہم نہ پہونچنے سے بہت سے بُرے نتائج مترتب ہوئے۔ مذہب کی حالت اور زیادہ دگرگوں اور ناگفتہ بہ ہے۔ مذہبی پیشوا ایک دوسرے پر ہمیشہ حملہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ حکومت کی بنا اس اصول پر رکھی گئی ہے۔ کہ دوسری حکومتوں کے امن وآزادی کو برباد کرکے اپنی قوت حاصل کی جائے۔ صنعت کا یہ حال کہ وہ تعصب اور جہالت کے ایک جنگل میں قزاقوں کے ایک گروہ کے پالے پڑی ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ انفرادی اور جماعتی نظام کی بنیاد عمدہ اصول پر رکھی گئی ہے اور یہ سطحی برائیاں محض اتفاقی ہیں۔ یہ برائیاں زندگی کی اساس کو منقطع کرنیوالی ہیں اور باوجود اس کے کہ خیر بھی فرد اور سوسائٹی کے اصول اساسی میں سے ہے لیکن خیر و شر کی کشمکش اس قدر عمیق گہرائیوں میں پہونچ چکی ہے کہ بغیر بنیادی تغیر کے ان کا تصادم ناگزیر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان پوشش لباس چھوڑ دے یا پیدایش دولت سے دستکش ہو جاے۔ یہ کسی کا عقیدہ نہیں کہ انسان کی عادتیں یکسر بدی پر مبنی ہیں۔ شوپن ہار کے پیرو بھی یہ ثابت نہ کرسکے کہ زندگی اچھی باتوں سے معرا ہے۔ لیکن جو خرابیاں ہم دیکھ رہے ہیں اور جن کو یقیناً سطحی نہیں کہا جاسکتا

اپنے اندر تغیر و تبدیلی کی تمنا پوشیدہ رکھتی ہیں جو معمولی اصلاح سے ایک قدم آگے ہونا چاہیئے۔
یہاں تک تو سب لوگ ان معاملات کو سمجھتے ہیں۔ اب جماعتی ضمیر بیدار ہو گیا اور مطمئن صاحبان ملکیت میں بھی بے چینی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مزدوروں کی بے چینی کا سب رونا روتے سنتے لیکن اب سرمایہ داروں کا اضطراب قابل دید ہے۔ بہت تھوڑے ایسے ہیں جو ہماری موجودہ تعلیم جس پر سب سے زیادہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے کے انفرادی نتائج سے مطمئن ہوں اور بہت کم ایسے ہیں جو اس سوسائٹی سے مطمئن ہیں جس میں ان کو زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اور وہ چند جو ان صورت حالات سے مطمئن ہیں وہ یقیناً بلا امتیاز ہر سوسائٹی میں خوشی سے زندگی گذار سکتے ہیں۔

ہمارے موجودہ زمانہ کی بعض خرابیاں زیادہ دقیق اور دلفریب ہیں۔ یہیں ہم کو مخبران صادق کی بصیرت درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ نہ تو شورش انگیز طبائع اور نہ پیشہ ور مدبرین ہی کو اس میں ان کی بلاغت کی چاشنی کے لئے مواد مل سکتا ہے۔ رجعت پسند بھی اس سے زیادہ پریشان خاطر نہیں ہوتے برائیوں کی جڑ یہی ہے اور یہی طرز زندگی ہے جس کو شرِّ عظیم سے تعبیر کرنا چاہیئے جس کے اثرات اور پیچیدگیاں مذہب، صنعت، سیاست، فنون لطیفہ، معمولی زندگی اور غرضکہ ہزاروں شعبوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے لباس عمرانی پیچیدگیوں، بیماریوں اور عام جہالت میں انسان کے مشابہ بندر کی بہت کم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یقیناً ہمارے رویّہ زندگی میں اس کے بہت آثار موجود ہیں ہمارا یہ رویّہ خود غرضیوں، تسلط کی خواہش، دوسروں سے بغض و حسد بچوں کو دھمکانے اور کسی تنہا فرد یا جماعت پر وحشیانہ غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ نظام جماعت کی کوئی اصلاح ان کا علاج نہیں کر سکتی اور اگر ہمارا نظام جماعت بالکل ابتدائی دور میں نہ ہوتا تو اس قسم کے رویہ کے کارگر ہونے کیلیئے بہت کم مواقع دستیاب ہوتے۔ ایک یا چند وحشیوں کی حکومت کی بجائے بہت سے وحشیوں کی حکومت بالکل معمولی ترقی ہے۔ بہت سوں نے تو حتمی طور پر اپنا

فیصلہ دیدیا ہے۔ کہ انقلاب پسندوں سے کسی قسم کی توقع رکھنا تحصیل حاصل ہے۔ جمہوریت ہرگز پسندیدہ نہیں
اگر اس سے یہ مراد ہے کہ عوام کی مرضی کے مطابق ہر ایک کو متابعت قبول کرنا ہوگی۔ اس لئے اگر انقلاب
کا مدعا نظام جماعت میں بہتری پیدا کرنا ہے تو اس سے قبل افراد کے کیرکٹر اور نظام جماعت کے متعلق
لوگوں کے رویّہ میں بنیادی تغیر ضروری ہے۔

اگر انقلاب کی کوئی حیثیت ہے تو وہ کم از کم اتنا تو موثر ہونا چاہیئے۔ جب کرل مارکس گفتگو کر رہا ہے
تو اُسکے اس کو نہ فراموش کرنا چاہیئے اور روسو کی تعلیمات کے جس نے لوگوں کو فطری زندگی کی طرف رہنمائی کی اس لئے
انکار نہ کرنا چاہیئے کہ اس نے معاہدہ جماعتی کے ذریعہ ایک سیاسی نظام قایم کرنا چاہا۔ بڑے بڑے انقلاب پسند
نے یہ دیکھ لیا ہے کہ مسئلہ دراصل اخلاقی ہے نہ کہ اقتصادی اور اس لئے اونہوں نے اس کا علاج بھی اخلاقیات سے
کرنا چاہا ہے۔ تمام انقلاب پسند اہل قلم مخبران صادق کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ محض اس
وجہ سے نہیں کہ انہوں نے مستقبل کے متعلق پیشینگو یاں کیں بلکہ جو کچھ ظہور پذیر ہونے والا تھا
اس کے لئے لوگوں میں جذبات پیدا کردئے۔ اس لئے ان تمام تر تصنیفات جماعتی تخیلات کے
لئے نوامیں ہیں اور وہ خود انسانوں کے مہتم بالشان ؟

ان مضمون نگاروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کوئی بڑے آدمی نہیں۔ مخبر صادق اور معا
کا عزت و احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کو مکمل انسان نہیں کہہ سکتے تمام بڑے بڑے انقلا
پسندوں نے اپنی ذاتی کمزوریاں محسوس کیں اور ان میں سے ہر ایک نے انسانوں کی ایسی جماع
دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جنہوں نے فن حیات کی پوری تکمیل کی ہو جو خود ان کے لئے غیر ممکن
تھا۔ اس فن میں کمال حاصل کرنے کے یہ معنی نہیں کہ قوت تخیلا نہ موجود ہو، نہ یہ کہ انسان
محض اپنے نفس پر پورا ضبط و اختیار حاصل ہو جائے جس کی دوررسی اور عیاری کی خا
بیراگی اور صوفی ہمیشہ تمنا خواں رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تکمیل انسانی کے لئے ضبط نفس پہلی منز
ہے۔ کیونکہ انسان کیلئے اس عقل کی سرگشتگی اور ان جذبات کی آوارگی سے نجات حاصل کرنا
ہے۔ جو اس کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملے ہیں۔ جس طرح ایک پہلوان کشتی میں اپنے جسم پر پو
قابو رکھتا ہے اسی طرح مکمل انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے

ماغ پر پورا قابو رکھے ۔اس لئے ضابطہ اور باقاعدگی ہر چیز کے کمال حاصل کرنے کے لئے لابدی ہیں
یکن کمال کی اصل طمانیت ہے بغیر کسی مزید جد و جہد کے تمام قوائے جسمانی اور دماغی میں جیتی ہونی چاہئے
یونکہ اگر اجتماعی عادات میں کوئی انقلابی تبدیلی انسان کو فن زندگی میں تکمیل بخش سکتی ہے تو زندگی کے
موز اور نوعیتوں میں مزید اضافہ ہوتا رہنا چاہئے نہ کہ یکسانیت اور استحکام ۔مہذب انسان اس
عنی کر آزاد ہو جائے گا جو فضا ، اور بلغار کے تخیل سے پرے ہے حالانکہ وہ حریت و آزادی
ی مدح میں ہر وقت رطب اللسان رہے ہیں اور جن کا یہ خیال ہے کہ قانون یا قوت بازو کے
زور سے یہ دولت حاصل کی جاسکتی ہے

مزید براں یہ کہ یہ آزاد انسان جو اپنی زندگیوں کے خود مختار ہوں گے محض پیدائش دولت
ا صرف خرچ کرنے میں ہی نہ مصروف رہیں گے نہ کسی خاص عقیدہ کے پیرو ہوں گے بلکہ ان
ی زندگی گویا ایک دوسرے کی ہمدمی و یاوری ہو گی ۔ نظام جماعت ان کے باہمی تعاون کا فطری
نتیجہ ہو گا اور وہ اپنی مکمل انسانیت کے جوہر اس متلون بغیر بدیہ اور ناقابل توضیح کائنات میں
کھلائیں گے ۔اس قسم کی دنیا بالکل ممکن ہے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ خیالات بعید
ز حقیقت ہیں ۔

"ترجمہ"

"یوسف حسین"
متعلم جامعہ

مطبوعات جدیدہ

تاریخ الدولتین از مولانا نیاز فتحپوری ۔ مطبوعہ شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ

تاریخ اسلام سے جو دلچسپی اس عرصہ میں مسلمانوں کو پیدا ہوگئی ہے اس کی برکت ہے کہ گذشتہ چند سال میں متعدد تصانیف اس مبحث پر شایع ہوئی ہیں ۔ اسلام کا دور کامرانی چند سال یا چند صدیوں تک محدود نہیں، تیرہ صدی کے طویل عرصہ میں متعدد اقالیم میں جو کارنامے اہل اسلام نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان کی فہرست بھی مختصر نہیں ہوسکتی ۔ حال میں جامعہ ملیہ کے شعبہ تصنیف و تالیف نے جو سلسلہ تاریخ الامت کے نام سے شایع کیا ہے اس کو ایک مختصر و جامع تاریخ ہونے کی حیثیت سے غیر معمولی کامیابی ہوئی لیکن ضرورت ہے کہ مختلف عہد و خاندانوں کی مکمل تاریخ بھی جداگانہ شایع کی جاے ۔ چنانچہ عہد بنی امیہ و بنی عباس کے متعلق جرجی زیدان کی مشہور تاریخ اسلام کے مقالہ سے فائدہ اٹھا کر مولانا نیاز فتحپوری نے تقریباً دو سو صفحے کی کتاب تاریخ الدولتین کے نام سے شایع کی ہے ۔ ابتدا میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں تاریخ عرب پر ایک اجمالی نظر کی گئی ہے اور عرب و عجم کے تعلقات کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کتاب بہ اعتبار طباعت و حسن صورت واقعی قابل تعریف ہے اگرچہ کتابت کے اغلاط سے بالکل پاک نہیں نیز طرز بیان کی خوبی زبان کی سلاوت و روانی اور واقعات تاریخی پر صحیح تنقید نے اس کے عام دلچسپی اور وقعت کو بہت بڑھا دیا ہے ۔ اور اس قابل ہے کہ عام طور سے اسلامی مدارس اور مسلمان گھروں میں جگہ پائے ۔ اس کتاب میں ایک بڑی کمی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ فہرست مضامین درج نہیں ہے ۔ قیمت عہ

بشریٰ ۔ از مولانا سید سلیمان ندوی ۔ مطبوعہ محمدی پریس علی گڈھ ۔ ملنے کا پتہ احمد برادران تاجران کتب علی گڈھ قیمت ۶ر

مذہب اسلام کی حقانیت، اس کی سادگی، اور ایک عملی مذہب ہونے کے دلائل دنیا کے پاس ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں موجود ہیں اس مسئلہ کو

مذہبی نظر سے اور نیز فلسفہ علامہ جدیدہ کی روشنی میں بارہا مختلف پہلوؤں سے پیش کیا جا چکا ہے۔
لیکن مولانا سید سلیمان صاحب کے زور قلم نے جو دلاویز تصویر اسلام کی لبشریٰ کے اوراق میں کھینچی
ہے اور جس میں زیادہ تر انھوں نے محض اسلامی روایات، احادیث، اور تفسیر قرآنی سے بحث کی ہے
وہ بجائے خود موثر و لطیف ہے۔ اسلام کو دنیا کا آخری مذہب، مکمل ترین راہ ہدایت اور امن
وسلامتی کا پیغامبر ثابت کیا ہے ابتدا ئے کتاب میں چند اوراق تعرف کے لئے خواجہ عبد الحیٰ صاحب
کے قلم سے شایع کئے گئے ہیں۔ اور یہ مختصر کتاب بہ حیثیت مجموعی اس قدر خوبی و نفاست سے طبع
ہوئی ہے کہ ایک مرتبہ ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کئے بغیر رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

ہمارا گھر (سوشل ڈراما)۔ از عبد اللطیف شاد۔ مطبوعہ خلافت پریس، بمبئی۔

ڈراما یا ناٹک ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں دنیا کالیداس کے نام کو کبھی فراموش نہیں
کرسکتی۔ لیکن کچھ عرصہ سے اس فن پر کوئی معقول تصنیف شائع نہیں ہوئی اور جو کچھ ہوئیں ان کا مرتبہ
نقش اول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمارا گھر بھی نئے طرز پر ایک ڈراما ہے جس میں ملک کی عام
اخلاقی حالت، مغربیت کی خرابیاں اور قدیم ایشیائی خصوصیات خلوص و ہمدردی انسانی کی خوبیاں
ایک قصہ کے پیرایہ میں ظاہر کی گئی ہیں۔ جدید قومی خیالات اور آزادی ہند کی جو تحریک دلوں
میں جاگزیں ہو چکی ہے اس کا اثر بھی اس قصہ میں نظر آتا ہے لیکن ان تمام خصوصیات کو ڈراما
کے محدود و مختصر حجم میں شامل کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں
ہوسکی واقعات کا تسلسل بھی کسی قدر خود ساختہ معلوم ہوتا ہے نیز جو کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں
ان کی خصوصیات میں مبالغہ نظر آتا ہے۔ برائی اور بھلائی ہر شخص میں ہوتی ہے اور دونوں کا
قدرتی تناسب ہی لطف پیدا کرتا ہے لیکن اس ڈرامہ میں مبالغہ نے اس لطف کو زائل کردیا
ہے عبارت بالخصوص باہمی گفتگو کے اس قدر دقیق ہیں کہ روزمرہ کی بول چال میں کہیں سننے
میں نہیں آتی۔ ذی علم حضرات کے یہاں بھی فارسی وعربی کے اس قدر الفاظ استعمال نہیں ہوتے
چہ جائیکہ انگریزی تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ خاندانوں اور بالخصوص ہندو خواتین کی زبان سے

یہ الفاظ تو بالکل ہی غیر معلوم ہوتے ہیں نیز انگریزی الفاظ کا بجنسہٖ استعمال اس کثرت سے اور اس قدر بے محل ہے کہ بعض وقت سخت ناگوار گزرتا ہے۔ فارسی عربی کے غیر مانوس و متروک الفاظ کو نہایت سنجیدہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرنا بھی دلچسپی کے اضافہ کا باعث نہیں ہوسکتا۔ مثلاً جس موقع پر باپ (دونانک پرشاد) اپنی بیٹی سرسوتی سے انتہائی خفگی میں کہتا ہے:۔

"میں تیری زبان سے یہ مذہبی کا فلسفہ سننا نہیں چاہتا۔ میں یہ بیہودہ شطحیات وطامات یہ سوفسطائی لغویات نہیں پسند کرتا۔"

کتاب نہایت خوبی وسلیقہ کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور نفسہ بہ حیثیت مجموعی دلچسپ و قابل مطالعہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ منشی عبداللطیف شاد۔ نمبر ۲۱۴ گول پٹھیا کھیت باڑی۔ فرسٹ کراس لائن۔ بمبئی نمبر ۴۔

صحابیات از مولانا نیاز فتحپوری۔ سلسلہ مطبوعات صوفی نمبر ۲ صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ منڈی بہاؤالدین گجرات

مولانا نیاز فتحپوری کے قلم سے ازواج النبی صلعم اور دیگر انصار و مہاجر خواتین اسلام کے حالات زندگی میں یہ اک مفصل تصنیف شایع ہوئی ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب اور خاص اہتمام سے طبع کیا گیا ہے عام طباعت و کتابت بھی اچھی ہے۔ کتاب میں انہاون خواتین اسلام کی حالات زندگی درج ہیں اور چونکہ عہد اسلام کے ابتدائی زمانہ کے حالات ہیں اس لئے متعدد مسائل مذہبی فقہ و حدیث کا ضمناً ذکر آجاتا ہے۔ آغاز کتاب میں ایک مفصل و مبسوط مقدمہ جس میں عورت کی حیثیت مذہب اسلام میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ بالخصوص اس زمانہ میں کہ عورتوں کے متعلق روز نئے مسائل اور نئی ضروریات سامنے آتی ہیں اسلام کی نامور خواتین کی پاک زندگیاں ہمارے لئے خاص طور سے مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہیں قیمت بلا جلد ۱۲؍ مجلد سے ۱۲؍

ناقد

نقد و نظر

نوبل پرائز کے نام سے جو انعامات سویزرلینڈ میں قایم ہیں اور ہر سال کسی مشہور سائنٹسٹ یا ادیب یا ماہر سیاست کو قیام امن کی خاطر دئے جاتے ہیں ان کا قایم کرنیوالا الفرڈ نوبل ایک سائنٹسٹ تھا جس نے ڈائنامائیٹ ایجاد کیا۔ وفات کے وقت اس کا سرمایہ دو کروڑ باسٹھ لاکھ سے متجاوز تھا اور اس نے یہ تمام رقم ان انعامات کے لئے وقف کردی علاوہ طبعیات، کیمیا، علم البدن یا طب کے ایک انعام ادب کے لئے اور ایک تقائے امن کے لئے دیا جاتا ہے اور ہر ایک کی رقم تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

جولائی سنہ ۱۹۲۳ء میں فرانس نے ایک ایسا قانون پاس کردیا جس کی رو سے کثرت اولاد کی طرف لوگوں کی توجہ ہو اور افزایش نسل کو بار دوش نہ سمجھا جائے۔
جس خاندان میں تین بچے موجود ہوں اُس کو ہر جدید بچہ کے لئے جسکی عمر ۱۳ سال سے کم ہو سولہ برس کی عمر تک ۹۰ فرانک سالانہ کا وظیفہ دیا جائے گا۔ اس امداد کے علاوہ جو حکومت کی طرف سے ہے مختلف جماعتیں اپنی طرف سے بھی اس مقصد کے لئے کچھ امداد کرنا چاہتی ہیں۔

بمبئی میں دلشاد بیگم حال میں جے۔ پی۔ یا مجسٹریٹ مقرر ہوئی ہیں۔ آپ دوسری خاتون ہیں جو اس عہدہ پر فایز ہوئی ہیں اور عدالت میں اجلاس فرماتی ہیں۔

مسز الیزبتھ انڈرسن ایک امریکی خاتون نے تین کروڑ روپیہ اس مقصد سے وقف کیا ہے کہ اس سرمایہ سے اک جماعت ایسی قایم کی جائے جس کا مقصد انسان کی مدت عمر میں اضافہ کی تدابیر اختیار کرنا ہو۔ نیویارک کا مشہور اخبار ٹریبون لکھتا ہے کہ اس بات سے مختلف ممالک

میں کافی کامیابی حاصل کی ہے۔

"بچوں کے حقوق" کے عنوان سے بعض خواتین اور ان کے اخبار ایک جدید تحریک کا آغا
چاہتی ہیں۔ اس وقت تک مردوں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، مزدوروں کے حقوق، وغ
بہت سی تقسیمیں کی جاچکی ہیں۔ اور بنی آدم کو مختلف و متضاد حیثیتوں میں پیش کیا گیا ہے
"بچوں کے حقوق" سے ایک ایسے فتنہ کی بنیاد پڑ جانے کا اندیشہ ہے جس سے زیادہ سخت وتکل
کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ عہد طفلی بےخبری و راحت کا مرادف سمجھا جاتا ہے لیکن اب حقوق کا سوا
کرنے کے بعد یہ سکون محض، اک محشر اضطراب بن جائے گا۔ بچوں کے حقوق بچوں کے د
نقش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بڑے بڑے حروف میں دیواروں اور
کے نمایاں مقامات پر ان حقوق کو خوبصورت اور نظر فریب انداز میں تحریر کردیا گیا ہے او
کو بالترتیب شمار بھی کرادیا ہے مثلاً۔

(۱) اچھے گھرانے میں پیدا ہوں (۲) اچھا کھائیں (۳) اچھے مکان میں رہیں (۴)
تعلیم ہو اور آخر میں یہ جملہ ہے کہ "بچہ جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور جب تک اس کو و
جائے گا وہ کبھی خوش نہیں ہوگا"

بنارس ہندو یونیورسٹی نے حال میں ایک جدید بورڈنگ ہاؤس کا اضافہ کیا۔
لڑکیوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ نیز پنڈت مدن موہن مالوی صاحب نے یہ اعلان بھی
کہ یونیورسٹی مذکور میں تمام تعلیمی سہولتیں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں ہیں۔ لڑکیا
جماعتوں میں جہاں لڑکے تعلیم پاتے ہیں بخوشی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہیں۔

ہندوستان میں مختلف مذاہب اور جماعتوں کو جداگانہ حق انتخاب دیا گیا ہے"
اس اصول کو کسی نے کبھی صحیح نہیں تسلیم کیا لیکن "مخصوص حالت" کی وجہ سے اس کو جا

دیا گیا ہے۔ سلطنت ترکی میں بھی مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں اور ہمیشہ باہمی اختلافات و فسادات کی اطلاعات بھی آتی رہی ہیں، لیکن وہاں کی حکومت نے جداگانہ حق انتخاب کے اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح دوسرے ممالک کے باشندوں کو ترکی عدالت میں خاص حقوق نہیں دئے گئے حالانکہ ہندوستان میں انگریزوں کے لئے گویا عدالت ہی علیحدہ ہے۔

انگلستان میں برٹش امپائر اگزیبشن (نمائش مصنوعات سلطنت برطانیہ) کے لئے جو اہتمام اور طیاریاں ہو رہی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوشمند قومیں باوجود کثرت دولت و اسباب فراغت کے اپنی ترقی کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی ہیں۔ کناڈا اور آسٹریلیا تقریباً ۵ لاکھ پونڈ، اور ہندوستان تقریباً دو لاکھ پونڈ (تیس لاکھ روپیہ) اس نمایش پر صرف کر رہے ہیں نوآبادیات مغربی افریقہ ایک لاکھ پونڈ اور نیوزیلینڈ و جنوبی افریقہ کا خرچ تقریباً دو لاکھ پونڈ ہوگا۔ صرف صوبہ برہمانے چالیس ہزار پونڈ اخراجات نمایش کے لئے منظور کئے ہیں۔

اسی طرح کی رقوم نوآبادیات مثلاً فیجی، ملایا، ہانگ کانگ، اور مشرقی افریقہ وغیرہ نے منظور کیں ہیں۔

ذاتی شوق اور اشغال تفریح کو مفید و کار آمد بنانے کی نہایت عجیب و غریب مثالیں ملتی ہیں۔ حال میں مسز الینر جتھ گرے کا اڈنبرا میں انتقال ہوا۔ اس خاتون کی عمر ۹۳ سال کی ہوئی اور اس طویل مدت میں اس نے انسانی و جمادی اجسام کے آثار (ملندرو) چالیس ہزار کی تعداد میں جمع کئے جو اب برٹش میوزیم نے اپنے مجموعہ کے لئے خرید لئے ہیں۔

کوہ ہمالہ پر اب دوسری جماعت حملہ کرنے والی ہے اور اس کی بلند ترین چوٹیوں تک

پہونچنے کی جو کوشش ایک عرصے کی جارہی ہے اس میں اس جدید مہم کا غالباً سب سے زیادہ حصہ ہوگا۔ اس لئے اب ۲۳۰۰۰ فٹ کی بلندی سے آگے گذرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس سفر میں تصاویر حاصل کرنے کے لئے جو آلہ (کیمرہ) استعمال کیا جانے والا ہے اس کو خاص اہتمام سے ایک خچر پر بار کراکر ساتھ لیجایا جائے گا اور وہ ۱۶۰۰۰ فٹ کی بلندی تک بغیر کسی دقت کے تصاویر لے سکے گا۔ اس منزل کے بعد آلہ کو خچر سے اُتار کر جداگانہ اجزا میں منتقل کردیا جائے گا اور ایک زبردست برقی قوت کی مدد سے اس سے تصاویر لیجایں گی۔ لیکن اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید یہ صورت بھی کامیاب نہ ہو اس لئے خیال ہے کہ بالآخر ایک دوربین کی مدد سے تصاویر لیجائیں گی جو ہائی میل کے فاصلہ سے نہایت صحیح تصویر کھینچ سکے گی۔

"ناظر"

سلکِ جواہر

بیادِ پنڈت جواہر لال نہرو

از مولوی اقبال احمد سہیل ایم اے ایل ایل بی

نیرنگیٔ چرخ! ترے صدقے — زنداں ہو نشیمنِ جواہر
خوکردۂ سایۂ تنعّم — پروردۂ دامنِ جواہر
وہ جس کے وجود کی بدولت — ہند اب بھی ہے معدنِ جواہر
جس کے فیضِ سخن سے اب تک — ہے سامعہ مخزنِ جواہر
آنند بھون سے کیا غرض اب — ہر دل ہے نشیمنِ جواہر
پہلو میں دلِ شرار پیکر — شمعِ تہِ دامنِ جواہر
اخلاص کی اک برقِ جانسوز — تیغِ سپہ افگنِ جواہر
آئینۂ محبتِ وطن کا — وہ عارضِ روشنِ جواہر

شیدائے وطن فدائے ملّت
سرتا بہ قدم ولائے ملّت

کھدّر اس پھول سے بدن پر — غیرتِ دہ اطلسِ مشجّر
اخلاص کی دلفریب تصویر — ایثار کا جان نواز پیکر

بھارت کا سپوت انارش ملک، اقبالِ وطن بہارِ کشور
اخلاق کی صورت مجسم ایمان کا شعلۂ مصوّر
ہند اس کے فیوض سے چراغاں ملک اس کے قدوم سے منوّر
الفاظ میں شہد کی حلاوت انداز میں جلوۂ گُلِ تر
آزادیٔ ہند کا ہراول حزبِ وطنی کا میرِ لشکر
وہ ہمّتِ مستقل کا مرکز وہ وحدتِ مدعا کا محور
وہ عزم کا ایک حصنِ رویئن وہ ضبط کا جوہرِ مقطر
وہ حسنِ خیال کا مرقع اور صدقِ مقال کا وہ مظہر
ہندو، مسلم، کرسچین، سکھ سب اس کے خلوص کے ثناگر
پنڈت جی کا عصائے پیری شوکت کا عزیز تر برادر
وہ قوتِ بازوئے محمد آزاد کا غمگسار و یاور
پائے شرفِ قبول یارب اقبال کا ہدیہ محقر

قد تو بہار ایں چمن باد
روئے تو فروغ انجمن باد

غزل

از جناب سجاد علی انصاری صاحب بی۔ اے ایل ایل بی

سرمستی انتظار کب تک امید کا اعتبار کب تک

اب شوق کو خود ہی حسن کر لے — افسانہ ہجر یار کب تک
اے گمرہِ منزلِ تمنا — یہ شغل جنون و خار کب تک
اب ہوش کی بھی تو کچھ خبر لے — پیراہن تار تار کب تک
مانا کہ سکون غم ہے بہتر — پر غم کا بھی اعتبار کب تک
آوارۂ رنگ و بو ہوں لیکن — یہ شعبدۂ بہار کب تک
جا راز کو اپنے فاش کر دے — دلداری راز کب تک
اے بیخبر رموز ہستی — امید کا یہ خمار کب تک
خود عرش پہ جا کے کھینچ لاؤں — یہ زحمت انتظار کب تک

الصلح للبقا

از جناب حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی

حیف ہے حیف ہے اے ہستی اجسام پرست — آہ! تیرے لئے ہو وجہہ تفاخر رزم وستیز
شیوۂ جنگ تو ہو نشۂ مینائی الست — اور شکست ایسی کہ ہو صلح سے آخر نہ گریز

بہرہ ور کچھ بھی جو ہو لذت روحانی سے — پھر یہ دنیائے دنی ہو نہ کبھی بہر تنگ
پائے عمر ابدی زندگی فانی سے — عار پیکار سے آئے سبب ننگ ہو جنگ

خود تفرقہ انداز ہے بنیاد نزاع — کاش ہو اس کی رہ ریشہ دوانی مسدود
نفرتوں میں بھی ہو توحید بحکم اجماع — پھر یہ دنیا نظر آجائے بہشت موعود

آؤ دنیا کو یہ عبرت کا سبق سکھلائیں
تاکہ ہر گبر و نصاری ہو فرید اور جنید

بزمِ کثرت میں وہ وحدت کا سماں دکھلائیں
عُمَر خالد سے جدا ہو نہ جدا عُمَر سے زید

شذرات

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ کا جلسہ تقسیم اسناد ۹- مارچ کو منعقد ہوا- یہ تقریب ہر دار العلوم کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن جامعہ کے مخصوص حالات اور مختلف مشکلات نے اس جلسہ کو بھی ایک جداگانہ حیثیت دیدی ہے- سال بھر کی عملی زندگی پر نظر، اکابرین قوم کو جامعہ کے صحیح حالات کی اطلاع، موجودہ ضروریات اور آیندہ کے پروگرام کے متعلق مشورہ اور قرار دینا یہ سب امور ایسے ہی اجتماع کے موقع پر انجام پاتے ہیں- اس مرتبہ نہ صرف مولانا محمد علی و شوکت علی صاحبان پہلی مرتبہ شریک جلسہ ہوئے بلکہ تمام اکابرین قوم کا اتنا بڑا مجمع تھا کہ بہت کم ایسی تقریبات میں نظر آتا ہے-

---

مسٹر محمد مار ماڈیوک پکھتال کا خطبہ صدارت اسلامی تعلیم اور حقایق قرآنی کی ایک فصیح و بلیغ تفسیر تھی- مسٹر پکھتال کی انگریزی زبان سے صحیح مخارج و تلفظ کے ساتھ آیات قرآنی کی تلاوت سُننے والوں پر خاص اثر کئے بغیر نہ رہتی تھی- اور جس خوبی و ضاحت سے انہوں نے تعلیم اسلام کو آزادی خیال اور صدق مقال کی بنیاد قرار دیکر موجودہ دور مغربیت میں اس کی اہمیت کو ظاہر کیا وہ بجائے خود سبق آموز ہے- اور آیندہ نسل کی کامیابی کا دارومدار اسی ایک اصول پر قرار دیا جائے تو بیجا نہیں محمدؐ اسلام صلعم کا ارشاد کہ "صحیح مذہب محض ایک نصب العین نہیں ہے جس کو دنیا کی عملی زندگی سے تعلق نہ ہو" اسی حقیقت کا اعادہ ہے- مسٹر پکھتال کے نزدیک اسلام "آزاد خیالی و عقلیت کا مذہب ہے- اگرچہ انسانی عقل جب حقایق کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو اپنے حدود کو نہ بھول جانا چاہئے اس لئے کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی وہ کوشش کرنا چاہتی ہے وہ نہایت عظیم الشان ہیں اور ان کی عظمت و شان ہی وجود باری کا ثبوت ہے-

آگے چل کر مسٹر پکھتال نے مذہب اسلام اور دنیا کے تعلقات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اکثر بھائی ایک شدید خوفناک غلطی میں مبتلا ہیں

ان کا قول و فعل ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان قوم اور دنیا بر سرپیکار ہے۔ حالانکہ سچا اسلام تو دنیا کے لئے ہے نہ کہ دنیا کا مخالف اس لئے کہ وہ حق کی حمایت و باطل کی مخالفت کے لئے آیا ہے اور صرف مسلمان قوم ہی کے لئے نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی ہو نیکی کو بدی کے مقابلہ میں پیش کرتا ہے۔

مسٹر پکتھال کے خطبۂ صدارت کا آخری حصہ مسلمان قوم سے اپیل ہے جس میں انہوں نے موجودہ مادی ترقیات اور اسلام کا رشتہ واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک ہم کو دنیا کی ترقی تمدن میں صرف مسلمان کی حیثیت سے حصہ لینا چاہئے تاکہ ہم دہریت و مادیت کے اجزا کو اپنے نور ایمان سے زائل کر سکیں۔ مذہب و شریعت کی ابتدائی سادگی کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی سعی کرنا چاہئے اور نئی نئی باتوں، جدید اختراعات، اور جدید ترقیات سے خوفزدہ نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ "پیغمبر اسلام صلعم جدید ترین (ماڈرن) انسان ہے اور قرآن مقدس دنیا کی جدید ترین کتاب ہماری کتاب اور ہمارا پیغمبر ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر عصر کے لئے وہ ایسا پیغام پہنچاتے ہیں جس کی اس عہد کو ضرورت ہوتی ہے۔

جن باتوں کو اسلام میں آج تم قدیم و بیکار پاتے ہو وہ فی الحقیقت معمولی دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں اور جو ایک وقت ہی کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ ان باتوں کو نکال دو اور پھر تم دیکھو گے کہ اسلام اس سبب سے فنا نہیں ہو سکتا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ دوبارہ اپنی قدیم شان کے ساتھ اس گوہر کی طرح چمک اٹھتا ہے جس پر سے صدیوں کی گرد ہٹا کر صاف کر دی گئی ہو۔

مجلس ملیہ انگورہ اور غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے جو فیصلہ مسند خلافت، اور سلطان عبدالمجید و خاندان عثمانی کی معزولی کا حال میں کیا ہے۔ اس کے متعلق غالباً سب سے زیادہ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہند کو تشویش ہے۔ ہمارے بعض اکابرین ملت کا خیال ہے کہ خلافت اسلامیہ کے منصب کو ختم کر دینا احرار ترک کا مقصد نہیں ہے۔ مگر جن حضرات کو ترکوں کی موجودہ روش، مغرب

مغرب پرستی اور جدید نقطہ نظر کا کچھ بھی اشارہ ہے وہ اس خیال کو بے بنیاد سمجھتے ہیں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔

اس عرصہ میں حکومت انگورہ پر جس قسم کی نکتہ چینی اخبارات میں ہوئی ہے وہ کسی طرح غیر متوقع نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن ہم کو تسلیم ہے کہ ترکی قوم کی گذشتہ صد سالہ مصایب و قربانیوں کا ہندوستانی مسلمانوں نے پورا لحاظ نہیں کیا۔ بے شک انہوں نے اپنی مشکلات سے تنگ کر اپنی گردن کو اس طوق سے آزاد کرالیا جو خلافت کے اقتدار اور خاندان شاہی کے نام سے ترکی م کی گردن میں تھا لیکن کیا اس اہم ذمہ داری کو بھی انہوں نے محسوس کیا جو چند صدیوں سے ن کے سر پر تھی اور جس کو ہمیشہ طوعاً و کرہاً وہ قبول کرتے رہے ہیں۔ منصب خلافت، شیرازۂ اسلامی ں سکتا تھا۔ اور آثار نظر آتے تھے کہ عین اس وقت جبکہ عالم اسلام اس حقیقت سے شناس ہوچکا ہے کہ ایک بین الاقوامی رشتہ اخوت پائیدار و مستحکم کیا جائے اسی موقع پر ومت انگورہ کا یہ فیصلہ ہر حیثیت سے انقلاب زا، اور دلخراش ہے۔ "جامعہ" نے شروع مسئلہ خلافت کی اس حیثیت پر توجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اکابرین قوم کی مصلحت اندیشی اہل قلم کی پُر اسرار خاموشی نے پوری کامیابی کا موقع نہ دیا۔ بہر حال ایک مرتبہ پھر ہم درخواست ہ گے کہ یہ موقع اپنی اہمیت و نزاکت کے اعتبار سے اس قسم کا ہے کہ ہر وہ شخص جو ان ئل کے متعلق کوئی قطعی رائے رکھتا ہے اس کو بر ملا ظاہر کردے اور اس طرح قوم نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دے۔

دنیائے شعر میں جن لطیف استعاروں نے دلوں کو مسخر کیا ہے ان میں شراب و خمارے کے ت خواب کا بھی ایک مرتبہ ہے۔ عرفی کی مشہور رقموں میں اس قطرۂ شراب کی قسم نہایت ہے جو جام صبوحی کے خالی کر دینے پر اس میں رہ جاتی ہے، اسی طرح نشۂ خواب کی ا اپنی رعنائیوں کے لئے کسی سے کم نہیں اور جب کہ نیند کی گہرائیاں خواب عدم کی لطف

ہوئی تو اس بیداری کی طالع بختی کا کیا کہنا! ایسی ہی ایک نیند تھی جس میں یادش بخیر! ہماری مسلم لیگ مست خواب رہی اور ایسی ہی خمار شکنی تھی جس کا جلوہ دہلی کے ایک خاموش کمرہ میں بعض ارکان لیگ کی مخصوص دلچسپیوں کا مرجع قرار پایا۔ خداوندان لیگ کی ہمتوں پر آفریں ہے، وہ گڑے مردے اکھاڑتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اپنی مسیحا نفسی سے وہ ان کو زندہ جاوید بنا

غلطیہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں!

مسلم لیگ کے حیات تازہ سے اگر مسلمانان ہند کی سیاسیات میں کسی خوشگوار تبدیلی کی امید کیجائے تو بلاشبہ کوشش کرنا چاہیئے کہ مسلم لیگ پھر پیدا جنم لے۔ اس لئے کہ اب اگر مسلمانوں کے کسی حصہ کو لیگ کے وجود سے دلچسپی ہو سکتی ہے تو وہ ان اصولوں پر تو ممکن نہیں جو اس نے اپنے ابتدائی دور حیات میں قرار دے تھے کامیابی کی اگر کوئی امید ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ ہندوستانی سیاسیات کی موجودہ فضا سے اس کا نصب العین جدا نہ ہو اور نہ اس کے طرز عمل میں اس زمانہ کے خلاف کسی قسم کی فرقہ بندی، گروہی یا خود پرستی کو دخل دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے مطالبات کے اظہار کے لئے خلافت کمیٹی میں کیا کمی ہے جو ایک دوسرے آرگنائزیشن کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ شائد خود کے لئے ہر مرتبہ نئے انداز کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اور اس جستجو میں روز نئے بت تراشے جاتے ہیں۔

حکومت انگلستان کی موجودہ پارلیمنٹ میں کئی خواتین ممبر ہیں جن میں سے اکثر جمیل ان صفحات میں آچکا ہے۔ حال میں ایک جدید قانون دار العلوم نے منظور کیا ہے ہے کہ اس کے نفاذ میں بھی زیادہ عرصہ نہ لگے گا، جس کی رو سے اکیس سال کی عمر کو حق انتخاب حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح رائے دہندہ عورتوں کی تعداد انگلستان

مردوں سے پانچ لاکھ زیادہ ہو جائے گی۔ گویا کثرت رائے عورتوں کے ہاتھ میں ہو گی۔
اس قانون کے متعلق مباحثہ بھی خصوصیت سے دلچسپ تھا اور سب سے زیادہ سبق آموز و عبرت انگیز وہ دلاویز تقریر تھی جو اس موقع پر ڈچز آتھول نے فرمائی۔ خاتون موصوف طبقہ امراء کے اعلیٰ خاندان کی فرد اور سوسائٹی کی مشہور خواتین میں سے ہیں۔ آپ نے عورتوں کو اس کثرت سے ووٹ کا حق دئے جانے کی سخت مخالفت فرمائی اس لئے کہ آپ کے نزدیک یہ حق "کم علم حیثیت اور جاہل عورتوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا جن سے امید نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر استعمال کر سکیں۔ حالت تو یہ ہے کہ ان عورتوں کا گھر نہ در، ماری ماری پھرتی ہیں پھر کیا توقع ہو سکتی ہے کہ ان کو اتنی خبر بھی سیاسیات کی ہو جس قدر کہ دوسرے لوگ اپنے ہمنشینوں سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیتے ہیں"۔

یہ وہ خیالات ہیں جو پارلیمنٹ کی عورت ممبر عورتوں کے حقوق کے متعلق رکھتی ہے! ترقی قومی کی سب سے بڑی علامت اگر عورتوں کا سیاسیات میں مردوں کے ساتھ مساویانہ حصہ لینا ہے تو بلاشبہ اس آزادی رائے کی قدر کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ہمدردی انسانی اور مساوات باہمی کے یہی نظارے ہیں تو پھر ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم عورتوں کی نرم دلی، فطری محبت، جانثاری و ہمدردی کا ماتم کریں جو یورپ کی ترقی یافتہ سوسائٹی میں اس وقت نظر آتا ہے تعجب ہے کہ انگورہ کی۔ ترقی پذیر حکومت نے اس وقت عورتوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے حق سے محروم کر دیا تھا لانکہ ان کے دوسرے بھائی مصر و قسطنطنیہ میں "تیرہ سو سال کی شدید ناانصافیوں" کی تلافی کر رہے ہیں، اور بزعم خود تعداد ازدواج کو مسدود کے جدید "دور ترقی" کا اجرا فرمانے والے ہیں!

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے "حقیقتوں" کو عریاں کرنے میں جو ناقابل

رشک شہرت حاصل کرلی ہے اس کے اعتبار سے مسئلہ خلافت پر ان کا مفہوم زیادہ
تعجب نہیں۔ لیکن یہ آج تک نہ معلوم ہوسکا کہ حقیقت کے چہرہ سے نقاب اُٹھانے اور
الہی کا فرض ادا کرنے کے لئے "وقت اور موقع" کس نظر سے انتخاب کیا جاتا ہے جو
گذشتہ دو سال میں مختلف حیثیتوں سے ملک میں پیش ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس تمام
صاحبزادہ صاحب نے اپنی "ذاتی حیثیت میں" کبھی توجہ نہ فرمائی۔ لیکن اس مرتبہ
حقایق پیش کرنے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں اور باوجود اس اصرار کے کہ وہ جو کچھ
ہیں اپنی ذاتی حیثیت میں فرماتے ہیں ان کو ایک مفصل مضمون کی ضرورت پیش
غالباً یہ نوجوان ترکوں کی جواں بختی کی دلیل ہے کہ ان کو صاحبزادہ صاحب جیسا بختہ کا
مل گیا ورنہ ہندوستان میں اس نظر سے مسئلہ خلافت پر بحث کرنے والے
وقت کم لوگ نظر آتے ہیں۔

[illegible]